DUE DATE

Cl. No. ______________ *Acc. No.* ______________

Late Fine **Rs. 1.00** per day for first 15 days.
Rs. 2.00 per day after 15 days of the due date.

ہنامہ

شاداب

حیدرآباد

( )



PRICE RS 10

جلد ۳
شمارہ ۱
جنوری سنہ ۱۹۹۷ء
قیمت دس روپے

ماہنامہ

شاداب

حیدرآباد

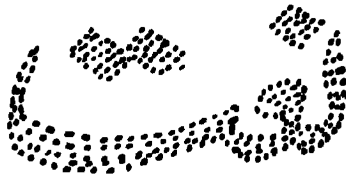
زرِ تعاون

	سالانہ	دو سال کیلئے	تاحیات
ہندوستان	۱۰۰ روپے	۱۸۰ روپے	۱۵۰۰ روپے
خلیجی ممالک	۳۰۰ //	۵۵۰ //	۴۰۰۰ //
امریکہ	۵۰ ڈالر	۹۰ ڈالر	۹۰۰ ڈالر
انگلستان	۳۰ پونڈ	۵۰ پونڈ	۵۰۰ پونڈ
پاکستان	۲۰۰ روپے	۳۵۰ روپے	۴۰۰۰ روپے

ترسیل زر کا پتہ　ماہنامہ شاداب ۱۴۷-۵-۱۱ ریڈہلز حیدرآباد

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلیشر محمد قمرالدین صابری نے نخیل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپوا کر دفتر شاداب ۱۴۷-۵-۱۱ ریڈہلز حیدرآباد سے شائع کیا۔

فہرست



نبیوں اور رسولوں میں بھی سب سے معتبر تم ہو
تمہارا مرتبہ کیا جائیں ہم "کیسے بشر تم ہو"

تمہارا نام مومن کے لیے فرحت کا باعث ہے
سکونِ قلب ہو تم اور تسکینِ جگر تم ہو

تمہارے امتی کہلا کے ہم خیر الامم ٹھہرے
ہمیں ہے ناز تم پر یا نبی خیر البشر تم ہو

بلاشک حق تعالیٰ ساری مخلوقات کا رب ہے!
بلاشک ساری مخلوقات کی رحمت مگر تم ہو

تمہارا معجزہ سب سے بڑا قرآنِ محکم ہے
ہے باعظمت یہ قرآں اور باعظمت بشر تم ہو

تمہاری ذریت ہی چار سو عالم میں ہادی ہے
تمہاری ذریت ساری ثمر ہیں اور شجر تم ہو

ھادی قدسی

صورت



حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی

صورت اور حقیقت میں بڑا فرق ہے

ایک چیز کی صورت ہوتی ہے اور ایک حقیقت، ان دونوں میں بہت بڑی مشابہت کے باوجود بہت بڑا فرق بھی ہوتا ہے آپ روزمرہ کی زندگی میں صورت اور حقیقت اور ان کے فرق سے خوب واقف ہیں، میں اس کی دو مثالیں دیتا ہوں، آپ نے مٹی کے پھل دیکھے ہوں گے جو بالکل اصلی پھل معلوم ہوتے ہیں لیکن صورت میں، حقیقت میں زمین و آسمان کا فرق ہے، اصل آم کوئی اور چیز ہے اور مٹی کا نقلی آم کوئی اور چیز، مٹی کے آم میں نہ اصلی آم کا ذائقہ ہے نہ خوشبو، نہ رس، نہ نرمی، نہ اُس کی خاصیتیں، صرف آم کی شکل ہے اور اُس کا رنگ و روغن۔ اس لیے اس کو آم کہیں گے مگر مٹی کا آم، یہ مٹی کا دیکھنے بھر کا ہے، نہ کھانے کا نہ سونگھنے کا، نہ ذائقہ، نہ خوشبو۔

آپ مردہ عجائب خانہ میں گئے ہوں گے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہاں سب درندے اور سب جانور موجود ہیں۔ شیر بھی ہیں اور ہاتھی بھی۔ تیندوا بھی، اور چیتا بھی مگر بے حقیقت بھس بھری ہوئی کھالیں جن میں نہ کوئی جان ہے نہ طاقت شیر ہے مگر نہ اُس کی آواز ہے نہ غصہ، نہ طاقت ہے، نہ ہیبت۔

حقیقت کے مقابلہ میں صورت کی شکست

اب میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ صورت کبھی حقیقت کے قائم مقام نہیں ہوسکتی، صورت سے حقیقت کے خواص کبھی ظاہر

نہیں ہوسکتے، صورت کبھی حقیقت کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ صورت کبھی حقیقت کا بوجھ سنبھال نہیں سکتی، جب صورت کسی حقیقت کے مقابلے میں آئے گی، اس کو شکست کھانا پڑے گی۔ جب صورت پر کسی حقیقت کا بوجھ ڈالا جائے گا، صورت کی پوری عمارت زمین پر آ رہے گی۔

صورت اور حقیقت کا یہ فرق ہر جگہ نمایاں ہوگا۔ ہر جگہ صورت کو حقیقت کے سامنے پسپا ہونا پڑے گا۔ یہاں تک کہ عظیم سے عظیم اور مہیب سے مہیب صورت اگر حقیر سے حقیر حقیقت کے مقابلہ میں آئے گی تو اس کو مغلوب ہونا پڑے گا اس لیے ہر چھوٹی سے چھوٹی حقیقت ہر بڑی سے بڑی صورت کے مقابلہ میں زیادہ طاقت رکھتی ہے، حقیقت ایک طاقت ہے۔ ایک ٹھوس وجود ہے، صورت ایک خیال ہے دیکھیے ایک چھوٹا سا بچہ اپنے کمزور ہاتھ کے اشارے سے ایک بھُس بھرے مردہ شیر کو دھکا دے سکتا ہے اُس کو زمین پر گرا سکتا ہے، اس لیے کہ بچہ خواہ کتنا ہی کمزور سہی ایک حقیقت رکھتا ہے، شیر اس وقت صرف صورت ہی صورت ہے، بچہ کی حقیقت شیر کی صورت پر آسانی سے غالب آجاتی ہے

نفس کا دھوکا

یہ عالم حقائق کا مجموعہ ہے اللہ تعالیٰ نے ہر چیز میں ایک حقیقت رکھی ہے مال کی بھی ایک حقیقت ہے اس کی محبت طبعی اور اس کی خواہش فطری ہے اگر حقیقت نہ ہوتی تو اس کے متعلق احکام کیوں ہوتے، اس میں کشش کیوں ہوتی؟ اولاد ایک حقیقت ہے اس سے طبعی محبت اور فطری تعلق ہوتا ہے، اگر اولاد ایک حقیقت نہ ہوتی تو شریعت میں اس کی پرورش و نگہداشت کے احکام و فضائل کیوں ہوتے؟ اسی طرح طبعی ضروریات اور خواہشات کی بھی ایک حقیقت ہے۔ ان حقیقتوں پر ایک بالاتر، قوی تر حقیقت ہی غالب آسکتی ہے، کوئی صورت غالب نہیں آسکتی۔ یہ حقائق کتنے باطل آمیز سہی

سبھی ان پہ فتح حاصل نہیں کر سکتی۔ اس لیئے کہ ادھر حقیقتیں ہیں اُدھر صرف صورت، آج ہم یہی دیکھ رہے ہیں کہ صورت اسلام ادنیٰ ادنیٰ حقائق پر غالب نہیں آرہی ہے اس لیئے کہ صورت میں دراصل کچھ بھی طاقت نہیں۔ ہماری صورتِ اسلام، صورتِ کلمہ، صورت نماز ہم سے ادنیٰ ترغیبات چھڑانے سے قاصر ہے، ادنیٰ عادات پر غالب آنے سے عاجز ہے ہم کو موسم کی ادنیٰ سختی اور حقیر ترین خواہش کا مقابلہ کرنے کی طاقت عطا نہیں کرتی۔ آپ کا یہ کلمہ جو کبھی گردن کٹوا دینے کی طاقت رکھتا تھا، جو مال اور اولاد کو اللہ کی راہ میں بے تکلف قربان کرا دینے کی قوت رکھتا تھا جو وطن چھڑا دینے اور تختہ دار پہ چڑھا دینے کی قوت رکھتا تھا، آج وہ ان سردیوں میں فجر کی نماز کے لیئے اُٹھانے کی طاقت نہیں رکھتا جو کلمہ زندگی بھر کی منہ لگی شراب کو شریعت کے حکم پر ہمیشہ کے لیے چھڑا سکتا تھا آج اگر ضرورت پڑ جائے تو آپ کی ادنیٰ مرغوب چیز کو یا معمولی عادت کو نہیں چھڑا سکتا اس لیئے کہ وہ کلمہ کی حقیقت تھی جس کے کارنامے آپ تاریخِ اسلام میں پڑھتے ہیں یہ کلمہ کی صورت ہے جس کی بے اثری آپ دن رات دیکھتے ہیں۔ ہم غلطی یہ کرتے ہیں کہ صحابہ کرام رض کی تاریخ کو اپنے اُوپر اوڑھنا چاہتے ہیں! اس کو اپنے اوپر منطبق کرنا چاہتے ہیں جب وہ منطبق نہیں ہوتی، جب وہ لباس راست نہیں آتا، جب جگہ جگہ جھول پڑ جاتے ہیں تو ہم شکایت کرنے ہیں، تعجب کرتے ہیں کہ کلمہ وہ بھی پڑھتے تھے ہم بھی پڑھتے ہیں، نماز وہ بھی پڑھتے تھے، ہم بھی پڑھتے ہیں، پھر کیوں اسی طرح کے واقعات ظہور میں نہیں آتے، کیوں اسی طرح کے نتائج و ثمرات برآمد نہیں ہوتے؟ دوستو اور بزرگو! اپنے نفس کو دھوکا نہ دو، وہاں کلمہ کی حقیقت تھی، ایمان کی حقیقت تھی۔ یہاں کلمہ کی صورت ہے، ایمان کی صورت ہے، نماز کی صورت ہے جس طرح املی کے بیج سے آم کے پھل کی توقع فضول ہے اسی طرح صورت سے حقیقت کے خواص کی اُمید بے کار ہے اور فریب نفس۔

حقیقتِ اسلام : حضرت خبیب رض کا واقعہ آپ نے سنا ہے پھانسی کے تختہ پر

ان کو چڑھایا گیا، چاروں طرف سے نیزوں کے لوگوں نے ان کو کوچنا شروع کیا، برچھیوں نے ان کے جسم کو چھلنی کر دیا، وہ صبر و استقامت کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے، عین اس حالت میں ان سے کہا جاتا ہے کہ کیا تم اس پر راضی ہو کہ تمہاری جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوں؟ وہ تڑپ کر جواب دیتے ہیں کہ میں تو اس پر بھی راضی نہیں کہ مجھے چھوڑ دیا جائے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تلوہ میں کوئی کانٹا بھی چبھے، حضرات کیا یہ صورتِ اسلام تھی جس نے انکو تختۂ دار پر ثابت قدم رکھا اور ان کی زبان سے یہ الفاظ کہلوائے؟ نہیں — وہ اسلام کی حقیقت تھی جو ان کے ہر زخم پر مرہم رکھتی تھی جو ہر نیزے کی چبھن پر ان کے سامنے جنت کا نقشہ لاتی تھی اور انھیں دکھاتی تھی کہ یہ تمہاری اس تکلیف کا صلہ ہے بس چند لمحوں کا معاملہ ہے یہ جنت تمہاری منتظر ہے۔ یہ خدا کی رحمت تمہاری منتظر ہے۔ اگر تم نے اس فانی جسم کی اس فانی تکلیف کو گوارا کر لیا تو غیر فانی زندگی کی غیر فانی راحت تمہارا حصہ ہے یہ عشق و محبت کی حقیقت تھی جب ان سے کہا گیا کہ کیا تم کو یہ منظور ہے کہ تمہاری جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوں؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت حقیقت بن کر ان کے سامنے آگئی اور ان کو گوارا نہیں ہوا کہ اس جسم اقدس کو ایک کانٹے کی بھی تکلیف ہو۔

یہ چند پاک اور بلند حقائق تھے جو درد و تکلیف کی حقیقت پر غالب آئے، صورتِ اسلام میں اس حقیقی درد و تکلیف کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہ پہلے تھی، نہ اب ہے، صورتِ اسلام تو تکلیف کے تصوّرات اور خیالات کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ہم کو اور آپ کو معلوم ہے کہ گذشتہ فسادات کے موقع پر خیالی خطرات کی بناء پر لوگوں نے صورتِ اسلام بدل دی مسلمانوں نے سروں پر چوٹیاں رکھیں اور غیر اسلامی شعار اختیار کئے۔ اس لئے کہ ان غریبوں کے پاس صرف صورتِ اسلام تھی جو اس میدان میں ٹھہر نہیں سکتی تھی۔

آپ نے سُنا ہے کہ حضرت صہیب رض رومی ہجرت کر کے جانے لگے تو کفارِ مکہ نے انکو راستہ میں روکا اور کہا کہ صہیب رض تم جا سکتے ہو۔ مگر یہ مال نہیں لے جا سکتے جو تم نے ہمارے شہر میں پیدا کیا ہے اب حقیقتِ اسلام کا حقیقتِ مال سے مقابلہ تھا۔ حقیقتِ اسلام اپنی مقابل حقیقت پر غالب آئی، صورت اسلام ہوتی تو وہ حقیقتِ مال کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔

آپ نے سُنا ہے کہ حضرت ابو سلمہ رض جب ہجرت کر کے جانے لگے تو کفار ان کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے کہا کہ تم جا سکتے ہو مگر ہماری لڑکی ام سلمہ رض کو نہیں لے جا سکتے' اب حقیقتِ اسلام کا ایک حقیقت سے مقابلہ تھا' وہ حقیقت کیا تھی؟ بیوی کی محبت' جو ایک حقیقت تھی لیکن اسلام کی حقیقت مومن کے دل میں ہر حقیقت سے زیادہ طاقتور اور گہری ہوتی ہے۔ انھوں نے بیوی کو اللہ کے حوالہ کیا اور تنِ تنہا چل دیئے۔ کیا صورتِ اسلام میں اتنی طاقت ہے کہ آدمی بیوی کو چھوڑ دے؟ ہم نے تو دیکھا ہے کہ لوگوں نے بیوی اور بچوں کے لیے کفر تک اختیار کر لیا اور صورتِ اسلام کی ذرا پروا نہیں کی ہے۔

آپ نے سُنا ہے کہ حضرت ابو طلحہ رض نماز پڑھ رہے تھے کہ ان کے باغ میں ایک چھوٹی سی چڑیا آگئی اور پھر اس کو جانے کا راستہ نہ ملا' حضرت ابو طلحہ رض کی توجہ ہٹ گئی۔ نماز کے بعد انھوں نے پورا باغ صدقہ کر دیا۔ اس لیے کہ حقیقتِ نماز اس شرکت کو گوارا نہیں کر سکتی تھی۔ باغ کی بھی ایک حقیقت ہے' اس کی سرسبزی' اس کی فصل' اس کی قیمت' ایک حقیقت ہے ہے اس حقیقت کا مقابلہ صورتِ نماز نہیں کر سکتی تھی' اس کا مقابلہ کرنے کی طاقت حقیقتِ صلوٰۃ ہی میں ہے۔ آج ہماری' آپ کی نماز ادنیٰ ادنیٰ حقیقتوں ہی میں ہے اس لیے نہیں کر سکتی کہ وہ حقیقت سے خالی اور ایک صورت ہے۔

آپ نے سُنا ہوگا کہ یرموک کے میدان میں چند ہزار مسلمان تھے اور کئی لاکھ رومی' ایک عیسائی (جو

مسلمانوں کے جھنڈے کے نیچے لڑ رہا تھا) کی زبان سے بے اختیار نکلا کہ رومیوں کی تعداد کا کچھ ٹھکانا ہے؟ حضرت خالدؓ نے کہا! "خاموش! خدا کی قسم اگر میرے گھوڑے اشقر کے سُم درست ہوتے تو میں رومیوں کو چیلنج بھیجتا کہ اتنی ہی تعداد اور میدان میں لے آئیں"

حضرات — حضرت خالدؓ کو یہ اطمینان و اعتماد کیوں تھا۔ اور وہ رومیوں کی تعداد کو بے حقیقت کیوں سمجھتے تھے؟ اس لیئے کہ وہ حقیقتِ اسلام رکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس کے مقابل صرف رومیوں کی صورتیں ہیں جو ہر طرح کی حقیقت سے خالی ہیں، یہ لاکھوں صورتیں اسلام کی حقیقت کے سامنے ٹھہر نہیں سکتیں۔

ہم یقیناً کلمہ پڑھتے ہیں، ہم میں سے بہت سے لوگ کلمہ کے معنیٰ سے واقف ہیں، لیکن حقیقتِ کلمہ کوئی اور چیز ہے، وہ ان الفاظ اور معنیٰ سے بہت بلند ہے کلمہ کی یہ حقیقت صحابہ رضؓ کرام کو حاصل تھی جب وہ کہتے تھے۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ تو واقعتہً سمجھتے تھے کہ اللہ کے سوا کوئی حاکم و بادشاہ نہیں۔ اللہ کے سوا کوئی محبت و خوف کے لائق نہیں۔ اللہ کے سوا کسی کی ہستی کوئی ہستی نہیں۔ کیا یہ حقیقتیں ہم سب کے دل میں اتری ہوئی ہیں۔ ہمارے دماغ کے اندر بسی ہوئی ہیں ہماری زندگی کے اندر جڑ پکڑے ہوئے ہیں؟ اگر ہم ان حقیقتوں سے واقف بھی ہوتے تو لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہتے ہوئے ہمیں احساس ہوتا کہ ہم کتنی بڑی بات کہہ رہے ہیں جس کو اس حقیقت کا ذرا بھی احساس ہے اسلام کا دعویٰ کرتے ہوئے سمجھتا ہے کہ وہ کتنا بڑا دعویٰ کر رہا ہے۔

چو می گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلات لا الٰہ را

ہم جب جانتے ہیں کہ آخرت برحق ہے۔ جنت و دوزخ برحق ہیں مرنے کے بعد یقیناً زندہ ہونا ہے لیکن کیا سب کو ایمان کی وہ حقیقت حاصل ہے جو صحابہؓ کرام حاصل تھی؟ اس

حقیقت کا نتیجہ یہ تھا کہ صحابیؓ کھجور کھاتے پھینک دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ان کے ختم ہونے کا انتظار کرنا میرے لیے بہت مشکل ہے اور فوراً بڑھ کر شہادت حاصل کرتا ہے اس لیے کہ جنت اس کے لیے ایک حقیقت تھی اور وہ حقیقت اس کے سامنے تھی۔ اس کی حقیقت جس کو حاصل تھی وہ قسم کھا کر کہتا تھا کہ مجھے اُحد پہاڑ کے اس طرف سے جنت کی خوشبو آرہی ہے یرموک کے میدان میں ایک صحابی ابو عبیدہؓ کے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ امیر! میں سفر کے لیے تیار ہوں کوئی پیغام تو نہیں کہنا ہے؟ وہ کہتے ہیں، ہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہمارا سلام عرض کرنا اور کہنا کہ آپ نے ہم سے جو وعدے فرمائے تھے وہ سب پورے ہوئے ہیں۔ یہ ہے یقین کی حقیقت اس حقیقت پر کون سی قوت غالب آسکتی ہے اور ایسی حقیقت رکھنے والی جماعت پر کون سی جماعت غالب آسکتی ہے؟

صورت اسلام حفاظت کرنے کیلئے کافی نہیں

امت میں جو سب سے بڑا انقلاب ہوا وہ یہ کہ اس کی ایک بڑی تعداد اور شاید سب سے بڑی تعداد میں صورت نے حقیقت کی جگہ لے لی یہ آج کی بات نہیں۔ یہ صدیوں کی پرانی حقیقت ہے صدیوں سے صورت نے حقیقت کی جگہ حاصل کر رکھی ہے عرصہ تک دیکھنے والوں کو صورت پر حقیقت کا دھوکا ہوتا رہا اور حقیقت کے ڈر سے اس صورت کے قریب آنے سے بچتے رہے لیکن جب کسی نے ہمت کر کے اس صورت کو چھوا تو معلوم ہوا کہ اندر سے پول ہے اور حقیقت غائب ہو چکی ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کبھی کبھی کاشتکار کھیت میں ایک لکڑی گاڑ کر اس پر کوئی کپڑا ڈال دیتا ہے جس کو دیکھ کر پرندوں اور جانوروں کو شبہ ہوتا ہے کہ کوئی آدمی رکھوالی کر رہا ہے۔ لیکن اگر کبھی کوئی سیانا کوا یا ہوشیار جانور ہمت کر کے کھیت میں جا پڑے تو ظاہر ہے کہ وہ بے جان شبیہ کچھ نہیں کر سکتی پھر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جانور اس کھیت کو

روند ڈالتے ہیں اور پرندے اس کا ستیاناس کر دیتے ہیں۔

مسلمانوں کے ساتھ یہی واقعہ پیش آیا، ان کی صورت حقیقت بن کر برسوں ان کی حفاظت کرتی رہی۔ قومیں ان کے قریب آنے سے ڈرتی تھیں حقیقت اسلام کے واقعات ان کے ذہن میں تازہ تھے اور کسی کو مسلمانوں پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی لیکن کب تک؟

جب تاتاریوں نے بغداد پر چڑھائی کی جس پر حملہ کرنے سے وہ برسوں احتیاط کرتے رہے تو اس صورت کی حقیقت کھل گئی اور مسلمانوں کا بھرم جاتا رہا اس وقت سے صورت اسلام حفاظت کرنے کے لئے کافی نہیں ہے اب صرف حقیقت اسلام ہی اس امت کی حفاظت کر سکتی ہے

ہماری خطاء:- آپ تاریخ اسلام میں مسلمانوں کی ناکامی کی تلخ داستانیں پڑھتے ہیں، یہ حقیقت کی شکست کے واقعات نہیں، یہ سب صورت کی شکست و ہزیمت کے واقعات ہیں، صورت نے ہم کو ہر معرکہ میں رسوا و ذلیل کیا ہے لیکن خطا ہماری تھی، ہم نے غریب صورت پر حقیقت کا بوجھ رکھنا چاہا وہ اس بوجھ کو سہار نہ سکی۔ خود بھی گری اور عمارت کو بھی زمین پر لے آئی

حقیقت اسلام مدتوں سے میدان میں آئی ہی نہیں } عرصۂ دراز سے صورت اسلام معرکہ آزما ہے اور شکست پر شکست کھا رہی ہے اور حقیقت اسلام مفت میں بدنام اور دنیا کی نگاہوں میں ذلیل ہو رہی ہے، دنیا سمجھ رہی ہے کہ ہم اسلام کو شکست دے رہے ہیں۔ اس کو خبر نہیں کہ حقیقت اسلام تو مدت سے میدان میں آئی ہی نہیں اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کو صرف صورت ہے نہ کہ اسلام کی حقیقت۔

یورپ کی قوموں کے مقابلہ میں ترکی میدان میں آیا لیکن اسلام کی ایک نڈھال صورت لے کر یہ نحیف و نزار صورت مقابلہ میں ٹھہر نہ سکی، فلسطین میں تمام عرب قومیں اور سلطنتیں مل کر یہودیوں کے مقابلہ میں آئیں لیکن حقیقت اسلام شوق شہادت، جذبۂ جہاد اور ایمانی کیفیات

سے اکثر عاری، عربی قومیت کے نشہ میں سرشار صرف اسلام کے نام و نسب سے آراستہ، نتیجہ یہ ہوا کہ اس بے روح صورت نے یہودیوں کی جنگی قوت و تنظیم و اسلحہ کی حقیقت سے مات کھائی، اس لئے کہ صورت حقیقت کا مقابلہ نہیں کرسکتی، یہودی ایک حقیقت رکھتے تھے۔ اگرچہ سرتاپا مادّی لیکن عرب صرف ایک صورت رکھتے تھے اگرچہ مقدس، لیکن صورت، صورت ہے اور حقیقت، حقیقت ہے۔

رحمت و نصرت، تائید و اعانت کے وعدے حقیقت سے متعلق ہیں

اسلام کی صورت اللہ کے یہاں ایک درجہ رکھتی ہے اس لئے کہ اس میں مدتوں اسلام کی حقیقت بسی ہوئی رہی ہے اور یہ کہ حقیقت کا قالب ہے اسلام کی صورت بھی اللہ کو پیاری ہے اس لئے کہ اس کے محبوبوں کی پسندیدہ صورت ہے، اسلام کی صورت میں بھی اللہ کی ایک بڑی نعمت ہے اس لیے کہ اس صورت سے حقیقتِ اسلام کی طرف منتقل ہونا نسبتاً آسان ہے جہاں صورت بھی نہیں وہاں حقیقت پر پہنچنا بہت مشکل ہے لیکن دوستو! اللہ تعالیٰ کی رحمت و نصرت کے وعدے دنیا میں اور مغفرت و نجات اور ترقی درجات کے وعدے آخرت میں سب حقیقت سے متعلق ہیں نہ کہ صورت سے، حدیث میں ہے۔ ان اللہ لا ینظر الیٰ قلوبکم و اموالکم ولکن ینظر الیٰ قلوبکم و اعمالکم۔ اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور مالوں کو نہیں دیکھتا ہے وہ تمہارے دلوں اور اعمال کو دیکھتا ہے جو لوگ صرف صورت کے حامل تھے اور حقیقت سے یکسر خالی تھے۔ ان کو وہ ان لکڑیوں سے تشبیہ دیتا ہے جو کسی سہارے رکھی ہوئی ہیں۔ وہ فرماتا ہے وَاِذَا رَاَیْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ وَاِنْ یَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ یَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَیْحَةٍ عَلَیْهِمْ　(سورہ منافقون ع۲)

اگر تم ان کو دیکھو تو تم کو ان کے جسم بڑے بھلے معلوم ہوں گے۔ وہ بات کریں گے تو تم کان لگا کر

سنو گے لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ لکڑیاں ہیں جو سہارے سے رکھی ہوئی ہیں ہر آواز کو وہ اپنے خلاف ہی سمجھتے ہیں

دین کے اقتدار اور امن و اطمینان کا وعدہ } دنیا میں بھی فتح و نصرت و تائید و اعانت کے وعدے حقیقتِ ایمان کے ساتھ مشروط ہیں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (آل عمران ۱۳۹) ترجمہ: سست و غمگین نہ ہو، تم ہی سر بلند ہو۔ اگر تم (حقیقۃً) صاحبِ ایمان ہو

ظاہر ہے کہ اس آیت میں خطاب مسلمانوں ہی کو ہے لیکن پھر بھی شرط لگائی ہے کہ اگر تم میں حقیقت ایمان پائی جاتی ہے تو پھر تمھاری سر بلندی میں شک نہیں۔

دوسری آیت میں بھی صفت ایمان ہی پر اپنی مدد کا وعدہ فرمایا۔

اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ (المومن ۵۱) ترجمہ: ہم ضرور ضرور اپنے پیغمبروں کی مدد کریں گے اور ان لوگوں کی جو صفت ایمان سے متصف ہیں، دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی جب اللہ کے گواہ کھڑے ہوں گے۔

اسی حقیقتِ ایمانی پر خلافت ارضی، دین کے اقتدار اور امن و اطمینان کا وعدہ فرمایا ہے

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِى ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا۔

(سورۂ نور ع ۵)

(باقی ص ۳۷ پر)

قاضی اطہر مبارک پوری

عہدِ رسالت میں خواتینِ اسلام کی تعلیم

عہدِ رسالت میں عورتوں کی دینی تعلیم کا باقاعدہ انتظام تھا وہ مردوں کی درس گاہِ نبوی میں حاضر نہیں ہوتی تھیں مگر مختلف طریقوں سے تعلیم حاصل کرتی تھیں، قرآن کی تعلیم خاص طور سے صحابہؓ اپنے گھروں میں عورتوں اور بچوں کو دیا کرتے تھے، ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علم دین کے اٹھ جانے کی بات کی تو ایک صحابی حضرت زیاد بن ولید انصاری رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ:-

کیف یختلس منا وقد قرأنا القرآن فو اللہ لنقرأنہ ولنقرأنہ نساءنا وأبناءنا [۱]

علم دین کیسے ختم ہو جائے گا؟ ہم نے قرآن پڑھا ہے خدا کی قسم اس کو ہم پڑھتے رہیں گے اور ہماری عورتیں اور ہمارے لڑکے اس کو پڑھتے رہیں گے۔

صحابیات کے خصوصی اتباع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے جا کر تعلیم و تلقین اور وعظ فرمایا کرتے تھے، امام بخاریؒ نے الجامع الصحیح کی کتاب العلم میں "باب ھل یجعل للنساء یوما علی حدۃ فی العلم" کا مستقل عنوان قائم کیا ہے اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ۔

"قالت النساء للنبی صلی اللہ علیہ وسلم غلبنا علیک الرجال فاجعل

---

[۱] ترمذی ابواب العلم باب ماجاء فی ذہاب العلم۔

لنا یوماً من نفسک فوعدھن یوماً لقیھن فیہ فوعظھن وامرھن، فقال لھن مامنکن امرأۃ ثلاثہ من ولدھا الا کان لھا حجاباً من النار، فقالت امرأۃ واثنین فقال واثنین " ؎

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عورتوں نے کہا کہ آپ کی تعلیم کے بارے میں مرد ہم عورتوں پر غالب ہیں، اس لئے آپ خود ہمارے لئے ایک مقرر فرمائیں اس پر آپ نے ان سے ایک دن کا وعدہ فرمالیا جس میں ان کو وعظ سنایا اور دینی باتوں کا حکم دیا، اسی سلسلہ میں آپ نے ان سے کہا کہ جس عورت کے تین بچے فوت ہو گئے ہوں وہ اس کے لئے نار جہنم سے پردہ ہوں گے، یہ سن کر ایک عورت نے سوال کیا اور جس کے دو بچے فوت ہوئے ہوں؟ آپ نے فرمایا کہ وہ بھی ۔"!

حضرت اسماء بنت یزید بن سکن انصاریہ رضی اللہ عنہا بڑی عاقلہ، فاضلہ اور دین دار صحابیہ تھیں۔ ان کو صحابیات نے اپنا ترجمان اور نمائندہ بنا کر خدمت نبوی میں بھیجا انہوں نے آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں مسلمانوں کی بیویوں کی طرف سے نمائندہ بن کر آئی ہوں، وہ کہتی ہیں اور میں بھی کہتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مردوں اور عورتوں کی طرف مبعوث کیا ہے، ہم عورتیں آپ پر ایمان لائیں اور آپکی اتباع کی، ہم پردہ نشین گھروں میں رہنے والی ہیں مردوں کی ہر خواہش پوری کرتی ہیں، ان کی اولاد کی پرورش کرتی ہیں اور مرد نماز باجماعت ادا کرتے ہیں، جنازہ اور جہاد میں شرکت کرتے ہیں، اس وجہ سے فضیلت اور ثواب پاتے ہیں، جب وہ جہاد میں جاتے ہیں تو ہم انکے مال و اولاد کی حفاظت و پرورش کرتی ہیں۔ یا رسول اللہ! کیا ان صورتوں میں ہم بھی اجر و ثواب میں مردوں کے شریک ہو سکتی ہیں؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسماء بنت یزید کی مدلل پذیر تقریر سن کر صحابہؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور ان سے پوچھا کہ اسماء بنت یزید سے پہلے لوگوں نے دین کے بارے میں اس سے بہتر

ؔ صحیح البخاری کتاب العلم، باب ہل یجعل للنساء یوماً علی حدۃ فی العلم

سوال کسی عورت سے سنا تھا؟ صحابہؓ نے نفی میں جواب دیا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسماءؓ جاؤ ان عورتوں کو بتادو کہ:

"ان حسن تبعل احداکن لزوجها وطلبها لمرضاته واتباعها موافقته يعدل كل ماذكرت للرجال"

تم میں کسی عورت کا اپنے شوہر کے ساتھ حسن سلوک، اس کی رضا جوئی اور اس کے مزاج کے مطابق اتباع ان تمام باتوں کے برابر ہے جن کا ذکر تم نے مردوں کے متعلق کیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے یہ بشارت سن کر اسماءؓ خوشی کے ساتھ تہلیل و تکبیر کہتی ہوئی چلی گئیں اور عورتوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت سنائی[1]

ان واقعات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ صحابیات میں علم دین حاصل کرنے کا کس قدر اہتمام تھا وہ اس کے لئے اجتماعی طور سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تقاضا کرتی تھیں اور آپ ان کو تعلیم دیا کرتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بسا اوقات وعظ و تلقین کے ذریعہ عورتوں کو تعلیم دیتے تھے ایک مرتبہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے کر عورتوں کے مجمع میں تشریف لے گئے ان کو وعظ سنا کر صدقہ کرنے کی ترغیب دی اور عورتیں اپنی بالیاں اور انگوٹھیاں دینے لگیں اور حضرت بلالؓ انکو اپنے دامن میں رکھتے لگے۔[1] حضرت عائشہؓ اور دیگر صحابیات کو جس بات میں شک و شبہ ہوتا تھا اس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم حاصل کیا کرتی تھیں، نیز صحابیات، حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلمہؓ کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسائل اور دین کی باتیں معلوم کرتی تھیں کسی رشتہ دار رشتہ کی عورتیں براہ راست آپؓ سے مراجعت کرتی تھیں۔

صحابہؓ کی طرح صحابیاتؓ میں بھی محدثہ، فقیہہ، عالمہ، فاضلہ، مفتیہ، کاتبہ تھیں، ام المومنین

---

[1] تہذیب السنۃ: ج ۱۰، ص ۴۲۳

حضرت عائشہؓ فقیہۃ الامت تھیں۔ ام المومنین ام سلمہؓ بھی فقیہہ و مفتیہ تھیں، حضرت زینب بنت ابو سلمہؓ حضرت ام سلمہؓ کی لڑکی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پروردہ تھیں، ان کے بارے میں لکھا ہے "کانت من أفقہ نساء أهل زمانها" وہ اپنے زمانہ کی عورتوں میں سب سے بڑی فقیہہ تھیں۔ ابو رافع تابعی کا قول ہے کہ میں مدینہ میں کسی عورت کو فقیہہ سمجھتا ہوں تو زینب بنت ابو سلمہؓ کو۔ حضرت ام الدرداءؓ الکبریٰ عاقلہ، فاضلہ، عابدہ اور واسعۃ العلم فقیہہ صحابیہ تھیں۔ حضرت سعدہ بنت قمامہؓ نماز میں عورتوں کی امامت کرتی تھیں حضرت سمرہ بنت نہیک اسدیہؓ کے حال میں لکھا ہے "عمرت وکانت تمر فی الاسواق وتأمر بالمعروف وتنهى عن المنكر وتضرب الناس بسوط كان معها۔" انھوں نے بڑی عمر پائی تھی، بازاروں میں جاکر امر بالمعروف اور نہی المنکر کرتی تھیں اور اپنے کوڑے سے لوگوں کو مارتی تھیں۔

بہت سی صحابیات لکھنا پڑھنا جانتی تھیں۔ امہات المومنین میں حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلمہؓ پڑھنا جانتی تھیں اور حضرت حفصہؓ لکھنا پڑھنا دونوں جانتی تھیں، حضرت شفا بنت عبداللہ عدویہؓ لکھنا جانتی تھیں۔ رسول اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ تم نے جس طرح حفصہؓ کو نملہ (پھوڑے) کا رقیہ سکھایا ہے، کتابت بھی سکھا دو، حضرت ام کلثوم بنت عقبہؓ اور حضرت کریمہ بنت مقدادؓ لکھنا جانتی تھیں۔ علمائے صحابہ کی طرح عالمہ صحابیات نے اپنا حلقۂ درس و تدریس باقاعدہ قائم نہیں کیا مگر ان سے احادیث کی روایت کی گئی اور فقہی مسائل اور فتاوے معلوم کئے گئے۔

صحابیات میں کئی شاعرات تھیں جن کے اشعار کتابوں میں پائے جاتے ہیں، ان میں حضرت خنساءؓ بہت مشہور ہیں اور اپنے بھائی صخر کے مرثیہ میں اتنے غمناک اشعار کہے ہیں کہ ارثی العرب کہلائیں، بعض روایات میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے اشعار سنے ہیں، ہند بنت عتبہ، زینب بنت عوام بن خویلد، سعدی بنت عمرو مریہ، سعدی بنت کریز بن ربیعہ، صفیہ بنت عبدالمطلب

(باقی سلسلہ صفحہ ۲۵ پر)

پرنس چارلس

اہلِ مغرب اور اسلام

تاج برطانیہ کے ولی عہد پرنس

چارلس آف ویلس نے ولسٹن پارٹ سسیکس میں ۱۳ دسمبر ۱۹۹۶ء

کو منتخب دانشوروں، تاجروں اور مذہبی عالموں کے ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے جو تقریر کی۔ ذیل میں اس کا خلاصہ پیش کیا جارہا ہے تقریر کی رپورٹنگ ۱۴ دسمبر کے دی ٹائمز لندن نے شائع کی تھی۔

میں اپنی گفتگو کا آغاز اس یقین کے ساتھ کر رہا ہوں کہ اسلامی تہذیب و ثقافت اپنے اندر مشرق کے کئی دیگر مذاہب جیسے یہودیت، ہندومت، جین مت اور بدھ مت کی طرح مغرب کے لئے اہم پیغام رکھتی ہے یہ نہ صرف ہمارے اردگرد کی دنیا کے بارے میں ایک مکمل اور متبرک نقطۂ نظر کی حامل ہے بلکہ میں تو یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ ہم مغرب کے رہنے والے اسلامی روحانیت کی قدر کرکے خود اپنے علم کی جڑیں تلاش کرنے میں مدد کرسکتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ قدر دانی کا یہ طریقہ ہمارے دو مذاہب کو ایک دوسرے سے قریب لانے میں ہماری مدد کرسکے گا۔ یہ انسان اور اس کے اردگرد کے ماحول کے تحفظ کے سلسلہ میں دوبارہ سوچنے کے تعلق سے بھی ہماری مدد کرسکتا ہے

ایک ایسے دور میں جب کہ جدید مادہ پرستی کا رجحان غیر متوازن ہوگیا ہے اور روز بروز اپنے خاتمے کی طرف بڑھ رہا ہے دنیا کے تقریباً تمام ہی بڑے مذاہب دنیا کے متعلق ایک مکمل اور متبرک نقطۂ نظر رکھتے ہیں مثال کے طور پر عیسائی مذہب اپنے گہرے صوفیانہ عقائد و علامتی تجسیم

کے ساتھ روایتی طور پر روحانی اور مادی دنیا کی وحدت اور اس دنیا اور انسانیت میں خدا کے ظہور کا پیغام اپنے اندر رکھتا ہے۔ لیکن گزشتہ تین صدیوں کے دوران کم از کم مغرب کی حد تک مذہب و سائنس کی ایک خطرناک تقسیم دیکھنے میں آئی ہے اور اب تک مذہب اور سائنس ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ ہو چکے ہیں۔ سائنس نے فطرت کی حدود سے تجاوز کرتے ہوئے کائنات کے حصے بخرے کر دیئے ہیں اور مذہب کے تقدس کو ہماری روزمرہ کی زندگی سے نکال کر ذہن کے ایک دوسرے خانے میں منتقل کر دیا ہے اور آج ہم اس کے تباہ کن نتائج کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ مغرب میں آج یہ بات صاف طور پر محسوس کی جاتی ہے کہ ہم نے ہمہ گیری اور وسعت کے تصور کو اور مخلوقات کے تئیں اپنی غیر منفک جواب دہی کے احساس کو کھو دیا ہے جس کی وجہ سے ہم اپنی اس روایت کو سمجھنے اور اس کی قدر کرنے میں ناکام ہوتے جا رہے ہیں جو صدیوں میں پروان چڑھی تھی درحقیقت اس کا سبب یہ ہے کہ ہم نے روایت کے ساتھ اس کے سلسلہ میں امتیازی رویہ کا مظاہرہ کیا ہے گویا یہ کوئی سماجی طور پر ناقابل قبول مرض ہو۔ میرے خیال میں آج ضرورت اس بات کی ہے کہ دنیا کے متعلق تقدس کا رویہ اختیار کیا جائے کیوں کہ موجودہ دور میں سائنس نے دنیا کو اس قدر پیچیدہ اور گنجلک بنا دیا ہے کہ دنیا اتنی پیچیدہ اس سے پہلے کبھی بھی نہیں سمجھی گئی تھی۔ لیکن سائنس اپنی جدید مادی اور ایک رخی شکل میں دنیا کی ہر شے کی وضاحت کرنے سے قاصر ہے۔ موجودہ سائنس اور ٹکنالوجی جس تیزی کے ساتھ علیحدہ ہوتی جا رہی ہیں اس طرح کی علیحدگی کے نتائج انتہائی تاریک اور خطرناک شکل میں ہمارے سامنے آ رہے ہیں اور روزمرہ کے مشاہدات اس کے گواہ ہیں۔

روایات کے بارے میں میں ہمیشہ سے محسوس کرتا رہا ہوں کہ یہ کسی انسان کی تخلیق کردہ نہیں ہیں بلکہ یہ تمام سب فطری وجدان اور خدائی عطیہ ہے جو فطرت کے مختلف پہلوؤں میں موجود

بظاہر متناقض تضادات کے اتحاد سے اُبھر کر سامنے آتی ہیں ۔ یہ روایات کی بے زبانی کو ظاہر کرتی ہیں اور اس کے رازہائے سربستہ کی آگاہی سے متعلق ہمارے علم میں استحکام پیدا کرتی ہیں یہی وجہ ہے کہ میں آدمی کو حیاتی مظہر کے علاوہ بھی بہت کچھ خیال کرتا ہوں یہ حالانکہ جدید سائنسی روایات کو آرٹ اور کلچر کہہ کر زندگی کے صرف اضافی گوشوں تک محدود کر دینا چاہتی ہے ۔ کائنات کے بارے میں میرا پیش کردہ نقطۂ نظر موجودہ سائنسی نقطۂ نظر کے بالکل برعکس ہے مثال کے طور پر ایک مسلمان دست کار یا فنکار اپنے کسی شاہکار کا کریڈٹ خود نہیں لیتا بلکہ اس کو خدا کی طرف منسوب کرتا ہے میرا خیال ہے کہ مسلمانوں میں یہ تصوّر قرآن کی اس آیت کا مرہونِ منت ہے :- "تم جس طرف بھی رخ کرو گے اللہ کو موجود پاؤ گے اللہ شفقت کرنے والا جاننے والا ہے۔"

روایتی مذاہب کائنات کے متعلق ایک مکمل زاویۂ نگاہ تو رکھتے ہی ہیں یہ لادینیت اور تقدس کے انضمام کی اہمیت کو دوبارہ تلاش کرنے میں ہمارے لیئے معاون بھی ہو سکتے ہیں ۔ اپنے وجود کے اس بنیادی پہلو کو نظر انداز کرنا روحانی عقلی طور پر ہی خطرناک نہیں ہوگا ہماری زندگیوں میں میں پائی جانے والی مادیت اسلامی اور مغربی دنیا کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل کر دے گی ۔ اسلام جہاں مادّیت کو رد کرتا ہے میں سمجھتا ہوں کہ یہ کسی احساس کمتری اور حسد کا نتیجہ یا کوئی سیاسی حربہ نہیں ہوتا ۔ اصل خطرناک وہ وسیع خلیج ہے جو اسلامی دنیا اور دیگر مشرقی مذاہب کے درمیان ایک طرف اور اسلام اور مغرب کے درمیان دوسری طرف روز بروز وسیع اور ناقابل عبور ہوتی جارہی ہے اور اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا ۔

اسلامی تہذیب و ثقافت نے اپنی روایتی شکل میں دنیا کے متعلق اپنے روحانی نقطۂ نظر کا تحفظ کرنے کی کوشش جس طریقے سے کی ہے اسے مغرب کو موجودہ نسل اپنے لیئے موزوں نہیں سمجھتی حالانکہ اس سلسلہ میں اسلامی دنیا سے اہل مغرب بہت کچھ سیکھ سکتے تھے باہم ایک دوسرے کو سمجھنے اور قدر دانی

محمد ایوب واقف　　(قسط اوّل)

ہماری زبان اور ہمارا رسم الخط

جس زبان کو میر تقی میرؔ اور مرزا اسداللہ خان غالبؔ جیسے اکابرینِ فن اور ماہرینِ زبان نے اظہارِ خیال کا مستقل ذریعہ بنایا ہو اس کے قابلِ امتیاز DISCERNIBLE اور لائقِ ستائش و توصیف ہونے میں کسی شک و شبہے کی گنجائش نہیں ہے مرزا داغؔ دہلوی جیسے پُرگوش مند اور بالغ نظر شاعر نے اُردو زبان کے بارے میں جب یہ ارشاد فرمایا کہ ؎

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغؔ　　:　　سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

تو اس حقیقت بیان کرنے اُنھیں بہت دُور تک سوچنا پڑا ہوگا اور اس کی چھ سو سالہ کارکردگی کے عمیق مطالعہ کا حق ادا کرنا پڑا ہوگا۔ حضرت داغؔ دہلوی کا مندرجہ شعر جتنی گہری معنویت کا حامل ان کے اپنے عہد میں تھا اس سے کہیں زیادہ معنویت کا حامل وہ آج ہمارے زمانے میں ہے عظیم اور دُور اندیش فنکار کی یہی توصفت اور نشانی ہوا کرتی ہے کہ وہ کسی شئے کی حقیقت، اس کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ بڑی خوب صورتی اور باریک بینی سے لگا لیتے ہیں اور پھر جب اس کے بارے میں کوئی رائے صادر کرتے ہیں تو ان کی رائے ہر عہد اور ہر زمانے میں سند کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔

اب یہی دیکھیئے کہ مرزا داغؔ دہلوی نے شعر کے مصرع اوّل میں "ہمیں جانتے ہیں داغ" بات جس پختہ اعتماد کے ساتھ کہی ہے اور مصرع ثانی میں سارے جہاں میں اُردو زبان کی دھ[illegible]

جو ذکسیکیل ہے معنویت اور ہمہ گیریت کے اعتبار سے کس درجہ کمال کی باتیں ہیں اس وقت اُردو زبان کی دھوم بلا مبالغہ سارے عالم میں ہے۔ دنیا کے بیشتر گوشوں اور علاقوں میں اُردو کی بستیاں آباد ہو چکی ہیں۔ ان بستیوں میں بڑے بڑے مشاعروں کے علاوہ لسانیات، تحقیقات، تنقیدات اور طنز و مزاح کی چھوٹی کی کانفرنسیں منعقد ہو رہی ہیں اسے میر تقی میر اور مرزا غالب کی قابلِ اعتنا اور طرفہ زبان کا اعجاز اور قابلِ فخر کمال نہیں تو اور کیا کہا جاسکتا ہے۔

سطورِ بالا میں ہم یہ بات بتا چکے ہیں کہ اُردو زبان اپنی عمر کے چھ سو سال مکمل کر چکی ہے۔ ارتقار اور ترقی کے ان چھ سو برسوں میں اس زبان نے نظم اور نثر کی جولانگاہوں میں کیسے کیسے نوادر اور شہ پارے چھوڑے ہیں اور کیسے کیسے یادگار اور بیش بہا (SUMPTUOUS) کارنامے انجام دیے ہیں اس کی تفصیل پیش کرنا بڑا دشوار گزار کام ہے لیکن اشارتاً اتنا کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اُردو زبان کی بیسویں صدی کی سب سے بڑی اور قابلِ تعظیم و احترام تخلیق شاعرِ مشرق علامہ اقبال کی شخصیت تھی علامہ اقبال کی شاعری بلاشبہ اپنی نوعیت کی منفرد شاعری تھی ایسی تابناک، لامحدود، بے پایاں وسعت اور عظمت والی اور قابلِ تعریف (COMMENDABLE) شاعری وردِ اقبال سے قبل وجود میں نہیں آئی اور نہ ایسی شاعری اقبال کے ماسوا کسی دوسرے کے بس کی چیز تھی۔ اس بنیاد پر ڈاکٹر اقبال کو دیوپیکر (COLOSSUS) شخصیت کا مالک فنکار کہا جاسکتا ہے۔ اقبال نے اپنے کلام میں جس نوع کے فکر و فلسفے کی صراحت اور ترجمانی کی ہے اس کی شہرت نے زمینی قیود اور ملکی سرحدوں کو عبور کر کے آفاقی (UNIVERSAL) وضع اور قطع کی صورت اختیار کر چکی ہے داغ دہلوی کے مذکورہ شعر کی ایک خوب صورت تعبیریوں بھی حاصل ہوتی ہے یہ بھی ایک حسنِ اتفاق ہی ہے کہ ڈاکٹر اقبال داغ دہلوی کے شاگرد تھے۔ بہرحال ان تمام امور کو پیش نظر رکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اُردو زبان کا کینوس بہت وسیع ہو چکا ہے عصبیت، تنگ نظری اور عناد

اور فساد ذہنی کا مسلسل شکار ہوتے کے باوجود اس کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ غیب جوئی (FAULT FINDING) کا شعار اختیار کرنے والے دشمنانِ اُردو اسے مبالغہ پر محمول کریں تو اس کا کوئی علاج ہمارے پاس نہیں ہے۔ ہم تو بحیثیت اُردو کے ایک طالب علم کے اتنا جانتے ہیں کہ اُردو زبان کا معیار اور اعتبار ہر لحاظ سے مسلم ہے اس کا رسم الخط بھی اس کے صوتی نظام کے پیش نظر حسب ضرورت جامع اور خوبصورت ہے اس میں کمی یا کجی کا احساس صرف ان افراد کو ہو سکتا ہے جو اُردو کے ساتھ دشمنان سرگرمیوں اور سازشوں میں مصروف ہیں اُردو کی ستم ظریفی یہ بھی ہے کہ اس پر عدم توجہی کے جو تیر برسائے جارہے ہیں ان میں سے زیادہ تر کا تعلق خود اُردو والوں سے ہے ایسی صورت میں "زخمیست مرہم ندارد" (ایسا زخم جس کا کوئی مرہم نہیں ہے) والی کہاوت بالکل درست ہے۔

اُردو زبان کے وجود میں آنے کے اسباب و علل پر صدق دل سے اگر غور کیا جائے تو پتا چلے گا کہ یہ زبان حد درجہ خوشگوار، مقدس اور روادرانہ ماحول میں پیدا ہوئی ہے۔ اس کے مقاصد بھی بڑے نیک رہے ہیں یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان میل جول اور پیار و محبت کا حسین رشتہ قائم کرنے والی زبان رہی ہے اس نے ہندوستان کے طول و عرض میں گنگا جمنی تہذیب کا ہر موقع پر علم بلند کیا ہے انسانیت سوز ماحول میں صحت مند اقدار کا فروغ اس کا اول و آخر مشن رہا ہے۔ ہندوستان پر سامراج کے غاصبانہ تسلط اور جابرانہ نظام کا تاریک دور ہو یا آزادی کے بعد ہندوستان کے ہولناک اور خوں ریز فسادات کا خونی منظر اُردو زبان نے اپنے مولد اور مسکن کے معاملات سے ایک لمحے کی غفلت بھی نہیں برتی۔ اس کے ایک ایک لفظ میں وطن عزیز کی خدمت کا جذبہ موجزن ہے جس زبان کا کردار ایسا بلند ہو اس کے راستے میں سنگِ گراں حائل ہو جائے یہ تو سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا لیکن افسوس کا مقام ہے کہ آزادی کے بعد اس زبان کو دستِ قاتل کے حوالے کر دیا گیا اور آزادی کے پچاس برسوں میں سرکاری اور عوامی سطحوں پر اس کو مٹانے کی وہ سازشیں اور مذموم حرکتیں کی گئیں کہ

یعنی الاماں والحفیظ ۔

اُردو والوں کے ذہنوں میں یہ بات بڑے منظم طریقے سے بٹھائی جارہی ہے کہ جو زبان روزی اور روٹی کے حصول میں ممد و معاون ثابت نہ ہو اسے پڑھنے اور پڑھانا کارِ فضول اور تضیعِ اوقات ہے کتنی مضحکہ خیز اور سستی اور اوچھی بات ہے۔ اُردو والوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اُردو محض ایک زبان کا ہی نام نہیں ہے بلکہ ایک تہذیب اور ایک ثقافت کا نام بھی ہے کوئی قوم اپنی ثقافت اور اپنی تہذیب کو روند کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ ہمارے لیئے یہ کتنی شرمناک بات ہو گی اگر ہم اپنی زبان اور اس کے رسم الخط کو جو ہماری تہذیب اور ثقافت کا دوسرا نام ہے نفع اور نقصان کے ترازو میں رکھ کر تولنے لگیں وقت کا یہ شدید ترین تقاضا ہے کہ اُردو دشمنی کے جان لیوا جال میں ہم نہ پھنسیں اور تمام مصلحتوں اور انجام و عواقب سے بے نیاز ہو کر دشمنانِ اُردو کو یہ باور کرادیں کہ ہم اپنی جان سے دست بردار تو ہو سکتے ہیں لیکن اُردو زبان سے جو ہماری مادری زبان بھی ہے اور ہمارا قیمتی قومی اور ثقافتی بھی کسی قیمت پر دست بردار نہیں ہو سکتے۔ قومی یگانگت حب الوطنی اور بھائی چارہ اگر اس حسن و رعنائی کے پیکر ملک کے لیئے ضروری چیزیں ہیں تو ان صفات کی ترجمان اُردو زبان کے موجودہ رسم الخط کو جو اس کا خوبصورت لباس ہی نہیں اسکی روح بھی ہے سینے سے لگائے رکھیں گے کیوں کہ زبان کی بقا کا راز اس کے اپنے رسم الخط میں پوشیدہ ہوتا ہے ۔

گزشتہ پچاس برسوں میں اُردو مخالف عناصر نے اُردو رسم الخط اپنے ظلم و ستم کا نشانہ جس منصوبہ بند طریقے سے بنایا ہے اس سے اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ دشمنانِ اُردو اُردو کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کرنے کے لیئے اس کے رسم الخط کو پہلے ختم کرنا ضروری سمجھتے ہیں وہ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جب تک اُردو رسم الخط زندہ اور سلامت ہے اس وقت تک اُردو کو مٹانا آسان کام نہیں۔ اس لیئے ان کے شب خون کا رخ اُردو کے رسم الخط کی طرف زیادہ ہے ' نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری کی کہاوت کے

عین مطابق کھیل کھیلا جارہا ہے ۔

بمبئی میں ۱۹۸۲ء میں روزنامہ "قومی آواز" کا اجراء ہوا تو اس کی مجلسِ ادارت میں میں بھی شامل کیا گیا پھر اسی ادارے کی جانب سے ہفت روزہ "قومی آواز" کی اشاعت ہوئی۔ میرا کام یہ ہوتا تھا میں اس کے لیے ہر ہفتہ کسی مشہور ادیب یا شاعر سے انٹرویو لیتا تھا چنانچہ عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس، راجندر سنگھ بیدی، اختر الایمان، علی سردار جعفری، قتیل شفائی، فیض احمد فیض، راہی معصوم رضا اور قرۃ العین حیدر وغیرہ سے میرے دھماکہ خیز انٹرویو اس زمانے کی یادگار ہیں ان تمام ادیبوں شاعروں اور افسانہ نگاروں سے اُردو زبان اور اس کے رسم الخط کے تعلق سے بھی باتیں ہوئی ۔

عصمت چغتائی اور راہی معصوم رضا کو چھوڑ کر باقی تمام فن کاروں نے پورے خلوص اور دیانت داری کے ساتھ اس امر پہ اتفاقِ رائے کیا کہ اُردو جیسی شیریں، شستہ اور بین الاقوامی زبان کو اس کے رسم الخط کے ساتھ باقی رکھنا اور اسکے فروغ کے لئے ہر ممکنہ کوشش کرنا ہم سب کا اولین فرض ہے اس کارِ گراں مایہ میں کسی طرح کا تساہل سمِ ظریفی اور سمِ قاتل سے زیادہ خطرناک ہوگا۔ یہ بات بہت واضح طور پہ کہی گئی کہ کسی زبان کی بقا کا پورا دارومدار اس کے لکھنے اور پڑھنے والوں پہ عائد ہوتا ہے لہذا اُردو والے اگر یہ طے کرلیں کہ اُردو زبان اور اس کا رسم الخط ان کا دین و ایمان ہے اور انھیں ان کے ساتھ ہی جینا اور مرنا ہے تو پھر عصبیت اور تعصب کا کوئی بھی وار کارگر نہیں ہو سکتا ۔ (باقی آئندہ)

[بقیہ سلسلہ "عہدِ رسالت میں خواتینِ اسلام کی تعلیم"]

ہاشم، عاتکہ بنت زید بن عمرو عدویہ رضی اللہ عنہن کے علاوہ متعدد صحابیات شعر گوئی میں مشہور تھیں

ان ہی حضرات صحابیات کے اسوہ پہ بعد میں خواتینِ اسلام نے حدیث و فقہ، فتویٰ، تفسیر، شعر و ادب اور دوسرے علوم و فنون میں بڑھ چڑھ کر بھرپور حصہ لیا، اس کے ساتھ عملی طور سے ہر دینی و ملی معاملہ میں نمایاں خدمات انجام دیں، اندر باہر، ہر جگہ اور ہر زمانہ میں اپنے نام اور کام کے نقوش چھوڑے ۔

اُردو نقطۂ نگاہ

دنیا ایک طویل عرصہ سے مختلف زبانوں کو اپنا ہمسفر بنائے متفرق موضوعات کے ساتھ مسلسل اپنے سفر پر رواں دواں ہے اس کے اس کارواں میں شامل "اردو" کی تازگی اور شگفتگی کو بڑی مدت تک کوئی بھی حالات افسردہ نہ کرسکی۔ تقسیم ہند سے پہلے اور اسکے ایک عرصہ بعد تک بھی یہ زبان مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلمانوں میں بھی اپنی دلکش شناخت اور جاندار وجود کا لوہا منوانے میں بڑی متحرک رہی لیکن پاکستان نے جب اسے اپنی قومی زبان قرار دیا تو اسے ایک دشمن ملک اور مسلمانوں کی ہی زبان ہونے کے الزام سے نواز کر ہندوستانی علاقوں سے منقطع کردینے کے ان گنت حادثے سے دوچار ہوجانا پڑا۔ کبھی زبانوں کو اپنے سینے سے چمٹا کر باہمی ربط، یکجہتی، امن اور شانتی کے شیریں گھونٹ پلاکر انسانیت کی تعمیر میں ایک اٹل کا رول ادا کرنے والی اُردو زبان کے ان جھلملاتے چراغوں کو اگر حقیقت کا آئینہ دکھلایا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ زبان روزی اور روٹی بلکہ تن ڈھانپنے کیلئے ایک چادر مہیا کرنے میں لڑکھڑا رہی ہے۔ اُردو کی ترقی کے ہزاروں دعوے ہمارے پاس کیوں نہ ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کو جو دیمک آہستہ آہستہ چاٹ رہی ہے اسکا پتہ اس زبان کے موجودہ شاعروں، ادیبوں اور مصنفوں اور دانشوروں کو ہی معلوم ہے آج ہمارا یہ وطن ایک ایسے دور میں داخل ہوگیا ہے کہ جہاں ابھی اُردو لکھنے اور بولنے والوں کو معاشرے کا ناکارہ، بیکار، نچلی سطح اور وقت گزارنے کا ذریعہ سمجھا جارہا ہے اُردو میں سونا اگلنے تو کوئلے کی حیثیت دی جارہی ہے سرکاری ملازمت کے کم افسران سے جو اُردو داں بھی ہیں اور اُردو جن کے آباء و اجداد کا اوڑھنا

بچھونا سہی' اُردو میں بات کیجئے تو ان کا جواب آپ کو انگریزی پلیٹ ہی میں ملے گا۔ اُردو میں جواب دیتے ہوئے انہیں ایسا لگے گا جیسے راشن کی لائن میں کھڑے ہوں یا پھر جیسے کسی شریف زادے کو پہلی بار طوائف کے کوٹھے پر چڑھنے میں ہچکچاہٹ سی محسوس ہوتی ہے انگریزی میں دال باٹنا ایک فیشن سا ہو گیا ہے ہوائی اڈوں' ریلوے اسٹیشنوں اور اس طرح کی معروف ترین جگہوں یا تفریح گاہوں میں اُردو داں اُردو اخبارات اور رسالوں کو انگریزی اخباروں میں لپیٹ کر اندر ہی اندر سے پڑھتے ہوئے نظر آئیں گے جیسے اُردو زبان نہ ہوئی کوئی چرایا ہوا تحفہ ہو ...

اُردو دنیا کی تیسری بڑی زبانوں میں شمار ہوتا ہے جس کو دنیا کی آبادی کا چھ فیصد سے بھی زیادہ حصہ بڑی روانی سے لکھتا اور پڑھتا بھی ہے خود ہمارے یہاں ہندوستان میں پچیس فیصدی مسلمان یعنی ساڑھے چار کروڑ کے قریب اسی زبان کے پابند ہیں اس زبان کی مٹھاس اور توانائی کی خوبی یہ ہے کہ اگر اس کو اس کے اصل رنگ میں پیش کیا جائے تو ایک بار مردہ جسم میں بھی ایک برقی لہر سی کوند جائے۔ ہندوستان میں بننے والی فلموں' سیریلوں' گانوں اور مکالموں میں ستر فیصد اُردو زبان کا استعمال ہوتا ہے لوگ یہ سب کچھ دیکھ کر اپنا سر دھنتے ہیں' آنسوؤں کا ایک سیلاب لیئے سینما گھروں سے اپنے گھر لوٹتے ہیں اس کے باوجود اُردو کی حق تلفی پر کوئی بھی آنکھ ایک آنسو تک نہیں بہاتی۔ دنیا کی ساری قومیں اپنی کسی نہ کسی زبان کو اس کی مملکت جان کر اُسے زندہ رکھنے اور اس کی وسعت کو مزید پھیلانے میں مصروف ہے لیکن اُردو صدیوں سے اپنے اندر مدنِ انسانی' اخلاقی اور ثقافتی خزانوں کے لادے کو باہر اگلنے کے لیئے بے تاب ہونے کے باوجود ان خزانوں سے فیضیاب ہونے والوں کی آج بھی تلاش میں سرد مہری کا شکار ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں اور دنیا کے دوسرے اُردو داں طبقہ کے لیئے یہ کتنی شرم کی بات ہے کہ جن کی مقدس ترین کتاب قرآن کریم کے سورۃ فاتحہ کی سات آیتوں کے پچیس الفاظ میں سے گیارہ اور اسی کے صرف پہلے ہی پارے "الم" کی دو سو چھیالیس آیتوں میں دو ہزار پانچ سو ستر سے بھی زیادہ

الفاظ سے ہی تین سو چھبیس الفاظ کے قریب الفاظ اُردو نے اپنے لئے شانِ کریمی کے موتی سمجھ کر چن لیا۔
یہی وجہ ہے کہ اُردو داں طبقہ کیلئے خدا اور اس کے رسول تک پہنچنے کی مسافت دنیا کی دوسری زبانوں
کے سہارے پہنچنے والوں کے مقابلے میں کم رہی ہے اور یوں بھی انگریزی یا کسی اور زبان کے رسوخ
سے قرآن کو سمجھنے اور اس کے الفاظ کے لب و لہجہ میں خدائی عقیدت اور وجاہت کا بڑا فقدان ہے۔
بدقسمتی سے اُردو مذہبی سلوک کے بعد جو اس کا پہلا حق بھی تھا صرف ادبیانہ، شاعرانہ اور فلسفیانہ حدود
تک محدود ہو کر رہ گئی تکنیکی اور قانونی زبان کو اپنی گود میں سمیٹ کر اس کے بھی کچھ خزانے اپنے چاہنے والوں
میں لٹاتی تو اس کے دوستوں کی نوعیت اور تعداد میں بھی کافی اضافہ ہوتا۔ تعجب ہے کہ ایک ایسی زبان جو
پل صراط کی باریکی سے مسلمانوں کو با خبر فرما کر خود بھی پچھڑی ہوئی انسانیت کو ملانے کے لئے ایک پائیدار
پل کی صورت میں نمودار ہوئی۔ آج آہستہ آہستہ پرانے کھنڈرات کی سی شکل میں تبدیل ہوتی جارہی
ہے اس زبان کے نقوش زرین بھی اس کو چاہنے اور اپنانے والوں کو پیچھے پیچھے نظر سے آتے ہیں۔

جو قومیں زبانوں کے اپنے ورثہ یادداشت کے حفاظت نہیں کرپاتیں وہ دوسری زبانوں کے
آگے ہاتھ پھیلانے پہ مجبور ہو جاتی ہیں۔ اُردو فاقہ کش ہی سہی، اس میں دال آٹے کا فقدان ہی سہی،
مفلسی اور غریبی کا تھکا ہارا قافلہ ہی سہی، لیکن انسانی دور اور سہارے دیوں کا مداوا بن کر قبیلاتی قربت کی
جو چاشنی اور حلاوت اُردو میں موجود ہے اس کا جواب کسی اور زبان میں میسر ہونا بڑا مشکل ہے۔
اُردو کو اس کا ایک خود مختار مقام دے کر اس کا ہمسفر اور پاسبان بننا بے حد ضروری ہے۔ دنیا کی
ساری قومیں اپنی زبانوں کی حفاظت پر جٹی ہوئی ہیں اُردو کے ٹمٹماتے ہوئے چراغوں کو ایندھن مہیا
کرنے والوں کو اسے اپنے رزق کی خاطر نہ سہی۔ ایک دردبھری زبان کو مزید تازگی بخشنے اور دوسری
زبانوں کے ساتھ شانہ بشانہ چلنے پھرنے کے لئے زندہ رکھنا ہوگا۔

اس وقت دنیا میں چار سو اسی ۴۸۰ کے قریب استعمال ہونے والی زبانوں میں ہر زبان اپنے چاہنے

والوں یا قدردانوں کے پیٹ بھرنے کی ضامن نہیں ہے اس کے باوجود یہ زبان کی برابر حفاظت رہی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اُردو کو پھر ایک بار اس کے اصل جامے میں لاکر اسے اس کی قدرتی ذمہ داریوں سے جوڑ دینے کی کوشش کی جائے۔ تب کہیں جاکر اس متاع عزیز کی حفاظت بھی ہوسکے گی اور نگہداشت بھی۔ ورنہ یہی ہچکیاں جو آج اُردو لے رہا ہے نہ صرف لاعلاج سی ہو کر رہ جائے گی بلکہ جو لوگ ساحل پہ کھڑے اس کے ڈوبنے کے انتظار میں ہیں انہیں ایک صحت مند زندگی عطا ہوگی۔

اُردو کے لئے جاگنے والوں کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ سوتے والوں کو صرف اس لئے جگادیں کہ ابھی اُردو کو اپنی عظمت اور طرز و فکر و گفتگو کے سہارے ایک دنیا کو جگانا ہے تاکہ یہ ثابت ہوسکے کہ زبانیں صرف ڈکاریں لینے کے اسباب نہیں بنا کرتیں بلکہ خدائی مخلوق کے زخموں کا مرہم بھی ثابت ہوسکتی ہیں۔ (ماہنامہ اُردو بک ریویو، نئی دہلی)

دائرۃ المعارف کی زبوں حالی' ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کا بیان

شہرہ آفاق ادارہ دائرۃ المعارف کے متعلق ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے کہا کہ اس عظیم ادارہ کا قیام ۱۸۸۸ء میں عمل علوم و فنون کی ترقی کیلئے عمل میں لایا گیا اور نظام گورنمنٹ اس ادارہ کی سرکاری سرپرستی کرتے ہوئے محکمہ تعلیمات سے اس ادارہ کو چلانے کیلئے سو فیصد گرانٹ فراہم کرتی تھی اور یہاں کے ملازمین کو سرکاری طور پر وظائف جاری ہوتے تھے لیکن ۱۹۸۴ء کے بعد سے حکومت آندھرا پردیش نے اس ادارہ کی گرانٹ میں تخفیف کرکے اسے خستہ حالت میں چھوڑ دیا جسکی وجہ سے ملازمین کی تنخواہیں آسمے دن تین تین ماہ تک نہیں ملتی اور جو ملازمین سبکدوش ہوئے انہیں وظائف جاری نہیں ہوئے۔ ۱۹۹۷ء میں یہ ادارہ (۱۰۷) کا ہوجائے گا۔ ڈاکٹر گوڑ نے اپیل کی کہ دائرۃ المعارف کی ڈائمنڈ جوبلی تقاریب حکومت کی نگرانی میں منائی جائے جس کی وجہ سے ملک بھر اس ادارہ کا نام ہوگا۔

نیتا جی
عزم و ایثار کی علامت

انڈین نیشنل آرمی (آئی این اے) کے سپریم کمانڈر نیتاجی سبھاش چندر بوس نے ۵ ار اگست ۱۹۴۵ء کو اپنے فوجیوں سے سنگاپور روانگی سے قبل آخری بار خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ "دہلی ہماری منزل ہے جہاں پہنچنے کے لئے کئی راستے ہیں اور ہندوستان بہت جلد آزاد ہوگا اس تقریر کے ٹھیک دو برس بعد بٹوارہ کے بعد ہندوستان آزاد ہوگیا۔

ہندوستان نے جن عظیم سپوتوں کو جنم دیا ان میں سبھاش چندر بوس جنھیں پیار سے نیتاجی کہا جاتا ہے ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں نمایاں مقام رکھتے ہیں انھوں نے ہمیں "جئے ہند" کا نعرہ دیا جس سے بیرونی استبداد سے ملک کو آزاد کرنے عوام کے ناقابل تسخیر عزم کا اظہار ہوتا ہے۔

نیتاجی کا جنم ۲۳ر جنوری ۱۸۹۷ء اڑیسہ کے شہر کٹک میں ہوا ان کے والد جانکی ناتھ بوس کٹک میونسپلٹی کے چیرمین تھے۔ ان کی والدہ پربھاوتی ایک پُرعزم خاتون تھیں۔ جانکی ناتھ ایک معروف شخص تھے چنانچہ ۱۴ بچوں کی تربیت کی ذمہ داری پربھاوتی پر عائد ہوئی۔ سبھاش چندر بوس اپنے والدین کی نویں اولاد تھے انھوں نے اپنی ثانوی تعلیم کٹک کے یوپینشاہ کالجیٹ اسکول سے مکمل کی اس کے بعد کلکتہ کے پریسیڈینسی کالج سے فلسفہ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔

نیتاجی اوربندو گھوش سوامی ویویکانند، بنکم چندر چٹرجی اور رابندر ناتھ ٹیگور سے بے حد

متاثر تھے۔ انھوں نے بنکم چندر چٹرجی کے ناول "آنند مٹھ" سے روحانی فیضان حاصل کیا اس ناول میں لکھا گیا ہے کہ ہندوستان کے سپوت مادرِ وطن کی خدمت کے لئے کس طرح اپنے آپ کو وقف کر دیتے ہیں۔ نوجوان سبھاش چندر نے تب ہی سے اپنے آپ کو ہندوستان کی آزادی اور اس کے استحکام کے لئے وقف کر دیا۔

سبھاش چندر بوس ۱۹۱۹ء میں آئی سی ایس کے امتحان میں شرکت کیلئے لندن روانہ ہوئے آئی سی ایس میں ان کے مضامین انگریزی مضمون نگاری، سنسکرت، فلسفہ، سیاسیات اور جدید تاریخ تھے۔ ان مضامین کے مطالعہ نے ان میں سیاسی شعور پیدا کیا اور ہندوستانی سیاست کی اندرونی کشمکش کو سمجھنے میں مدد کی۔ اگست ۱۹۲۰ء میں نیتاجی نے آئی سی ایس امتیاز کے ساتھ کامیاب کیا اور کامیاب امیدواروں کی فہرست میں ان کا نمبر چوتھا تھا۔ آئی سی ایس انٹری کو ٹھکرا کر انھوں نے ۱۹۲۱ء میں ۲۲ سال کی عمر میں پوری دلچسپی کے ساتھ آزادی کی جدوجہد میں کود پڑنے کا فیصلہ کیا۔

وہ کلکتہ واپس پہنچ کر تحریکِ عدم تعاون میں شریک ہوگئے اور عملی سیاست میں حصہ لینے لگے۔ اس وقت قومی سطح پر گاندھی جی کی قیادت میں اور کلکتہ میں دیش بندھو چترنجن داس کی رہنمائی میں قومی تحریک زور پکڑ رہی تھی۔ سبھاش چندر انقلابیوں سے جڑے ہوئے تھے جنھوں نے گاندھی جی کی عدم تشدد کے فلسفہ کو رد کر دیا تھا۔ جب حکومت پرنس آف ویلز کے دورۂ ہند کا اعلان کیا تو وہ کانگریس کی جانب سے سارے ملک میں جاری شاہی ادارہ کے بائیکاٹ کی مہم میں شامل ہوگئے۔ ۱۰ ڈسمبر ۱۹۲۱ء کو انھیں سی آر داس اور انکے ساتھیوں کے ساتھ نظر بند کر دیا گیا اس طرح سبھاش چندر بوس پہلی دفعہ جیل گئے۔ جنوری ۱۹۴۱ء میں اپنی روپوشی تک انگریزوں کی جانب سے انھیں کم از کم (۱۱) دفعہ جیل کی سزا ہوئی تھی۔

اس کے فوری بعد ۱۹۲۳ء میں انھوں نے انڈین نیشنل کانگریس میں شرکت کرلی اور بنگال کی صوبہ جاتی کانگریس کے سکریٹری مقرر ہوئے اور انھوں نے سیاسی جلسوں اور کانفرنسوں میں تقریر کرنا شروع کردیا۔ اگرچیکہ جواہر لال نہرو ان سے عمر میں دس برس بڑے تھے لیکن ۱۹۲۹ء کے دوران کلکتہ میں یہ دونوں انڈین یوتھ کے نمائندے مقرر کئے گئے تاکہ کانگریس میں آزادی کے تصور کی بھرپور حمایت کرسکیں۔ بوس ایک نوجوان اور پرجوش سیاستداں کے روپ میں ابھرے نیتاجی نے بہت جلد اپنے غیر معمولی عزم، استقلال اور لگن کے ذریعہ ایسی مقبولیت حاصل کرلی کہ انگریز سرکار نے انھیں گرفتاری، شہر بدری اور نظربندی کی سزائیں دیں۔ لیکن ان سزاؤں کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ ۱۹۲۴ء میں نیتاجی کو انقلابی سرگرمیوں میں ملوث ہونے کے شبہ میں گرفتار کرلیا گیا۔ ایک سال بعد انھیں برما کی منڈالے جیل منتقل کردیا گیا۔

۱۹۳۸ء میں انھیں انڈین نیشنل کانگریس کا صدر منتخب کیا گیا۔ ان کی کانگریس قیادت نے ہندوستانی تاریخ کا ایک موڑ ثابت ہوئی۔ آزادی کے حصول کے لئے گاندھیائی طریقوں سے انھوں نے اختلاف کرتے ہوئے کانگریس سے علیحدگی اختیار کرلی۔

ڈسمبر ۱۹۴۰ء میں انھیں کلکتہ میں گھر پر نظربند کردیا گیا تھا یہاں سے فرار ہوکر وہ ۱۹۴۱ء میں برلن پہنچ گئے تاکہ طاقت کے ذریعہ انگریز راج کی برخاستگی کے نظریہ کو عملی جامہ پہنا سکیں۔ انھوں نے برلن میں فری انڈیا سنٹر کھولا اور جرمنی کی سرزمین پہ آزاد ہند فوج کو منظم کیا۔ آزاد ہند ریڈیو برلن سے ان کی پرجوش تقاریر نے ہندوستانیوں کو بے حد متاثر کیا۔ آزاد ہند ریڈیو اسٹیشن نے کئی ہندوستانی زبانوں میں اپنے پروگرام شروع کئے جو خاص طور پر ہندوستان کے لئے سنگاپور، بنکاک، رنگون، سائیگوان اور ٹوکیو سے نشر کی جاسکیں۔

اس کے بعد وہ بے حد مخدوش حالات میں مشرق بعید کے فوجی سفر کے لئے روانہ ہوئے۔

نیتاجی براہ جاپان میڈغاسکر پہنچے اور وہاں سے جنوب مشرقی ایشیا د جاپان جہاں انھوں نے راش بہاری بوس سے انڈین انڈپینڈنس لیگ کی صدارت کا جائزہ حاصل کیا۔

نیتاجی نے اپنے گہرے سیاسی شعور اور فوجی مہارت کے ذریعہ جنوب مشرقی ایشیا میں بسنے والے ہندوستانیوں کے گروپ کو ایک مشہور جنگی طاقت انڈین آرمی (آئی این اے) میں تبدیل کر دیا۔ انھوں نے اپنے مشن کے استحکام میں حکومت جاپان کی بھرپور امداد کا تیقن حاصل کیا اور بیرون ہند سے فوجی امداد کے حصول کے لئے ہر ممکنہ کوشش کی۔

۲۱ر اکتوبر سنہ ۱۹۴۳ء کو نیتاجی نے سارے مشرقی ایشیا کے انڈین انڈپینڈنس لیگ کے نمائندوں کی موجودگی میں سنگاپور میں آزاد ہندوستان کی صوبائی حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا۔ انکی للکار "مجھے خون دو اور میں تمہیں آزادی دوں گا" سے سارا مشرقی ایشیا لرزنے لگا۔ تاہم جب انھوں نے اپنی حکمت عملی کو عملی جامہ پہنانا چاہا قسمت نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ ۱۷ر اگست ۱۹۴۵ء کو انھوں نے ٹیگاوں ایرپورٹ سے جاپانی بمبار طیارہ میں جاپان کے لئے روانہ ہوئے لیکن جاپان نہیں پہنچ سکے۔ یہ ان کی آخری پرواز تھی۔

ہندوستان کو نیتاجی کے خوابوں کی تعبیر کو دیکھنے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ آج انکی پیدائشی صدی تقریب کے دوران قوم ممنونیت کے ساتھ نیتاجی کو ان کے عزم و استقلال حب الوطنی اور ان کے نعرہ کے "چلو دہلی" کو یاد کرتی ہے جو قومی احساس میں ہلچل پیدا کرتا ہے۔

بقیہ سلسلہ "اہل مغرب اور اسلام"

کے مختلف طریقے اختیار کیے جا سکتے ہیں مثال کے طور پر ایسے ہم نہیں شروع کر سکتے ہیں کہ برٹش اسکولوں میں مسلم اساتذہ کا تقرر ہو یا اساتذہ کے باہم تبادلے کار حجان اسلامی دنیا اور مغرب میں فروغ دیا جائے آج دنیا میں ہر جگہ لوگوں کو انگریزی سیکھنے کی ضرورت ہے لیکن مغرب میں ہمیں اس چیز کی ضرورت ہے کہ اسلامی اساتذہ ہمیں پڑھائیں اور ہمارے قلب و دماغ علم کے نور سے منور ہوں اور ہم اپنے پورے وجود کو روحانیت کے نور سے بھر لیں۔

فزیکل ریسرچ لیباریٹری

احمدآباد میں یم جی سائینس انسٹیٹیوٹ کی معمولی ابتدا سے لیکر فزیکل ریسرچ کے موجودہ عظیم نیوکلیائی ادارہ نے ۱۱ر نومبر ۱۹۹۶ء کو گولڈن جوبلی سال میں قدم رکھا ہے۔ فزیکل ریسرچ لیباریٹری کی بنیاد ڈاکٹر وکرم اے سارا بھائی نے احمدآباد میں ایک معیاری تحقیق ادارہ کے قیام اور کاسمک شعاعوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی غرض سے کیا تھا۔ لیباریٹری کی کارکردگی میں آنے والے سالوں میں کافی وسعت ہوئی اور بین الاقوامی جیو فزیکل سال ۵۸-۱۹۵۷ء کے پروگرام میں سرگرم حصہ لیا گیا جسکی بنیاد پر بین الاقوامی سطح پر سائنٹفک امور میں وسیع پیمانے پر اپنے موقف کو مستحکم کرنے میں مدد ملی۔ نظریاتی طبعیات کا مطالعہ بالخصوص اسپیس فزیکس بلاسما فزیکس، نیوکلیر فزکس کے میدان میں جاریہ صدی کے ساتویں دہے میں آگے قدم بڑھانے میں سودمند ثابت ہوا۔

جاریہ صدی کے ساتویں دہے کے دوران عالمی سطح پر سیٹلائٹ کے اطلاقی پہلوؤں کی روشنی میں بہتر انداز میں زمین اور فضاء کو سمجھنے کی نمایاں کارگذاری انجام دی جاسکی۔ ہندوستان میں خلائی تحقیق کو بڑھاوا دینے کیلئے ڈاکٹر وکرم سارا بھائی کے تعاون سے انڈین اسپیس ریسرچ آرگنائزیشن سنہ ۱۹۶۹ء میں قائم کیا گیا جس کے صدرنشین ڈاکٹر وکرم سارا بھائی اس وقت کے ڈائرکٹر فزیکل ریسرچ لیباریٹری تھے اس اعتبار سے فزیکل ریسرچ لیباریٹری صحیح انداز میں ہندوستان

کے خلائی پروگرام کی ترقی کے لئے خدمات انجام دیں اور صدی کے ساتویں دہے میں آسٹروفزکس
اکسپریمنٹل پلاسما فزکس، جیو کاسمک فزکس، انفریڈ آسٹرانومی اور ریڈیو آسٹرانومی کے
میدانوں میں آگے قدم بڑھانے کا بھی باعث ہوا ہے۔
رصدگاہ گروسکھر اور آسٹرانومی سنٹر تمالیخ (قریب احمد آباد) اور ادے پور کی شمسی
رصدگاہ سورج کے مشاہدہ میں مصروف رہا گویا فزیکل ریسرچ لیباریٹری کی کارکردگی کا ایک جزو
قرار پایا۔ ذراتی فزکس اور زمان ڈائنا میکس کے اضافہ کے ساتھ نظریاتی فزکس کی تحقیق کو کافی
وسعت حاصل ہوئی ہے حال ہی میں لیزر فزکس اور کوانٹم آپٹکس کی تحقیقاتی کارکردگی
میں بھی پیشرفت ہوئی ہے۔ بعض پلازما فزسیٹس کی کارکردگی کو وسعت دینے کے لئے انہیں
فزیکل ریسرچ لیباریٹری سے جاریہ صدی کے نویں دہے کے دوران علیحدہ رکھا گیا اور گجرات
کے صدر مقام گاندھی نگر کے قریب پلازما ریسرچ کیلئے ایک نیا ادارہ "دی انسٹیٹوٹ فار
پلازما ریسرچ" قائم کیا گیا، پچھلے پانچ دہوں کے دوران لیباریٹری کی تعداد اور سائنٹفک
کارکردگی میں زبردست ترقی ہوئی ہے فی زمانہ فزیکل ریسرچ لیباریٹری کی تحقیق آسٹرانومی
آسٹروفزکس، پلانیٹری اور اسپیس سکشن، ارضیاتی سائنس کے علوم، نظریاتی طبعیات،
لازر فزکس اور کوانٹم آپٹکس کے میدانوں میں کافی وسعت کے ساتھ عمل میں لارہی ہے۔
بین الاقوامی اشتراک عمل :- ایک سال سے زیادہ عرصہ تک فزیکل ریسرچ
لیباریٹری کے سائنس دانوں نے قومی اور بین الاقوامی مہمات مثلاً انٹرنیشنل اوزون انٹرکمپارزن
میژرمنٹس، انٹرنیشنل مڈل اٹماسفیرک پروگرام، نوبار سائنس پروگرام، دی الورادھا
اسپیس لیاب اکسپریمنٹ، انڈین انٹارکٹک اکسپیڈیشن، سولا اکلپس کیا مپینس، جیوکیمکل
روشن سکشن اسٹڈیز وغیرہ میں حصہ لیا ہے شمالی فضائی سائنسی تجربات بین الاقوامی ایجنسیوں

آئی ایس آر او، ایس سی آر ایس آئی (روس) آئی ایس آر او - ڈی ایل آر (جرمنی) اور آئی ایس آر او - سی این ای ایس (فرانس) کے ساتھ اشتراک عمل کے ذریعہ کئے گئے - سردست سائنسدان جیو اسفیر بایو سفیر پروگرام (آئی جی بی پی) ورلڈ لونا سفیر، تھرما سفیر سسٹم ڈبلیو ٹی آئی ایس) سولا ٹیریسٹیرا انیرجی پروگرام (ایس ٹی ای پی) جائینٹ گلوبل روشن فلکس اسٹیڈیز (جے جی او ایف ایس) اور گلوبل آسیلیشن نٹ ورک گروپ (جی او این جی) وغیرہ کے ساتھ سرگرم حصہ لے رہے ہیں نظریاتی طبعیات گروپ سے تعلق رکھنے والے سائنسداں بھی کئی قومی اور بین الاقوامی سائنسدانوں کے ساتھ سرگرم عمل ہیں۔

تحقیقی کارکردگی : - فزیکل ریسرچ لیباریٹری ملک کے سرفہرست ان اداروں میں سے ایک ہے جو کہ ڈاکٹورل اور پوسٹ ڈاکٹورل ریسرچ کا کام فضائی طبعیات اور ارضیاتی سائنس کے میدانوں میں انجام دیتا ہے سردست ملک میں تقریباً چالیس ریسرچ اسکالرس اور پندرہ پوسٹ ڈاکٹورل فیلوز پی آر ایل میں موجود ہیں جنھیں ملک کے مختلف علاقوں سے لیا گیا ہے کئی سالوں سے اس ریسرچ سنٹر نے متحرک سائنسدانوں اور ٹکنالوجسٹس میں کارکردگی کا جوش پیدا کیا ہے پی آر ایل کو اپنے افراد پر اس بات کا فخر حاصل ہے کہ کئی افراد نے ہندوستانی خلائی پروگرام کی ترتیب میں اپنا اہم کردار ادا کیا ہے۔ مزید برآں اپنی تحقیقی کارکردگی کے علاوہ لیباریٹری کی جانب سے کالجوں اور یونیورسٹی سے وابستہ سائنس کے طلباء اور ٹیچرس کیلئے سائنٹفک کورسس کا اہتمام کرتی ہے اور یہ لیباریٹری گجرات کے مختلف انجینئرنگ کالجس اور پالی ٹیکنک طلبا کی تعلیم کا بھی انتظام کرتی ہے جس کیلئے مختلف طلبا خواہشمند ہوتے ہیں اس لیباریٹری کی کارکردگی مختلف میدانوں میں بنیادی تحقیق کی حامل ہے جو کہ قومی اور بین الاقوامی سطح پر مسلمہ قرار دی گئی ہے۔ مختلف سائنٹفک اکیڈیمیوں سے وابستہ سائنسدانوں کو قومی اور بین الاقوامی باوقار اعزازات، ایوارڈس اور فیلوشپ سے سرفراز کیا گیا ہے خود لیباریٹری کو

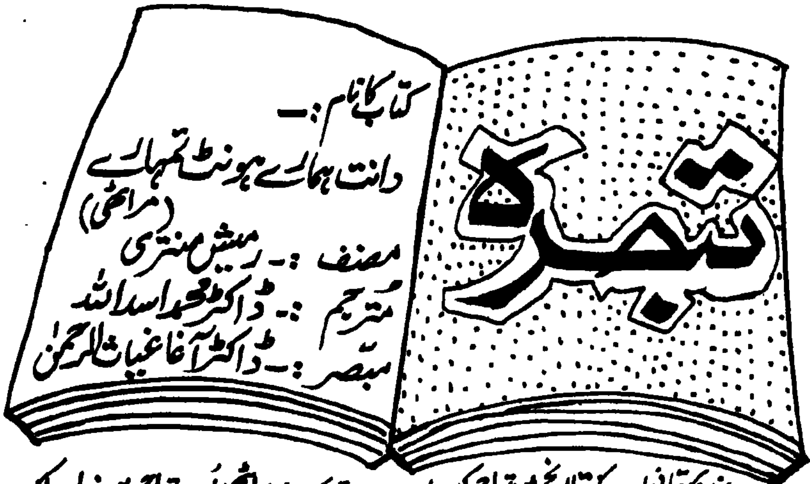
وکرم سارا بھائی ایوارڈ حکومت گجرات کی جانب سے خلائی اور اراضیاتی سائنس کے میدانوں میں بہترین صلاحیت اور کارناموں کی بنیاد پر دیا گیا ہے سائنس کو ترقی دینے اور غیر معمولی صلاحیت کے حامل سائنسدانوں کی مسلسل حوصلہ افزائی کرنے کے لیئے لیباریٹری نے ہری اوم آشرم پریرت وکرم سارا بھائی ریسرچ ایوارڈس منتخبہ نظم وضبط کی بنیادوں پر دئیے گئے ہیں غیر قابل ترجیح سائینسدانوں کو مدعو کیا جاتا ہے تاکہ وہ باہمی اشتراک عمل کے علاوہ وکرم پروفیسر شپ اور راماناتھم میموریل پروگرام کے تحت لکچر دے سکیں۔ پولار سیٹلائٹ کو کامیاب طریقے پر داغنے کے لانچ وہیکلس (پی ایس ایل وی) اور قیمتی آلات کی فراہمی مثلاً لیڈارس لازرس جیسے دوربین اور ماس اسپکٹرومیٹرس اور انٹروڈکشن آف ریسرچ پروگرام یا ریڈیکل فزکس، نان لائنر ڈائنامکس لیزر فزکس اور کوانٹم اسپکٹس کی مدد سے پی آر ایل اپنی پرجوش صلاحیتوں کے ساتھ اکیسویں صدی میں داخل ہو رہا ہے۔

(بقیہ صہ ۱۳ سے آگے)

ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان رکھتے ہیں اور جن کے عمل صالح ہیں اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو زمین کی خلافت سے سرفراز کرے گا جیسے ان لوگوں کو سرفراز کیا جو ان سے پہلے تھے اور ان کے دین کو جو اللہ کا پسندیدہ ہے اقتدار عطا فرمائے گا اور ان کے خوف کو امن سے بدل دے گا۔

لیکن باوجود اس کے یہ سارے وعدے ایمان وعمل صالح کی بنیاد پر تھے پھر یہ شرط فرمائی کہ یہ ضروری ہے کہ ان میں اسلام کی حقیقت (توحید کامل) پائی جائے۔

(دوسری قسط آئندہ شمارے میں)



ہندوستانی ادب کی تاریخ میں تراجم کی روایت بہت قدیم ہے مراٹھی اردو تراجم سے قطع نظر دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس سمت میں مختلف اصناف کی بے شمار کتابوں کے ترجمے اردو میں موجود ہیں مذہبی کتابیں رامائن، مہابھارت، گیتا، انجیل، وید، قرآن واحادیث کے تراجم سے اردو کا دامن مالامال ہے۔ مسیحی مذہب، آریہ سماج، بدھ مت اور جین مت کے اعتقادات سے متعلق کتابوں کے ترجمے بھی اردو میں ہوئے ہیں مغلیہ دورِ حکومت میں سینکڑوں قدیم سنسکرت، فارسی، عربی کتابوں کے ترجمے ہوئے اور کالی داس کی تقریباً سبھی کتابوں کے ترجمے بھی اردو ادب کے ذخیرہ میں بیش بہا اضافہ ہیں۔

ادب کی کوئی صنف ایسی باقی نہیں جس میں دیگر زبانوں کے ادب پاروں کے ترجمے اردو میں نہ ہوئے ہوں مراٹھی اردو کے لسانی وادبی روابط اور ہندو مسلم تہذیب و تمدن کے آثار مہاراشٹرا میں مسلمانوں کی آمد یعنی آٹھویں صدی عیسوی سے ہی ملتے ہیں ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط نے اپنی کتاب "اردو مراٹھی کے تہذیبی رشتے" میں اس پر مفید معلومات فراہم کی ہیں جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا۔ ہندو مسلم کلچر ایک دوسرے کے قریب آتا گیا۔ ہندو سنتوں اور مسلمان صوفیوں نے روحانیت کی تعلیم کو عام کیا مٹھوں اور خانقاہی نظام کے تحت ہندو مسلم بلا امتیازِ مذہب و ملت ایک دوسرے کے قریب تر ہوگئے۔ سید محمد غوث گوالیاری نے

(م ۱۵۱۴ء) کے مریدین کے شجرہ میں مسلمانوں کے نام کے ساتھ تقریباً سات نام ہندوؤں کے بھی آتے ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ سلسلہ بیعت میں ہندو مسلم کی تخصیص بھی باقی نہیں رہی تھی۔ ان روابط کا اثر زبان و ادب پر پڑنا بھی ناگزیر تھا۔ تیرھویں صدی عیسوی میں مہاراشٹرا میں مہانوبھاؤ پنتھ تحریک کو فروغ ہوا اس تحریک سے ان رجحانات کو مزید تقویت حاصل ہوئی سترہویں صدی عیسوی تک اردو مراٹھی کے یہ رشتے مضبوط تر ہوتے چلے گئے اور اس میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے اردو اور مراٹھی کو بلا تفریق اپنے اظہار و ابلاغ کا ذریعہ بنایا اور تخلیقات کا سلسلہ جاری کیا جس میں نثری اور شعری تخلیقات کے علاوہ تراجم اور ذو لسانی اشعار کا رواج بھی ہوا۔ (اردو کے ہندو شعراء اور مراٹھی کے مسلم شعراء پر تحقیقی کام جاری ہے) رفتہ رفتہ یہ سلسلہ سیاسی تغیرات کے زیر اثر دورِ حاضر میں داخل ہوتا ہے اس میں شعری اور نثری تخلیقات کے شانہ بشانہ تراجم کی روایت بھی برقرار ہے۔ چنانچہ آج مراٹھی سے اردو میں ترجمے کرنے والے ادیبوں کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے۔ ڈاکٹر محمد اسداللہ کا نام بھی اس فہرست میں شامل ہے۔

زیر نظر کتاب "دانت ہمارے ہونٹ تمہارے" مراٹھی کے مزاح نگار رمیش منتری کے مختلف مزاحیہ افسانوں اور کہانیوں کا اردو ترجمہ ہے ۱۱۵ صفحات پر مشتمل یہ کتاب مہاراشٹرا اردو اکادمی ممبئی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے۔ پیش لفظ یونس اگاسکر کا تحریر کردہ ہے کتاب کے متعلق ضروری توضیحات مراٹھی مزاحیہ کہانیوں پر تبصرہ اور رمیش منتری کا تعارف مترجم نے پیش کیا ہے۔

کتاب کا انتساب بہت معنی خیز ہے اور بڑی بے باکی کے ساتھ اسداللہ نے ایک سوال کھڑا کیا ہے۔

ڈاکٹر اسداللہ اردو کے انشائیہ نگار کی حیثیت سے اردو دنیا میں تعارف کے محتاج نہیں انکے انشائیے نہ صرف ہندوستان بلکہ پاکستان کے موقر جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کا شمار اردو کے صفِ اول کے انشائیہ نگاروں میں ہوتا ہے۔

ڈاکٹر اسد اللہ گوناگوں صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ انشائیوں کے علاوہ ان کے تحقیقی مضامین، تبصرے، خاکے، مراٹھی ادب پاروں کے ترجمے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اسد اللہ اُردو، مراٹھی اور انگریزی پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ زیر نظر کتاب سے پہلے مراٹھی کے معروف ادیبوں کے مزاحیہ مضامین کے تراجم "جمالِ ہم نشین" میں پیش کر چکے ہیں۔

تراجم کے تعلق سے ڈاکٹر اسد اللہ کا خیال ہے کہ اصل ادب پارہ کی لذت اور مفہوم کی کماحقہ ترجمانی محض ترجمہ کر دینے سے ادا نہیں ہوسکتی یہاں کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر اسد اللہ جیسے معتبر انشا پرداز کے ترجمہ سے ربیش منتری کی تخلیقات پھیکی نہیں ہوئیں اور نہ انکی روح تخلیق مجروح ہوئی بلکہ ان میں لذت کا چٹخارہ اور بڑھ گیا ان کے ہاتھوں سے گزر کر کہانیوں کی اثر انگیزی دو آتشہ ہوگئی۔

مراٹھی سے اردو تراجم کے سلسلہ میں یونس اگاسکر اور خود مترجم نے اس قدر تفصیلی اور وقیع معلومات فراہم کی ہیں کہ اس میں مزید اضافہ کی گنجائش نہیں۔

اسد اللہ نے کہانیوں کا انتخاب بھی اپنے مزاج اور طبیعت کے میلان کے مطابق کیا ہے ہر کہانی میں سماجی، سیاسی اور دفتری نظام کی بے اعتدالیوں پر طنز اور انسانی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کی ترجمانی ملتی ہے۔

ڈاکٹر اسد اللہ کے تراجم محض منہ کا مزہ بدلنے کیلئے نہیں ہیں بلکہ بقول خود ان کے نئی سمت کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ ان کے ڈانڈے اس سوتے سے ملتے ہیں جو کبھی مہاراشٹرا میں خالق ہوں اور سنتوں سے پھوٹتے تھے۔

میں اُمید کرتا ہوں کہ ڈاکٹر محمد اسد اللہ کی کتاب دلچسپی کے ساتھ فکر و نظر کی گہرائی سے بھی دیکھی جائے گی۔ ملنے کا پتہ۔ معرفت ایم آئی قاضی پلاٹ نمبر ۱۹ نزد مسجد احباب کالونی۔ ناگپور ۴۴۰۰۱۳ ▲



ڈاکٹر محمد منشاء الرحمٰن خان منشاء

کششِ بہارِ گل و یاسمیں میں کچھ تو ہو
انوکھی شان فضائے چمن میں کچھ تو ہو

بقائے دائمی اس کو نہیں نصیب تو کیا
غرورِ حسن گلوں کی پھبن میں کچھ تو ہو

اسے بھی لوگ زمیں کی طرح عزیز رکھیں گے
کمالِ فیض رسانی گگن میں کچھ تو ہو

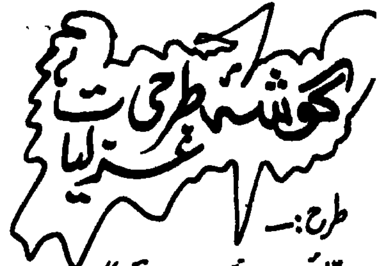
یہ کیسے مان لیں مستی بھری ہیں وہ آنکھیں
ادائے دلبری مستانہ پن میں کچھ تو ہو

زبانی باتوں سے کچھ بات بن کہیں پاتی
عمل کی سوزشِ پیہم لگن میں کچھ تو ہو

ثبوت کچھ تو ملے وحشتِ فراواں کا
جنوں کی آن پھٹے پیرہن میں کچھ تو ہو

کوئی ہنر نہیں محتاج داد کا لیکن
ہنر کی قدر بھری انجمن میں کچھ تو ہو

اے منشاء پاس روایات تو بجا ہے مگر
جدتِ نو کا تقاضا سخن میں کچھ تو ہو



طرح :-

"ہم تلخیٔ کلام پہ مائل ذرا نہ تھے"

رحمٰن جامی

تھے خوش بہت ہی درد سے واقف ذرا نہ تھے
جب تک ہمارے حال سے وہ آشنا نہ تھے

کشتی کو ڈوبنے سے بچایا تو ہم نے تھا
یہ بات ہے درست کہ ہم ناخدا نہ تھے

وہ اپنے رہنما تھے مقدّر کی بات ہے
حالاتِ زندگانی سے جو آشنا نہ تھے

ہم کو ہیں یاد آپ کی کافر ادائیاں
کیسے کہیں کہ آپ کبھی بے وفا نہ تھے

منزل کے راستے میں لُٹے راہ رو سبھی
ڈھونڈا تو قافلے میں کہیں رہنما نہ تھے

مانا کہ دُور دُور تھے راہِ حیات میں
جو ہم خیال لوگ تھے آپسی جُدا نہ تھے

کیا کیا ستم زمانے کے ہم پر رَوا نہ تھے
ہم پھر بھی اپنے وقت سے خائف ذرا نہ تھے

تم کیا ملے کہ چھن گئی خود آشنائی بھی !
ہم اپنی ذات سے کبھی ایسے جدا نہ تھے

احساسِ پارسائی تو بخشا ہے آپ نے
اپنی نگاہ میں کبھی، ہم پارسا نہ تھے

ہم جانتے ہیں آپ ہی دل میں مقیم ہیں
ورنہ ہم اپنے آپ پہ ہرگز فدا نہ تھے

یہ کیا کہ تم نے توڑ دیا اپنا آئینہ
تم اپنے آپ سے کبھی یوں تو خفا نہ تھے

اچھا ہوا کہ وقت نے آئینہ دے دیا
اپنی نظر میں خیر سے ہم لوگ کیا نہ تھا

اُنکے ہی لب پہ حرفِ شکایت ہے کیا کریں
جو لوگ دوستی سے بھی واقف ذرا نہ تھے

ملتا بھی کیا کسی کو، ہمیں سُن کے دوستو
جو سب کے من کو موہ لے ہم وہ کتھا نہ تھے

دینے چلے تھے ہم کو ہی درسِ وفا عزیزؔ
حرفِ وفا سے لوگ جو خود آشنا نہ تھے

عزیز بھارتیؔ

سید غلام محمود

وہ کبھی دور دور وہ ہم سے سوا نہ تھے
تھے شیخ جی ہماری طرح پارسا نہ تھے

دل بدگماں تھا بس ہی گئیں بدگمانیاں
وہم و گماں میں ہم تو کبھی مبتلا نہ تھے

آئی وفا کی بات تو کہنا پڑا ہمیں
محتاط گو ضرور تھے ہم بے وفا نہ تھے

نیرنگئ جہاں میں اگرچہ تھے منہمک
لیکن خیالِ یار سے غافل ذرا نہ تھے

ایسی بھی احتیاط و حیا شیخ محترم
دیوار و در تو در تھے دریچے بھی وا نہ تھے

ہم خستہ حال تھے مصیبت زدہ مگر
مایوس تیری دین سے ہرگز خدا نہ تھے

بدحال ہم کو دیکھنے والے یہ دیکھ لے
ماضی ہمارا کیسا تھا ہم کیا تھے کیا نہ تھے

ہو کر جدا بھی ہم سے اک اک موڑ پر ملے
مجبور تھے کہ راستے ان کے جدا نہ تھے

احباب ساتھ ساتھ تھے محمود کے مگر
بے فیض کوئی دافعِ رب و بلا نہ تھے

محمد امر اللہ خان زائر

پردہ نشیں بُت تھے کبھی بے ردا نہ تھے
حالات پردہ دار تھے دروازے وا نہ تھے

سر تا پا بندگی کا نمونہ بنے ہوئے
پیغمبرانِ حق تھے مگر خود خدا نہ تھے

الزام بے وفائی کا مجھ کو قبول ہے
اس راہ میں تو آپ بھی کچھ پارسا نہ تھے

کہدے کوئی نہ اُلجھے ہمارے مزاج سے
ہم سر پھرے ضرور تھے آفت رسا نہ تھے

منظر وہ پُر بہار گئے بھی تو کس طرف
لگتے ہیں خال خال کہیں جا بجا نہ تھے

پوجے گئے ہیں بُت جو خدائی کے نام پہ
ہم نے گرائے تھے جنھیں کیا وہ خدا نہ تھے

اس گھر سے جاہ ہو تو ملے گا وہاں بھی گھر
یعنی کہ دو جہاں میں بے آسرا نہ تھے

وارفتگی عشق میں کیا کیا نہ کر گئے
جو دار تک چلے تھے وہ زنجیر پا نہ تھے

زائر ہیں آپ خوب حقائق سے آشنا
وہ زندگی کی دوڑ میں کیا کیا تھے کیا نہ تھے

رؤف خیر

اب کیا کہیں کہ اپنے لیئے کیا تھے' کیا نہ تھے
وہ لوگ جو عجیب سفر پر روانہ تھے

ہم خود ہی اپنے آپ سے کھلواڑ کر گئے
ورنہ ہمیں جو درد ملے لا دوا نہ تھے

اب خرچ ہو گئے کہ ترے کام آ گئے
ہم یوں بھی کچھ اثاثۂ بے انتہا نہ تھے

جو سرزمینِ پاک کو ناپاک کر گئے
رشتے برادرانہ نہیں' تاجرانہ تھے

دن ہی کا اور چھور یہاں تھا نہ رات کا
خود ہم بھی بے مکان نہیں' بے ٹھکانا تھے

سب ڈھیر تھے بس آنکھ اٹھانے کی دیر تھی
حملے جو تھے حریفوں کو سب بزدلانہ تھے

رکھا اسی ملال نے بے خواب آج تک
سچ تو یہ ہے کہ اس کے گلے ناروا نہ تھے

مشکل ہے اب زمین سے وہ سر اٹھا سکیں
کل تک جو آسمان کے شانہ بہ شانہ تھے

آخر رؤف خیر ہمیں مان ہی گئے
اہلِ قلم جو مان کے دیتے ذرا نہ تھے

رشید ضارب

قارونِ وقت صاحبِ جود و سخا نہ تھے
جو مصلحت پسند تھے فرماں روا نہ تھے

دشتِ وفا کی خاک وہ چھانے کے کیا کہیں
نقشِ قدم بھی دیکھے تو بے آبلہ نہ تھے

جیب سے ہمارے عزم نے تلوار سونت لی
ہنگامہ ہائے دہر کھڑے جا بجا نہ تھے

شبنم نژاد لہجہ شہیدِ وفا کا تھا
الفاظ پُرخلوص تمازت نما نہ تھے

احساس کا وہ مرمریں کانٹا چبھو گئے
جن سے تعلقات مرے دوستانہ تھے

خوشبو نے زندگی کو دیئے ہیں نشاطِ غم
افکار گرچہ قاصدِ رنج و بلا نہ تھے

بانگِ درا' زبورِ عجم' بالِ جبرئیل
پڑھتے بہت تھے اور سمجھتے ذرا نہ تھے

کہدوں وثوق سے کہ ہے الزام سر بہ سر
عیسیٰ نبی ضرور تھے ابنِ خدا نہ تھے

الزام دہر کے آپ نے بدنام کر دیا
ضارب اگرچہ قائلِ رسمِ وفا نہ تھے

زعیم زمرّہ

ب آپ غور کیجئے ہم کیا تھے کیا نہ تھے
ں تک ہم اپنے آپ سے خود آشنا نہ تھے

قدموں تلے زمین تھی سر پر تھا آسماں
م اس بھرے جہان میں بے آسرا نہ تھے

یپ سادہ لی کہ کانچ کا برتن نہ ٹوٹ جائے
ہم بھی جواب کے لئے دست و پا نہ تھے

ثرمندگی سے سر جو جھکا پھر نہ اُٹھ سکا
معلوم اُن کو جب ہوا ہم بے وفا نہ تھے

ہے دیر اس کے پاس تھی اندھیر تو نہ تھی
ندے تھے ہم ہی حاملِ صبر و رضا نہ تھے

ندوم بت شکن کا بتایا گیا ہے بت
لیسے تو بت وہ بننے پہ مائل ذرا نہ تھے

ہ ڈرے رہے تھے ہم کو دعا کس طرح زعیم
ست دعا اُٹھے تو تھے محو دعا نہ تھے

میر فاروق ظہیر

انسانیت کا پیار کا وہ آسرا نہ تھے
کیا لوگ اس نگر کے کبھی با وفا نہ تھے

جمہوریت کا درس جو دیتے تھے چار سو
دراصل وہ ہمارے کبھی رہنما نہ تھے

پرچم اُٹھائے عشق کا آ جائیں گر تو کیا
سچ پوچھیئے تو وہ کبھی اہلِ وفا نہ تھے

ملکِ سخن میں آج یہ دستور ہے عجب
شہرت ملی اُنھیں جو سخن آشنا نہ تھے

ہم زندگی کی راہ میں تنہا ہی چل پڑے
اب کیا ہوا جو ساتھ کوئی رہنما نہ تھے

خنجر وہ آستیں میں لیے ساتھ تھے مگر
کیسے میں مان لوں اُنھیں وہ بے وفا نہ تھے

کوشش تھی اُنکی ہم کبھی منزل نہ پا سکیں
واقف نہ تھے خوب راہ سے ہم رہنما نہ تھے

نامہ وہ بھیج کر ہمیں بلوا لیے یاں ظہیر
وہ بدگماں ضرور تھے نہ آشنا نہ تھے

اطیب اعجاز

سامان سارے عیش کے اس سے جُدا نہ تھے
حالات سازگارِ زلیخا ذرا نہ تھے
انداز اُس کے لاکھ بڑے شاعرانہ تھے
"ہم تلخیٔ کلام پہ مائل ذرا نہ تھے"
ماں کی دعائیں لے کے جو رخصت ہوا ہوں میں
جنت کا جیسے مول تھے حرفِ دعا نہ تھے
اوراق کہہ رہے ہیں یہ تاریخ کے جناب
وہ سُرخرو ہوئے جو اسیرِ انا نہ تھے
پانسہ پلٹ کے رکھ دیا اعمال نے میاں
حاکم تھے رہنما بھی تھے ہم لوگ کیا نہ تھے
مانا کہ پچھلی قوموں میں بدکار تھے بہت
اِس دَور کی طرح تو حریفِ خدا نہ تھے
سانسوں کے سائباں میں تھک کر میں گر پڑا
اس ریگ زار ہی میں کہیں نقشِ پا نہ تھے
ہوتے ہی صبح کیسے ہوئے شہر کے رئیس
کل رات تک تو آپ بھی محتاجِ دانہ تھے
تم کیا گئے کہ دنیا ہی سونی سی ہوگئی
اطیب کے خواب بھی کہیں بے آسرا نہ تھے

قمر صابری

اربابِ کبر و ناز مقام آشنا نہ تھے
یہ لوگ بندگانِ خدا تھے خدا نہ تھے
شیرینیٔ کلام سے وہ آشنا نہ تھے
"ہم تلخیٔ کلام پہ مائل ذرا نہ تھے"
دل نے کیا تباہ مرقع حیات کا
ایسے بھی دن نصیب تھے جب مبتلا نہ تھے
دنیا کے ساز باز میں مصروف ہی رہے
ظاہر پرست حاملِ صدق و صفا نہ تھے
روزِ ازل سے ان میں رہا حسن پردہ پوش
ظاہر میں کچھ نہیں تھے حقیقت میں کیا نہ تھے
اہلِ وفا کے سامنے آئے مقامِ جبر
کر گذرے وہ امور جو بالکل رَوا نہ تھے

اک آئینہ قمر تھے وہ میرے وجود کا
وہ میری چاندنی تھے وہ مجھ سے جُدا نہ تھے

یہ گھر یہ کتابیں یہ بچے اب تیرے حوالے ہیں بابا

نئی دہلی۔ خانقاہ کے اغراض و مقاصد کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے صدر مشاعرہ پروفیسر عنوان چشتی نے کہا کہ اس خانقاہ کے تین نمایاں مقاصد ہیں (۱) رنگ، نسل اور مذہب کی تفریق کے بغیر انسانوں کی روحانی، تعلیمی اور فلاحی ترقی کے امکانات کو بروئے کار لانا ہیں انہوں نے کہا کہ خانقاہ ہی ایک ایسا مرکز ہے جہاں تمام انسان ایک دوسرے سے مل سکتے ہیں۔ اس مشاعرے کی نظامت کے فرائض جناب اسلم جمشید پوری نے انجام دیئے۔ مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے تنجیر ٹکاروی اور ساحل سحری نے شرکت کی۔ مشاعرہ میں صدر مشاعرہ کے علاوہ پروفیسر عنوان چشتی، ساحل سحری، تنجیر ٹکاروی، ڈاکٹر شہیر رسول، علامہ سلطان نظامی رامپوری، وصی احمد وصی، وحیدی بیرہان، بدر نظری، اسلم جمشید پوری نے اپنا کلام سنایا۔

پروفیسر عنوان چشتی صدر مشاعرہ : وہ زہر کو امرت کہتے ہیں جو چاہنے والے ہیں بابا
چومیں گے نشتے ہیں ہر گل کو گویہ ہونٹ پہ چھالے ہیں بابا

طوفاں سے اگر بچ نکلے ہم پھر آن ملیں گے اپنوں سے ؛ یہ گھر یہ کتابیں یہ بچے سب تیرے حوالے ہیں بابا

الفاظ کے شہکار لیئے پھرتے ہو ساحل ؛ انعام تو کیا زادِ سفر بھی نہ ملے گا (ساحل سحری)

انسانیت نواز ہواؤں کو کیا ہوا ؛ ہے خوں میں غرق آج سرِ شام زندگی (تنجیر ٹکاروی)

پیروں سے تعلق ہے مگر میرا نجومی ؛ ہاتھوں کی لکیروں میں سفر ڈھونڈھ رہا ہے (علامہ سلطان نظامی)

چاہنا چھوڑ نہ دوں چاہ کے ملتا کیا ہے ؛ تیرنا آج جو سیکھا ہے تو دریا غائب
(ڈاکٹر شہیر رسول)

وہ بادل کا ہے اک ادنیٰ سے ٹکڑا ؛ جو سورج کو نگلنا چاہتا ہے (وصی احمد وصی)

تجھے سکونِ مسلسل کی ہے تلاش ابھی ؛ میں منتظر ہوں ترا، تو مری نگاہ میں آ۔

***

طرحی حمد کا عظیم الشان کل ہند انعامی مقابلہ

بزمِ یاراں، جلگاؤں کے زیرِ اہتمام

★ حمد وصول ہونے کی آخری تاریخ ۳۱ مارچ ۱۹۹۷ء مقرر ہے

انعام اول :- پندرہ سو اکیاون روپے =/1551

انعام دوم :- ایک ہزار اکیاون روپے =/1051

انعام سوم :- پانچ سو اکیاون روپے =/551

مصرعِ طرح　اپنے مالک سے مانگو جو کچھ تم کو حاجت ہے
قافیہ　ردیف

شرائط :- حمد مع مطلع و مقطع سات شعر پر مشتمل ہو ۔ حمد کی چار عدد نقل ارسال کریں تین صفحات پر مقطع کے بغیر چھ چھ شعر درج ہوں چوتھے صفحہ پر مقطع کے ساتھ سات شعر اور شاعر کا نام و پتہ (مع پن کوڈ) تحریر ہوں ۔

- حمد خوشخط تحریر فرمائیں　و جج حضرات کا فیصلہ قطعی اور آخری ہوگا
- نتیجہ کا اعلان آخری تاریخ سے ڈیڑھ ماہ بعد اخبارات و رسائل میں شائع ہوگا
- ایک شاعر کی ایک حمد ہی قابلِ قبول ہوگی ۔ حمد رجسٹرڈ ڈاک سے ارسال فرمائیے تاکہ وصول ہونے کی رسید آپ تک پہنچ جائے ہم فرداً فرداً حمد وصول ہونے کی اطلاع دینے سے قاصر ہیں

انعام یافتہ اور منتخب معیاری حمد کتابی صورت میں شائع کی جائیں گی ۔ (بزم کے زیرِ اہتمام)

پتہ :- شفیق ناظم صدر بزم بزمِ یاراں ۲۶/۴ قدوائی نگر بالاجی پیٹھ جلگاؤں ۴۲۵۰۰۱ (مہاراشٹرا)

ماہنامہ

شاداب

حیدرآباد

جلد ۱۳
شمارہ ۲
فروری سنہ ۱۹۹۷ء
قیمت دس روپے

زرِ تعاون

	سالانہ	دوسال کیلئے	تاحیات
ہندوستان	۱۰۰ روپے	۱۸۰ روپے	۱۵۰۰ روپے
خلیجی ممالک	۳۰۰ "	۵۵۰ "	۴۰۰۰ "
امریکہ	۵۰ ڈالر	۹۰ ڈالر	۹۰۰ ڈالر
انگلستان	۳۰ پونڈ	۵۰ پونڈ	۵۰۰ پونڈ
پاکستان	۲۰۰ روپے	۳۵۰ روپے	۴۰۰۰ روپے

ترسیل زر کا پتہ ماہنامہ شاداب ۱۴۷-۵-۱۱ ریڈہلز حیدرآباد

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمرالدین صابری نے نخشل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپوا کر دفتر شاداب ۱۴۷-۵-۱۱ ریڈہلز حیدرآباد سے شائع کیا۔

فہرست

سید قطب شہید
ترجمہ: محمد رضی الاسلام ندوی
ادارۂ تحقیق علی گڑھ

تاریخ دعوت نبوی کا ایک ورق



سورۂ مزمل کی شان نزول میں یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ قریش دارالندوہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور جو دعوت آپ لے کر آئے تھے اس کے خلاف تدبیریں سوچنے اور سازشیں کرنے کے لئے اکٹھا ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم ہوا تو آپ کو رنج ہوا اور آپ چادر اوڑھ لپیٹ کر حزن و ملال کے ساتھ سو گئے۔ اُس وقت جبرئیل علیہ السلام اس سورۃ کا ابتدائی حصہ (یا ایہا المزمل قم اللیل الا قلیلا.... الخ) لے کر آئے۔ سورۃ کا دوسرا حصہ (ان ربک یعلم انک تقوم ادنیٰ من ثلثی اللیل... آخر سورۃ تک) پورے ایک سال کے بعد نازل ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کا ایک گروہ اتنی دیر تک عبادت الٰہی میں کھڑا رہتا تھا کہ اُن کے قدم متورم ہو جاتے تھے اس طرح تقریباً بارہ مہینوں کی تربیت کے بعد سورۃ کے اس دوسرے حصہ کے ذریعہ تخفیف کا حکم نازل ہوا۔

اُس سلسلہ میں ایک دوسری روایت بھی بیان کی جاتی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعثت سے تین سال قبل سے غار حرا میں "تحنث" یعنی عبادت الٰہی کیا کرتے تھے آپ کا یہ عمل ہر سال ایک ماہ (ماہ رمضان میں) ہوا کرتا تھا۔ آپ غار حرا جو مکہ سے دو میل کے فاصلہ پر تھا تشریف لے جاتے۔ وہاں آپ کے ساتھ آپ کے اہل بھی جاتے تھے جو آپ کے قریب ہی رہتے تھے وہاں آپ ایک ماہ قیام کرتے۔ اگر کوئی مسکین ادھر پہنچ جاتا تو اسے کھانا کھلا دیتے اور اپنا سارا وقت عبادت اور اپنے ارد گرد کے مناظر کائنات اور ان کے پیچھے پوشیدہ

تخلیقی قدرت میں تفکر و تدبر میں صرف کرتے ۔ آپ کی قوم شرک کے جن فاسد عقائد اور کمزور تصورات میں مبتلا تھی ان پر بے چین رہتے ۔ لیکن آپ کے سامنے کوئی واضح راستہ اور متعین طریقہ نہ تھا، کوئی سیدھا راستہ نہ تھا جس پر مطمئن ہو جاتے اور اسے اختیار کر لیتے ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عزلت نشینی اس تدبیر الٰہی کا ایک حصہ تھی جس کے ذریعہ وہ آپ کو آئندہ پیش آنے والے امر عظیم کے لئے تیار کر رہا تھا اس گوشۂ تنہائی میں آپ مراقبہ کرتے اور زندگی کی بھیڑ بھاڑ اور چھوٹی چھوٹی مشغولیات سے نجات حاصل کر کے کائنات کے اشارات اور ابداع و تخلیق کے دلائل میں تدبیر میں ہمہ وقتی مشغول ہو جاتے آپ کی روح کائنات کی روح کے ساتھ ہم آہنگ اور اس جمال و کمال کے ساتھ ہم آغوش ہو جاتی اور ادراک و فہم کے ساتھ حقیقت عظمیٰ سے اس کا تعامل ہونے لگتا ۔

کوئی بھی روح جس سے تقاضہ ہوتا ہے کہ وہ انسانی زندگی کے حالات پر اثر انداز ہو کر اس کا رخ پھیر دے اس کے لئے لمبا اوقات خلوت گزینی اور عزلت نشینی ضروری ہوتی ہے اس کے لئے لازم ہوتا ہے کہ وہ روئے زمین کی مشغولیات، زندگی کے شور و غل اور زندگی کو مشغول رکھنے والے چھوٹے چھوٹے تفکرات سے ترک تعلق کرے ۔

تامل، تدبر اور عظیم کائنات اور اس کے زندہ حقائق کے ساتھ تعامل کے لئے کچھ خالی اوقات ضروری ہوتے ہیں ۔ وسائل زندگی میں استغراق سے نفس ان سے مانوس و مالوف ہو جاتا ہے پھر ان میں تبدیلی لانے کی کوئی کوشش نہیں کرتا لیکن اگر تھوڑی دیر کے لئے ان سے کنارہ کشی اور الگ تھلگ ہو جائے اور معمول کے حالات اور معمولی مشغولیات کے قید و بند سے چھٹکارا حاصل کر کے مکمل آزادی کی فضاء میں زندگی گزارے تو اس کے ذریعہ عظیم روح اپنے سے بڑی حقیقت کا مشاہدہ کرنے کے قابل ہو جاتی ہے اور اسے اپنی ذات کی ہمہ جہت تکمیل کا شعور ہو جاتا ہے لوگوں کے عرف یا اس کے علاوہ کسی دیگر سرچشمہ سے مدد حاصل کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی ۔

اللہ تعالیٰ جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو امانت عظمیٰ کا بار اٹھانے، روئے زمین کی کایا پلٹ دینے اور تاریخ کا دھارا موڑنے کے لیئے تیار کر رہا تھا اس نے کار رسالت سونپنے سے تین سال قبل آپ کے لئے اس عزلت نشینی کا نظم کر دیا تھا ۔ آپ کا ایک ماہ کا عرصہ کائنات کی آزاد روح کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر تنہائی میں گزارتے اور اس کے پرے پوشیدہ

غیبیات میں تدبر کرتے تاآنکہ باذن الہیٰ اس غیب کے ساتھ تعامل کا وقت موعود آن پہونچے۔

پھر جب مشیئت ایزدی یہ ہوئی کہ اس رحمت کا فیضان اہل زمین پر ہو تو جبرئیل علیہ السلام، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس غار حرا میں تشریف لائے اور وہ کچھ ہوا جس کی آپ نے خبر دی تھی۔ ابن اسحاق نے وہب بن کیسان سے اور انہوں نے عبید کے واسطہ سے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

"جبرئیل میرے پاس آئے اس وقت میں سو رہا تھا۔ اُن کے ساتھ دیبا کے ایک کپڑے میں ایک تحریر تھی انہوں نے مجھ سے کہا پڑھو۔ میں نے کہا میں نہیں پڑھ سکتا (دیگر روایات میں ہے کہ " میں نے کہا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔") انہوں نے مجھے بھینچ لیا، یہاں تک کہ میں گمان کرنے لگا کہ بس اب موت آئی۔ پھر انہوں نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا پڑھو، میں نے کہا میں نہیں پڑھ سکتا۔ انہوں نے پھر مجھے بھینچ لیا۔ یہاں تک کہ میں گمان کرنے لگا کہ بس اب موت آئی۔ انہوں نے پھر مجھے چھوڑ دیا اور کہا پڑھو، میں نے کہا کیا پڑھوں ؟ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں نے یہ صرف اس لئے کہا تھا کہ کہیں میرے یہ کہنے پر کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں وہ دوبارہ میرے ساتھ یہی نہ کریں) اس پر انہوں نے کہا۔ " اقرا باسم ربك الذی خلق ، خلق الانسان من علق ، اقراء وربك الاکرم الذی علم بالقلم ، علم الانسان مالم یعلم "۔ (آنحضرت نے فرمایا کہ) ان آیات کو میں نے پڑھا اس کے بعد جبرئیل چلے گئے اور میں اپنی نیند سے بیدار ہو گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ گویا وہ آیات میرے دل پر نقش ہو گئی ہوں (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں) میں وہاں سے نکلا یہاں تک کہ جب میں پہاڑ کے وسط میں تھا تو میں نے آسمان سے ایک آواز سنی "اے محمد آپ اللہ کے رسول ہیں اور میں جبرئیل ہوں۔" میں نے سر اُوپر اٹھایا تو دیکھا کہ جبرئیل ایک آدمی کی صورت میں ہیں ان کے قدم آسمان کے اُفق میں پھیلے ہوتے ہیں اور وہ کہہ رہے ہیں۔ "اے محمد آپ اللہ کے رسول ہیں

اور میں جبرئیل ہوں۔" (آنحضرت فرماتے ہیں) میں رک کر انہیں دیکھنے لگا میرا قدم نہ آگے بڑھتا تھا نہ پیچھے ہٹتا تھا میں اُن کی طرف سے چہرہ ہٹا کر افق میں اِدھر اُدھر گھمانے لگا لیکن ہر طرف وہ مجھے اسی حالت میں نظر آئے۔ میں وہیں کھڑا کا کھڑا رہ گیا نہ آگے بڑھتا تھا نہ پیچھے ہٹتا تھا۔ ادھر خدیجہؓ نے میری تلاش میں لوگوں کو بھیجا وہ مجھے تلاش کرتے ہوئے مکہ کے بالائی حصہ تک پہنچ گئے اور مجھے نہ پاکر واپس چلے گئے میں وہیں کا وہیں کھڑا رہا۔ پھر جبرئیل چلے گئے تو میں بھی گھر واپس آگیا۔ خدیجہؓ کے پاس آکر میں اُن کے انتہائی قریب بیٹھ گیا۔ انہوں نے کہا ۔ "اے ابوالقاسم آپ کہاں تھے؟ خدا کی قسم میں نے آپ کی تلاش میں لوگوں کو بھیجا تھا وہ مکہ تک آپ کو ڈھونڈھ آئے مگر آپ نہ ملے تو تھک ہار کر واپس آگئے۔" ۔ میں نے جو دیکھا تھا وہ بیان کر دیا تو کہنے لگیں "اے میرے چچا کے لڑکے بشارت قبول کیجئے اور ثابت قدم رہیئے ۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں خدیجہ کی جان ہے مجھے امید ہے کہ آپ اس امت کے نبی ہوں گے۔"

پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک مدت تک وحی کی آمد منقطع رہی۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ جب آپ پہاڑ پر تھے وہاں اچانک پھر جبرئیل علیہ السلام پر نظر پڑی۔ اس وقت آپ پر کپکپی طاری ہو گئی یہاں تک کہ ایسا لگنے لگا کہ آپ گر پڑیں گے۔ آپ کانپتے ہوئے گھر واپس آئے اور کہا ۔ "مجھے چادر اوڑھاؤ۔ مجھے ڈھانک دو" لوگوں نے ایسا ہی کیا ۔ آپ پر جو خوف طاری تھا اس سے آپ کانپ رہے تھے اس وقت جبرئیل علیہ السلام یہ آیات لے کر آئے یا ایہا المزمل (اور دوسری روایت میں ہے کہ وہ یا ایہا المدثر والی آیات لے کر آئے تھے) اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کون سی آیات تھی۔

سورہ کے ابتدائی حصے کی شان نزول کے سلسلہ میں خواہ پہلی روایت صحیح ہو یا دوسری، بہر حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اچھی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ یہ کوئی خواب نہیں ہے بلکہ آپ پر ایک گرانبار بوجھ ڈالا گیا ہے آپ کو طویل جہاد کرنا ہے اور یہ ندا چین کی نیند نہ سونے دے گی ۔ بلکہ اب بیداری، محنت اور مشقت کا وقت آگیا ہے ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ۔ "اٹھ کھڑے ہو" آپ کھڑے ہو گئے اور بیس سال سے زائد عرصہ کھڑے رہے۔ آرام کیا نہ سکون کی سانس لی اپنے لئے زندہ رہے نہ اپنے گھر والوں کے لئے۔ آپ اٹھ کھڑے ہوئے اور لوگوں کو اللہ کی طرف بلاتے رہے اپنے

کندھے پر بھاری اور گراں بار بوجھ اٹھائے رہے اور تھکن کا اظہار تک نہ کیا۔ روئے زمین پر امانتِ عظمیٰ کا بوجھ پوری انسانیت کا بوجھ، عقیدہ کا بوجھ اور مختلف میدانوں میں جدوجہد اور جہاد کا بوجھ۔ آپ نے انسانی ضمیر کے میدان میں جدوجہد اور جہاد کا بار اٹھایا۔ وہ ضمیر جو جاہلیت کے اوہام و خرافات میں ڈوبا ہوا تھا زمین اور اس کی پرکشش چیزوں کے بوجھوں سے جھکا جارہا تھا، شہوتوں کے بندھنوں اور بیڑیوں میں جکڑا ہوا تھا یہاں تک کہ جب بعض صحابہ کے ضمیر کو جو جاہلیت اور دنیوی زندگی کے ڈھیر تلے دبا ہوا تھا آزادی ملی تو آپ نے دوسرے میدان میں دوسرا معرکہ شروع کر دیا۔ بلکہ پے درپے متعدد معرکے برپا کیئے۔ دعوتِ الٰہی کے دشمنوں کے ساتھ معرکہ، جو اس کی اور اس پر ایمان لانے والوں کی عداوت پر کمربستہ ہو گئے تھے اور جس پاکیزہ پودے کو قبل اس کے کہ وہ پروان چڑھے اور اپنی جڑیں مٹی میں اور شاخیں آسمان میں پھیلائے اور دوسرے میدانوں میں سایہ فگن ہو، کونپل نکلتے ہی اکھاڑ پھینکنے کے خواہاں تھے۔ آپ جزیرہ العرب کے معرکوں سے ابھی فارغ بھی نہ ہوئے تھے کہ روم اس نئی امت کے درپے ہو گیا اور اس کی سرزنش کے لئے شمالی سرحدوں پر تیاری کرنے لگا۔

اس دوران اولین معرکہ، معرکۂ ضمیر۔ ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ یہ تو ہمیشہ قائم رہنے والا معرکہ ہے اس میں فریق مخالف شیطان ہے جو انسانی ضمیر کی اندرون میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے سے ایک لمحہ بھی نہیں چوکتا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس محاذ پر اللہ کی دعوت پہنچا رہے تھے اور مختلف میدانوں میں ہونے والے معرکہ پیہم میں ڈٹے ہوئے تھے آپ چھوٹی موٹی زندگی گزارتے تھے جبکہ دنیا آپ کی طرف مائل تھی جدوجہد کرتے اور آپ کے گرد رہنے والے اہلِ ایمان امن و سکون کی چھاؤں میں زندگی گزارنے۔ مسلسل اور پیہم مشقت کرتے اور تمام تکالیف پر صبرِ جمیل کرتے، راتوں میں قیام کر کے اپنے رب کی عبادت اور قرآن کی تلاوت کرتے اور سب سے ترکِ تعلق کر کے اسی سے لو لگاتے اور وہ کچھ کرتے جس کا آپ کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا۔

یاایھا المزمل قم اللیل الا قلیلا نصفہ او انقص منہ قلیلا اوزد علیہ ورتل القرآن ترتیلا۔ انا سنلقی علیک قولا ثقیلا انا ناشئۃ اللیل ھی اشد وطا واقوم قیلا۔ ان لک فی النھار سبحا طویلا

واذکر اسم ربک وتبتل الیہ تبتیلا۔ رب المشرق والمغرب لا الہ الا ھو فاتخذہ وکیلا واصبر علی ما یقولون واھجرھم ھجراً جمیلا

(اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو مگر کم۔ آدھی رات یا اس سے کچھ کم کر لو یا اس سے کچھ زیادہ بڑھا دو اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔ ہم تم پر ایک بھاری کلام نازل کرنے والے ہیں، درحقیقت رات کا اٹھنا نفس پر قابو پانے کے لئے بہت کارگر اور قرآن ٹھیک پڑھنے کے لئے زیادہ موزوں ہے۔ دن کے اوقات میں تو تمہارے لئے بہت مصروفیات ہیں اپنے رب کے نام کا ذکر کیا کرو اور سب سے کٹ کر اسی کے ہو رہو۔ وہ مشرق و مغرب کا مالک ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے لہٰذا اسی کو اپنا وکیل بنالو اور جو باتیں لوگ بنا رہے ہیں ان پر صبر کرو اور شرافت کے ساتھ ان سے الگ ہو جاؤ)

اس طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اٹھ کھڑے ہوئے اور اس وقت سے جب کہ آپ نے اعلیٰ اور بزرگ و برتر ذات کی ندا سنی تھی اور بڑی ہیبت ذمہ داری کو قبول کیا تھا بیس سال سے زیادہ عرصہ تک مسلسل اور پیہم سفر کر میں زندگی گزاری۔ اس پوری مدت میں کسی چیز نے آپ کو اس مہم سے غافل نہیں رکھا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہماری طرف سے اور پوری انسانیت کی طرف سے اچھا بدلہ عطا فرمائے۔

سورۃ کے ابتدائی حصہ میں موسیقی کا ایک آہنگ اور تقریباً یکساں بہاؤ پایا جاتا ہے اور وہ ہے لام مطلقہ ممدودہ کا۔ یہ آسودگی، وقار اور عظمت کا آہنگ ہے جو ذمہ داری کی عظمت، معاملہ کی سنجیدگی اور سباق میں بیان کردہ پے در پے ہولناک مناظر کے ساتھ چلتا ہے قول ثقیل کی ہیبت جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا۔ خوفناک دھمکی کی ہیبت: "وذرنی والمکذبین اولی النعمۃ ومھلھم قلیلا ان لدینا انکالا وجحیما وطعاما ذا غصۃ وعذابا الیما" (ان جھٹلانے والے خوش حال لوگوں سے نمٹنے کا کام تم مجھ پر چھوڑ دو اور انہیں ذرا کچھ دیر اسی حالت پر رہنے دو۔ ہمارے پاس ان کے لئے بھاری بیڑیاں ہیں اور بھڑکتی ہوئی آگ اور حلق میں پھنسنے والا کھانا اور دردناک عذاب) کائنات کے مناظر اور نفوس کی گہرائیوں میں ظاہر ہونے والے رویہ کی ہیبت "یوم ترجف الارض والجبال وکانت الجبال کثیبا مھیلا (یہ اس دن ہوگا جب زمین اور پہاڑ لرز اٹھیں گے اور پہاڑوں کا حال ایسا ہو جائے

گا جیسے ریت کے ڈھیر ہیں جو بکھرے جا رہے ہیں)۔ فکیف تتقون ان کفرتم یوما یجعل الولدان شیبا، السماء منفطر بہ کان وعدہ مفعولا۔ (اگر تم ماننے سے انکار کرو گے تو اس دن کیسے بچ جاؤ گے جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا اور جس کی سختی سے آسمان پھٹا جا رہا ہوگا؟ اللہ کا وعدہ پورا ہو کر ہی رہتا ہے)۔

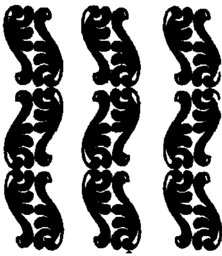
آخری طویل آیت جو سورہ کا دوسرا حصہ ہے قیام لیل (جس کے نتیجے میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کے ایک گروہ کے قدم متورم ہو جاتے ہیں اور جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے اصحاب کو ایک عظیم مقصد کے لئے تیار کر رہا تھا) سے مذکورہ حکم کے ایک سال بعد نازل ہوئی۔ اس کے ذریعہ مذکورہ حکم میں تخفیف کر دی گئی اور یہ اطمینان دلایا گیا کہ ایسا اللہ تعالیٰ نے ان کی ذمہ داریوں اور فرائض منصبی کو دیکھتے ہوئے اپنے علم اور حکمت کے مطابق کیا ہے۔ یہ آیت ایک خاص نہج پر ہے۔ اس میں طوالت اور اس کی موسیقیت میں تموج اور پھیلاؤ ہے سکون اور استقرار ہے اور اس کا قافیہ اس استقرار سے ہم آہنگ ہے اور وہ ہے "م" اور اس سے قبل "ی" کی "مد" اور غفور رحیم"۔

سورہ کے دونوں حصے اس دعوت کی کتاب تاریخ کا ایک ورق پیش کرتے ہیں اس کا آغاز اعلیٰ و کریم ذات کی اس ندا سے ہوتا ہے جس کے ذریعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عظیم ذمہ داری سے نوازا گیا ہے اور اس کی تیاری کرنے کے لئے قیام لیل، نماز، تلاوت و ترتیل قرآن، خشوع و تبتل کے ساتھ ذکر، صرف اللہ سبحانہ کی ذات پر بھروسہ، تکالیف پر صبر، جھٹلانے والوں سے شرافت کے ساتھ علیحدگی اور ان کے اور جبار و قہار ذات (جو دعوت و معرکہ میں ایک فریق ہے) کے درمیان سے ہٹ جانے کو کہا گیا ہے۔ اور اس کی انتہا نرمی، رحمت، تخفیف اور آسانی کے احساس، اطاعت و طلب تقرب کی ہدایت اور اللہ کی رحمت و مغفرت کے بیان پر ہوتی ہے۔

اس طرح سورہ کے دونوں اجزاء سے اس پاکیزہ جد و جہد کا ایک صفحہ منظر عام پر آتا ہے جو انسانیت، گمراہ انسانیت کے اس منتخب گروہ نے کی تھی تاکہ اس کے رب کی طرف پھیر دے اور اس کی اذیتوں پر صبر کیا تھا ان کے ضمیروں سے جنگ کی تھی اور زندگی کی تمام پرکشش آسائشوں، لہو میں مبتلا کر دینے والی لذتوں، عیش و عشرت کی میٹھی لذتوں سے کنارہ کش ہوتے تھے۔



ڈاکٹر صالح بن عبداللہ بن حمید
مترجم: محمد اسلام عمری



حکمت دعوت

الحمد للہ والصلوٰۃ والسلام علی رسول اللہ وعلی آلہ و اصحابہ وبعد

حکمت اور دعوت الی اللہ سے متعلق یہ چند باتیں ہیں جو داعی کو دعوت کے میدان میں پیش آتی ہیں۔ داعی کو اپنی دعوتی زندگی میں ان تمام مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو ماضی اور موجودہ دور میں اس طرح کا کام کرتے ہوئے پیش آتی ہیں، گویا ایک طرح سے اللہ تعالیٰ کی سنت ہے جو گزشتہ اور موجودہ داعیوں میں مروج ہے۔

دعوت الی اللہ کا کام رسولوں کے کام جیسا ہے اس کام میں انبیاء و رسل کو بھی اپنے دور کے لوگوں اور جماعتوں کی طرف سے روگردانی، انکار، رکاوٹ اور لعنت و ملامت کا سامنا کرنا پڑتا تھا اس انبیائی دعوت سے روگردانی کرنے والے بہت سے لوگ ہوتے ہیں۔

قل هٰذه سبيلي ادعوا الى الله على بصيرة انا ومن اتبعني وسبحٰن الله وما انا من المشركين (سورۃ یوسف: آیت نمبر ۱۰۸)

ترجمہ: "تم ان سے صاف کہہ دو کہ میرا راستہ تو یہ ہے میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں۔ میں خود بھی پوری روشنی میں اپنا راستہ دیکھ رہا ہوں اور میرے ساتھی بھی اور اللہ پاک ہے اور شرک کرنے والوں سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔"

حکمت عملی کے معنیٰ، مفہوم اور دلائل کی وضاحت پر اس کتاب میں گفتگو منحصر رہے گی واقعہ یہ ہے کہ جب دعوت کے ساتھ حکمت بھی شامل ہو جاتی ہے تو امید اور یقین کو قوت مل جاتی ہے۔ مدعو کے اندر احساس ذمہ داری اور مکلف ہونے کا بھی احساس بڑھ جاتا ہے اور جب مدعو کے اندر یہ شعور جاگزیں ہو جاتا ہے تو اُن کا مزاج بدل جاتا ہے۔ ان کا رہن سہن معتدل ہو جاتا ہے اور ان کی سمت درست ہو جاتی ہے۔ اس

موقع پر داعی الی اللہ کے لئے ضروری ہے کہ مدعو پر اپنا کام شروع کرے۔

اس گفتگو کے بعد حکمت، موعظہ حسنہ اور جدال احسن کی تعریف پیش کی جائے گی پھر ان دلائل کا بھی تذکرہ ہوگا جن سے حکمت کے مفہوم کی حقیقت مزید واضح ہوگی حکمت کے مفہوم میں لوگوں کی مزاج شناسی، مدعو کی درجہ بندی، حالات و زمانہ کی رعایت اور قولی و عملی اسلوب شامل ہے۔

حکمت کی تعریف :- حکمت ماخوذ ہے حکمۃ سے۔ حکمت اس چیز کو کہتے ہیں جو جانور کو رام کرنے کے لئے لگایا جاتا ہے تاکہ وہ اپنے سوار کا فرماں بردار ہو جائے اور اس کی سرکشی ختم ہو جائے۔

حکمت اس سے ماخوذ ہے۔ (۱) اہل زبان اس کو اسی طرح استعمال کرتے ہیں کیونکہ حکمت، صاحب حکمت کو اخلاق رذیلہ سے روک دیتا ہے (۲) حکمت کا حقیقی مفہوم کسی چیز کو اس کی مناسب جگہ پر رکھنا ہے (۳) حکمت کی یہ تعریف عام ہے۔ اقوال و افعال اور ساری سرگرمیوں کو یہ شامل ہے۔ اے میرے بھائی شاید آپ کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس رسالہ میں میرے پیش نظر حکمت کا وہ مفہوم ہے کہ جس سے داعی کو متصف ہونا ضروری ہے۔ حکمت کے اس مفہوم کی مناسبت سے حکمت قولی ہے کہ علم و نصیحت کے وقت حکمت کام آتی ہے یا فعلی ہوتی ہے۔ مدعو کو خیر کی طرف کر دیا جائے اور برائی سے ان کو باز رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے

حکمت کے اس مفہوم کے بارے میں ابن زید کہتے ہیں۔

"ہر بات جو آپ کو نصیحت کرے یا نیک کام کی طرف رغبت ہو یا کسی قبیح سے روک دے وہی حکمت ہے۔"

اس سے زیادہ ادق قول ابو جعفر محمد بن یعقوب کا ہے

"ہر وہ درست بات جس کے نتیجہ میں درست کام ہو وہی حکمت ہے۔"

حکمت کی تعریف میں جرجانی فرماتے ہیں

"ہر وہ بات جو حق کے موافق ہو وہ حکمت ہے۔"

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے

یؤتی الحکمۃ من یشاء ومن یؤت الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیرا (البقرۃ: ۲۶۹)

ترجمہ :۔ جس کو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے اور جس کو حکمت ملی اسے حقیقت میں بڑی دولت مل گئی"

آیت کریمہ میں حکمت اور خیر کے درمیان بڑا گہرا ربط ہے۔ اس ارتباط کی وجہ یہ ہے کہ قول وفعل کی درستگی کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے درست معنی میں حکمت شامل ہے دوسرے الفاظ میں حکمت کے نام ہے علم کی پختگی اور اس علم کی بدولت سرزد ہونے والے افعال کا۔ جو شخص اس قسم کی حکمت عملی سے مزین ہونا چاہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے افکار درست ہوں قوت اور مزاج میں اعتدال ہو۔ ایسا ہی شخص حقائق کو سمجھ سکتا ہے اور حق کے لئے ضروری ہے کہ اس کے افکار درست ہوں قوت اور مزاج میں اعتدال ہو۔ ایسا ہی شخص حقائق کو سمجھ سکتا ہے اور حق کے لئے اپنے آپ کو سرنگوں کرسکتا ہے حق واضح ہوکر سامنے آجانے کے بعد قبولیت حق سے اس کو خواہش نفس عصبیت اور فخر وغرور سے باز نہیں رکھ سکتا۔ پھر اس کو ایسے اسباب میسر آجاتے ہیں کہ وہ داعی بن کررہ جاتا ہے اور دشمنوں سے مقابلہ کرتا ہے۔ داعی کو ان اسباب کے میسر آجانے کے بعد اللہ تعالیٰ سے مزید اسباب کی آسانی اور حجاب فہم کی دعا کرنی چاہیئے۔ اس طرح کا دعوتی کام آسان ہوجائے گا ایسے ہی وقت کے لئے کہا گیا ہے کہ اس کو خیر کثیر مل جاتا ہے فقد اوتی خیرا کثیرا۔

خیر کثیر حاصل ہوجانے کے بعد آدمی کی رائے میں پختگی اور ہدایت الٰہی کی طرف میلان ہوجاتا ہے حکمت کی بنیاد سے خیر وقوع پذیر ہوتا ہے۔ حکمت کا قاعدہ یہ ہے کہ یہ لوگوں کو غلط کاموں یا گمراہی میں مبتلا ہونے سے بچاتا ہے کیوں کہ اگر آپ لوگوں کو لاحق ہونے والے مصائب و مشکلات کا جائزہ لیں تو اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ یہ زیادہ تر لوگوں میں جہالت، گمراہی، نادانی اور بدخواہی کی وجہ سے ہے اس کے برعکس لوگوں کو جو فوائد اور سہولیات حاصل ہوتے ہیں وہ ان کے علم اور حقائق سے واقفیت کی وجہ سے ہے ان لوگوں کو حقیقت کا صحیح علم ہوجائے تو وہ ہلاکت و گمراہی سے محفوظ رہ سکتے ہیں (۴)

گزشتہ مباحث سے واضح ہوگیا کہ حکمت ایک عام لفظ ہے جس میں نفس کو بیدار کرنے والے اور خیر بیدا کرنے والے اقوال شامل ہیں۔ اس کے مفہوم میں سعادت اور بدبختی بھی شامل ہے یہ قاعدہ کلیہ تمام اصول و آداب کو جامع ہے۔ حکمت خالص نام ہے لوگوں کو سکھانے، مہذب بنانے اور دین کی طرف متوجہ کرنے میں رونما ہونے والی غلطیوں کے ادراک کا یعنی اس طرح کا کام کرتے ہوئے غلطی کہاں سرزد ہورہی ہے اس کی نشاندہی حکمت کی بناء پر ہی ہوسکتی ہے اور پھر بعد میں اس کے تدارک کی کوشش کی جائے۔ حکمت ایک جامع نام ہے ہر اس کلام کا جس میں لوگوں کی اصلاح حال

یا مستقل غیر متغیر اصلاح عقیدہ کی کوشش کی جائے۔ (۵)

حکمت کا اطلاق :- نصوص شریعت میں لفظ حکمت مذکورہ معنوں میں استعمال ہوتا ہے اس سے کتب سماویہ قرآن اور انجیل وغیرہ مراد لئے جاتے ہیں نیز اس سے نبوت، ہدایت، علم، عدل، تفقہ اور بردباری بھی مراد لی جاتی ہے۔(۶)

موعظہ حسنہ :- حکمت کی سابقہ تعریف میں یہ ملحوظ رہنا چاہیئے کہ موعظہ حسنہ اور جدال احسن حکمت کے مفہوم میں داخل ہیں۔ لیکن موعظہ حسنہ اور جدال احسن کی مزید تعریف و وضاحت سے ان کے اندر حسن پیدا ہوسکتا ہے کیونکہ یہ مقام ہی ایسا ہے جہاں حکمت کے مفہوم کو شرح و بسط سے پیش کیا جاسکتا ہے۔ مندرجہ ذیل آیت کریمہ میں یہ دونوں الفاظ ذکر کے ساتھ خاص کرکے آئے ہیں۔

ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ و جادلھم بالتی ھی احسن (النحل آیت ۱۲۵)

ترجمہ :"اے نبی! اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقہ پر جو بہترین ہو۔"

جب یہ دونوں الفاظ معنوی اعتبار سے حکمت کے معنی میں شامل ہیں تو آیت کریمہ میں ان دونوں کا عطف خاص پر عام کے عطف کے قبیل سے ہے۔ موعظت کے مفہوم میں یہ بات شامل ہے کہ وہ مخاطب کے دل کو نرم کردیتا ہے تاکہ وہ کار خیر کے لئے تیار ہوجائے اور اس کو بخوشی قبول کرنے پر بھی راضی ہوجائے۔ باعتبار معنی موعظت بشارت کی ترغیب دینا اور خوف سے آگاہ کرنا ہے۔ ابن عطیہ فرماتے ہیں۔

" انسان کو نرمی کے ساتھ خوف اور امید دلانا اور اس کے ساتھ نرمی کا اس طرح برتاؤ کرنا گویا آپ کو برتر پائیں۔ اس کو چاق و چوبند بناکر ایسا مہذب بنا دیں کہ وہ تمام فضائل کو اپنے اندر جذب کرلینے کی صلاحیت پیدا کرے۔" (۱)

زمخشری اس کے ایک لطیف معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"موعظت حسنہ یہ ہے کہ لوگوں پر آپ کا یہ راز پوشیدہ نہ رہے کہ آپ ان کے ساتھ خیر خواہی کا برتاؤ کررہے ہیں اور ان کے ساتھ وہ کام کررہے ہیں جو ان کے لئے نفع بخش ہے خلاصہ یہ کہ موعظت حسنہ تذکیر بالخیر کا نام ہے جس سے دل نرم ہوجائے۔" (۸)

خوبصورت اشارہ ہے جیسا اہل علم نے نہایت باریک بینی سے موعظہ حسنہ کی تعریف میں پیش کیا ہے یہ باتیں حکمت کو نہیں کیونکہ حکمت درجہ کمال کی تعلیم کا نام ہے جو شخص بھی درجہ کمال تک پہنچنے کا نشانہ رکھتا ہو اور آدمی کا اس منزل تک پہنچنا حالت حسنہ ہی میں ہو سکتا ہے اس لئے حکمت میں حسنہ کی وضاحت کی چنداں ضرورت نہ تھی۔

موعوظ حسنہ کا معاملہ یہ ہے کہ اس کا مقصد غالباً موعظ کے نفس کو برے اعمال یا متوقع برے اعمال سے روکنا ہے یہ اس صورت میں ہوتا ہے جب واعظ کے دل میں تنگی ہو اور موعوظ کے دل اس کی باتیں قبول کرنے کے اہل نہ ہوں۔ وعظ حسن میں نرم کلامی اور موعوظ کو خیر کی رغبت دلانا شامل ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس کی ہدایت کی تھی

اذھبا الی فرعون انہ طغی فقولا لہ قولا لینا لعلہ یتذکر او یخشی　(سورہ طٰہٰ آیت نمبر ۴۳ و ۴۴)

ترجمہ: جاؤ۔ تم دونوں فرعون کے پاس کہ وہ سرکش ہو گیا ہے اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا شاید کہ وہ نصیحت قبول کرے یا ڈر جائے۔

جدال احسن :- جدال کا اصلی معنی صحیح رائے کے لئے دلائل پیش کرنا اور مخالف کی بات کی تردید کرنا ہے گویا یہ ایک طرح کی گفتگو ہے اور دلائل کا تبادلہ اور ان پر جرح و تنقید کرنا ہے۔ جدال کا معاملہ یہ ہے کہ وہ خصام اور مخاصمہ سے زیادہ وسیع ہے اس کے برخلاف مخاصمہ ایک طرح کا جدال ہی ہے کہ اس میں مخاطب کی بات اور دلائل کو رد کر دیا جاتا ہے۔ جدال احسن کی تعریف میں جرجانی کہتے ہیں "اپنے مدمقابل کے غلط نظریہ کو دلائل یا مشابہ دلائل سے رد کرنا یا مدمقابل کے کلام کو درست کرنے کی نیت سے بحث و مباحثہ کرنے کو جدل کہا جاتا ہے اور حقیقت خصومت اسی کو کہتے ہیں لیکن یہاں جدال سے مراد حجت بازی اور ایسی گفتگو ہے جو لڑائی جھگڑے کی نوبت ہی نہ آنے دے۔ لیکن جب جدال انتہا پسند طور سے ہو تو خصومت کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا کیوں کہ ایسے آدمی سے اچھائی کی امید بہت کم ہوتی ہے داعی کے لئے جب جدال ناگزیر ہو جائے تو بطریقہ احسن ہو جانا چاہیئے۔

موعظہ حسنہ کے سلسلہ میں مذکورہ توجیہ کے قریب قریب یہ بات بھی ہے کہ حسن جدال میں معروضی انداز کو اختیار کرنا چاہیئے اس کے بعد قبول کرنا چاہیئے اس میں وقت کی بچت ہے عزت نفس ہے اور یہی طریقہ کمال مروت کے مطابق بھی ہے۔ ان تمام حالات میں نرمی کا

ختیار کرنا چاہیئے۔ شدت پسندی اور سختی سے دور رہنا چاہیئے۔ طاہر بن عاشور (۹)
تعریف کے مطابق جدال احسن میں یہ بھی شامل ہے کہ دو ٹوک الفاظ مقابل کی بات
تردید کردی جائے۔ داعی جو بات اپنے مخالف کے سامنے رکھ رہا ہے وہ بہت
اضح اور فیصلہ کن ہو۔ مثلاً

وانا اوایاکم لعلی ھدی أو فی ضلال مبین (سبا ۴۲)

دوسری جگہ ارشاد ہے

وان جادلوک فقل اللہ اعلم بما تعملون۔ اللہ یحکم
بینکم یوم القیامۃ فیما کنتم فیہ تختلفون (الحج ۶۸-۶۹)

رجمہ: اور اگر وہ تم سے جھگڑیں تو کہہ دو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ کو خوب معلوم ہے
اللہ قیامت کے روز تمہارے درمیان ان سب باتوں کا فیصلہ کردے گا جن میں تم اختلاف
کرتے رہے ہو۔"

حکمت اور اس کے مفہوم کی گہرائی میں اُترنے۔ حکمت کے سابقہ معنی کی طرف اشارہ کرنے اور
عی کی صفات، فکری سلامتی، معتدل مزاجی، عصبیت اور ہٹ دھرمی سے کا تذکرہ کرنے سے قبل میں
س طرف اشارہ کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ داعی کی کیا صفات ہوں حکمت کی ضرورت کہاں ہوتی
ہے اس وقت تبلیغ حق کا مقصد یکسوئی کے ساتھ پورا ہوگا داعی کے اندر کون سی صفات ہونا ضروری
ہے۔ ان میں کچھ مندرجہ ذیل ہیں۔

تقوی:- تقوی کے مفہوم میں ہر قسم کے اوامر اور نواہی شامل ہیں۔ متقی کے اندر اہل ایمان
کی جملہ صفات ہونا ضروری ہے۔ اپنے لوازمات کے ساتھ تقوی کی دولت جب
اللہ تعالی اپنے کسی بندہ کو عطا کردیتا ہے تو اس کی بدولت دل روشن ہوجاتا ہے اور قوت ادراک
بڑھ جاتی ہے۔ تقوی کی صفت سے مزین آدمی اس صفت کی وجہ سے راہ حق کو پالیتا اور ان
وسائل و اچھے اسباب کی طرف اس کی رہنمائی ہوجاتی ہے جو حالات زمانہ اور اشخاص کے موافق
ہوتے ہیں انجام کار اہل تقوی کے لئے ہے۔

ومن یتق اللہ یجعل لہ امرہ یسرا (الطلاق: ۴)

رجمہ "اللہ تعالی کے اولیاء ہی متقی ہوتے ہیں۔"

اخلاص: اخلاص کا باب وسیع ہے نظریاتی اعتبار سے اس کی حقیقت معلوم ہے

لیکن حقیقت کے اعتبار سے بہت مشکل ہے جس شخص کو اس صفت کی حقیقت کا علم ہو جاتا وہ لوگوں کی نگاہوں اور ان اشیاء کی طرف رخ ہی نہیں کرتا اور نہ ان کی مرضیات کی پرواہ کرتا۔
اس وقت مجھے امام مجدد شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب ؒ کا یہ قول یاد آرہا ہے کہ بعض لوگ بظاہر دعوت الی اللہ کا کام کرتے ہیں لیکن درحقیقت وہ اپنے نفس کی دعوت دیتے ہیں۔ لوگوں میں سے زیادہ وہ ان صفات کے ضرورت مند علماء اور دعاۃ ہیں۔ قیامت کے دن سب سے پہلے اس خصلت کے فقدان کی وجہ سے جہنم بھڑکائی جائے گی۔ امام غزالی ؒ نے احیاء علوم الدین میں اس خفیہ خواہش سے آگاہ کیا ہے کیوں کہ اس کی وجہ سے آدمی شرک خفی کا ارتکاب کرنے لگتا ہے۔

" داعی جب دعوت کا بیڑا اٹھاتا ہے تو اپنے آپ کو علم و دین سے مزین پاتا ہے اور دوسروں کو نادانی اور جہالت کی وجہ سے ذلیل سمجھتا ہے بسا اوقات وہ اپنے دعوتی کام کا اظہار صرف اپنی برتری اور دوسروں کو ذلیل کرنے کی غرض سے کرتا ہے۔ اگرچہ اس کی یہ حرکتیں معمولی ہی کیوں نہ ہوں۔"

امام غزالی مزید لکھتے ہیں۔ " یہ بہت بڑی جائے لغزش، بڑی گمراہی اور شیطان کی طرف سے ایک دھوکہ ہے جس میں انسان کو مبتلا کر دیتا ہے۔ صرف وہ شخص اس سے محفوظ رہ سکتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نفس کے عیوب کی شناخت کی توفیق دے رکھی ہو اور اپنی نور ہدایت سے اس کی بصیرت کو وا کر دیتا ہے کیوں کہ دوسروں کے بارے میں فیصلہ کرنے سے نفس کو بہت لذت ملتی ہے۔

امام غزالی ؒ نے صرف اس وضاحت پر اکتفا نہیں کیا بلکہ معیار اخلاق کے بارے میں بھی لکھ ہے کہ اس میدان کے بھی کچھ معیار ہیں؟ داعی کے لئے ضروری ہے کہ ان معیارات کو آزمالے۔ اس کی آزمائش یہ ہے کہ وہ غیروں کی اصلاح اور ان کی طرف سے قبولیت سے زیادہ اپنے لوگوں کی اصلاح و دعوت کو پسند کرے۔ اگر وہ غیر کی دعوت پر قناعت کر لیتا ہے تو بہتر ہے اور اگر وہ دوسرے اہل علم و دعوت کو ناپسند کرتا ہے۔ تو گویا وہ صرف اپنے نفس کو دعوت دیتا ہے اور اپنے دعوتی کام کے واسطہ سے اپنے نفس کے رتبہ و مرتبہ کا اظہار کرتا ہے اس سلسلہ میں اس کو اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہیئے اور اپنے نفس کو ایسی برائی سے پاک کر لینا چاہیئے۔ (۱۰)

امام غزالی کا یہ قول (غیر کو دعوت دینے سے زیادہ پسندیدہ اپنے نفس کو دعوت دیتا ہے) میرے نزدیک محل نظر ہے۔ مندرجہ حدیث کی روشنی میں مزید امام غزالی کا قول محل نظر ہو جاتا ہے۔

فواللہ لان یہدی اللہ بک رجلا واحدا خیر لک من
ان یکون لک حمر النعم (۱۱)

اس سلسلہ میں مقابلہ خیر کی طرف ہونا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

ومن احسن قولا ممن دعا الی اللہ وعمل صالحا (فصلت ۳۳)

ترجمہ: اور اس شخص کی بات سے اچھی اور کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں۔"

غیر شرعی مقابلہ میں اخلاص اور نیت کی درستگی کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔

(سلسلہ صـ ۳۲ سے آگے)

موصوف نے سو کتابوں کے برابر مواد لکھ کر اردو میں شائع کیا ہے اک کا یہ ماہ کے باذوق حضرات اور طالبعلموں کیلئے زبردست اہمیت کا حامل ہے مشاعرے میں مرادآباد کے ایس پی شری دیویندر شیکھر اور مظفر نگر کے ایس پی شری اوم کار سنگھ نے بھی شرکت کی۔ اس موقعہ پر پروفیسر عنوان چشتی کو ایوارڈ، محسن اردو کا خطاب، شال اور نقد رقمی ایوارڈ پیش کیا گیا۔ مشاعرے میں صدر کے علاوہ وصی احمد وصی، ڈاکٹر تنویر چشتی، ریاض ساغر اور ریحانہ شاہین وغیرہ نے اپنا اردو کلام پیش کیا اور ہندی کے نامور شعراء مجھو بنو جی، ڈاکٹر راجیندر راجن، ڈاکٹر بالا بھی سا گر، دلیویندر شیکھر اور راکیش شرما (مرادنگر) نے اپنا ہندی کلام سنایا اور خوب داد حاصل کی۔ پروفیسر عنوان چشتی (رباعی) یہ سحر یہ سایہ یہ ثمر کس کا ہے

دامان زمین چاند نگر کس کا ہے

وصی احمد وصی / نئے مکاں میں یہ احساس کھا جاتا ہے
پرانے گھر سے تعلق بنا کے رکھا تھا
کاشی کے تقدس کی قسم یہ تو بتا

تنویر چشتی / کاش یہ مقدور ہوتا تجربے کے واسطے
کعبہ جسے کہتے ہیں وہ گھر کس کا ہے
میں تری زلفیں تو کیا خوشبو کو چھو کر دیکھتا

ریحانہ شاہین　سبھی کے ہاتھ کے پتھر بکھر گئے لیکن
جو پھول کر گیا زخمی ترے مکان سے تھا

آخر میں صدر مشاعرہ عنوان چشتی نے ریاض ساغر اور دیگر متعلقہ حضرات کا شکریہ ادا کرتے ہوئے انکسارا (اپنی گراں قدر علمی خدمات کے بارے میں) میر کا یہ شعر پڑھا

ہم سے کیا ہو سکا محبت میں
اس نے تو خیر بے وفائی کی

مادھو گوڈبولے
ترجمہ: شارق علوی
دوسری قسط

اجودھیا کا المیہ



گذشتہ کڑیوں اور احباب سوالات جو اجودھیا مسئلہ سے متعلق ہیں ان کی شروعات بی جے پی کے قرطاس ابیض کے جاری ہونے سے ہوتی ہے جس میں حکومت کے جاری کردہ قرطاس ابیض کو گمراہ کن اور غلط بیانی سے تعبیر کیا گیا تھا جبکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ خود اغلاط کا پلندہ تھا اس میں اس روح کو دوبارہ زندہ کرنے کی بات تھی جو سومناتھ مندر کی تعمیر کے بعد معطل ہو گئی تھی تاریخی پس منظر کو اس پیرائے میں پیش کیا گیا تھا جو بی جے پی کی تسلیم شدہ پالیسی سے مطابقت رکھتی ہے۔

اس قرطاس ابیض میں بی جے پی نے کہیں بھی اس بات کا اشارہ نہیں دیا اور کھلے دماغ سے اس بات کی وضاحت کی کہ مندر کہاں تعمیر ہوگا۔ اس میں یہ معیار رکھا گیا کہ مندر کی تعمیر شروع ہونے اور اس کے مکمل ہونے کے درمیانی وقفے کا استعمال جو تقریباً دو یا ڈھائی سال ہوگا۔ بابری مسجد کے ڈھانچے کے بارے میں طے کرنے میں صرف ہوگا جس میں باہمی مفاہمت عدالتی فیصلہ یا قانونی رائے شامل ہے لیکن اس کے ساتھ اس میں اس کا بھی ذکر ہے کہ مذہبی عقیدت کے مسائل میں قانونی دخل اندازی کی گنجائش نہیں ہے۔ اس میں اس کا بھی ذکر نہیں کیا گیا اتر پردیش حکومت نے کلیان سنگھ کی سربراہی میں الہ آباد ہائی کورٹ لکھنو بنچ کے سامنے بار بار آراضی کے سرکاری تحویل میں لینے کے مقصد کی متضاد دلیلیں دیں تاکہ اہم مقصد سامنے نہ آسکے جبکہ اکتوبر، نومبر ۱۹۹۱ء میں بڑی تعداد میں یاتریوں کے آنے والوں کا ترک دیکر فوری طور پر زمین کو تحویل میں لے گیا اس پر آنے والوں کی سہولیات کے سلسلے میں تعمیری کام مارچ ۱۹۹۲ء میں شروع ہوا۔ آراضی پر قبضہ لینے کے بعد ریاستی حکومت نے اسے سنتوں اور مہنتوں کے حوالے کر دیا اور سرکاری مشینری کا پورا استعمال کرتے ہوئے انھیں پرانے مندر اور دیگر قدیمی ڈھانچوں کو مسمار کرنے کی کھلی چھوٹ دیدی۔ حکومت نے اس غیر قانونی کارروائی سے عدالت کے سامنے اپنے کو بری الذمہ ٹھہرایا اور اس بات سے لاعلمی ظاہر کی کہ کن لوگوں نے سرکاری تحویل میں لی گئی اراضی

پر توڑ پھوڑ کی ہے بی جے پی کے لیئے یہ کیوں ضروری تھا کہ وہ جبکہ مندر کی تعمیر کے لیئے پابند تھے وہ اس طرح کا رویہ اختیار کریں ؟ کیوں کر بی جے پی یا اس کی سرکار نے ہائی کورٹ، پارلیمینٹری کمیٹی یا سپریم کورٹ کے نامزد کمیشن کے سامنے تعمیر کا پلان پیش نہیں کیا ؟ کیا لوکل باڈیز کے کسی بھی قانون اور ضابطے کے تحت بغیر نقشہ / پلان منظور کرائے کوئی عمارت تعمیر کی جاسکتی ہے۔

اگر مسلمانوں کا دعویٰ کمزور تھا جیسا کہ بی جے پی نے اپنے قرطاس ابیض میں لکھا ہے تو پھر اس کا فائدہ اس نے عدالت میں معاملہ سپرد کر کے کیوں نہیں اٹھایا ؟ جبکہ ایک مخصوص مقام رام کی جائے پیدائش ہے یا نہیں کے بارے میں کسی عدالتی فیصلے کی گنجائش نہیں ہے لیکن کیا اس جگہ پہلے کوئی مندر تھا اس بات کا فیصلہ عدالت کے دائرہ اختیار میں آتا ہے لیکن بی جے پی نے ایک منصوبہ تیار کیا تھا کہ وہ اتر پردیش قانون ساز اسمبلی سے ایک ایسا قانون منظور کرائے جس کے تحت ایودھیا کی تمام متعلقہ اراضی اس کے قبضہ میں آجائے اور وہ مسجد کو اس کی جگہ سے منتقل کر سکے۔

جہاں تک متنازعہ ڈھانچے کی حفاظت کا سوال ہے۔ قرطاس ابیض میں اس نقطہ پر خاموشی اختیار کی گئی ہے کہ اتر پردیش کی حکومت نے وقتاً فوقتاً قومی یکجہتی کونسل حکومت ہند اور سپریم کورٹ کو جو یقین دہانی کرائی تھی اس کا کیا ہوا۔ ۶ ڈسمبر سے قبل حکومت ہند نے صوبائی حکومت کے ساتھ مشترکہ حفاظتی انتظامات کی جو پیشکش کی تھی اس کو ریاستی حکومت نے کیوں نہیں تسلیم کیا۔ اس دستاویز میں اس سوال کا جواب بھی نہیں ملتا کہ کیا کلیان سنگھ نے کارسیوکوں کے عمارت مسمار کرنے کی کارروائی شروع ہوتے ہی استعفیٰ پیش کیا تھا یا بی جے پی لیڈر شپ نے ان کو اس وقت تک وزیر اعلیٰ بنے رہنے کا مشورہ دیا تھا جب تک متنازعہ ڈھانچہ پوری طرح مسمار نہ ہو جائے۔

اس دستاویز میں مرکزی حکومت کی طرف سے ان رکاوٹوں کا ذکر تو ہے کہ وہ کس طرح مندر تعمیر کے معاملہ کو کارسیوا کی شروعات سے الگ کرنا چاہتی تھی لیکن بی جے پی کی نیت صاف نہیں تھی اور وہ نیز اتر پردیش حکومت اس بات سے برابر اجتناب کر رہی تھی کہ مندر کا نقشہ پیش کریں جس میں اس بات کی وضاحت ہو کہ متنازعہ ڈھانچہ پر مندر کی تعمیر کا کوئی اثر نہیں پڑے گا اور اس میں کوئی دخل اندازی نہیں ہوگی حالانکہ وشوا ہندو پریشد مندر کے جس نقشے کی تشہیر کر رہا تھا اس میں صاف طور پر متبرک مقام وہی رکھا گیا تھا جہاں رام لیلا کی مورتی پہلے رکھی جا چکی تھی۔

اس دستاویز میں قانون اور ضابطے کے وہ حوالے بھی نہیں دیئے گئے ہیں جن کی رو سے لکھنؤ

میں بیٹھے ہوئے اترپردیش کے وزیراعلیٰ اجودھیا میں تعینات افسران پر غنڈہ گردی اور
امن روکنے کے لیے کتنا "فورس" استعمال کریں کی وضاحت کی گئی ہو قانون کی کس دفعہ کے
تحت وزیراعلیٰ نے اجودھیا میں تعینات پولیس عملے پہ یہ پابندی لگا رکھی کہ وہ قانون
ادھیوں کو خاموش تماشائی کی طرح اڑتے ہوئے دیکھتے رہیں، موقع پہ موجود بی جے پی کے وہ
لیڈران جو ڈسپلن اور ضابطوں کے پابند ہونے کا راگ الاپتے رہتے ہیں انھوں نے ہندوستان
کے سیکولرزم کی آبروریزی اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتے ہوئے دیکھا اور اسے روک نہیں
سکے۔ کیا وہ پارٹی جس نے سپریم کورٹ سے کئے گئے وعدوں کی خلاف ورزی کی ہو، عدلیہ کے
احکامات کو بالائے طاق رکھا ہو، اجودھیا میں جو کچھ ہوا اس کے لیئے عدلیہ کو ہی مورد الزام
ٹھہرا سکتی ہے؟ کیا الٰہ آباد ہائی کورٹ کا فیصلہ کہ اجودھیا میں جو زمین سرکاری تحویل میں لی
گئی ہے وہ غیر قانونی ہے۔ اگر ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء سے پہلے ہو گیا ہوتا تو حالات پر کچھ دوسرا اثر
پڑتا؟ یا یہ کہ بی جے پی حکومت چاہتی تھی کہ مرکزی حکومت الٰہ آباد ہائی کورٹ پر اثر انداز
ہو کر فیصلہ اس کے حق میں کرا دے۔ کیا بی جے پی نے ڈرانے دھمکانے کا ہر ممکن حربہ استعمال
نہیں کیا کہ اگر ریاست میں صدر راج نافذ کیا جاتا ہے تو وہ متنازعہ ڈھانچے کی حفاظت کے
ذمہ دار نہیں ہوں گے۔

کیا یہ سمجھداری اور ذمہ داری کا وہ پیمانہ تھا جس کے تحت وزیراعلیٰ سپریم کورٹ کے سامنے
یہ کہا کہ کسی بھی طاقت کا استعمال ان لوگوں کے خلاف نہیں کیا جا سکا جنھوں نے قانون اپنے ہاتھوں
میں لے لیا تھا؟ ایک جمہوری نظام میں یہ کس طرح کا طرز حکومت تھا؟ وہ سیاسی پارٹی جس کا
قانون کے نفاذ پر یقین ہی نہ ہو اور جو عدلیہ کے احکامات پر عمل ہی نہ کرے وہ مقدمہ کے فیصلہ
میں تاخیر کی بات کیسے کر سکتی ہے؟ یہ کہنا کتنا افسوسناک ہے کہ "ڈھانچہ" منہدم ہوا عدالت
کے حکم کے باوجود عدالت ہی کی وجہ سے؟ مرکزی حکومت کی طرح عدالتی فیصلہ میں تاخیر کی ذمہ دار
ہو سکتی ہے؟ اس کے علاوہ بہت سے مقدمات میں تو مرکزی حکومت الٰہ آباد ہائی کورٹ میں
زیر غور معاملات میں ملوث بھی نہیں تھی۔

کس طرح ایک قومی سطح کی سیاسی پارٹی بی جے پی جو مرکزی حکومت پر نظریں جمائے ہے کھلے عام
متنازعہ ڈھانچے کو مسمار کئے جانے کو ایک "اتفاقیہ بات" بتاتی ہے جبکہ اس نے ہر طرح سے اس کی پشت
پناہی کی اور ایسے حالات پیدا کیئے اور ایسی فضا ہموار کی اس کا منہدم ہونا "یقینی" ہو گیا۔

بی جے پی کے جاری کئے قرطاس ابیض میں اُٹھائے گئے نکتوں پر لمبا عتراضات کئے جا سکتے ہیں کیونکہ شاطرانہ فکر کے ساتھ سیاسی داؤں پیچ پیش نظر رکھتے ہوئے تیار کی گئی یہ دستاویز ہے لیکن حکومت ہند کی طرف سے جو قرطاس ابیض جاری کیا گیا ہے وہ سب کچھ ہے مگر "سفید" نہیں ہے یہ بھی بڑی چالاکی سے تیار کی گئی دستاویز ہے جس میں بہت سے اہم سوالوں کے جواب ندارد ہیں۔

حکومت ہند کا قرطاس ابیض وزیر اعظم کے دفتر میں تیار کیا گیا اور وزارت داخلہ سے اس پر رائے مانگی گئی۔ مجھے اس میں درج کچھ باتوں پر اعتراض تھا کچھ تو وزیر اعظم کے مشیر خاص نرلش چندرا سے گفتگو کے بعد رفع ہو گئے جس میں سکریٹری محکمہ قانون پی سی راؤ بھی ہم لوگوں کے ساتھ بات چیت میں موجود تھے لیکن کچھ براہ راست وزیر اعظم سے نرلش چندرا کی موجودگی میں طئے پائے۔ وزیر اعظم نے جب آخری مسودہ ملاحظہ کر لیا تو وہ وزارت داخلہ کو چھپوا کر پارلیمنٹ میں پیش کرنے کے لئے ان کے دفتر سے موصول ہوا۔ مسودہ ابھی پریس میں ہی زیر طبع تھا کہ ایک دن وزیر اعظم نے مجھ کو فون کیا کہ ان پر ہر طرف سے یہ اعتراض کیا جا رہا ہے کہ جب متنازعہ ڈھانچہ مسمار کیا جا رہا تھا تو وہ سو رہے تھے اس بات کی وضاحت قرطاس ابیض میں ایک دو جملوں میں کر کے غلط فہمی دُور کر دی جائے۔

اس سے قبل وزیر برائے انسانی وسائل کی ترقی ارجن سنگھ نے قرطاس ابیض پر کچھ پریشان کن اعتراضات کئے تھے اور ان کا کہنا تھا کہ سارے حقائق عوام کے سامنے اس طرح رکھے جائیں کہ وہ خود صورتحال کا اندازہ لگا سکیں ارجن سنگھ کا کہنا تھا کہ قرطاس ابیض میں تاریخ اور جغرافیہ کا زیادہ ذکر ہے اور پانچ اہم نکات پر یہ بالکل کورا ہے۔

۱۔ نیشنل انٹیگریشن کونسل کی میٹنگ اور ۶ر ڈسمبر ۱۹۹۲ء کے درمیان حکومت نے کیا قدم اٹھائے
۲۔ ۲۷ر نومبر ۱۹۹۲ء کو سی سی پی اے کی میٹنگ میں کیا ہوا اور اس میں لیے گئے فیصلوں کے بارے میں حکومت نے مرکزی داخلہ سکریٹری مادھو گوڈبولے کو کیا ہدایات جاری کیں۔
۳۔ وسنت ساٹھے اور بالا صاحب دیورس کے درمیان ۲۸ر نومبر کو جو ملاقات ہوتی اس میں کیا گفتگو ہوئی۔
۴۔ وزیر اعظم نے سادھوؤں اور کلیان سنگھ سے جو متعدد ملاقاتیں کیں ان سے کیا نتائج اخذ کیے گئے۔

۵۔ ۶ ر ڈسمبر ۱۹۹۲ء کو دوپہر ۱۲ بجے سے شام ۶ بجے تک وزیر اعظم کیا کرتے رہے ؟
سرکاری قرطاس ابیض میں ان ہنگامی تیاریوں کا کوئی ذکر نہیں ہے جو حکومت نے جولائی ۱۹۹۲ء یا ڈسمبر ۱۹۹۲ء میں فوری کارروائی کے لیے مرتب کیئے تھے اس بات کا بھی ذکر نہیں ہے کہ ان پلان کو ان دو موقعوں پر کیوں نہیں نافذ کیا گیا۔

دستورِ ہند کی دفعہ ۳۵۵ اور ۳۵۶ کے استعمال سے کیوں احتراز کیا گیا جبکہ ایسا کرنا پارلیمنٹ میں وزیر اعظم کے دیئے گئے بیان کے عین مطابق ہوتا اس کے علاوہ دستاویز وزیر اعظم کی مصالحانہ کوششوں اور مختلف لوگوں سے ان کی سپریم کورٹ میں جو مختلف ذرائع اس تنازعے کو حل کرنے کے لیے پیش کیئے گئے تھے ان کا بھی ذکر اس میں نہیں، یہ اس سوال کا جواب بھی دینے سے قاصر رہے کہ کیا جو صورت پیدا ہو گئی تھی اس میں ڈھانچہ کا انہدام ناگزیر تھا یا یہ کہ اس کی حفاظت کی جا سکتی تھی۔ ذاتی اور سیاسی فائدہ کے مدنظر بہت سے اہم سوالات اس دستاویزی میں زیر بحث نہیں آئے۔

اجودھیا معاملہ میں شہریوں کے ٹریبونل جو سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے تین ملازمت سے سبکدوش ججوں جسٹس او چناپا ریڈی، جسٹس ڈی اے ڈیسائی اور جسٹس ڈی ایس تیوتیا پر مشتمل تھا، ستمبر ۱۹۹۳ء میں اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ

"مرکزی حکومت برابر بے حس رہی اور لگاتار "انتظار" دیکھو" اور "امید" کے مفروضوں میں اپنی بے عملی کا ثبوت دیتی رہی ہے اور یہی سوچتی رہی کہ کچھ نہیں ہوگا جبکہ اجودھیا میں لاکھوں کی تعداد میں لوگ جمع ہو چکے تھے"

کمیشن نے آگے لکھا ہے کہ:

"حکومت ہند کی بے عملی اسکے صحیح رخ میں جانے کی ہچک، غیر یقینی پالیسی اور عدم اعتماد کی غمازی کرتی ہے جہاں فیصلہ اور عمل کی فوری ضرورت تھی وہاں اسکا فقدان تھا حکومت ہند کو دستور کے مطابق بے پناہ اختیارات حاصل تھے کہ وہ اس المیہ کو روک سکتی مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ مرکزی حکومت کسی بھی کارروائی سے گریز کر رہی تھی اور وہ اس مجرمانہ غفلت اور دانستہ بے عملی کی ذمہ دار ہے حکومت ہند نے اپنے دستوری فرائض سے کوتاہی کر کے اقلیتی فرقے اور اسکی عبادتگاہ کی حفاظت کر کے قانون کی بے حرمتی کی ہے"

(بقیہ آئندہ شمارہ میں)

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

محبت فاتح عالم



محبت کو اقبال نے فاتح عالم کہا ہے اس سے ہمارا ذہن ان فاتحین عالم اور کشور کشاؤں کی طرف جاتا ہے جنھوں نے اپنے زور بازو دیا نوک شمشیر سے ملک فتح کئے اور ہزاروں لاکھوں انسانوں کے جسم پر (اکثر ان کی مرضی کے خلاف) حکومت کی بہت سے فلسفیوں اور دانشوروں نے دماغوں کو تسخیر کیا، زبانوں کو گنگ کر دیا۔ دلائل کے لشکروں کو شکست فاش دی اور اپنے دماغی تفوق اور عملی فتح کا سکہ بٹھا دیا۔ بہت سے دولت مندوں اور سرمایہ داروں نے بہت سے لوگوں کی زبانوں پر سونے کی مہر اور اشرفی کا ٹھپہ لگا دیا اور وہ انھیں کا گن گانے لگے۔ ان کے دماغ ان سے باغی، ان کے دل ان سے بیزار لیکن ان کی زبانیں ان کی مدح و توصیف میں سرشار تھیں۔

لیکن محبت کی فتح ان سب فتوحات سے نرالی ہے ایسی نرالی کہ اس کو فتح کہتے ہوئے بھی محبت سے معذرت کرنی پڑتی ہے اور اس میں اس کی حق تلفی یا ناشناسی کی بو آتی ہے اس لئے کہ محبت نے اور اہل محبت نے اکثر کھو کھو کر پایا ہے اور ہار ہار کر جیتا ہے اس کو کسی ہم جنس کی طرف، کسی اشرف المخلوقات انسان کی طرف کسی صاحب ضمیر ہستی کی طرف شکست کی نسبت کرنے سے بھی تکلیف محسوس ہوتی ہے اور اپنی انسانیت دوستی اپنے لطیف جذبات اور اپنے نازک احساسات سے شرم آنے لگتی ہے بادشاہوں، فاتحین عالم اور مادی طاقت رکھنے والوں کا اس اصول پر عقیدہ اور عمل تھا کہ "نہ رہے بانس نہ بجے بانسری" اور اہل محبت کا اس اصول پر کہ بانس بھی رہے اور بانسری بھی صرف اس کا نغمہ بدل جائے۔

اس سے پہلے نفرت و عداوت کے گیت نکلتے تھے۔ بادشاہوں اور طاقتوروں کا اصول یہ تھا کہ

دشمن کو دوست نہیں بلکہ عاشق بنالیا جائے اور شاہوں کا اصول یہ تھا کہ دشمن کو فنا کردیا جائے۔ عاشق بنالیا جائے والے اصول کا کرشمہ یہ تھا کہ جو خون کے پیاسے ہو کر آتے تھے وہ ان کا کلمہ پڑھنے اور ان کا دم بھرنے لگتے تھے اور ساری عمر ان کی چوکھٹ پر گزار دیتے تھے۔

اس اصول پر سب سے زیادہ خدا کے پیغمبروں مذہبی پیشواؤں اور سچی روحانیت اور بے لوث محبت کے علمبرداروں نے عمل کیا۔

مذہب اخلاق روحانیت اور فقر و تصوف کی تاریخ ان مثالوں سے بھری ہوئی ہے کہ آدمی جان لینے آیا اور ان کے دربار میں جان و دل دونوں کھو بیٹھا' میں نے کہا غلط کہا کہ اس نے کھویا نہیں! بلکہ سب کچھ پا لیا۔ اپنے آپ کو بھی پالیا۔ اپنی نامعلوم صلاحیتوں کو حسن و احسان کو اُنس و محبت کو بہر انسان کے اندر محبت کرنے' قدر کرنے اور اثر لینے کی جو صلاحیت ہے اس نے نہ صرف اس کو دریافت کرلیا بلکہ اس کا مزہ چکھ لیا اور پھر ساری عمر اس کا مزہ لیتا رہا۔ وہ اپنے کو نہیں پہچانتا تھا۔ جان گیا'، کولمبس کو نئی دنیا دریافت کرنے سے اتنی خوشی نہ ہوئی ہوگی جتنی اس کو اپنی نئی دنیا دریافت کر لینے سے خوشی ہوئی۔ اقبال ہی کی زبان سے سنئے

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن
من کی دنیا' تن کی دُنیا سوز و مستی جذب و شوق
تن کی دنیا سُود و سودا مکر و فن

کتنے آدمی تھے جن کے دل و دماغ میں شک و انکار کی گرہیں پڑی ہوئی ہیں فلسفہ و منطق علم و استدلال جتنا ان گرہوں کو سلجھانا چاہتا تھا اتنی ہی اور نئی نئی گرہیں پڑتی جاتی تھیں ان اہلِ دل اور اہلِ محبت کی ایک نگاہ دلنواز اور آنکھوں کی ایک چمک اور لبوں کی ایک مسکراہٹ نے برسوں کی دماغ کی گرہیں اور دل کی سلوٹیں دور کردیں۔ حسرت نے اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے۔

دِلوں کو فکر دو عالم سے کردیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

اور اقبال نے کہا ہے۔

وہ عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذت آشنائی

یہاں پر ہندوستان کے ایک عظیم روحانی پیشوا اور صوفی حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کا ایک واقعہ بیان کروں گا اس سے اندازہ ہوگا کہ محبت و مروت میں شرافت و اخلاق میں اور عفو و درگزر میں کیا جادو، کیسی موہنی اور فتح و تسخیر کی کیسی طاقت ہے۔ خواجہ صاحبؒ کے یہاں دستور تھا کہ جو لوگ ملنے آتے تھے وہ اکثر کوئی بے تکلف نذر اور تحفے لاتے تھے اور یوں بھی خواجہ صاحبؒ اکثر روزہ سے ہوتے تھے اور اُن کو کھانے پینے سے زیادہ دلچسپی نہ تھی، یہ سب غریبوں اور مہمانوں کے کام آتا۔ ایک مرتبہ ایک بہت پڑھے لکھے آدمی فلسفی قسم کے امتحان کے طور پر آنے والوں کے مجمع میں شامل ہو گئے۔ انہوں نے سوچا کہ بہت سے آدمی نذر و نیاز و تحفہ لاتے ہیں، خواجہ صاحب کو کیا پتہ چلے گا کہ کون کیا لایا۔ انہوں نے راستے سے اُٹھا کر مٹی کی ایک پڑیا باندھ لی اور سب لوگوں کے تحفہ کے ساتھ مٹی کی وہ پڑیا بھی رکھ دی خواجہ صاحبؒ کے یہاں دستور تھا کہ جب تحفے جمع ہو جاتے تو آپ اپنے خادم خاص خواجہ اقبال سے فرماتے کہ اُس کو اُٹھا لو وہ لے جا کر اس کو مستحقین میں تقسیم کر دیتے۔ اس دن بھی ایسا ہی ہوا خواجہ صاحبؒ نے اشارہ کیا اور خواجہ اقبال سب تحفوں کو سمیٹ کر لے جانے لگے۔ جب اُس پڑیا کی باری آئی تو آپؒ نے فرمایا کہ اس پڑیا کو رہنے دو "یہ میری آنکھوں کا سُرمہ ہے" خواجہ صاحب کو خیال ہوا کہ اگر راز فاش ہو گیا تو اُن عالم صاحب کی خیر نہیں۔ بزرگانِ دین کسی کی توہین اور ذلت برداشت نہیں کر سکتے اور دل توڑنا اُن کے مذہب میں روا نہیں وہ فاضل آپؒ کی یہ ادا دیکھ کر اس شمشیرِ محبت کے گھائل اور آپؒ کی محبت و عظمت کے قائل ہو گئے۔ وہیں قدم پکڑ لیئے اور پھر عمر بھر اُنہیں کا دم بھرتے رہے۔

انہیں حضرت محبوب الٰہی کا مقولہ ہے کہ عداوت کا جواب عداوت، نفرت کا جواب نفرت اور مخالفت کا جواب مخالفت نہیں، عداوت کا جواب دوستی اور خیر خواہی، نفرت کا محبت اور بدی کا نیکی ہے۔ فرماتے تھے کہ اگر کانٹے کے ساتھ کانٹا رکھ دیا جائے تو کانٹے ہی کانٹے ہو جائیں گے اور کانٹوں کا ڈھیر لگ جائے گا اس سے کچھ فائدہ نہیں۔ یہ بھی فرمایا کہ لوگ کہتے ہیں کہ سیدھے کے ساتھ سیدھا ہے اور ٹیڑھے کے ساتھ ٹیڑھا۔ اور میں کہتا ہوں کہ سیدھے کے ساتھ بھی سیدھا ہے اور ٹیڑھے کے ساتھ بھی سیدھا، چنانچہ ان کی ساری عمر اسی پر عمل رہا۔

ایک شخص خواہ مخواہ مخالف و دشمن تھا اور موقع بے موقع بُرا بھلا کہتا رہتا تھا جب اُس

کا انتقال ہوا تو آپ اس کے یہاں تعزیت کو گئے دو رکعت نماز پڑھی اور اس کے لئے یہ دعا کی اور کہا کہ " خدایا میں نے اس کو معاف کیا تو بھی اس کو معاف کر "
انھیں کے سلسلے کے ایک بزرگ شاہ میناؒ صاحب جن کی عمر لکھنؤ میں گزری، اکثر فارسی کے دو شعر پڑھا کرتے تھے ۔

ہر کہ مارا یار بنود ایزد اور ایار باد
ہر کہ مارا رنج دادہ راحتش بسیار داد

ہر کہ او خارے نہد در راہ ما از دشمنی
ہر گل کز باغ عمرش بشگفد بے خار باد

ان اشعار کا مفہوم یہ ہے کہ (خدایا جو میرا دوست نہ ہو تو اس کا دوست رہنا، خدایا جس نے مجھے تکلیف پہنچائی۔ اس کو بہت راحت عطا فرما، جس نے میرے راستے میں کانٹے بچھائے خدا کرے اس کے گلشن حیات میں جو پھول کھلیں بے خار رہیں) اور یہ درحقیقت ان کے مذہب کی تعلیم اور اس کا پیغمبر کا عمل تھا جس پر ان کا ایمان تھا
قرآن شریف میں ہے کہ " نیکی اور بدی برابر نہیں تم بدی کا جواب بہت زیادہ نیکی سے دو اس کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ جس شخص کے اور تمہارے درمیان دشمنی ہے وہ تمہا جگری دوست بن جائے گا ۔"

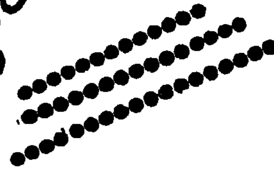
ہندوستان کی تاریخ میں ایسے واقعات کی کمی نہیں قانون قدرت ہمیشہ سے ایک ہے خدا نے جن چیزوں میں جو اثر پیدا کر دیا ہے ہزاروں لاکھوں برس سے وہ اثر چلا آ رہا ہے محبت میں اب بھی وہی تاثیر ہے جو کام وہ کر سکتی ہے کوئی اور طاقت نہیں کر سکتی تجربہ شرط ہے۔ تھوڑی سی ہمت، تھوڑے سے صبر اور یقین محکم کی ضرورت ہے
آئیے علامہ اقبال کی آواز میں ایک بار پھر پڑھیں

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

تخلیقات کا طلبیدہ ہونا ضروری نہیں ، جواب طلب امور کیلئے جوابی لفافہ آنا ضروری

محمد ایوب واقف (قسط دوم)

ہماری زبان اردو ہمارا رسم الخط



راہی معصوم رضا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بمبئی گئے۔ قسمت نے یاوری کی بمبئی کی فلم نگری میں قدم جم گئے دل میں کدورت کا آتش فشاں تو موجزن تھا ہی موقع ملا پھٹ گیا انھوں نے فرمان جاری کر دیا کہ "اردو آئندہ پچاس برسوں کی مہمان ہے اس کے بعد وہ باقی نہیں رہے گی لہذا اردو والوں کو چاہیئے کہ جتنی جلد ممکن ہو وہ اردو کے سرمایے کو دیو ناگری لپی میں منتقل کر دیں۔" میں نے راہی صاحب کے گھر میں ہی ان سے کہا کہ "راہی صاحب سر دست تو ہم خدا سے یہی دعا کریں گے کہ آپ اگلے پچاس سال تک ضرور زندہ رہیں تاکہ آپ کی سمجھ میں یہ بات آجائے کہ اردو کے تعلق سے آپ کا فرمان کتنا لغو اور مکر و فریب کا حامل ہے لیکن افسوس کہ خدا نے ہماری دعا قبول نہیں کی اور راہی معصوم رضا صاحب دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ اردو جب تقسیم کے خلفشار سے نکل کر بیسویں صدی کی آخری دہائی میں داخل ہو چکی ہے تو انشاء اللہ آگے بھی اپنا سفر جاری رکھے گی۔ بس ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو والے اردو زبان اور اس کے رسم الخط کے تعلق سے جاں نثاری اور فداکاری کا جذبہ پیدا کر لیں۔

عصمت چغتائی نے بھی اپنے انٹرویو میں اردو رسم الخط کے تعلق سے منفی رائے کا اظہار کیا جب ان کے انٹرویو کو شائع کیا گیا تو سارے ملک میں ایک کہرام مچ گیا۔ احتجاجی خطوط کا سلسلہ رکنے کا نام نہیں لیتا تھا حالات دگرگوں ہوئے تو میں عصمت چغتائی صاحبہ

کے یہاں پھر حاضر ہوا اور قارئین " قومی آواز " جس بے چینی اور اضطراب کا شکار تھے ا
سے انھیں آگاہ کیا۔ محترمہ مزاج کے اعتبار سے بڑی ضدی خاتون تھیں سمجھوتہ کرنا تو
جانتی ہی نہیں تھیں۔ لیکن اس روز نہ جانے کیوں سچ کو انھوں نے بڑی بے باکی سے
اگل دیا۔ انھوں نے کہا کہ " میں جو چیزیں لکھتی ہوں اس کے پس پشت میری یہ
خواہش ہوتی ہے کہ لاکھوں لوگ اسے پڑھیں۔ اردو پڑھنے والے لوگ اب چوں کہ
زیادہ نہیں رہ گئے ہیں اس لیئے میں چاہتی ہوں کہ اردو دیوناگری لپی میں لکھی جائے"
عصمت چغتائی کے انداز فکر سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اردو کے رسم الخط سے
انھیں بیر ہے وہ خود غرضی اور ذاتی مفاد کا پیدا کردہ ہے اردو زبان نے عصمت چغتائی
کو روٹی بھی دی اور عالمی شہرت بھی۔ ان پر یہ لازم تھا کہ وہ اردو کی ایک ادیبہ کی حیثیت
سے اس کے فروغ اور نشر و اشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتیں اور ہوا کا رخ جو اردو
کے خلاف کیا جا رہا تھا اسے موافق سمت میں لائیں لیکن انھوں نے ذاتی غرض کے پیش نظر
اپنے آپ کو دشمنانِ اردو کی صف میں شامل کر لیا۔ اس ملاقات میں اردو زبان کے
تعلق سے محترمہ عصمت چغتائی کی زبان سے کچھ ایسی سچائیاں بھی اجاگر ہوئیں جنھیں ہم اردو
زبان کی خوبی کا نام دے سکتے ہیں۔ اردو کے سلسلے میں ان کے ہاتھ کی تحریر میری ڈائری
میں ابھی بھی محفوظ ہے۔ وہ تحریر یوں ہے

" اردو اسکرپٹ ہر اسکول اور کالج میں سکھائی جانا چاہیئے یہ ہندی
کے مقابلے میں بالکل SHORT HAND کی رفتار سے لکھی جا سکتی ہے انگریزی
کی SHORT HAND بہت الجھی ہوتی ہے مگر اردو ہندی سے دوگنی تیزی سے
لکھی جا سکتی ہے، کم جگہ میں زیادہ لکھا جا سکتا ہے زیادہ آسانی سے بچوں کو سکھائی
جا سکتی ہے ب ج د ر س ص ط ع ف ق ک ل م ن و ہ ی ے،
ان حروف کو سیکھنے کے بعد اردو بہت آسانی سے سیکھی جا سکتی ہے وہ ہندی
جو آزادی کے بعد سنسکرت کے الفاظ سے کیلوں کی طرح ٹھونک کر تعمیر کی گئی
ہے وہ سرکاری ہو مگر عوام کی زبان ہرگز نہیں۔ باوجود کوشش کے بولنے
میں دقت ہوتی ہے بے حد SPEED BREAKERS ٹھونس دیئے گئے ہیں
جن سنسکرت کے الفاظ کو برسوں میں گھس گھسا کر چکنا اور سہل بنایا تھا پھر

ان گرڈھ کر دیا۔ مگر شکر ہے کوئی بولتا نہیں ان الفاظ کو۔"

اُردو زبان کے تعلق سے اپنے ماضی کے تجربات کو بیان کرتے ہوئے محترمہ عصمت چغتائی نے میری ڈائری میں مزید لکھا کہ :

" میری انگریزی کمزور تھی اور لکھنے کی رفتار بہت دھیمی۔ جب ازا بیلا تھوبرن کالج میں پروفیسروں نے لکچر دینے شروع کیئے تو مجھ سے نوٹس نہیں لیئے جاتے تھے۔ اس لیئے میں انگریزی لکچر اُردو اسکرپٹ میں لکھ لیتی تھی۔ اور بعد میں ڈکشنری کی مدد سے انگریزی میں منتقل کر لیتی تھی۔ اس طرح میں لکچر کا ایک ایک لفظ لکھ سکتی تھی اور میرے نوٹ بعض وقت پروفیسر کے کام آجاتے تھے۔ کیونکہ وہ جو بولتی تھیں لکھتی نہیں تھیں۔"

عصمت چغتائی کے ان تحریری بیانات پر میں کوئی گرہ نہیں لگانا چاہتا۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا، کے مصداق اُردو زبان پر قہر اور عتاب نازل کرنے والے اور اس سے خدا واسطے کا بیر رکھنے والے اس تاریخی تحریر کے آئینے میں اُردو زبان کا خوب صورت چہرہ اور اس کے رسم الخط کی عمدہ کارکردگی کا نقش دیکھ سکتے ہیں۔ میری ڈائری میں اُردو کے بے حد اہم افسانہ نگار اور ناول نویس مرحوم خواجہ احمد عباس کی تحریر بھی محفوظ ہے راہی معصوم رضا کے بیان پر اپنے ردّ عمل کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے لکھا کہ :۔

" اُردو ایک بے حد اہم زبان ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ اُردو زبان ہندی بھاشا کے قریب ترین ہے بشتیر الفاظ گرامر وغیرہ تقریباً مشترک ہیں۔ ان دونوں زبانوں کی حیثیت دو بہنو یا دو سوکنوں جیسی ہے یہ دو زبانیں جتنی قریب ہیں اتنا ہی تعصب آپس میں بڑھتا جاتا ہے ضرورت اس تعصب کو دور کرنے کی ہے۔"

خواجہ احمد عباس صاحب نے آگے لکھا کہ :

" جو لوگ اُردو رسم الخط کی تبدیلی کا مطالبہ کرتے ہیں وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ علمی و ادبی کاموں کے لئے اُردو رسم الخط کی ضرورت ہمیشہ باقی رہے گی کیونکہ یہ رسم الخط ہمیں دوسری ایشیائی زبانوں مثلاً عربی، عربی فارسی اور سندھی وغیرہ کے قریب لے آتا ہے۔ یوں بھی زبردستی کسی زبان کا رسم الخط

ختم نہیں کیا جا سکتا۔ ابھی ہندی میں اتنی وسعت القلبی پیدا نہیں ہوئی ہے
کہ وہ اُردو ادب کے بہترین نمونوں کو اپنے اندر ضم کر لے۔ قومی ضروریات
کے تحت اُردو رسم الخط کو باقی رہنا ہے۔ یہ ایک بڑا ادبی اور تکنیکی سوال
ہے اس کو نظر میں رکھنا چاہیئے۔

خواجہ احمد عباس مرحوم اپنی باتیں بہت محتاط ہو کر اور ناپ تول کر لکھتے اور کہتے تھے
ان کے ناولوں اور کہانیوں کی بات چھوڑ کر "بلٹز" میں ان کی چالیس سال پر مشتمل کالم نگاری
کا ہی صرف جائزہ لیا جائے تو بھی یہی مفروضہ سامنے آتا ہے ان کی تحریر کا جو اقتباس میں نے
اپنی ڈائری سے پیش کیا ہے اس کا تجزیہ کیا جائے تو بھی یہی خیال تقویت پاتا ہے۔ اپنی
تحریر میں اُردو زبان اور اس کے رسم الخط سے متعلق جو اشارے انھوں نے کیے ہیں لگی لپٹی سے
دور حقائق کی معنویت اور قوت پوشیدہ ہے ان سے استفادہ دور رس نتائج کا حامل ہو سکتا ہے
راجندر سنگھ بیدی کا نام دنیائے افسانہ نگاری کا بہت محترم اور قابلِ تعظیم نام ہے۔
انھوں نے اپنے افسانوں بالخصوص گرم کوٹ' من کی من میں' دس منٹ بارش میں'
لاروے' بھولا' پان شاپ' گرہن' لاجونتی زین العابدین اور کوکھ جلی' وغیرہ میں حقائق
کی گہرائیوں میں اتر کر پورے نظم و ضبط کے ساتھ مسائل کا جو تحلیل و تجزیہ کیا ہے اور جس
نتیجے تک پہنچے ہیں اس سے ان کے قاری کو بے پناہ بصیرت حاصل ہوتی ہے بیدی صاحب
اُردو کے بڑے شیدائی تھے۔ ایک بار میں نے ان سے سوال کیا کہ انھوں نے اُردو کو ہی
اظہارِ خیال کا ذریعہ کیوں بنایا؟ ــــ فوراً بول پڑے ــــ " اگر اُردو زبان نہ ہوتی تو میں
اظہارِ خیال کرتا ہی کیوں؟ " عمر کی جس منزل میں' میں نے ان سے انٹرویو لیا تھا وہ منزل
ان کے لئے بڑی سخت تھی۔ فالج نے انھیں بیکار کر کے چھوڑ دیا تھا۔ بمشکل تمام انھوں نے میری
ڈائری میں یہ جملے لکھے۔

کوئی زبان بغیر رسم الخط کے زندہ نہیں رہ سکتی'
اسی طرح اُردو بھی اسی وقت تک زندہ رہے گی جب تک اس
کا رسم الخط موجود ہے۔"

ایک سوال ہمارے پیشِ نظر اور ہے اور وہ سوال یہ ہے کہ کیا دیوناگری رسم الخط میں
اتنی وسعت اور صلاحیت ہے کہ وہ اُردو زبان کے الفاظ کی ادائیگی کا فرض بحسن و خوبی انجام دے سکے

دیوناگری رسم الخط کی وکالت کرنے والے ٹھنڈے دل ودماغ سے اس سوال پر غور کریں گے تو صحیح جواب حاصل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ سستی جذباتیت اور کوری حمایت مسئلے کا حل پیش کرنے سے رہی۔ زبان کا صوتی نظام اس بات کا متقاضی ہوتا ہے کہ پہلے ہم اس سے متعلق تمام امور پر غور کریں اور پھر کوئی فیصلہ صادر کریں۔ ہندی اور اُردو کے صوتی نظام کا الگ الگ مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ ہندی کے دیوناگری رسم الخط میں اتنی صلاحیت اور مجموعیت (TOTALITY) نہیں ہے کہ وہ اُردو کے ساتھ ان کی ادائیگی زبان کے الفاظ کی خصوصیت (QUIDDITY) کے ساتھ ان کی ادائیگی کا کام انجام دے کیونکہ دیوناگری رسم الخط صوتی اعتبار سے خود ہی مشتبہ اور قابلِ گرفت (QUESLIONABLE) ہے۔

اُردو کا ایک بہت ہی چھوٹا سا لفظ "وہ" ہے' اُردو والے اس لفظ کا تلفظ جس طریقے سے کرتے ہیں اس طریقۂ تلفظ کو دیوناگری لپی اختیار کرنے سے قطعی قاصر ہے "وہ" کی جگہ پر ہندی میں جو لفظ رائج ہے وہ "वह" ہے۔ ہمارے اُردو کا "وہ" ہندی میں ضم ہوگا تو اس کا تلفظ بگڑ کر "وَہ" वह ہو جائے گا۔ یہاں اُردو تہذیب اور ثقافت کی موت واقع ہوگئی تلفظ کے بگڑنے کی یہ ایک ادنیٰ سی مثال ہے۔ اُردو رسم الخط کو اگر ہم نے دیوناگری لباس پہنایا تو سیکڑوں مقامات پر ایسی موتیں واقع ہوں گی۔ اُردو میں (ط اور ت) (ز ذ اور ژ) (الف اور ع) (س ص اور ث) وغیرہ مختلف حروف سے جو الفاظ بنتے ہیں ان کی بعینہٖ ادائیگی کا کام دیوناگری رسم الخط انجام دینے سے ہی قاصر ہے "طرف" اور "تعریف" میں آئے حروف ط اور ت کے لیئے دیوناگری لپی میں صرف ایک لفظ त ہے "زحمت" "ذلت" "ژولیدہ" وغیرہ الفاظ میں آئے ہوئے حروف ز ذ اور ژ کے لئے دیوناگری کے خزانہ حروف میں صرف ایک حرف ज़ ہے وہ بھی نقطے (بندی) کے نظام سے خالی۔ "احمد" اور "عادل" الفاظ میں دو متضاد حروف آئے ہیں ان کے لئے دیوناگری رسم الخط صرف ایک حرف अ فراہم کرتا ہے۔ "سفینہ" "صفت" اور "ثروت" کے س، ص اور ث کے لئے دیوناگری رسم الخط کے پاس صرف स ہے اتنی مثالوں میں یہ بات سمجھ میں آجانی چاہیئے کہ دیوناگری رسم الخط خام ہی نہیں ہر طریقے سے نامکمل بھی ہے اور اُردو کا صوتی نظام جو اپنے آپ میں مکمل (COMPLETE) کیفیت آور (STIMULANT) اور ہمہ گیریت (VERSATILITY) کا حامل ہے اُردو رسم الخط کو اُردو زبان کے لئے مفید اور

کارآمد بناتا ہے۔

اُردو زبان اور اس کے رسم الخط کے تعلق سے یہاں ایک واقعہ کا ذکر اور کرتا چلوں تو بہتر ہوگا۔ یہ واقعہ غالباً ۱۹۶۸ء کا ہے۔ بمبئی یونیورسٹی کے اس وقت کے وائس چانسلر ڈاکٹر گجیندر گڈکر نے بمبئی کے مشہور تعلیمی ادارہ بھارتیہ ودیا بھون کے روحِ رواں کے۔ ایم منشی کے تعاون سے یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ کی ایک سہ روزہ کل ہند کانفرنس منعقد کی تھی۔ اس کانفرنس میں ملک کی ۸۵ یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبا نے حصہ لیا تھا۔ بمبئی یونیورسٹی کے عربی، فارسی اور اردو کے طلباء کی نمائندگی کا کام میرے سپرد تھا۔ اساتذہ کی نمائندگی ہمارے ہردلعزیز پروفیسر مرحوم سید نجیب اشرف ندوی نے کی۔ اس کانفرنس کا افتتاح مشہور سرودے لیڈر جے پرکاش نارائن کے ہاتھوں انجام پایا۔ پنڈت ہردے ناتھ کنزرو اور مدراس یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر مدلیار بھی افتتاحی تقریب میں شریک تھے۔ سید نجیب اشرف ندوی صاحب کی ایما پر میں نے آنجہانی جے پرکاش نارائن، پنڈت ہردے ناتھ کنزرو۔ کے ایم منشی اور ڈاکٹر مدلیار سے مختصراً اُردو زبان اور اس کے رسم الخط کے تعلق سے کچھ سوالات کئے اگر میں مذکورہ تمام آئمہ سیاست اور ماہرینِ تعلیم کے جوابات شاملِ مضمون کروں تو ضخامت بہت بڑھ جائے گی اس لیئے میں مدارس یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر مدلیار کے بیان کے اندراج پر اکتفا کروں گا۔ ڈاکٹر مدلیار چونکہ اُردو نہیں جانتے تھے اس لیے انہوں نے اپنا بیان انگریزی میں لکھوایا۔ انھوں نے کہا۔ I WOULD LIKE TO EXPRESS MY FEELING OF REGRETS FOR NOT KNOWING THIS BEAUTIFUL LANGUAGE. I ACCEPT THAT IT IS A VERY RICH LANGUAGE AND AN IMPORTANT PART OF OUR CULTURAL AND HISTORICAL LEGANCY. SEING THE MOTHER TONGUE OF THE LARGEST MINORITY COMMUNITY IT SHOULT NOT BE NEGLECTED AND SHOULD BE GIVEN ALL OPPERTUNITIES TO SPREED IT.S BEAUTY AND ELEGANCE. URDU SPEAKING PEOPLE AND ALL LOVERS OF THIS BEAUTIFUL LANGUAGE SHOULD MAKE ALL POSSIBLE EFFORTS TO KEEP IT ALIVE AS FAR AS IT. SCRIPT IS CONCERNED NO ONE SHOULD BE ALLOWED TO CHANGE IT.

AND DESTROY ITS ESSENCE AND ORIGINALITY. OUR PEOPLE IN TAMIL NADU CAN LAY DOWN THEIR LIVES BUT WOULD NEVER ALLOW ANY TEMPERING OF THE SCRIPT OF THEIR MOTHER TONGUE.

ڈاکٹر مدلیار نے اپنے بیان میں جو کچھ کہا ہے اس سے ہمیں زندگی کی حرارت بھی ملتی ہے اور جہد و عمل کا پیغام بھی۔ ہمیں یہ طئے کر لینا چاہیئے کہ ہم زندہ رہیں گے تو بس اپنی زبان اور زبان کے رسم الخط کے ساتھ۔ ہمیں یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ دشمنان اردو ہمارے اپنے ہی خیمے سے اردو زبان اور اس کے رسم الخط پر دھاوا بولنے والے مصلحت پسند افراد کو ڈھونڈ کر لائیں گے۔ ہمیں ایسے افراد سے دھوکا نہیں کھانا ہے۔ دراصل اردو کے مسئلے کو ایک سیاسی مسئلہ بنا دیا گیا ہے حالانکہ کسی بھی طرح یہ سیاسی مسئلہ نہیں تھا اس لیئے شدید باد مخالف کے باوجود ہمیں زندگی کا ثبوت دینا ہے سیاسی بازیگروں کے ناپاک عزائم سے جب تک اردو زبان کلیتاً محفوظ نہیں ہو جاتی اس وقت تک ہمیں مردانہ وار خدمتِ اردو میں ڈٹے رہنا ہے۔ ہمیں اردو زبان اس لیئے بھی عزیز ہے کہ جنگِ آزادی کے دوران اس نے "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ دے سامراج کے خلاف ہم کو صف آرا کیا تھا۔ اردو زبان ہمیں اس لیئے بھی عزیز ہے کہ یہ وطن سے محبت کا والہانہ سبق پڑھاتی ہے اور ہمیں اس زبان سے اس لیئے بھی محبت ہے کہ یہ ہمارے اپنے ملک کی زبان ہے۔ یہ ہندوستان میں پیدا ہوئی ہے اسے ہندوؤں اور مسلمانوں نے اپنے خونِ جگر سے سینچ کر گل و گلزار کیا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اس خوبصورت ورثے کی حفاظت ہمارا اولین فریضہ ہے اور ہم اس فریضے کی ادائیگی سے چوک نہیں سکتے۔

کعبہ جسے کہتے ہیں وہ گھر کس کا ہے

پروفیسر عنوان چشتی کی ادبی خدمات کا اعتراف میں ایوارڈ اور اعزاز، کھتولی ضلع مظفر نگر میں جلسہ اور مشاعرہ

مظفر نگر۔ ۱۶ اور ۱۷ فروری کی درمیانی شب میں کھتولی ضلع مظفر نگر میں عظیم الشان جلسہ اور مشاعرہ انجمن ہم نفسانِ ادب اور قومی یکتا کمیٹی کے زیر اہتمام منعقد ہوا۔ کھتولی اور مضافات کے ہزاروں افراد نے شرکت کی۔ ممتاز محقق، نقاد، شاعر اور خطیب پروفیسر عنوان چشتی نے جلسہ اور مشاعرہ کی صدارت کی۔ ریاض ساغر نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ ریاض ساغر نے پروفیسر عنوان چشتی کے بارے میں کہا کہ

بادشاہ نامہ

شاہجہاں کے دور کی ۴۴ نادر پینٹنگس کا مجموعہ

مغل شہنشاہیت کے دور کا ایک اہم قلمی مسودہ" بادشاہ نامہ" جو رائل لائبریری ونڈسر کاسل سے لایا گیا ہے ۔ ۲۸ فروری سے دہلی کے نیشنل میوزیم میں عوام کے مشاہدہ کے لئے رکھا جائے گا ۔ " شاہ عالم" کے زیر عنوان اس بادشاہ نامے میں ۴۴ پینٹنگس اور ۲ الیومینیشنس بھی شامل ہیں۔ ملکہ الزبتھ دوم نے یہ مسودہ مستعار دیا تھا۔ اب تک وقت واحد میں اس کتاب کا کوئی ایک ہی جز دیکھا جا سکتا تھا لیکن ایک حالیہ تحفظ پراجکٹ کے ذریعہ اس کتاب کی جلد کو نکالنے اور وقت واحد میں تمام تصاویر کی نمائش کی سہولت ہوگئی ہے اس مسودے کی نئی دہلی کے بعد کوئینس گیلری لندن اور پھر امریکہ میں نمائش کے بعد اسے دوبارہ مجلد کر دیا جائے گا۔" بادشاہ نامہ" شاہجہاں کے دور حکومت کے ابتدائی دس سالوں سے متعلق ہے ۔ ۱۶۳۹ء میں عبدالحمید لاہوری کو اس عہد کی تاریخ نویسی پر مامور کیا گیا تھا۔ رائل لائبریری کے مسودے کی نقل مشہد کے خطاط محمد امین نے ۵۷ - ۱۶۵۶ء میں کی تھی اور یہ مسودہ مغلیہ دور کے بہترین فنکاروں کی شاہکار پینٹنگس پر مشتمل ہے اس کتاب میں درباری شان وشوکت، شکار اور محاصرے کے مناظر کی تصاویر شامل ہیں اور ان تصاویر میں موجود افراد کے کپڑوں اور رنگوں کی باریک ترین تفصیلات موجود ہیں۔ یہی کتاب نواب آف اودھ نے لارڈ ٹین ماؤتھ کو پیش کی تھی جو گورنر جنرل لارڈ ویلسلی کے نام سے مشہور ہیں ۔ ۱۷۹۷ء میں لارڈ ویلسلی نے یہ مجموعہ کنگ جارج سوم کو پیش کیا تھا اور تب سے اسے شاہی نوادرات میں شامل کر لیا گیا۔ اس نمائش کا انعقاد مشترکہ طور پر برٹش کونسل نیشنل میوزیم دہلی کی جانب سے اور رائل لائبریری کے تعاون سے کیا جارہا ہے۔ ایر انڈیا، اے این زیڈ گرنڈلیز اور ڈی لاریو نے اس نمائش کو اسپانسر کیا ہے۔

پروفیسر اسرار احمد
علی گڑھ یونیورسٹی

پروفیسر عبدالسلام

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

اقبال کے اس شعر پر جھوم تو سبھی اٹھتے ہیں لیکن اقبال کے مردِ مومن کی طرح شمشیریں ہاتھ میں لے کر اٹھ کھڑے ہونے کا حوصلہ بہت کم لوگوں کو ہوتا ہے۔ نوبل انعام یافتہ پروفیسر عبدالسلام ان چند جیالوں میں تھے جنھوں نے نہ صرف اس شمشیر کو اٹھایا بلکہ اس سے بھرپور جہاد بھی کیا۔ ۲۱ نومبر ۱۹۹۶ء کو داعی اجل کو لبیک کہنے والے اس شخص کی پوری زندگی اس شعر کی تفسیر پیش کرتی ہے۔

ستر سال کا زمانہ ـــــ کائناتی پیمانہ پر اس کی حقیقت ایک خفیف ترین وقفہ سے زیادہ نہیں۔ البتہ جب یہی زمانہ کسی مردِ کامل کے ہاتھوں کائنات کی حقیقتوں پر پڑے ہوئے دبیز پردوں کو اٹھانے، منشائے تخلیق کی تہہ تک پہنچنے اور مخلوقِ کائنات کے درد کو سمجھنے اور بانٹ لینے میں صرف ہو تو وہ مستقبل کو جذب کر کے ایک لامتناہی حجم اختیار کر لیتا ہے۔ وہ جاوداں بن جاتا ہے اور تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ کے لئے نقش ہو جاتا ہے عبدالسلام ایک ایسا ہی مردِ کامل ہے جس نے کائنات کے رازِ سربستہ سے سرگوشی کی، فطرت کی بظاہر مختلف قوتوں کو وحدت کی مضبوط لڑی میں پرو دیا، تیسری دنیا کے دکھ درد کو سمجھا اور اس کے مداوا کے لیے شب و روز ایک کر دیا۔ اس طرح انھوں نے اپنی گزشتہ عمر کے ساٹھ سال کو زمانہ مستقبل پر محیط کر دیا۔

سطحِ آب پر کبھی مختلف لہروں کو باہم متصل ہوتے ہوئے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہوگا۔ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ باہم ملنے والی لہروں کے نشیب فراز کسی خاص ترتیب یا نظم

یا آہنگ سے نہیں ملتے ۔ میزانا ایک لہر کا نشیب دوسرے کے فراز سے مل کر ایک دوسرے کے اثر کو کم کرتا رہتا ہے اور سطح آب پر صرف ہلکورے نظر آتے ہیں۔ البتہ بعض انتہائی مخصوص حالات میں یہ بھی ممکن ہے کہ ایک خاص مقام پر مختلف لہروں کے فراز ایک خاص ترتیب کے ساتھ ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتے ہوئے ملیں ۔ ایسی صورت میں پانی اپنی نارمل سطح سے کافی اونچا اٹھ کر ایک بڑے فراز کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ عبدالسلام کی ابتدائی زندگی حالات کی لہروں کے فرازوں کا باہم مل کر ایک بڑا فراز بن جانے کے مترادف ہے انھوں نے ایک ایسے خاندان میں آنکھ کھولی جو علم دوست تھا۔ انہیں ایسے والدین ملے جنھوں نے ان کی تعلیم و تربیت میں غیر معمولی دلچسپی لی۔ قدرت نے انھیں ایک غیر معمولی ذہن سے نوازا۔ نتیجہ ان جیسا شاندار تعلیمی ریکارڈ شاید ہی کسی کا ہو۔ ہر امتحان میں کامیاب ہونے والوں میں وہ سرفہرست رہے اور بیشتر میں نئے ریکارڈ قایم کئے۔ پھر قدرت نے کچھ ایسے حالات پیدا کیئے کہ وہ اپنے عزیز و اقارب کی شدید خواہش کے باوجود سول سروس میں نہ جا پائے۔ اس طرح ان کی عبقریت بے موت مرتے مرتے بچی ۔ اتنا ہی نہیں قدرت نے یہ انتظام کردیا کہ وہ علوم جدیدہ کے بہترین گہوارے میں زانوئے تلمذ طے کریں۔ یعنی اعلیٰ تعلیم کے لیئے اسکالرشپ کے ایک ایسے فنڈ کا قیام جس سے صرف اور صرف عبدالسلام مستفید ہو سکے۔ اس طرح حالات کی ہر لہر کا فراز انھیں ان کی موجودہ بلندی کی طرف لے گیا۔

گو قدرت نے عبدالسلام کی پشت پناہی قدم قدم پر کی، لیکن یہ سب کچھ اللہ کی سنت کے مطابق ہوا۔ خدا بھی انہی کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ عبدالسلام کی ہر کامیابی کے پیچھے ان کی شب و روز کی محنت، لگن اور اپنے مقصد سے جذباتی لگاؤ کا ہاتھ زیادہ ہے۔ اگر وہ قدرت سے عطا کی گئی زرخیزیوں کو اپنی محنت کے پسینے سے سیراب نہ کرتے تو ان بلندیوں کو جن پر وہ آج ہیں چھو پانا ممکن نہ ہوتا۔ ایسا نہیں کہ زندگی کے سفر میں انہیں ہمیشہ ہی ہموار راستہ ملا ہو۔ ایسا ہوتا خلاف فطرت ہوتا۔ ان کی راہ میں کئی ناہمواریاں بھی آئیں ۔ خصوصاً اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بعد جب وہ اپنے وطن پاکستان واپس لوٹے اور پنجاب یونیورسٹی میں ریاضی کے پروفیسر کی حیثیت سے کام کرنا شروع کیا۔ اس زمانے میں پاکستان میں کوئی علمی ماحول نہ تھا خصوصاً سائنسی علوم کے لیئے وہاں کی زمین بالکل بنجر تھی (آج بھی حالات کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں) عبدالسلام نے اس بنجر کو زرخیز بنانے کی کوشش بہت کی، مگر کچھ کامیابی نہ ملی ۔ انھیں اپنی کوششوں

کے جواب میں تمسخر، حوصلہ شکنیاں اور حاسدانہ جذبات ملے۔ یقیناً انہیں اپنی ساری اعلیٰ تربیت خاک میں ملتی نظر آئی ہوگی۔ اپنے ملک کو بین الاقوامی سائنس میں ایک خاص مقام دلانے کا ان کا خواب چور چور ہوگیا ہوگا پر وہ عبدالسلام ہی کیا جو رکاوٹوں سے گھبرا جائے۔ ناموافق حالات کے سامنے سپر ڈال دے۔

سرسم ہوائیں لاکھ مزاحم ہوئیں مگر
دیوانہ وار موج نے ساحل کو جا لیا

انہوں جب یہ یقین ہوگیا ہوگا کہ وہ اپنے وطن کی خدمت اپنے وطن سے دور رہ کر زیادہ بہتر طور پر کرسکتے ہیں تو انہوں نے پردیس کی طرف رخ کیا۔ انگلستان نے اُن کا خیر مقدم کیا جہاں وہ پہلے نظریاتی طبیعات کے لکچرر پھر چند ہی سال بعد پروفیسر بنائے گئے ہر چشم بینا یہ دیکھ سکتی ہے کہ باہر رہ کر انہوں نے جو کمال حاصل کیا اور جس طرح انہوں نے اپنے ملک و ملت کی خدمت کی وہ پاکستان میں رہ کر ممکن نہ تھی۔

عبدالسلام کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں ان میں کئی کمال ہیں کئی خوبیاں ہیں اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ان میں کوئی انسانی کمزوری نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ فرشتہ ہوتے۔ پھر اس دنیا کے کام کے نہ رہ جاتے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کی شخصیت میں کمالات کا وہ جمگھٹا ہے اور عظمتوں کی وہ چکا چوند ہے کہ انسانی کمزوریوں کے چند خفیف دھبے جو یقیناً ہوں گے نظر نہیں آتے۔

عبدالسلام کی عظمت کی مضبوط بنیاد یہ ہے کہ وہ ایک عظیم سائنس داں تھے سائنس کے میدان میں اپنی عظمت کا سکہ انہوں نے نہایت کم عمری میں ہی جما لیا تھا۔ ان کا پہلا اہم کام یہ ہے کہ انہوں نے نظریاتی ذراتی طبیعات میں موجود ایک ریاضیاتی طبیعات کے حسن میں جو بھونڈا پن تھا اُس کو دور کرنے کا طریقہ کار دیا جس کے بعد ریاضیاتی طبیعات میں نکھار آگیا۔ سائنسی کمیونٹی میں ان کے اس کام کی پذیرائی ہوئی اور انتہائی کم عمری (۳۱) میں اُن کو فیلو آف رائل سوسائٹی چن لیا گیا۔ ان کا دوسرا اہم کام بھی نظریاتی طبیعات کو تجربات کی روشنی میں خوبصورت تر بنانے سے متعلق ہے۔

سنہ ۱۹۵۶ء تک یہ عام خیال تھا کہ کائنات میں کارفرما مختلف قوتیں کسی طبیعاتی عمل اور آئینے میں اس کے عکس میں تمیز نہیں کرتیں۔ عبدالسلام نے یہ نظریہ پیش کیا کہ یہ اصول مطلق نہیں خفیف نیوکلیائی قوت اس سے انحراف کرتی ہے۔ اسی زمانے میں دو امریکی سائنس داں لی LEE اور ریانگ YANG نے بھی ایسا ہی نظریہ پیش کیا جس پر انہیں نوبل انعام سے نوازا گیا۔ یہ ایک

طرح کا تعصب تھا جو عبدالسلام کو اس نوبل انعام میں شریک نہیں کیا گیا۔ نوبل کمیٹی کا یہ رو
جس پر منصف مزاج سائنس دانوں کا حلقہ متعجب بھی ہوا۔ عبدالسلام کی دل شکنی کا باعث ن
بن سکا۔ وہ مستقل اپنی گراں قدر سائنسی تخلیقات سے طبیعات کو نوازتے رہے اور ذراتی طبیعا
کو نئی نئی راہوں سے روشناس کراتے رہے۔ ۱۹۶۴ء کے لگ بھگ انھوں نے دوسرا بنیادی
اہمیت کا نظریہ پیش کیا۔ یہ برق، مقناطیسی، خفیف نیوکلیائی قوتوں کی وحدت کا نظریہ ہے
اس نظریئے کی صداقت کا تجرباتی ثبوت ۱۹۷۲ء میں ملا۔ اور اسی نظریہ کو پیش کرنے پر انہیں
۱۹۷۹ء میں نوبل انعام ملا۔ یہ نظریہ دراصل عبدالسلام کے پیش کردہ "کائنات میں کارفرما
بظاہر مختلف قوتوں کی وحدت کے وسیع تر نظریہ کی پہلی کڑی ہے۔ اس کی دوسری کڑی برق
مقناطیسی، خفیف نیوکلیائی و قوی نیوکلیائی قوتوں کی وحدت کا نظریہ ہے جس کی ایک پیش گوئی
یہ ہے کہ اب تک اٹوٹ سمجھا جانے والا پروٹان بھی ایک لمبے عرصے کے بعد ٹوٹ سکتا ہے۔ دنیا کی
بڑی تجربہ گاہوں میں عبدالسلام کے اس نظریے کی پیش گوئی کو تجربے کی کسوٹی پر پرکھا جارہا
اگر ان کی یہ پیش گوئی درست ثابت ہوئی تو عام خیال تھا کہ ان کو دوسری بار نوبل انعام سے نوازا جا
وہ کائنات کی کل چار بظاہر مختلف قوتوں یعنی برق مقناطیسی خفیف نیوکلیائی قوی نیوکلیائی اور
کشش ثقل کی وحدت کی ایک قابل قبول تھیوری دینے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے کیا عجب
قدرت نے توحید کے اس پرستار کو کائنات کی بظاہر مختلف چاروں قوتوں کے وحدت کے راز آشکا
کرنے کے لیے چن لیا ہو۔

عبدالسلام کی عظمت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ مشرق کی روحانی قدروں کے پرجوش علم
تھے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ مغرب میں گزارنے کے باوجود سرتاپا مشرقی تھے۔ مغربی تہذیب
کی چکاچوند یا اس کے نت نئے رجحانات کے تیز دھاروں سے وہ چنداں مرعوب نہیں۔ وہ نیوٹ
اور میکسویل کے دیس میں رہتے ہوئے بھی بوعلی سینا اور ابن الہیثم سے قریب تھے۔ وہ اپنے
دین اسلام کی حقانیت پر کامل یقین رکھتے تھے اور اس کی ہدایات پر سختی سے عمل بھی کرتے تھے
مغرب میں ہونے والی کانفرنسوں کی پارٹیوں میں جب سب شرکاء جام کے جام لنڈھا رہے ہوتے
تھے۔ عبدالسلام کے ہاتھ میں دودھ یا کسی شربت کا گلاس ہوتا تھا۔ انھیں اپنے کلچر پر فخر تھا
اور اس کے اعلیٰ ہونے کا وہ برملا اظہار بھی کرتے تھے۔ اس بابت ان کے جذبات کا اندازہ نوبل انع
کے جشن کے موقع پر ان کے لباس کے انتخاب سے لگایا جاسکتا ہے نوبل انعام لیتے وقت وہ جھنگ کے

مخصوص علاقائی لباس میں تھے شلوار و شیروانی، سر پر پگڑی اور پیروں میں لمبی نوکوں والے جوتے۔

عبدالسلام کی عظمت کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ وہ پایہ کے سائنسداں ہونے کے ساتھ ساتھ ایک انتہائی کامیاب ایڈمنسٹریٹر بھی تھے۔ عموماً محققین میں انتظامی صلاحیت نہیں کے برابر ہوتی ہے یا اگر کسی میں ہوتی بھی ہے تو وہ انتظامی امور سنبھالنے کے بعد علمی کام یکسر چھوڑ دیتا ہے۔ اسے عبدالسلام کا کمال ہی کہئے کہ وہ اعلیٰ پیمانے کی تحقیق بھی کرتے رہے اور ساتھ ہی ایک کافی بڑے بین الاقوامی مرکز کا انتظام بھی سنبھالتے رہے ان کے نزدیک ایسا کرنا زیادہ مشکل نہیں تھا بس ذرا سی توجہ اور اپنے اوقات میں ترتیب کی ضرورت ہے۔ اکثر وہ اس بات پر اظہارِ تاسف بھی کرتے تھے کہ ہمارے پس ماندہ ممالک کی یہ بڑی بد قسمتی ہے کہ ان کے سائنس داں اعلیٰ انتظامی عہدہ سنبھالتے ہی علمی کام چھوڑ دیتے ہیں یعنی وہ اس کام سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں جس کی بدولت انھیں یہ عہدہ ملا تھا اس وجہ سے علمی ترقیوں سے ان عہدہ داروں کی ناواقفیت روز بروز بڑھتی جاتی ہے جس کا ایک برا اثر ملک کی سائنسی پالیسی پر پڑتا ہے

ادھر چند سالوں سے عبدالسلام کے کاندھوں پر انتظامی امور کا کچھ زیادہ ہی بوجھ آن پڑا تھا انہوں نے تھرڈ ورلڈ اکیڈمی آف سائنس کو قائم کیا، جس کے وہ صدر ہے اس کے باوجود وہ علمی تحقیق کے لیے وقت نکال لیتے تھے۔

عبدالسلام کی شخصیت کا سب سے زیادہ روشن پہلو یہ ہے کہ وہ ایک دردمند دل کے مالک تھے، وسیع القلب اور منکسر المزاج تھے اور یہی وہ پہلو ہے جو انہیں دنیا کے عظیم سائنس دانوں کے درمیان فلک آور بناتا ہے۔ عبدالسلام کے ہم پلہ یا ان سے بڑے اور بھی سائنسداں ہیں۔ ان جیسے کامیاب اور بھی ایڈمنسٹریٹر ہیں۔ اپنی تہذیب کے پرجوش علم بردار بھی کم نہیں۔ لیکن کسی ایک فرد میں ان کمالات کا اجتماع ہونا اور ساتھ ہی اس فرد کا منکسر المزاج اور دردمند ہونا صرف عبدالسلام کا ہی تشخص تھا۔ ان کی بلند قامتی صرف اس وجہ سے نہیں کہ انھوں نے بنیادی اہمیت کے سائنسی نظریات پیش کیئے بلکہ اس سے زیادہ ان کی اس تگ و دو کی وجہ سے ہے جو پس ماندہ ممالک کے سائنس دانوں کو اعلیٰ تحقیق کے وسائل فراہم کرنے کے لئے کرتے تھے ان کی زندگی کا سب سے بڑا دکھ یہ تھا کہ پس ماندہ ممالک میں نہ جانے کتنے عبدالسلام پیدا ہونے سے پہلے ہی مر جاتے ہیں پس ماندہ ممالک کے سائنس داں بھائیوں کی مدد کے لئے انہوں نے اٹلی میں ایک بین الاقوامی مرکز قائم کیا ہے جس کا نام انٹرنیشنل سینٹر فار تھیوریٹیکل فزکس ہے۔ پچھلے بیس سال سے وہ اس مرکز

کو خوش اسلوبی سے چلا رہے تھے جس سے سیکڑوں ہزار سائنس دانوں کو فائدہ پہنچا ہے۔ یہ مرکز بھی عبدالسلام کے زرخیز ذہن کی ایک اعلیٰ تخلیق ہے۔ اس کے دوررس اثرات بیان کرنے کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ مختصراً اس مرکز نے پس ماندہ ممالک میں ایک سائنسی انقلاب کی بنیاد ڈال دی ہے۔

عبدالسلام ایک فرد کا نہیں ایک تحریک کا نام تھا یہ تحریک ہے علم و دانش کی، عمل و جفاکشی کی اور اپنے تہذیبی ورثے میں جائز فخر کی۔ یہ تحریک ہے دنیا سے غربت و جہالت مٹانے کی اور طاقتور ممالک کے ظلم و استحصال کے خلاف جہاد کی۔ وہ اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے مستقل باور کراتے رہتے تھے کہ دنیا کے ترقی یافتہ و طاقتور ممالک بڑی عیاری سے پس ماندہ ممالک خصوصاً عالم اسلام کا خون چوس رہے ہیں۔ ان ترقی یافتہ ممالک کے امدادی پروگرام اور ان کے بظاہر فیاضانہ سلوک کے پس پردہ پس ماندہ ممالک کا معاشی و سیاسی استحصال ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کا معاشی و سیاسی استحصال ہے۔ ترقی یافتہ ممالک نے کبھی بھی دل سے یہ نہ چاہا کہ دنیا سے غربت، افلاس و معاشی و علمی ناہمواری دور ہو۔ وہ اس بات کا اظہار انتہائی پر درد الفاظ میں کرتے تھے کہ پس ماندہ دنیا آج جس بحران سے دوچار ہے اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی تھی، حتی کہ نوآبادیاتی دور میں بھی نہیں جب تیسری دنیا کے خام مال پر ترقی یافتہ ممالک کو کامل اختیار حاصل تھا۔ اس دور میں پس ماندہ دنیا سے صرف خام مال برآمد ہوتا تھا اور آج خام مال کے ساتھ بہترین دماغ بھی۔ ان باتوں کی صداقت کے ثبوت میں وہ مختلف ذرائع سے حاصل کیے گئے اعداد و شمار پیش کرتے تھے۔

وہ اس بات کی مستقل تبلیغ کرتے رہے کہ عالم اسلام کی فلاح خود اپنے پیر پر کھڑا ہونے اور اپنے گم شدہ ورثے کے حاصل کر لینے میں ہے۔ ان کے نزدیک یہ گم شدہ ورثہ سائنس ہے وہ مسلمانوں کو بار بار ان کی تاریخ یاد دلاتے رہے کہ کس طرح ان کے آبار و اجداد بلا شرکت غیر چار سو سال تک دنیائے علم و دانش کے امام رہے اور سائنس کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ ان کے خیال میں ملت اسلامیہ کے زوال کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس نے مغرب میں آنے والے سائنسی انقلاب اور اس کے بطن سے پیدا ہونے والے ٹیکنیکی انقلاب سے خود کو باخبر نہ رکھا اور اس کی طرف سے مکمل بے اعتنائی برتی۔ وہ بڑے اعتماد سے کہتے کہ ملت اسلامیہ صرف چند دہائیوں میں عالمی برادری میں پھر سے اپنا کھویا ہوا وقار بحال کر سکتی ہے۔ مسند امامت پر پھر سے فائز ہو سکتی ہے بشرطیکہ وہ علم و دانش کی راہ اپنا لے سائنسی تخلیق کی عرق ریزیوں کی لذتوں

پروفیسر عبدالسلام

سائنس ٹکنالوجی اور تیسری دنیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشہد ان لا الٰہ الا اللہ و اشہد ان محمد رسول اللہ

اپنی بات کہنے سے پہلے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک قول پیش کروں گا جس کا مفہوم یہ ہے کہ جو شخص انسان کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ خدا کا شکر گزار نہیں۔ اس ارشادِ گرامی کے پیشِ نظر اس میز کے گرد بیٹھے ہوئے معزز اشخاص میں سے بائیں طرف سے شروع کرتے ہوئے سب سے پہلے میں جناب سید حامد کا دلی شکریہ ادا کروں گا جنھوں نے اپنے دور میں مجھے یہاں پہلی بار مدعو کر کے اس عظیم یونیورسٹی کو دیکھنے کا موقع عطا فرمایا اور اس یونیورسٹی کی اعزازی ڈگری دے کر علیگ برادری میں شامل کیا۔ میں سید حامد صاحب کا ان مخلصانہ کلمات کے لئے بھی شکر گزار ہوں جو ابھی انھوں نے میرے بارے میں کہے ہیں۔ اسلامی سائنس کی بابت انھوں نے میرے جذبات کی صحیح ترجمانی کی ہے اس کے بعد جناب پرو وائس چانسلر صاحب ہیں جن کا شکریہ ادا کرنا مجھ پر واجب ہے جنھوں نے وائس چانسلر صاحب کی عدم موجودگی میں مجھے یہاں مدعو کیا تھا اور میری بڑی عزت افزائی کی تھی اب یہ جواں سال شیروانی صاحب ہیں جن کی مجھ پر بڑی کرم فرمائیاں ہیں آپ نے مجھے ڈیوٹی سوسائٹی کے سرپرستوں میں شامل کیا اور ڈیوٹی سوسائٹی کی طرف سے دعوت نامے بھیجے۔ مجھے یہ دیکھ کر دلی خوشی ہے کہ شیروانی صاحب آج بھی پُرجوش اور فعال ہیں اور میرے مقابلے میں کم عمر دکھائی دیتے ہیں۔

یہ آپ کے وائس چانسلر جناب سید ہاشم علی صاحب ہیں جن کی اس لحاظ سے مجھ پر دیرینہ نوازشیں رہی ہیں کہ مجھے کئی موقعوں پر یاد کیا اور یہ انھیں کے اخلاص کی کشش ہے جو میں آج آپ کے درمیان موجود ہوں۔ میرے اعزاز میں اس جلسے اور دوسرے کئی پروگراموں کا اہتمام کر کے

سید ہاشم علی صاحب نے جس طرح اپنی نوازشوں کی بوچھار کی ہے اس کے لیئے میں تہہ دل سے بہت بہت شکر گزار ہوں۔

اس کے بعد میں جناب حکیم عبدالحمید صاحب کا دلی شکریہ ادا کروں گا جنھوں نے سب سے پہلے مجھے ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیمی مسائل سے آگاہ کیا اور ان کی تعلیمی پس ماندگی کی طرف متوجہ کیا۔ حکیم صاحب کی یہاں موجودگی سے میری ہمت افزائی ہوئی ہے اور میں آپ تمام حضرات کے ساتھ مل کر تن تنہا ایک یونیورسٹی قائم کرنے پر انھیں دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

اب میں ڈاکٹر اسرار احمد کا شکریہ ادا کروں گا جو اکثر ترسیلے میں مجھے یہاں کے سائنسی پروگراموں کی پیش رفت سے ازراہ مہربانی آگاہ کرتے رہے ہیں اور جنھوں نے میری پذیرائی میں ماہنامہ تہذیب الاخلاق کا خوب صورت یادگار شمارہ نکالا ہے جس کے پہلے صفحے پر میرے اقوال نقل کیئے ہیں۔ میں ان کا اس لیئے بھی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے مجھے سرسید کے زریں اقوال کی ایک فہرست پیش کی ہے اور اس لیئے بھی کہ وہ تہذیب الاخلاق کو ایک مفید رسالہ بنانے کی انتھک کوشش کر رہے ہیں۔

یہ رہے میرے دوست انعام یافتگان جنھوں نے اردو زبان میں معیاری عام فہم سائنسی مضامین لکھ کر انعام حاصل کیا ہے ان کا شکریہ ادا کرنا مجھ پر اس لیئے واجب ہے کہ انھوں نے سائنس کے فروغ میں دلچسپی لی جو میرا مشن ہے۔

آخر میں تمام معزز مہمانوں، اساتذہ اور طلبار کا شکریہ ادا کروں گا کہ اس جلسے میں بھاری تعداد میں شریک ہو کر میری بڑی عزت افزائی کی اور میری باتوں کو سننے کے لیے اپنا قیمتی وقت صرف کیا۔

حضرات — اب میں خصوصیت کے ساتھ تیسری دنیا میں سائنسی اور ٹکنالوجی کی حالت کے بارے میں گفتگو کروں گا۔ کل میں آپ کے وزیر اعظم سے ملا تھا اور انھیں تھرڈ ورلڈ آف سائنس کے زیر اہتمام شائع ہونے والی اپنی کتاب Notes on Science Technology and Science Education in the South کا تحفہ پیش کیا۔ اس کتاب کو ساؤتھ کمیشن کے لیئے تیار کیا گیا ہے جیسا کہ آپ کو معلوم ہوگا اس کمیشن کو قائم کرنے میں آپ کے وزیر اعظم راجیو گاندھی نے بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ اس کمیشن کے تعلق سے میرا یہ کام رہا ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی کو اس کے صحیح پس منظر میں دیکھا جائے۔ میری درخواست

یہ آپ کے وزیراعظم نے اس کتاب کے خلاصے کو دلچسپی سے پڑھا جسے میں یہاں دہرانا چاہوں گا۔
یہ کرۂ ارض دو مختلف قسم کے انسانوں سے آباد ہے۔ یو این ڈی پی کی ۱۹۸۳ء کے اعداد و شمار کے مطابق تقریباً ایک ارب انسان یعنی دنیا کی چوتھائی آبادی ترقی یافتہ ہے جو زمین کے تقریباً ½ رقبہ پر بستی ہے اور جس کے قبضے میں تقریباً اسی فی صد قدرتی ذخائر اور وسائل ہیں اس کے مقابلے میں باقی تقریباً ساڑھے تین ارب انسان جو زمین کے ½ رقبہ پر بستے ہیں غریب، پسماندہ اور مصیبتوں کے مارے ہوئے ہیں۔ انسانوں کے ان دونوں گروہوں میں فرق یہ ہے کہ اول الذکر گروہ کے پاس جوش، ولولہ، طاقت اور دولت ہے جو بنیادی طور پر اس دور کی سائنس اور ٹکنالوجی پر اس کی مہارت کی وجہ سے ہے۔ اب یہ ان لیڈروں کو طئے کرنا ہے جن کے ہاتھ میں پس ماندہ انسانیت کی قسمت ہے کہ کیا وہ ان اقدامات کو کرنے کے لئے تیار ہیں جن سے تیسری دنیا کے لوگ اس قابل ہو سکیں کہ جدید سائنس اور ٹکنالوجی میں مہارت حاصل کر کے تخلیقی کام کریں اور اسے ترقی کے لئے استعمال کریں۔"
یہی میرا پیغام ہے جسے میں ملک ملک پہنچا رہا ہوں۔ اس پیغام کی تفسیر اس کتاب میں ہے ماہرین معاشیات کو شکایت یہ ہے کہ میں نے معاشی محرکات پر خاموشی اختیار کی ہے میرے نزدیک معاشی محرکات کی بات دوسرے درجے میں آتی ہے۔ اول کام ان اقدامات کا کرنا ہے جس سے دولت کی تخلیق ہو سکے۔

اس دور کی سائنس اور ٹکنالوجی چار اقسام کی ہیں

۱) بنیادی سائنس (۲) اطلاقی سائنس (۳) روایتی ادنیٰ ٹکنالوجی (۴) اعلیٰ ٹکنالوجی

بنیادی سائنس:۔ بنیادی سائنس کا منبع، تجسس، غور و فکر اور جاننے اور سمجھنے کی ہمک ہے۔ اس کی پانچ اہم شاخیں ہیں۔

ا۔ فزکس (ب) کیمسٹری (ج) ریاضی (د) بایولوجی اور (ہ) بنیادی میڈیکل سائنس

بنیادی سائنس کا تجسس سے کتنا گہرا تعلق ہے اس کی خوب صورت تشریح وولف گانگ وائلڈ نے اس طرح کی ہے۔

• "قرون وسطیٰ میں جتنا کچھ گرجا گھروں کی تعمیر پر صرف کیا جاتا تھا، اس سے نسبتاً کہیں کم ہم بنیادی تحقیق پر صرف کر رہے ہیں۔ حقیقت کی تلاش اور علم میں ترقی ایک ایسا مقصد ہے جس کی عظمت کسی طرح سے بھی گرجا گھروں کی

تعبیر سے کم نہیں۔ یہ سوچنا حقیقت کے خلاف نہیں کہ انسانی تاریخ کے اس
دور کا سب سے اہم اور عظیم کارنامہ سوسائٹی میں سائینسی علوم کی ترقی ہے
اس لیے ہمیں مشہور ریاضی داں ڈیوڈ ہلبرٹ کے اس قول سے اتفاق ہونا چاہیئے
ہمیں ضرور جاننا چاہیئے' ہم ضرور جانیں گے "
ڈیوڈ ہلبرٹ نے کوئی نئی بات نہیں کہی تھی اس نے جو کچھ کہا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
کی تعلیمات کے زیر اثر صدیوں پہلے سے مسلمانوں کی تہذیب کا ایک جزو تھا مگر افسوس ہے کہ
دوسری اقوام نے اپنی تہذیب کا ایک جزو بنا لیا ہے اور ہم صدیوں سے اسے بھول بیٹھے ہیں
ترقی یافتہ ممالک میں بنیادی سائنس میں ریسرچ اور تربیت یا تو یونیورسٹیوں میں
دی جاتی ہے یا مخصوص تحقیقی مراکز میں۔ اس سلسلے کے اخراجات بالعموم نیشنل سائنس
فاونڈیشنز یا سائینسی اکاڈمیز برداشت کرتی ہیں۔
جہاں تک ترقی پذیر ممالک کا تعلق ہے یہاں بنیادی سائنس پر کوئی زور نہیں ہے
کسی وجہ سے یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ یہ غیر ضروری ہے اور یہ کہ دوسروں کی سائینسی تحقیقات سے
ہمارا کام چل سکتا ہے اس رجحان نے سائنس کے لیئے سم قاتل کا کام کیا ہے۔ ایک مثال
کافی ہوگی۔ ترقی پذیر ممالک کے حکمراں ٹولے کے اس رویے کے سبب تیسری دنیا اپنے ان
ذہین تخلیق افراد سے محروم ہو رہی ہے جنھوں نے اپنے اپنے مخصوص علمی میدانوں میں مہارت
حاصل کی تھی اور جو ممالک کی ترقی میں سائنس کے استعمال کی بابت ماہرانہ صلاح و مشورہ دے
سکتے تھے۔

۲۔ اطلاقی سائینس :۔ اطلاقی سائنس کے درج ذیل پانچ بڑے میدان ہیں

ا۔ زراعت (اس میں جنگلات' مچھلی کی پیداوار وغیرہ شامل ہیں)
ب۔ صحت عامہ اور دواسازی　(ج) توانائی یا انرجی　(د) ماحولیات اور آلودگی
ہ۔ ارضی سائنس (سینچائی' مٹی' معدنیات وغیرہ بھی)

یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ بنیادی اور اطلاقی سائنس کے درمیان فرق کی حد
نہیں کھینچی جا سکتی۔ یہی بات اطلاقی سائنس اور ٹکنالوجی کے لئے بھی صحیح ہے ان کی سرحدیں
ایک دوسرے میں مدغم ہیں اس دور میں جب کسی خاص میدان میں سائنس آگے بڑھ رہی ہے
یہ کہنا مشکل ہے کہ کون سی ریسرچ بنیادی ہے اور کون سی اطلاقی۔ سر جارج پورٹر نے

کے بقول سائنس صرف دو طرح کی ہے۔ ایک وہ جس کا اطلاق ہو چکا ہے۔ دوسری وہ جس کا اطلاق ہونا ابھی باقی ہے۔

۳۔ روایتی ادنیٰ ٹکنالوجی : روایتی ٹکنالوجی کی پانچ اہم شاخیں ہیں

(الف)۔ زیادہ مقدار کی کیمیاوی صنعتیں (ب) لوہے، فولاد اور دوسری دھاتوں کی صنعتیں
(ت)۔ پیٹرولیم کی صنعتیں (ج) کپاس چمڑے وغیرہ سے متعلق صنعتیں
(د)۔ پاور کی پیداوار

کسی ملک کی صنعتی ترقی کے لیے روایتی ٹکنالوجی میں مضبوط ہونا ضروری ہے اس لیے سائنس کے نئے قوانین یا اصولوں میں مہارت کی ضرورت نہیں۔ یہاں ماضی کی سائنس کا استعمال ہے البتہ ڈیزائن، کوالٹی، بدلتے زمانے کے ساتھ ضروری تبدیلیوں اور قیمتوں پر نگاہ ضروری ہے۔

۴)۔ اعلیٰ ٹکنالوجی : یہ ٹکنالوجی کا وہ میدان ہے جس میں دولت ہی دولت ہے آج کل اس زمرے میں درج ذیل ٹکنالوجیاں شامل ہیں۔

(الف)۔ مصنوعی خام مال (ب) مواصلاتی سائنس (۱) مائیکرو الیکٹرانکس (۲) فوٹانکس
(ج) فضائی اور خلائی سائنس (۵) اعلیٰ درجے کی کیمیاوی اشیاء (۶) بایو ٹکنالوجی

آخر الذکر یعنی بایو ٹکنالوجی سے زراعت، توانائی اور میڈیسین میں زبردست انقلاب کی توقع ہے۔

ہائی ٹکنالوجی (اعلیٰ ٹکنالوجی) روایتی ٹکنالوجی سے اس لحاظ سے مختلف ہے کہ اس میں متعلقہ بنیادی سائنس جیسے فزکس، کیمسٹری، بایولوجی وغیرہ میں اعلیٰ سطح کے تربیت یافتہ سائنس دانوں کی ضرورت ہے۔ اس میں بہت کم مقدار میں خام مال کی ضرورت ہوتی ہے۔

ترقی پذیر ممالک میں چند کو چھوڑ کر تقریباً سبھی ممالک کا یہ خیال ہے کہ اعلیٰ ٹکنالوجی ان کے بس کی چیز نہیں۔ آج اسی خیال کے بدلنے کی ضرورت ہے کیوں کہ مستقبل اسی میدان میں ہے یہ ممالک اگر یہ سوچتے ہیں کہ اعلیٰ ٹکنالوجی کو ترقی یافتہ ممالک سے منتقل کیا جا سکتا ہے تو یہ سوچنا سراسر غلط ہے کیونکہ کوئی ترقی یافتہ ملک اپنی تحقیقات سے بھرپور فائدہ اٹھانے سے پہلے اسے ترقی پذیر ممالک کو منتقل کرنے سے رہا۔ اس لیے ترقی پذیر ممالک کے کرنے کا کام یہ ہے کہ شائع شدہ تحقیقی مقالوں کی مدد سے اعلیٰ ٹکنالوجی کی بنیاد خود ڈالیں۔

ترقی پذیر دنیا کا سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں پیچھے رہنے کا ایک بنیادی سبب یہ ہے کہ

انھیں سائنسی علوم کی اہمیت کا کوئی احساس نہیں۔ وہ شاید یہ نہیں جانتے کہ سائنس کو ترقی کے لیے استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔ اس احساس کے پیدا ہونے سے کتنا فرق پڑ سکتا ہے اس کی مثال جاپان ہے وہاں کے شہنشاہ نے ۱۸۷۰ء میں میجی انقلاب کے زمانے میں پانچ حلف اُٹھائے تھے ان میں ایک حلف یہ تھا۔

" جاپان کی عظمت اور تحفظ کے لئے علم کو دنیا کے کونے کونے اور ہر ممکن طریقے سے حاصل کیا جائے گا۔"

ترقی پذیر ممالک میں سائنس اور ٹکنالوجی کتنی پیچھے ہے اس کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ ترقی یافتہ ممالک میں سائنسدانوں کی تعداد کئی ہزار فی دس لاکھ ہے۔ جبکہ ترقی پذیر ممالک میں یہ تعداد ایک یا دو سو فی دس لاکھ ہے اس پس ماندگی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ترقی پذیر ممالک سائنسی ریسرچ اور متعلقہ امور پر قومی آمدنی کا بہت کم حصہ صرف کرتے ہیں۔ یہ جان کر آپ کو حیرت ہوگی کہ جب کہ ترقی پذیر اور ترقی یافتہ ممالک دونوں گروپ دفاع پر اپنی قومی آمدنی کا تقریباً 5.6٪ یعنی برابر خرچ کرتے ہیں سائنس اور ٹکنالوجی پر ترقی پذیر ممالک کا خرچ ترقی یافتہ ممالک کے مقابلے میں قومی آمدنی کے لحاظ سے تقریباً دس گنا کم ہے اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ترقی پذیر ممالک کے لوگ سائنس کے بارے میں سنجیدگی نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ ترقی کے میدان میں جتنی مدت میں ترقی پذیر ممالک دس قدم آگے بڑھتے ہیں ترقی یافتہ ممالک سو قدم آگے بڑھ جاتے ہیں۔

مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں نہ صرف یہ کہ سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم پر کافی زور ہے بلکہ یہاں ایسے پروگرام شروع کیے گئے ہیں جن سے ملک میں سائنس کا فروغ ہو۔ یہاں کے فروغ سائنس پروگرام کافی غور و خوض کے بعد بنائے گئے ہیں اور ان کی کامیابی کے اشارے ملنا شروع ہو گئے ہیں تیسری دنیا میں شاید ہی کوئی دوسری یونیورسٹی ایسی ہو اگر یہ کام اسی انہماک لگن سے چلتا رہا تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ سرسید نے جس اُمید پر اس درس گاہ کی بنیاد ڈالی تھی اس کے پورے ہونے کا وقت زیادہ دور نہیں۔

میں ایک بار پھر تمام انعام یافتگان کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دُعا کرتا ہوں کہ خدا آپ لوگوں کی عام فہم زبان میں سائنس کی اشاعت کی کوششوں کو کامیاب کرے۔

پروفیسر عبدالسلام
ترجمہ :- پروفیسر اسرار احمد



تاج محل کے تین سو سال بعد؟

آج سے تقریباً تین سو سال قبل ۱۶۶۰ء میں جدید عالمی تاریخ کی دو عظیم یادگاریں قائم ہوئیں ایک مغرب میں۔ لندن کا سینٹ پال کیتھیڈرل۔ دوسری مشرق میں آگرہ کا تاج محل۔ بیان کی ضرورت نہیں یہ دونوں یادگاریں بذاتِ خود اس بات کا مجسم اظہار ہیں کہ تاریخ کے اس دور میں ان دو میں سے کون سی تہذیب فنِ تعمیرات، کاریگری، دست کاری، صناعی اور ثروت کی کس منزل میں تھی۔ البتہ لگ بھگ اسی زمانے میں ایک تیسری یادگار بھی وجود میں آئی جس کے بعد کے اثرات زیادہ گہرے اور دور رس ثابت ہوئے۔ یہ نیوٹن کی طبیعات کے موضوع پر شہرۂ آفاق تخلیق پرنسپیا Principia ہے مغرب کے اس شاہ کار کے ہم پلہ مغل ہندوستان میں کچھ بھی نہ تھا۔ اب میں آپ کو مختصراً بتاؤں گا کہ نادرالمثال تاج محل دینے والی ٹکنالوجی سے نیوٹن کی پرنسپیا پر قائم ٹکنالوجی سے ٹکرانے کے بعد کیا بیتی۔

اس ٹکراؤ کا پہلا دھماکہ ۱۷۵۷ء میں ہوا۔ شاہ جہاں کے تاج محل کی تعمیر کے تقریباً سو سال بعد رابرٹ کلائیو کے ہلکے پھلکے اسلحہ جات کی بہتر کارکردگی نے شاہ جہاں کے وارثوں کو شرم ناک شکست دی اور اس کے مزید سو سال بعد ہندوستانی شہنشاہ کا شاندار تاج ملکہ وکٹوریہ کے قدموں پر تھا۔ آہ! یہ صرف ایک عظیم الشان سلطنت کا خاتمہ نہ تھا بلکہ ایک تہذیب، ایک تمدن، ایک طرزِ معاشرت اور ایک ٹکنالوجی کی موت تھی ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستانی اسٹیٹ کی زبان فارسی کے بجائے انگریزی ہو گئی مشرق کے شیریں نغموں کو اسکولوں کے نصاب سے نکال کر ان کی جگہ شیکسپیئر اور ملٹن کی ادبیات کو لایا گیا۔ مشرق کے علمی خزانوں کو تاریخ کے اوراق سے اڑا دیا گیا اور ڈھاکہ کے ململ کے خاکستر پر لنکاشائر کی سوتی بیڈ شیٹوں کا محل تعمیر ہوا۔

ماہنامہ

شاداب

حیدرآباد

جلد ۱۴
شمارہ ۳
مارچ سنہ ۱۹۹۷ء
قیمت دس روپے

زر تعاون

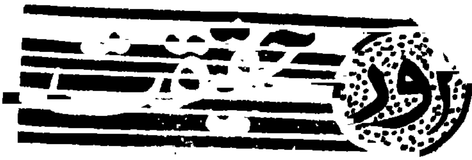
	سالانہ	دو سال کیلئے	تاحیات
ہندوستان	۱۰۰ روپے	۱۸۰ روپے	۱۵۰۰ روپے
خلیجی ممالک	۳۰۰ "	۵۵۰ "	۴۰۰۰ "
امریکہ	۵۰ ڈالر	۹۰ ڈالر	۹۰۰ ڈالر
انگلستان	۳۰ پونڈ	۵۰ پونڈ	۵۰۰ پونڈ
پاکستان	۲۰۰ روپے	۳۵۰ روپے	۴۰۰۰ روپے

ترسیل زر کا پتہ ماہنامہ شاداب ۱۴۷-۵-۱۱ ریڈ ہلز حیدرآباد

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلیشر محمد قمر الدین صابری نے نفیس فائن پرنٹنگ پریس میں چھپوا کر دفتر شاداب ۱۴۷-۵-۱۱ ریڈ ہلز حیدرآباد سے شائع کیا۔

فہرست





حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی　　قسط دوم

يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا (النور)

(اس شرط سے کہ میری عبادت کریں گے میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے۔

مت کی سب سے بڑی خدمت

پس اس وقت سب سے بڑا کام اور امت کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ اس کے عوام اور سوادِ اعظم کی صورت سے حقیقت کی طرف سفر کرنے کی دعوت دی جائے۔ صورتِ اسلام میں روحِ اسلام اور حقیقتِ اسلام پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس وقت امت کی سب سے بڑی احتیاج یہی ہے کہ اسی سے س کے خیالات اور اس کے نتیجہ میں دنیا کے حالات بدلیں گے، دنیا کے حالات اس امت کے حالات اور اس حقیقت کے تابع ہیں، یہ امت حضرت مسیح علیہ السلام کے الفاظ میں زمین کا لہ ہے، دیگ کا مزا نمک کے تابع ہے اور نمک کا مزا اس کی نمکینی پر موقوف ہے اگر ا کی نمکینی ختم ہو جائے تو وہ نمک کس کام کا؟ اور پھر کھانے کو خوش ذائقہ بنانے والی یز کہاں سے آئے گی؟ آج ساری زندگی بے کیف اور بے روح ہے اس لئے کہ اس مت کی بڑی تعداد حقیقت سے عاری اور روح سے خالی ہے پھر زندگی میں روح اور حقیقت ہاں سے آئے گی؟

دوسری قوموں کی زندگی کی جڑیں خشک ہو چکی ہیں

دنیا کی اور قومیں بھی ہیں جو ہزاروں برس سے اپنے [illegible] حقیقت اور روح سے خالی ہو چکی ہیں اور ان [illegible] بے روح رسمیں اور چند بے حقیقت صورتیں رہ گئی ہیں یکن ان قوموں کی دینی و روحانی زندگی ختم ہو چکی ہے، ان کی زندگی کے سوتے خشک ہو چکے ہیں آج دنیا کا کوئی طاقت، کوئی شخصیت، کوئی اصلاح ان میں حقیقی دینی اور [illegible] [illegible]

اخلاقی روح پیدا کرنے کی انتہائی جدوجہد کی، وہ زمانہ حال کے وسائل اور سہولتوں کے باوجود سخت ناکام رہے، اس لئے کہ درحقیقت ان میں ایمان و یقین اور دینی روح پیدا کرنے کا سرچشمہ عرصہ ہوا خشک ہو چکا ہے زندگی کا سرا اور سررشتہ کٹ چکا ہے جب کسی درخت کی جڑ خشک ہو چکی ہو اور اس کی رگیں زمین چھوڑ چکی ہوں تو اس کی پتیوں کو پانی دینے سے کچھ نہیں ہوتا۔

مسلمانوں کے لیے حقیقت کی طرف ترقی کرنے کی ضرورت لیکن اس امت کی زندگی کا سرچشمہ موجود ہے اس امت کی زندگی کا سرا موجود ہے اور یہ امت اس سے وابستہ ہے، وہ ہے اللہ اور اس کے رسول پر ایمان آخرت اور حساب کتاب کا یقین لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا اقرار اس امت کا اس گئی گذری حالت میں بھی اللہ اور اس کے رسول سے جو تعلق ہے وہ دوسری قوموں کے خواص کو بھی نصیب نہیں، اس انحطاط کے زمانہ میں بھی جتنی حقیقت اس میں پائی جاتی ہے وہ دوسری قوموں میں مفقود ہے اس کی کتاب آسمانی (قرآن مجید) محفوظ ہے اور اس کے ہاتھوں میں ہے اس کے پیغمبر کی سیرت اور زندگی جو آج بھی ہزاروں لاکھوں دلوں کو گرما دینے اور زمانہ کے خلاف لڑا دینے کی طاقت رکھتی ہے، مکمل طریقہ پر موجود ہے اور آنکھوں کے سامنے ہے صحابہ کرامؓ کی زندگی اور ان کی زندگی کا انقلاب اور ان کی کوششوں سے دنیا کا انقلاب نظر کے سامنے موجود ہے یہ سب زندگی کے سرچشمے ہیں، یہ سب حرارت اور روشنی کے مرکز ہیں صرف اس کی ضرورت ہے کہ اس امت میں صورت سے حقیقت کی طرف ترقی کی ضرورت کا عام احساس پیدا ہو، زندگی کے ان مرکزوں سے تعلق پیدا ہو اور مادی و معاشی انہماک سے ان کو مرکزوں سے اکتساب فیض کی فرصت ملے اور وہ اپنی اصل زندگی کے چند دن گذار کر اپنی زندگی میں انقلاب اور اپنی پوری زندگی میں ایمان و احتساب اور اللہ کے وعدوں پر یقین اور اس کی رضا کے شوق میں کام کی روح پیدا کرے۔

ہماری دعوت صرف یہ ہے کہ :-

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا "اے مسلمانوں صورت اسلام سے حقیقت ایمان کی طرف ترقی کرو۔"

ہمارے مستقل ہفتہ وار اجتماعات جن کی ہم شہر شہر اور قصبہ قصبہ دعوت دیتے ہیں

سی لیے ہیں کہ ہر آبادی میں ایسے مرکز قائم ہوں جہاں مسلمان جمع ہوکر اپنی زندگی کا بھولا ہوا
سبق یاد کریں جہاں سے انھیں حقیقتِ اسلام کا پیغام ملے جہاں سے ان کو اپنی کھوئی ہوئی
زندگی کا سراغ ملے جہاں سیرتِ نبویؐ اور اصلی اسلامی زندگی کے واقعات اور دین کی
بنیادی و اصولی دعوت کے ذریعہ ان میں دینی انقلاب کی خواہش پیدا ہو۔ اگر یہ مرکز اور
اس طرح کے اجتماعات نہ ہوں تو بڑے پیمانے پر اور طاقتور اور موثر طریقہ پر امت کی
اکثریت میں حقیقتِ اسلام اور "روحِ اسلام" پیدا ہونے کی کیا توقع ہے؟

پھر ہم مسلمانوں کو اس کی دعوت دیتے ہیں کہ وہ کچھ دن حقیقتِ اسلام کو حاصل کرنے
اور اس کو اپنے میں راسخ کرنے کے لیے اپنے اوقات فارغ کریں اور اس ماحول سے
نکل کر جس میں حقیقتِ اسلام پنپنے اور ایمانی کیفیات ابھرنے نہیں پاتیں، ایک ایسے ماحول
میں وقت گزاریں جہاں اصلی زندگی کی جھلک موجود ہو، جہاں علم و ذکر، دعوت و تبلیغ،
خدمت و ایثار، تواضع و خلق، محنت و جفاکشی کی زندگی ہو، ہم اس وقت مسلمانوں کو اس
مقصد کے لیے جماعتوں کی شکل میں نکلنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اگر مسلمانوں کی بڑی تعداد اس
کو جزوِ زندگی بنالے اور اس کا رواج پڑ جائے تو ہم کو اللہ کی ذات سے امید ہے کہ کروڑوں
مسلمانوں تک حقیقتِ اسلام کا یہ پیغام پہنچ جائے گا اور لاکھوں مسلمانوں کی زندگی میں
دینی روح ایمان و اسلام کی حقیقت اور اس کی صفات و کیفیات پیدا ہوجائیں گی۔

حقیقتِ اسلام دوبارہ پیدا ہوسکتی ہے

حضرات! ہم اس سے بالکل مایوس نہیں ہیں کہ اس زمانہ میں
حقیقتِ اسلام پیدا نہیں ہوسکتی، ہم کسی ایسے زمانہ اور انقلاب کے
قائل نہیں جس میں حقیقتِ اسلام دوبارہ پیدا نہیں کی جاسکتی آپ پیچھے
مڑکر دیکھیے، تاریخ کے سمندر میں آپ کو حقیقتِ اسلام کے جزیرے بکھرے ہوئے نظر آئیں گے
بارہا حقیقتِ اسلام ابھری اور ایمانی کیفیات پیدا ہوئیں۔ وہی اللہ اور رسول پر یقین و
اعتماد، وہی شہادت کا ذوق، جنت کا شوق، وہی دنیا پر آخرت کی ترجیح، جب کبھی اور
جہاں کہیں حقیقتِ اسلام پیدا ہوگئی اس نے ظاہری قرائن و قیاسات کے خلاف حالات اور
مخالف طاقتوں پر فتح پائی ہے، تمام گزرے ہوئے واقعات کو دہرادیا ہے اور قرن اول
کی یاد تازہ کردی ہے۔

حقیقتِ اسلام میں آج بھی طاقت ہے

حقیقتِ اسلام اور حقیقتِ ایمان میں آج بھی وہی طاقت

ہے جو ابتدائے اسلام میں تھی آج بھی اس سے وہ تمام واقعات ظاہر ہوسکتے ہیں جو اس سے پہلے ظاہر ہوتے ہیں آج بھی اس کے سامنے دریا پایاب ہوسکتے ہیں، سمندر میں گھوڑے ڈالے جاسکتے ہیں درندے جنگل چھوڑ کر جاسکتے ہیں، بھڑکتی ہوئی آگ گلزار بن سکتی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ حقیقتِ ابراہیمیؑ موجود ہو ؎

آج بھی ہو جو ابراہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا



(باقی سلسلہ ص ۱۵ سے آگے)

ہم کو شناور مزشناس ہونا چاہیئے۔ اگر کوئی مسلمان "خاموشی" والی بات میں کہیں گرفتار یا مبتلا ہوگیا ہو تو موقع اور حالات کے لحاظ سے اپنے لئے کوئی "پہلو" یا حکمتِ عملی اختیار کرلے علامہ اقبال کی یہ بات کتنی قدر دور رس اور گہری حقیقت کی حامل ہے

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند



(باقی سلسلہ ص ۲۵ سے آگے)

سیمینار تھا جو مسلسل تین دن تک چلتا رہا۔ اس سیمینار کو منعقد کرنے میں جناب منور پیر صحافی، جناب الیس اے انعام دار، جناب ڈاکٹر حفیظ صدیقی اور جناب امین حزیں نے سب سے اہم کردار ادا کیئے اور خاص طور پر محترمہ سیدہ واحدہ عبدالقادر دعلمی تسنیم نے پینل گروکس کی ترتیب میں مدد دی۔

اس طرح کے سیمینار اگر ہر ریاست میں ہو تو "ادبِ اطفال" پر صحیح کام ہوسکے گا اور ادب میں بچوں کے ادب کو فروغ ملے گا۔

مولانا محمد رضوان القاسمی



تعزیت کا اسلامی طریقہ

تعزیت عربی زبان کا لفظ ہے۔ اہل لغت نے ان الفاظ سے اس کا ترجمہ کیا ہے۔
تسلی دینا، صبر دینا، ماتم پرسی، پرسہ دینا، غم میں شریک ہونا۔ اسلامی انسائیکلوپیڈیا میں ہے کسی کے مرنے پر صبر کی تلقین اور اظہار ہمدردی کرنا۔ فارسی اور ہندی میں اسے سوگ کہتے ہیں۔ تعزیت اور سوگ کے مقابلے میں عربی اور اردو میں جو لفظ استعمال کیا جاتا ہے وہ "تہنیت" ہے جس کے معنی خوشی اور مسرت کے موقع پر مبارکباد دینے کے ہیں۔ قومی، ملکی اور سماجی پس منظر میں دیکھا جائے تو تعزیت اور تہنیت کے مختلف انداز اور طریقے ہیں۔ زیر نظر مضمون میں ان تمام انداز اور طریقوں کا احاطہ یا تقابلی مطالعہ مطلوب نہیں ہے بلکہ اسلام میں تعزیت کا جو معنی و مفہوم ہے اور اس سلسلہ میں پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جو ہدایات و تعلیمات ہیں۔ ان کا ذکر مقصود ہے۔
سب سے پہلے اس حقیقت پر نظر رکھنی چاہیئے کہ اس دنیا میں دکھ اور رنج بھی ہے اور آرام اور خوشی بھی۔ شادی بھی ہے اور غمی بھی ہے شیرینی بھی ہے اور تلخی بھی، سردی بھی ہے اور گرمی بھی خوشگواری بھی ہے اور ناخوشگواری بھی۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے اور آپ کے حکم اور فیصلہ سے ہوتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے والے بندوں کا حال یہ ہونا چاہیئے کہ جب کوئی دکھ اور مصیبت پیش آجائے تو وہ مایوسی اور سراسیمگی کا شکار نہ ہوں بلکہ ایمانی صبر و ثبات کے ساتھ اس کا استقبال کریں اور دل میں اس یقین کو تازہ کریں کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے جو ہمارا حکیم اور کریم رب ہے اور وہی ہم کو اس دکھ اور مصیبت سے نجات دینے والا ہے۔ اسی طرح جب ان کے حالات سازگار ہوں اور ان کی چاہتیں ان کو مل رہی ہوں اور خوشی اور شادمانی کے سامان میسر ہوں تو بھی وہ اس کو اپنا کمال اور اپنی قوت بازو کا نتیجہ نہ سمجھیں بلکہ اس وقت اپنے دل میں اس یقین کو تازہ کریں کہ یہ سب کچھ محض اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی بخشش ہے وہ جب چاہے لے لے

بخشی ہوئی ہر نعمت چھین سکتا ہے اس لئے ہر نعمت پر اس کا شکر ادا کریں، یہ اسلام کی خاص تعلیمات میں سے ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طرح طرح سے اس کی ترغیب اور تعلیم دی ہے اس تعلیم پر عمل کرنے کا ایک نتیجہ تو یہ ہوتا ہے کہ بندہ ہر حال میں خدا سے وابستہ رہتا ہے اور دوسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کبھی مصیبتوں اور ناکامیوں سے شکست نہیں کھاتا اور رنج غم کے تسلسل سے بھی اس کی جان نہیں گھلتی اور مایوسی اور دل شکستگی اس کی عملی قوتوں کو ختم نہیں کرسکتی۔ جہاں تک تعلق "مصیبت" کا ہے تو ایک حدیث سے واضح ہے کہ جو شئے بھی مسلمان ناگوار گذرے، بس وہی اُس کے حق میں مصیبت ہے گویا اس کا اطلاق نہایت وسیع اور عام ہے اور اس کے تحت چھوٹا بڑا ہر ناخوشگوار واقعہ، تکوینی آگیا، بیماری ہو، مالی نقصان ہو، دوستوں، عزیزوں کی جدائی کا صدمہ ہو، موت کا غم ہو، لاولدی ہو، توہین اور بے عزتی ہو اور اس طرح کی دوسری چیزیں، ایسے تمام مواقع پر مومن بندوں کو صبر کرنا چاہیئے جس کا مطلب یہ ہے کہ حالت غم اور شدتِ الم میں بھی وہ اپنے قدم حدودِ شریعت سے باہر نہ نکلیں۔ تاہم صبر کرنے کے معنیٰ یہ نہیں کہ بندہ بالکل بے حس ہو جائے اور غم کو غم محسوس نہ کرے اس کا نام صبر نہیں بے حسی ہے، صبر یہ ہے کہ انتہائی غم ناک و دردانگیز واقعہ پر بندہ عقل کو نفس پر غالب رکھے۔ زبان کو شکوہ اور ناشکری سے آلودہ نہ ہونے دے اور نظر مسبب الاسباب پر، اس کی مصلحت و حکمت پر، اس کی شفقت و حکمت پر رکھے۔

بقول اکبر الہ آبادی

غم میں بھی قانونِ فطرت سے میں کچھ بدظن نہیں
یہ سمجھتا ہوں کہ میرا دوست ہے دشمن نہیں

صبر کے سلسلہ میں یہ تو "عقیدۂ قلب" ہوا۔ جہاں تک معاملہ زبان کا ہے تو چھوٹی بڑی ہر ناگواری کے موقع پر جو کلمہ اس سے نکلنا ہے "انا للہ وانا الیہ راجعون" یعنی بے شک ہم اللہ ہی کے لئے ہیں بیشک ہم اسی کی طرف (خواہ آج، خواہ چند روز بعد) واپس ہونے والے ہیں۔ (البقرہ 156) غور کریں تو اس کلمہ میں تین چیزوں کی تعلیم مل رہی ہے ایک یہ کہ ہم سب عبد محض ہیں اور تمام تر اسی اللہ کی ملک ہم خود بھی اور ہماری ہر چیز بھی۔ اپنی کوئی شئے ہی نہیں، نہ بیوی نہ بچے، نہ مال نہ جائیداد، نہ وطن، نہ خاندان، نہ جسم نہ جان۔

اکبر الہ آبادی ہی کے بقول۔

جو کچھ ہے سب خدا کا وہم و گمان ہمارا

انسان کے سارے رنج و غم ' درد و حسرت کی بنیاد صرف اس قدر ہوتی ہے کہ وہ اپنی محبوب
چیزوں کو اپنی سمجھتا ہے۔ لیکن جب ذہن اس عام مغالطہ سے خالی ہو جائے اور کوئی سی بھی شئے
ہو ' سرے سے اپنی ہی نہ ہے تو گلہ و شکوہ اور رنج و ملال کا موقع کہاں باقی رہتا ہے۔ دوسری
بات یہ ہے کہ بڑے بڑے رنج اور صدمے اور دل کے داغ بھی عارضی اور فانی ہیں ' رہ جانے والے
ئی بھی نہیں ہیں عنقریب انہیں چھوڑ چھاڑ کر مالک کی خدمت میں حاضری دینا ہے ' تیسرے یہ
وہاں پہنچتے ہی سارے قرضے بے باق ہو جائیں گے۔ ہر کھوئی ہوئی چیز وصول ہو کر رہے گی
. تینوں عقیدے جس کے جتنے زیادہ مضبوط ہوں گے ' اسی قدر اس کے دل کو دنیا میں امن و سکون
صل رہے گا۔ بقول مولانا عبدالماجد دریابادی۔

غم و حزن کے بار کو ہلکا کرنے کا جو عارفانہ اور بیتر بہدف نسخہ قرآن کی اس آیت میں بتایا گیا ہے
صحائف کائنات میں بے نظیر ہے۔ " رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت تاریخ کا بیان ہے
آپ ادنیٰ ' ادنیٰ تکلیف یا ناگواری (کانٹا چبھ گیا ' چراغ بجھ گیا ' سوئی گم ہو گئی وغیرہ) کے موقع
ربھی یہ کلمہ زبان پر لاتے ہوتے۔ اور یہی معمول صحابہ کرام کا رہا ہے۔ ان کے نقش قدم پہ جو لوگ چلیں
. اور انا للہ وانا الیہ راجعون کی حقیقت کو دل و دماغ میں اتارتے ہوئے زبان سے
ں کلمہ کو ادا کریں گے ' ایسے ہی لوگوں پر قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے کہ " ان پر نوازشیں ہوں گی
ن کے پروردگار کی طرف سے اور رحمت بھی اور یہی لوگ راہ یاب ہیں " (البقرہ 157)

انا للہ وانا الیہ راجعون کے سلسلہ میں جو بعض روایات آئی ہیں ان کا
ا موقع پر مطالعہ کرنا مزید ایمانی تقویت کا باعث ہوگا۔ ایک حدیث میں ہے کہ " جب کوئی بندہ
یبت کے وقت انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی مصیبت کو دور فرما دیتا ہے
اکو اچھے انجام سے نوازتا ہے اور اس کو اس کی پسندیدہ چیز اس کے صلہ میں عطا فرماتا ہے۔ ایک مرتبہ
کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا چراغ بجھ گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انا للہ وانا الیہ راجعون
پڑھا۔ کسی نے کہا یا رسول اللہ کیا چراغ بجھنا بھی کوئی مصیبت ہے آپ نے فرمایا
جی ہاں ــــ ! جس بات سے بھی مومن کو دکھ پہنچے وہ مصیبت ہے (بخاری)

حضرت ابو موسیٰ اشعری کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ " جب کسی
ندے کا کوئی بچہ مرتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے پوچھتا ہے کہ کیا تم نے میرے بندے کے بچے کی

جان قبض کرلی؟ وہ کہتے ہیں ــــ "ہاں ۔" پھر وہ ان سے پوچھتا ہے تم نے اس کے
کے ٹکڑے کی جان نکال لی ــ؟ وہ کہتے ہیں " ہاں " پھر وہ ان سے پوچھتا ہے تو میرے
بندے نے کیا کہا' وہ کہتے ہیں ۔ اس مصیبت میں اس نے تیری حمد کی " اور انا للہ وا
الیہ راجعون پڑھا" ۔ تو اللہ تعالیٰ ان سے فرماتا ہے ۔ میرے اس بندے کے لئے جنت
میں ایک گھر تعمیر کرو اور اس کا نام " بیت الحمد " (شکر کا گھر) رکھو " ۔ (ترمذی)

ایک حدیث میں ہے کہ جس مسلمان مرد یا عورت پر کوئی مصیبت آئی ۔ اسے یاد کرکے جو
انا للہ وانا الیہ راجعون کہے ۔ اگرچہ مصیبت کو زمانہ گذر گیا ہو تو اللہ تعالیٰ اس پر
نیا ثواب عطا فرماتا ہے اور ویسا ہی ثواب دیتا ہے جیسا اس دن کہ جس دن نئی مصیبت آئی تھی او
اس نے اس وقت انا للہ وانا الیہ راجعون کہا تھا (احمد و بیہقی)

ایک انسان خود کسی مصیبت میں گرفتار ہوا ہو یا کسی مصیبت زدہ کی مصیبت کا واقعہ'
سامنے آیا ہو' یا کسی کا انتقال ہوگیا ہو' ہر صورت میں انا للہ وانا الیہ راجعون
کہنا چاہئیے ۔ مصیبت زدہ لوگوں کی تعزیت کرنا' خواہ اس کے پاس جاکر یا وہ آیا ہو تو ملاقات
دوران یا کسی کے ذریعہ پیغام بھیج کر یا خط لکھ کر یہ تمام صورتیں نبی کریم' ہادئ اعظم محمد صلی اللہ
سے ثابت ہیں ۔ جس کا اندازہ آپ کو درج ذیل حدیثوں سے ہوسکے گا ۔

حضرت قرۃ بن ایاس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب تشریف
فرماتے تو آپ کے صحابہ میں سے کچھ لوگ آپ کے پاس بیٹھ جاتے ۔ ان بیٹھنے والوں میں سے ایک
صاحب تھے جن کا ایک چھوٹا بچہ تھا ۔ یہ بچہ حضور کے پاس آپ کی پشت کی جانب سے آتا تو آپ
کو اپنے سامنے بٹھالیتے ۔ پھر ایسا ہوا کہ وہ بچہ مرگیا' تو بچہ کا باپ اس کے غم میں کچھ دنوں آپ کی مجلس
میں نہیں آیا ــ تو آپ نے دریافت فرمایا کہ وہ شخص کیوں نہیں آتا ؟ کیا بات ہے؟ لوگوں نے
بتایا کہ ان کا چھوٹا بچہ جسے آپ نے دیکھا تھا انتقال ہوگیا (شاید اسی وجہ سے وہ نہیں آرہے
یہ خبر پاکر آپ ان سے ملاقات کے لئے تشریف لے گئے اور بچہ کے بارے میں دریافت فرمایا ــــ
انہوں نے بتایا کہ اس بچہ کا انتقال ہوگیا ہے تو آپ نے انہیں تسلی دی' پھر فرمایا' بتاؤ تمہیں کیا
پسند ہے ؟ " کیا یہ بات پسند ہے کہ وہ بچہ زندہ رہے یا یہ پسند ہے کہ وہ بچہ پہلے چلا جا
اور جنت کا دروازہ تمہارے لئے کھولے اور جب تم پہنچو تو وہ تمہارا استقبال کرے ؟ (نسائی شر
سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ " نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب غزوہ احد سے واپس تشریف

لائے تو خواتین اپنے اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کا حال معلوم کرنے کے لئے حاضر ہوئیں۔
جب حضرت حمنہ بنت جحش آپ کے سامنے آئیں تو آپ نے ان کو صبر کی تلقین فرمائی اور کہا اپنے بھائی عبداللہ پر صبر کرو، انھوں نے انا للّٰہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور دعائے مغفرت کی، پھر آپ نے فرمایا "اپنے ماموں حمزہ پر بھی صبر کرو"۔ انھوں نے پھر انا للّٰہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور دعائے مغفرت کی۔

حضرت اسامہ ابن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی (حضرت زینب رضی اللہ عنہا) نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کہلا بھیجا کہ میرے بچے کا آخری دم ہے اور چل چلاؤ کا وقت ہے لہذا آپ اس وقت تشریف لے آئیں۔
آپ نے اس کے جواب میں سلام کہلا بھیجا اور پیام دیا کہ بیٹی: اللہ تعالیٰ کسی سے جو کچھ لے وہ بھی اسی کا ہے اور کسی کو جو کچھ دے، وہ بھی اسی کا ہے۔ الغرض ہر چیز ہر حال میں اسی کی ہے (اگر کسی کو کوئی چیز دیتا ہے تو وہ اس کی اپنی ہے اور کسی سے لیتا ہے تو اپنی چیز لیتا ہے) اور ہر چیز کے لئے اس کی طرف سے ایک مدت اور وقت مقرر ہے (اور اس وقت کے آجانے پر وہ چیز دنیا سے اٹھالی جاتی ہے) پس چاہیئے کہ تم صبر کرو اور اللہ تعالیٰ سے اس صدمہ کے اجر و ثواب کی طالب بنو۔ صاحبزادی صاحبہ نے پھر آپ کے پاس پیام بھیجا اور قسم دی کہ اس وقت حضور ضرور ہی تشریف لے آئیں۔ اس کے بعد آپ جانے کے لئے اٹھے۔ آپ کے اصحاب میں سے سعد بن عبادہ، معاذ بن جبل، ابی بن کعب، زید بن ثابت اور چند اور لوگ آپ کے ساتھ شامل ہو گئے۔ بچہ (یعنی آپ کا نواسہ) اٹھا کر آپ کی گود میں دیا گیا، اس وقت اس کا سانس اکھڑ رہا تھا، اس کے اس حال کو دیکھ کر آپ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس پر حضرت سعد بن عبادہ نے عرض کیا —— "حضرت یہ کیا؟" —— آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ رحمت کے اس جذبے کا اثر ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دلوں میں رکھ دیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت ان ہی بندوں پر ہوگی، جن کے دلوں میں رحمت کا یہ جذبہ ہو۔ (اور جن کے دل سخت اور رحمت کے جذبے سے بالکل خالی ہوں وہ خدا کی رحمت کے مستحق نہ ہوں گے۔" (مسلم)

اسی طرح کا واقعہ خود آپ کی ذات سے متعلق ہے آپ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم آپ کی گود میں تھے یہ وقت ان کی جاں کنی کا تھا یہ رقت انگیز منظر دیکھ کر آپ کی آنکھوں سے

آنسو ٹپکنے لگے اور فرمایا —— "اے ابراہیم ہم تیری جدائی سے مغموم ہیں مگر زبان سے وہی نکلے گا جو پروردگار کی مرضی کے مطابق ہوگا۔" (مسلم)

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان کے ایک لڑکے کا انتقال ہو گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہ تعزیت نامہ لکھوایا۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اللہ کے رسول محمد (علیہ الصلوۃ والسلام) کی طرف سے معاذ بن جبل کے نام۔ میں پہلے اس اللہ کی تم سے حمد بیان کرتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں (بعد ازاں) دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تم کو اس صدمہ کا اجر عظیم دے اور تمہارے دل کو صبر عطا فرمائے اور ہم کو اور تم کو نعمتوں پر شکر کی توفیق دے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری جانیں، ہمارے مال اور ہمارے اہل و عیال، یہ سب اللہ تعالیٰ کے مبارک عطیے ہیں اور اس کی سونپی ہوئی امانتیں ہیں (اس اصول کے مطابق تمہارا لڑکا بھی اللہ تعالیٰ کی امانت تھا) اللہ تعالیٰ نے جب تک چاہا خوشی اور عیش کے ساتھ تم کو اس سے نفع اُٹھانے اور جی بہلانے کا موقع دیا اور جب اس کی مشیت ہوئی اپنی اس امانت کو تم سے واپس لے لیا اور وہ تم کو اس کا بڑا اجر دینے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی خاص نوازش، اس کی رحمت اور اس کی طرف سے ہدایت کی تم کو بشارت ہے اگر تم نے ثواب اور رضائے الٰہی کی نیت سے صبر کیا۔ پس اے معاذ۔ صبر کرو، اور ایسا نہ ہو کہ جزع و فزع (آہ و بکا چیخ و پکار) تمہارے اجر کو غارت کر دے اور پھر تمہیں ندامت ہو (کہ صدمہ بھی پہنچا اور اجر سے بھی محرومی رہی) اور یقین رکھو کہ جزع و فزع سے کوئی مرنے والا واپس نہیں آتا اور نہ اس سے دل کا رنج و غم دور ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو حکم اترتا ہے وہ ہو کر رہنے والا ہے بلکہ یقیناً ہو چکا ہے"
(المعجم الکبیر للطبرانی)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس تعزیت نامہ میں ہر اس صاحب ایمان بندے کے لئے تعزیت و نصیحت اور تسلی و تشفی کا پورا سامان ہے، جس کو کوئی صدمہ پہنچے۔ کاش اپنی مصیبتوں میں ہم رسول اللہ کی اس ایمان افروز تعزیت و نصیحت سے سکون حاصل کریں اور صبر و شکر کو اپنا شعار بنائیں۔ تعزیت کے سلسلہ میں اوپر جو حدیثیں اور روایتیں درج کی گئی ہیں ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے علماء نے تعزیت کو "سنت" قرار دیا ہے۔ صراحتاً حدیث بھی ہے کہ جو شخص اپنے بھائی کو کسی مصیبت میں تعزیت کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو

قیامت کے دن بزرگی کے لباس پہنائے گا (ابن ماجہ)۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ جو کسی مصیبت والے کی تعزیت کریگا اس کو بھی برابر کا ثواب ملے گا۔ (ترمذی)

تعزیت کا جو انداز ہونا چاہئیے۔ اس کا ایک بہترین خاکہ اس تعزیت نامہ میں ہے جسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل کے لئے لکھوایا تھا اس میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں فاعظم اللہ لک الاجر والهمک الصبر ورزقنا وایاک الشکر (اللہ تعالیٰ تمہیں اجرِ عظیم دے اور تمہیں صبر دے اور ہمیں اور تمہیں شکر کی توفیق بخشے)۔

آپ اپنی صاحبزادی حضرت زینب کو ان کے فرزند کی وفات کے موقع پر جو تعزیتی الفاظ ارشاد فرمائے تھے ان میں بھی ہمارے لئے نمونہ ہے۔ آپ نے فرمایا تھا۔

" ان للہ ما اخذ ولہ ما اعطی وکل عندہ باجل مسمی فلتصبر ولتحتسب" (جو لے لیا وہ اللہ ہی کا تھا جو دیا وہ اسی کا تھا اور اللہ کے یہاں ہر ایک چیز ایک معین حد (مدت) تک ہے۔ پس صبر کرو اور ثواب کی اُمید رکھو۔

جو شخص تعزیت کر رہا ہو اس کے لئے یہ الفاظ بھی آئے ہیں

" اعظم اللہ اجرک واحسن عزاءک وغفر لمیتک"

(اللہ تعالیٰ تجھ کو اجر عظیم عطا فرمائے، تیرے صبر کا اچھا بدلہ دے اور تیرے مردے کو بخش دے)

اگر میت غیر مکلف ہو یعنی بچہ یا مجنوں ہو تو غفر لمیتک کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔

یہاں ایک پہلو اور قابل ذکر ہے وہ یہ کہ اسلام میں اعلیٰ انسانی اخلاق و اقدار کا جو تصور ہے اس کے پیشِ نظر یہ کیسے ممکن تھا کہ غیر مسلم کی بیماری میں اس کی طرف سے تیمار داری اور مزاج پرسی نہ ہو۔

ایک حدیثِ قدسی میں تو مطلق انسان کی بعض اہم ضرورتوں (کھانا، پینا، عیادت اور مزاج پرسی اور تیمارداری وغیرہ) کو اللہ تعالیٰ نے اپنی ضرورتیں قرار دیتے ہوئے ان کی تکمیل کی کے لئے آنے والوں کو اپنی رضا اور قرب کا پروانہ عطا فرمایا ہے اور ایسے مواقع پر نہیں آنے والوں کو قیامت میں مواخذہ اور باز پرس کی خبر سنائی گئی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے غیر مسلم بیمار کی عیادت ثابت ہے۔ اسی طرح جب انتقال ہو جائے تو غیر مسلم رشتہ داروں کی تعزیت کرنی چاہئیے، جس میں مناسب حال تسلی و تشفی کے کلمات ہوں۔ اس سلسلہ میں فقہی کتابوں میں جو الفاظ ملتے ہیں وہ یہ ہیں۔
" اعظم اللہ اجرک واحسن عزائک " (الموسوعۃ الفقہیہ جلد ۱۲ صفحہ ۲۸۹) اسی طرح یہ جملہ بھی ہے۔ " اخلف اللہ علیک خیرا واصلحک " (فتاوی محمودیہ جلد ۹ صفحہ ۱۶۱)۔ ان دونوں جملوں کا مفہوم یہ ہے کہ اس مصیبت پر اللہ تعالیٰ بڑا اور اچھا بدلہ دے، بعد میں اچھی صورت نکالے اور حال درست فرمادے۔ بہتر یہ ہے کہ میت کے تمام قریبی رشتہ داروں سے تعزیت کی جائے۔ خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے۔ مرد ہوں یا عورت، مگر عورت کے سلسلہ میں یہ قید ہے کہ وہ محرم ہو غیر محرم نہ ہو۔ تعزیت کا وقت موت سے لے کر تین دن تک ہے۔ اس کے بعد پسندیدہ نہیں ہے کہ غم تازہ ہوگا لیکن اگر تعزیت کرنے والا یا جس کی تعزیت کی جائے وہاں موجود نہیں ہے یا اسے علم نہیں ہے تو بعد میں حرج نہیں۔ جو ایک بار تعزیت کے لئے جاکر آیا اسے دوبارہ تعزیت کے لئے جانا پسندیدہ نہیں ہے۔ یہ بھی علم رہے کہ تین دن سے زیادہ سوگ جائز نہیں ہے۔ مگر وہ عورت جس کے شوہر کا انتقال ہو گیا ہے اس کے لئے چار ماہ دس دن سوگ کرنے کی اجازت ہے۔ سوگ کے اس زمانے کی جو تفصیلات اور حکمتیں ہیں وہ اہل علم سے معلوم کی جاسکتی ہیں۔ اسی طرح مردوں کی اچھائی کا تذکرہ تو کرنا چاہئیے لیکن برائیوں کے سلسلہ میں زبان روک لینا چاہئیے
یہ بھی واضح رہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایام جاہلیت میں رواج یافتہ ماتمی رسوم کو یکسر ختم کر دیا اور انسان کے فطری غم کے اظہار کے لئے تہذیب و شرافت کے دائرہ میں رہتے ہوئے تعزیت کی جو بہتر صورتیں ہوسکتی ہیں ان کی اجازت دی ہے جس کا حاصل ہے میت کے لئے دعائے مغفرت اور ایصال ثواب اور اہل میت کے لئے تشفی و تسلی کے کلمات اور صبر کی تلقین ہے ان سے ہٹ کر دوسری قوموں اور تہذیبوں سے خوشہ چینی کرنا اور نئے نئے طریقے وضع کرنا افسوسناک بھی ہے اور اسلامی غیرت اور دینی حمیت کے خلاف بھی۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ جو شخص کسی دوسری قوم کے اخلاق و عادات اور اطوار و کردار کی پیروی کرنے لگے وہ انہیں میں سے ہو جاتا ہے اس لئے اپنے ہر عمل کو سنت اور شریعت کی کسوٹی پر جانچنے اور پرکھنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اسلام ایک

مکمل دین اور مستقل تہذیب ہے کسی دوسرے مذہب اور تہذیب و تمدن سے کوئی چیز لینے کی ضرورت نہیں ہے اسی لئے سورہ بقرہ آیت (208) میں اہل ایمان سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جائیں، یعنی اسلامی عقائد و اعمال اور احکام و تعلیمات کی صداقت و حفاظت پر دل و دماغ بھی مطمئن ہو اور اعضاء و جوارح بھی اس کا ثبوت پیش کر رہے ہوں۔

جہاں تک تعلق سوگ میں خاموشی کا ہے تو یہ مغربی تہذیب کا اپنا انداز ہے اسلامی شریعت سے اس کا تعلق نہیں ہے۔ فتاوی رحیمیہ، مشہور فقہ و فتاوی کی کتاب ہے اس کے مولف معروف و ممتاز عالم دین مولانا مفتی سید عبدالرحیم لاجپوری ہیں۔ ان سے ایک صاحب نے سوال کیا کہ مسلمانوں میں کسی لیڈر یا بڑے آدمی کی وفات پر انگریزوں کی طرح دو منٹ گردن جھکا کر ساکت کھڑے رہ کر سوگ (تعزیت) منانے کا طریقہ رواج پا رہا ہے۔ کیا یہ جائز ہے؟ حضرت مفتی صاحب نے یہ جواب دیا کہ سوگ منانے کا مذکورہ طریقہ جائز نہیں ہے؟ اس میں دوسری قوم کے ساتھ مشابہت لازم آتی ہے۔ لہذا اس رواج کو ترک کر دینا ضروری ہے فتاوی رحیمیہ جلد اول صفحہ 385) اس فتوی کو نقل کرنے سے اسلامی نقطہ نظر کی تحقیق اس سے روشناس کرانا اور اس کو اختیار کرنے کی دعوت ہے نہ کہ کسی کے عمل، طریقہ اور رواج کی تحقیر و تضحیک۔ قرآن کا فرمان ہے ـــ کل حزب بما لدیھم فرحون (الروم۔ 32) یعنی ہر گروہ اپنے اس طریقے پر نازاں ہے جو اس کے پاس ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے اس کی تفسیر میں لکھا ہے کہ "یہ حقیقت تو بالکل کھلی ہوئی ہے کہ ہر گروہ اور ہر ٹولی عام اس سے کہ وہ اہل حق میں سے ہو یا اہل باطل سے بس اپنے ہی مزعومات و معتقدات یا آج کل کی زبان میں اپنی آئیڈیالوجی ہی میں مست ہے۔" اس لئے اگر کسی تہذیب اور معاشرت میں، اجتماعی تعزیت کے موقع پر کچھ دیر کی "خاموشی" کا عنوان اختیار کیا گیا ہو تو یہ اس کا "اندرون خانہ" معاملہ ہے اہل اسلام کا طریقہ وہی ہونا چاہئیے۔ جس کی وضاحت اوپر کی سطروں میں کی گئی ہے۔ خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کا حلقہ ہو تو تعزیت کا اسلامی طریقہ ہی اپنانا چاہئے اسے چھوڑ کر کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرنا۔ اسلامی شان کے خلاف ہے دیکھنے میں بعض چیزیں چھوٹی معلوم ہوتی ہیں مگر چھوٹی چیزوں کا اہتمام کرنے والا ہی بڑی چیزوں کی رعایت اپنی زندگی میں کر سکتا ہے ایک عاشق اور محب کو تو "مزاج یار" (بقیہ)

محمد ثناء اللہ عمری ایم اے عثمانیہ

قلم کی طاقت

قلم کی طاقت اور قوت ہر وقت اور ہر جگہ مسلم رہی ہے، بلا شبہ تقریر کی قوت بھی اپنے اثرات اور برکات رکھتی ہے لیکن یہ نتائج و ثمرات بہر حال محدود ہیں الا یہ کہ انھیں تحریری شکل میں لالیا جائے اور انھیں زیورِ طبع سے آراستہ کرکے ان کی عام اشاعت کی جائے، مثلاً اردو ادب میں مولانا ابوالکلام آزاد کی تقریریں اور خطبات ہیں کہ اپنی اصلی شکل و صورت میں انتہائی مفید اور موثر ہونے کے علاوہ کتابی صورت میں بھی بڑی معلوماتی اور ولولہ انگیز ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ نوکِ قلم سے جو رشحات نکلتے ہیں ان کا دائرۂ اثر بہت وسیع ہوا کرتا ہے دُنیا میں چھوٹے چھوٹے، بڑے بڑے جو بھی کام انجام پائے اور جو بھی انقلاب برپا ہوئے ہیں ان میں قلمی جد و جہد کا بہت بڑا حصہ رہا ہے، دنیا کے نامور اصحابِ قلم نے گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر ایسے کاموں اور کارناموں کی داغ بیل ڈالی ہے جن کا تصور بھی دنیا دار لوگوں کے لئے مشکل تھا۔ اُن اولوالعزم ہستیوں نے عالمی رائے عامہ کو بدلنے اور اسے اپنا ہمنوا بنالینے اور سنگلاخ زمین کو ہموار کرلینے میں پوری کامیابی حاصل کی۔

۱۷۸۹ء کا انقلاب فرانس عالمِ انسانیت کا ایک بہت بڑا واقعہ گردانا جاتا ہے اس کے پس منظر میں تاریخ سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ جان روسو اور اس کے نقشِ قدم پر چلنے والے مفکروں نے جو اپنے علمی تجربہ کے باعث ENCYCLOPAEDISTS کہلاتے، فرانسیسی عوام و خواص کے دل و دماغ میں ایسی ہلچل ڈال دی کہ ان اصحابِ قلم کے واضح کئے ہوئے نشانِ راہ کے مطابق ایک ہمہ گیر سیاسی انقلاب ناگزیر ہوگیا جس نے زندگی کے تمام گوشوں کو بے حد متاثر کیا۔ تاریخ کی رو بدل دی۔ یہ دیکھ دنیا کے دور و نزدیک کے تمام علاقوں سے اس کی بازگشت آج بھی سنائی دے رہی ہے اور اس انگریزی کہاوت کی صداقت واضح کر رہی ہے کہ:-

THE PEN IS MIGHTIER THAN THE SWORD

یعنی ــــ قلم تلوار سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔

قلم دراصل ایک دو دھاری تلوار ہے جس سے اچھے اور برے دونوں قسم کے کام لیے جا سکتے ہیں، اس کے طفیل حق کی تبلیغ و اشاعت کے ساتھ باطل کی حمایت اور تشہیر بھی ہو سکتی ہے، یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہو کہ انسان نے اللہ کی دی ہوئی اس طاقت کو سب سے زیادہ غلط ہی طریقوں پر استعمال کیا۔ دنیا کے اسٹیج پر جو بر خود غلط مذہبی، سیاسی، سماجی اور اخلاقی افکار و خیالات چھائے ہوئے ہیں وہ سب کے سب غیر ذمہ دارانہ جنبشِ قلم ہی کے برگ و بار ہیں۔

اسلام میں ادب برائے ادب کا تصور نہیں ہے جو بے لگام بن کر انسانیت کی تمام قدروں کو روندنا اور حرفِ غلط کی طرح مٹا دینا چاہتے ہے، گذشتہ صدیوں میں یورپ اور امریکہ کے "ادیب" نے مذہبی اور جنسی اعتبار سے جو خطرناک کروٹیں لی ہیں اور جس کی یہ بے ڈھنگی رفتار بغیر روک ٹوک کے آج بھی جاری ہے اور جس کے تباہ کن اثرات عالمی ادب پر مرتب ہوئے ہیں ان کی کہانی بڑی طولانی ہے اور پڑھے لکھے لوگوں کے لئے ان کا اعادہ ضروری نہیں، ان کی طرف اشارہ کافی ہے۔

مثال کے طور پر ایک فرائڈ ہی کو لیجئے اور دیکھئے کہ آں نے انسان کے جنسی تعلقات کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے، اس بدبخت کو یہ کہتے ہوئے بھی شرم نہ آئی کہ بچہ ماں کے چھاتی سے دودھ پیتا رہتا ہے تو اس کی جنسی خواہش اور شہوت کو تسلی ملتی رہتی ہے، ماں سا مقدس رشتہ بھی اس کی گندی ذہنیت سے محفوظ نہ رہ سکا ع

وائے گر در پسِ امروز بود فردائے

دنیا جو چاہے کہہ لے اور کرے۔ مگر امت مسلمہ ایسا نہیں کر سکتی، اس لئے کہ دنیا والوں کی طرح وہ اپنی مرضی کی آپ مالک نہیں، اس نے اپنی مرضی اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تابع کر دی ہے لہذا اسے اپنی تمام صلاحیتیں، اپنی پسند اور ناپسند کے تحت ضائع نہیں کرنی چاہئیں بلکہ اپنے مالک و مولیٰ کی بتائی ہوئی راہ پر لگا دینی چاہئیں، یہ صلاحیتیں ہمیں ملی ہی اس لئے ہیں کہ ان کا برمحل استعمال ہو اور ایسا استعمال وہی ہے جس کی تفصیل کتاب و سنت کے صفحات میں موجود ہے اس کے علاوہ جو کچھ ہے صریح مغالطہ ہے۔ عین ضلالت ہے اور قطعاً درخور التفات نہیں، یہ سودا امت مسلمہ کے حق میں مہنگا پڑے گا۔ سورۂ نور میں ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَن تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ

جو لوگ چاہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں میں فحش پھیلے وہ دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب کے مستحق ہیں۔ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

قرآن مجید نے جابجا یہ حقیقت بھی واضح کی ہے کہ حواس انسانی کے استعمال کی بابت قیامت کے روز باز پرس ہوگی جو ہر قسم کی قوتوں اور قابلیتوں کا منبع ہیں، سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا۔

إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا (۳۶)

یاد رکھو، کان، آنکھ عقل ان سب کے بارے میں باز پرس ہونے والی ہے۔

سورۂ نور کی ایک اور آیت ہے :

يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۔ (۲۴)

وہ اس دن کو بھول نہ جائیں جب کہ ان کی اپنی زبانیں اور ان کے اپنے ہاتھ پاؤں اُن کے کرتوتوں کی گواہی دیں گے۔

یہاں تک تو انسانی قویٰ کی بابت عام بیان تھا جو قرآن نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے اللہ کی اس آخری کتاب نے بعض مقامات پر خاص طور پر قلم کا نام لیا ہے۔ بلکہ قلم کی قسم بھی اللہ نے کھائی ہے اور معلوم ہے کہ قرآن کی قسمیں مقسم بہ کی اہمیت اور عظمت پر دلالت کرتی ہیں، قلم کی قسم سے جس سورت کا آغاز ہوا ہے وہ سورۂ قلم کہلاتی ہے۔

چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے،

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ ۔ (۱)

قسم ہے قلم کی اور اس چیز کی جسے لکھنے والے لکھ رہے ہیں۔

واضح رہے کہ یہاں قسم قلم اور اس کے عمل رقم دونوں کی کھائی گئی ہے اس دوہری قسم سے اس ذریعۂ ارقام کی دگنی اہمیت معلوم ہوتی ہے

قرآن کی نظر میں قلم کی اہمیت اور عظمت اس حقیقت سے اور زیادہ آشکارا ہو جاتی ہے کہ اس سے تعلیم و تدریس کا ذکر سب سے پہلی وحی میں کیا گیا ہے، چنانچہ سورۂ علق میں فرمایا:

اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ○ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ○ اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ○ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ○ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ○ (۱-۵)

پڑھو (اے نبیؐ) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا، جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی پڑھو اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا، انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اس آیت پر بڑا اچھا نوٹ لکھا ہے رقمطراز ہیں "یعنی یہ اس کا انتہائی کرم ہے کہ اس حقیر ترین حالت سے ابتدا کر کے اس نے انسان کو صاحب علم بنایا جو مخلوقات کی بلند ترین صفت ہے اور صرف صاحب علم ہی نہیں بنایا بلکہ اس کو قلم کے استعمال سے لکھنے کا فن سکھایا جو بڑے پیمانے پر علم کی اشاعت، ترقی اور نسلاً بعد نسلٍ اس کے بقاء اور تحفظ کا ذریعہ بنا، اگر وہ الہامی طور پر انسان کو قلم اور کتابت کے فن کا علم نہ دیتا تو انسان کی علمی قابلیت ٹھٹھر کر رہ جاتی اور اسے نشو و نما پانے، پھیلنے اور ایک نسل کے علوم دوسری نسل تک پہنچنے اور آگے مزید ترقی کرتے چلے جانے کا موقع ہی نہ ملتا"۔

(تفہیم القرآن، ششم ص ۳۹۶)

لکھنے لکھانے کا عمل اکثر و بیشتر طبیعتوں پر شاق گزرتا ہے، لوگ عموماً بولتے زیادہ ہیں اور لکھتے بہت کم ہیں، اس کی ایک وجہ انسان کی سہل پسندی ہے، قلم چلانے کا کام بڑا وقت طلب، صبر آزما اور دشوار گزار، لوگ عموماً اسی وجہ سے اس طرف مائل نہیں ہوتے، بس سوچا کرتے رہتے ہیں کہ کیا کیا لکھیں اور کیسے لکھیں اور کیسے لکھیں!

بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق مرحوم نے بڑے پتہ کی بات لکھی ہے، فرماتے ہیں لکھنا سے آتا ہے، جیسے تیرنے سے تیرنا ــــ بات سولہ آنے درست ہے، ظاہر ہے کہ آدمی تیراکی کے اصول از بر کر لے، مگر انھیں برتے نہیں، پانی میں اتر کر ہاتھ پیر مارے بنیں تو تیراکی کیا خاک سیکھے گا! اس کے برعکس ندی نالے میں اترے گا اور تیراکی کے اصول وقواعد برتے گا تب کہیں جا کر وہ تیرنے لگے گا۔ لکھنے لکھانے کا بھی یہی حال ہے، یہاں بھی اقدام مشق و ممارست کی ضرورت ہے، یہ چیزیں جس تناسب سے حاصل ہوں گی قلم پر قدرت اسی تناسب سے حاصل ہوگی، ابتدائی ناکامی ہمیں پست ہمت نہ بنا دے، بلکہ مہمیز کا کام دے۔

جب قلم چلنے لگے تو ہر نوشتہ کو حرف آخر نہ سمجھا جائے، بلکہ جیسا کہ بعض اصحاب نے لکھا ہے اول وہلہ میں لکھی ہوئی چیز کو چند سے کہیں رکھ چھوڑا جائے، کیا مبتدی، کیا اپنی تحریر پر دوبارہ نظر ڈالے گا تو خود ہی محسوس کر لے گا اس میں ایک طرف

حشو و زوائد ہیں تو دوسری طرف نقص اور کوتاہی ہے، یہ احساس اسے آمادہ کرے گا کہ وہ مسودے کو حتی الوسع بہتر سے بہتر بنائے، نظر ثانی بلکہ بار بار کے مطالعہ سے کم سے کم دو فائدے حاصل ہوں گے زبان اور اسلوب بہتر ہوں گے اور مواد کی کمی بیشی بھی دور ہو جائے گی، اس عمل کو حک و اصلاح کہہ لیجئے جو قلمی زندگی کا ایک مانا ہوا اصول ہے مجرب نسخہ ہے

بڑے بڑے اصحاب قلم کے حالات زندگی سے اس قبول کی صداقت معلوم کرلی جاسکتی ہے ٹالسٹائی اور اس کے شاہکار WAR AND PEACE (جنگ اور امن) پڑھے لکھے طبقے کے لوگ بخوبی واقف ہیں۔ بتایا گیا ہے کہ اس عظیم رکسی مصنف نے ہزاروں صفحات پر پھیلے ہوئے اور دو جلدوں میں بٹے ہوئے اس ناول کی حک و اصلاح دو ایک بار نہیں نو دس مرتبہ کی، تب کہیں جاکر مسودہ پریس بھیجا گیا۔ اس واقعہ سے ٹالسٹائی کی صحیح معنوں میں انتھک محنت کا اندازہ ہوتا ہے اس انتہائی دیدہ ریزی اور جاں فشانی کا ثمرہ دنیا کے سامنے آیا تو دنیا نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اب شاید ہی کوئی زبان ایسی ہو جس میں اس کا ترجمہ نہ چھپا ہو۔

یہ ذرا پرانی بات ہے نسبتاً نئی اور تازہ بات یہ ہے کہ امریکہ کے ۳۷ ویں صدر رچرڈ نکسن نے اپنی قوم کے نام ایک نشری تقریر پر رات بھر محنت کی اور دو چار بار نہیں پورے ایک درجن بار اسے کاٹتا اور بناتا رہا۔ جب جاکر اسے اطمینان ہوا کہ ہاں بات بنی ہے جب تقریر نشر ہوئی تو نتیجہ حسب دل خواہ نکلا، امریکی عوام جو کسی معاملے میں خار کھائے بیٹھے ہوئے تھے، یہ تقریر سن کر اس کے ہمنوا ہوگئے، شاید ایسی ہی کوئی تقریر تھی جسے سن کر ایک اردو شاعر بے ساختہ کہہ اٹھا تھا ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

یہ بات رکسی اور امریکی ادب کے ساتھ مخصوص نہیں، ہر زبان کے اہل قلم لکھتے، مکرر سہ کرر لکھتے، بار بار لکھتے اور کاٹتے اور بناتے رہتے ہیں تاکہ ہر تحریر میں قوت و تعبیر جاندار اور شاندار ہو جائے اور حتی الوسع مواد کی ترتیب اور معلومات کی فراہمی میں کوئی کسر نہ رہ جائے۔

اردو کے ادیبوں اور مصنفوں کی دو ایک مثالیں سن لیجئے۔

مشہور انشا پرداز اور ادیب مولانا عبدالماجد دریا بادی مرحوم نے "آپ بیتی"

کے متعلق لکھا ہے کہ انھوں نے بار بار اس کی اصلاح و تہذیب کی تھی۔

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے "ذکرِ آزاد" میں لکھا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد اپنی تحریروں کی اصلاح اور ان پر نظرِ ثانی کیا کرتے تھے انھیں سنوارا کرتے تھے ایسے اساطین کے لئے بھی یہ عمل ضروری ہوگیا۔

دنیا میں بے شمار ہنر اور فن ہیں اور سب کے سب انتہائی محنت اور مشقت کے طالب ہیں۔ یہ باتیں ہاتھ کے کھیل نہیں ہیں، بڑے پتہ مار و کام ہیں، تحریر و کتابت کا فن بھی ایسا ہی ہے۔ انسان کے اندر اس کے خالق نے جو صلاحیت ودیعت کردی ہے جو قابلیت اس کے اندر بالقوۃ رکھ دی ہے اسے روبہ عمل لانے کے لئے نفسیات کی زبان میں قوت ارادی کے ساتھ قوت تنقیدی بھی ناگزیر ہے جس طرح ہم کپڑے کو پوری قوت سے نچوڑتے ہیں کہ پانی کی ایک بوند بھی اس کے اندر باقی نہ رہے اسی طرح ہمیں اپنے جسم و ذہن کو بھی نچوڑنا ہوگا تاکہ ان دونوں کی صلاحیتیں پوری طرح کام پر لگ جائیں، کام کرنے لگیں، نچوڑنے کا یہ عمل ادھورا رہ گیا تو ہمارا کام بھی ادھورا ہی رہ جائے گا۔ اس کے برعکس اگر یہ عمل پوری دھن اور لگن سے ہو تو نتیجہ بھی بہتر سے بہتر حاصل ہوگا۔ راہ کی مشکلات کافور بن کر اڑ جائیں گی، جیسے سیلاب کی روانی نشیب و فراز دونوں کو ڈبو دیتی ہے آگ سوکھے کے ساتھ گیلے کو بھی جلا کر راکھ کر دیتی ہے اور ہوا چھوٹے چھوٹے پیڑوں کے ساتھ بڑے بڑے تناور درختوں کو بھی زمین کے برابر کر دیتی ہے اسی طرح شوق اور محنت بھی ناممکن کو ممکن بنا کر رکھ دیں گے ؎

شوقِ تو زادمی دہد، ذوق تو راہ می دہد



الحاج قاضی سید شوکت حسین

مائک پر خواتین کی تلاوتِ کلامِ پاک

جنّت سے نکالا ہوا یارب انساں میں ہوں
دنیائے جہنّم کو جنّت میں بدلنے والا انساں میں ہوں

شیطان مردود ملعون نے انسان کو جنّت سے نکالنے کے لئے کیا کیا نہ کیا اور کامیاب ہو گیا باوا آدم و ماما حوا کے پاس گیا۔ آدم علیہ السّلام نے لعنت بھیجی اُن کے پاس وہ مردود ہوا تو سیدھا ماما حوّا کے پاس گیا اور دنیا کا سبز باغ دکھایا۔ وہ بھولی بھالی دھوکے میں آگئیں۔ جب سے خواتین شیطان مردود ملعون کی آلۂ کار بن گئیں۔ بلکہ قدرت نے خواتین کو مجسم جاذب نظر خوش الحان، نازک بدن بنایا اور حد سے زیادہ اُن پر تحدیدات عائد کر دیں۔ خواتین کتنی ہی بھدی کیوں نہ ہوں اور ان کی آواز بھی کتنی کرخت کیوں نہ ہو لیکن ان میں قدرت نے جاذبیت پیدا کر دی ہے اور حد سے زیادہ تحدیدات اُن پر عائد بھی کر دی گئیں تاکہ اُن کی مقناطیسی کشش سے مرد دور رہیں۔

شیطان مردود ملعون کی دھوکہ دہی کی کئی خوبیوں میں کی ایک خوبی تو یہ ہے کہ اچھے سے اچھے زاہد و عابد کو بھی بڑی خوبی سے گناہ کو عبادت بتا کر چکر دے دیتا ہے۔

حیدرآباد میں ایک عرصہ سے سماعتِ قرآن کی محفلیں منعقد ہوتی چلی آرہی ہیں۔ بحمداللہ کثرت سے خواتین اُن میں شرکت بھی کرتی ہیں۔ خواتین ہی ان محفلوں کا انتظام کرتی ہیں۔ کسی مرد کو ان محافل میں داخلے کی اجازت نہیں ہوتی۔ ہر قسم کی احتیاط برتی جاتی ہے تمام خواتین اس متبرک محفل کو نہایت خشوع و خضوع سے متبرک بنانے میں کسی قسم کا دقیقہ نہیں چھوڑتیں۔ "تلاوتِ قرآن خوش الحانی سے سنانے والی دو تین خواتین ہی مائک پر سناتی ہیں

اوران کی خوش الحانی غیر مردوں کے کان میں پڑتی ہے جو خلاف احکام الٰہی ہے۔ یہ تو ایسا ہوا کہ بہترین پاک وصاف وشفاف کانچ کے گلاس میں جا نماز پر باوضو بیٹھ کر اعلیٰ قسم کی شراب پی جائے۔

شیطان مردود و ملعون کس کس طرح دھوکہ دیتا ہے اس کا اندازہ کرنا۔ انسانی سمجھ کے باہر ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی احکام الٰہی کی خلاف ورزی کو روکنا چاہتا ہے تو کسی کو چن لیتا ہے۔ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ (آیت ۱۰۵ سورۃ بقر پارہ آلم)

یہ جو مسئلہ ہے کہ سماعت قرآن کی محفلوں کو خوش الحان خواتین ہی سنائیں تو با برکت ہوگا۔ یہ سمجھنا بہا یانی غلطی ہوگا۔ کیونکہ اس کی بنیاد احکام الٰہی کی خلاف ورزی پر رکھی گئی ہے۔

اس بدعت کو روکنے کے لئے شیطان مردود کے بہکائے ہوئے راہ رو کو راستہ دکھانے کے لئے ہر قدم پر شیطانی قوت کا مقابلہ ایسا ہی شخص کر سکے گا جس کی کامیابی کا خود اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہو اور اس کے لئے ہزاروں ملائکہ کو یکے بعد دیگرے بھیجنے کا تیقن دیا ہو۔

ملاحظہ ہو۔

پارہ قال الملاء ۹ سورۃ الانفال ۸ آیت ۷ = ۸۹ اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۸۶ ۷ یعنی ۳ غلطیاں دکھائی دے رہی ہیں جن کو ختم کرنا لازمی ہے ایسی بدعت (۱) سماعت (۲) ابصار (۳) تفکر پیدا کرتی ہے۔

(۱) قاری پڑھتا ہے (۲) سامعین سنتے اور کلام پاک دیکھتے ہیں (۳) اور ہر فرد غور وفکر کرتا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے بار بار غور وفکر کرنے کی تاکید فرمائی ہے

پورے کلام مجید میں الشوکۃ صرف ایک ہی بار آیا ہے اور یہ پارہ اور یہ سورہ کلام مجید ۷ پ ۲۳ جو سجدہ تلاوت کی شروعات ہوتی ہے کے بعد آنے سے اس سورہ اور پارہ کی اہمیت کا جو اندازہ ہوتا ہے اس کو جاننا انتہائی عقل وفہم سے بالاتر ہے۔ ۲۴ رمضان المبارک کو جو واقعہ میرے گھر میں پیش آیا۔ اس کی پیش گوئی لفظ بہ لفظ ۱۴۱۷ھ قرآن مجید میں صاف صاف دے دی گئی واقعہ۔

میری اہلیہ محبوب النساء بیگم طیبہ اور بڑی لڑکی فیض النساء شاہدہ جو بے حد متقی۔ مذہبی خواتین ہیں دونوں میں تنازعہ ہوا کہ آخری دہے رمضان یعنی ۲۵، ۲۶، ۲۷ رمضان المبارک کو اپنے گھر میں

مجلس سماعت رکھی جائے۔ اہلیہ کا کہنا تھا کہ غریب خانہ میں اتنی وسعت نہیں کہ ایسی مبارک محفل خواتین کی گنجائش نکالی جائے لیکن دوسری لڑکی شاکرہ اور ان سب کے بچوں نے کہا کہ انشاء اللہ تعالیٰ ہم سب تمام سامان ہٹا کر ۲۰۰ خواتین کی گنجائش نکال سکیں گے۔ سب کو اس محفل سماعت کی اطلاع کر دی گئی۔ الحمد للہ پورا گھر مصروف بہ کار ہو گیا اور ۲۴ رمضان المبارک کی شام تک تمام انتظامات مکمل ہو گئے۔ ۲۵ رمضان المبارک کی صبح ½۸ بجے مہمانوں کے آنے کا وقت ہو گیا۔ دونوں محترمہ صاحبات جو مائک سے قرآءت سنانے والی تھیں نہیں آئیں۔ دونوں کو فون کیا گیا۔ دونوں نے بعض قدرتی مجبوریوں کی وجہ آنے سے قاصر رہنے کی مجبوری ظاہر کی۔

ہماری پریشانی کا عالم نہ پوچھیئے۔ حواس باختہ۔ اللہ تعالیٰ سے استعانت کے لئے گڑگڑائے۔ فوری خیال آیا جناب عابد صاحب مدرسہ انوارالہدیٰ دارالعلوم موسیٰ نگر کو فون کیا۔ عابد صاحب نے دو حفاظ کو لانے کا وعدہ کیا۔ لیکن ان کے آنے کو دو گھنٹے درکار تھے۔ معزز مہمان آنا شروع ہو گئے۔ الحمد للہ ہمارے دو پوتے سید شاہ نواز حسین اور سید شاد حسین ولد الحاج سید شفاعت حسین جو انوارالہدیٰ دارالعلوم میں زیر تعلیم حفظ ہیں نے مائک سنبھالا اور بسم اللہ کر کے قرأت شروع کر دی۔ ان دو ننھے حافظوں کی معصومانہ آواز سے قرأت کا آغاز ہوا اور اہل محفل کو سماعت قرآن میں غیر معمولی انہماک پیدا ہو گیا اور انوارالہدیٰ دونوں حفاظ غفار صاحب اور ابرار صاحب کے آنے تک جلسہ سماعت قرآن میں غیر معمولی جان آ گئی۔

اس واقعہ سے قرآنی احکام یہ ملتے ہیں :-

کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی عبادت ہو حتیٰ کہ نماز بھی خواتین گھر میں بلند آواز سے ادا کریں بلکہ گھر کے کونے میں پڑھیں چہ جائے کہ محفل سماعت اور زنانی آواز مائک سے بے شمار غیر مرد سنیں۔

احتیاط زر و دولت سے مالا مال کرتی ہے
اور عزت و وقار میں اضافہ ہوتا ہے
اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہدایت دے۔ آمین ثم آمین

نوٹ : جواب طلب امور کیلئے پوسٹ کارڈ یا مناسب ڈاک ٹکٹ آنا ضروری ہے

دلشاد رضوی

نکاح وقت کی پکار

ایک عرصہ سے جنسی بے راہ روی کے باعث انسانی قدریں پامال ہوتی جارہی ہیں ان پر فوری روک لگانے کی ضرورت ہے اس لئے کہ مغربی ممالک میں تو وہ وقت آہی گیا ہے کہ عصمت وعفت کی باتیں قصۂ پارینہ بن چکی ہیں اور مغرب کی اندھی تقلید کرنے والے اگر ابھی ہوش نہ سنبھالیں تو اغلب ہے کہ مشرقی تہذیب میں بھی یہ زہر عنقریب سرایت کرجائے گا۔ ذیل کی چند مثالوں سے یہ بات واضح ہے کہ مغربی ممالک میں حالات کس درجہ تشویشناک ہیں۔

۱۱رمئی ۱۹۹۶ء کو ہمارے شہر کے معروف اخبار "سیاست" میں جناب سید مصطفیٰ کا اسپرنگ فیلڈ سے بھیجا ہوا ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ اس کے مطابق امریکہ میں روایتی ARRANGED شادیوں کا رواج بالکل ہی نہیں ہے۔ لڑکا اور لڑکی کئی دنوں، مہینوں بلکہ سالوں تک UNDECLARED میاں بیوی کی طرح زندگی گزارتے ہیں اور طرفہ یہ کہ اُن کی اس حرکت پر وہ ہمت افزائی کے بھی مستحق قرار دیئے جاتے ہیں کہ جیسے انہوں نے یہ "غیر مہذبانہ" عمل کر کے کوئی بڑا معرکہ سر کیا ہے۔ حتیٰ کہ اُن کے ہاں بچے بھی تولد ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات بعد از خرابی بسیار شادی بھی رچالی جاتی ہے لیکن اعداد وشمار کے مطابق ایسی ۷۰٪ شادیوں کا خاتمہ المناک طلاق پر ہوتا ہے۔ یہاں یہ امر غور طلب ہے کہ اُن معصوم بچوں کا مستقبل کے ساتھ ہوگا جن کا نہ کوئی صحیح سرپرست ہوتا ہے نہ ہی رہنما۔ اُن بچوں کے ماں باپ کے لئے تو یقیناً یہ امر باعث فکر وتردد بلکہ کربناک ہی ہوتا ہوگا جنھوں نے اس طرح باہمی روابط کو پروان چڑھایا۔ سماج پر اس کے جو منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں وہ علیحدہ ہیں۔

اب سے تقریباً ساٹھ سال پہلے روسی مصنف ANTON N AMILOV نے اپنی تصنیف THE BIOLOGICAL TRAGEDY OF WOMAN میں یوں لکھا تھا کہ میں ایسے ہزارہا واقعات کا حوالہ دے سکتا ہوں کہ شہوانی بے قاعدگی SEXUAL LICENTIOUSNESS نہ صرف انجانے لوگوں میں بلکہ پڑھے لکھے ترقی یافتہ افراد میں بھی پھیل گئی ہے۔ یہ ایک نہایت خطرناک بات ہے جو سوشلسٹ نظام کو برباد کرنے کی پیشگی خبر کے مترادف ہے۔ اتنے لمبے عرصے بعد جبکہ ایڈز جیسا جان لیوا اور تاحال لاعلاج مرض ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لئے جارہا ہے۔ مذکورہ مصنف

کے الفاظ موجودہ حالات پر مِن وعن منطبق ہوتے جا رہے ہیں بالخصوص مغربی ممالک کے لئے تو
ایک لمحۂ فکر ہے۔

ملک کے مایہ ناز قلمکار اور سابق سفیر برائے سوویت یونین جناب آئی کے گجرال نے اپنے ایک
مضمون میں جو ۲۴ ستمبر ۱۹۹۵ء کے اخبار "سیاست" میں شائع ہوا تھا سوویت یونین میں وہاں کے صا
کے اہلِ خاندان کے حالات لکھتے ہوئے سابق صدر سوویت یونین برزنیف کی صاحبزادی گلینا کے
میں اس طرح انکشاف فرمایا کہ " سفارتی حلقوں میں گلینا کی آوارگیوں کی باتیں عام تھیں ج
نے کئی شادیاں کیں اور بالآخر اب اس کا شوہر یوری چربانوف ہے" واضح ہو کہ یہ واقعہ
غیر معروف شخص کے اہلِ خاندان کا نہیں بلکہ اپنے وقت کے ایک عظیم ملک کے صدر کی اپنی صاحبزا
کا ہے۔

مشہور اخبار "ہندوستان ٹائمز" نے اپنی ۲۱ ستمبر سنہ ۹۰ء کی اشاعت میں ہالی وڈ کی معروف ا
GRETA CARBO کے بارے میں لکھا ہے کہ اُس نے شادی نہیں کی اور ساری عمر عیش و عشر
میں گزاری۔ لیکن وقت کے گزرتے گزرتے جب بڑھاپے میں اُس کا کوئی ساتھی نہ رہا تو ۱۸
سنہ ۹۰ء کو اُس نے اپنے مکان میں اپنی پچہترویں سالگرہ تنہا منائی۔ جب اُس کے سوانح نگار نے اُ
سے سوال کیا کہ آیا اُسے شادی نہ کرنے کا افسوس ہے تو گاربو نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر جواب دیا
" میرا خیال ہے کہ میرا شادی نہ کرنا ایک غلطی تھی۔"

سچائی یہ ہے کہ مغربی خواتین اپنی جوانی کے نشے میں ظاہری چمک دمک سے فریب کھاتی ر
ہیں اور پھر جب وہ عمر کے ڈھل جانے پر چونکتی ہیں تب بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے کیونکہ د
جنسِ مخالف کے لئے اپنی نسوانی کشش باقی نہیں رکھتیں اور تب انہیں یہ کربناک احساس
ہے کہ ماضی کی ساری باتیں ایک سراب تھیں۔ کچھ اسی طرح کا معاملہ امریکہ کی مقبول ترین ہستی
MARILYN MONROE کے ساتھ پیش آیا۔ اُسے جوانی میں " جنسی دیوی" "SEX GODDESS"
کے لقب سے نوازا گیا۔ دولت، عزت، شہرت اُس کے قدم چومتی رہی لیکن یہ ساری چیزیں اُسے
سکون نہ بخش سکیں جو ایک عورت کے گھر گرہستی میں نصیب ہوتی ہیں۔ چنانچہ ذہنی دباؤ کا تا
لاکر اُس نے ۵ اگست سنہ ۱۹۶۲ء کو خودکشی کر لی جبکہ اُس کی عمر صرف چھتیس ۳۶ سال تھی۔

اس سے بھی برا حال مشہور و معروف حسین و جمیل ایکٹریس الیزبیتھ ٹیلر کا ہوا۔ اُس نے ک
دوست احباب پیدا کیئے اور خوب رنگ رلیاں منائیں۔ لاکھوں ڈالر کمائے لیکن جب اُسے ایڈز

مرض لاحق ہوا تو اس کے وہ دوست جو کبھی اس کی قربت کو اپنی خوش نصیبی سمجھتے تھے اس سے ایسے
بھاگنے لگے جیسے وہ کوئی عورت نہیں کوئی دیوانہ جن ہو جو انہیں دبوچنے آرہا ہو۔ اور بالآخر وہ بھی
ایک حسرت ناک موت کے آغوش میں کسی ساتھی کے لئے ترستی تڑپتی ڈوب گئی۔
مغرب کے ان گئے گزرے حالات میں امید کی ایک کرن اس وقت نظر آئی کہ جب ۸ رفیروری ۱۹۷۸ء
کے ٹائمس آف انڈیا میں ایک امریکی خاتون MARABEL MORGAN کی تصنیف TOTAL
WOMAN کا سبق آموز تذکرہ شائع ہوا۔ اس کتاب کی مقبولیت کا عالم یہ تھا کہ صرف ایک سال میں
اس کی تیس لاکھ جلدیں فروخت ہوگئیں۔ اس میں مذکورہ مصنفہ نے خواتین کو مشورہ دیا ہے کہ اپنے
شوہر کی اچھی ساتھی بنو۔ اس کو کبھی برا بھلا مت کہو اور اس کی ضرورتوں کو سمجھو۔
سچائی یہ ہے کہ عورت شادی کے بندھن میں بندھ کر ہی اپنا جائز مقام حاصل کرتی ہے وہ
اپنے شوہر سے نہ صرف وابستہ ہو جاتی ہے بلکہ اس کے پورے خاندان کا ایک فرد کہلاتی ہے اس
کی زندگی کی ایک تاریخ مرتب ہوتی ہے اور اس کی زندگی میں ہر آنے والا دن اس کی عزت و توقیر
میں اضافہ کے ساتھ ساتھ ایسے پرسکون ماحول عطا کرتا ہے صحت مند رجحانات اس کے گرد اکٹھا ہوتے
ہیں وہ اپنے شوہر کے دوش بدوش رہ کر اپنے بڑے یا چھوٹے گھر کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتی
ہے اس کا معاملہ مرد کے مقابلے میں صرف جنسی فرق کا معاملہ ہوتا ہے نہ کہ کسی بھی طرح کی کمتری کا
وہ شادی کے بعد سوسائٹی میں ایک لائق احترام حیثیت اختیار کر لیتی ہے اس طرح نکاح نہ
صرف پاکیزگی کا دوسرا نام ہے بلکہ وقت کی پکار بھی ہے •••

(بقیہ سلسلہ "بھومیا کی زندگی بدل ڈالی" صفحہ ۲۵ سے آگے)

کر رہے ہیں۔ مسٹر بھومیا کا کہنا ہے کہ سب سے پہلے ان کے لئے خدا ہے۔ بعد میں ان کے
والدین اور تیسرے درجہ پر اسٹیٹ بنک آف انڈیا سنگاریڈی ہے۔ انہوں نے کہا کہ
ایس بی آئی سنگاریڈی نے حسب ضرورت انھیں کافی قرضوں کی فراہمی انجام دی ہے۔ انہوں نے
کہا کہ عوام کی زندگی کا دیہی پہلو بھی بدل چکا ہے اور اب وہ قیمتی صابن، ڈٹرجنٹ اور کریم وغیرہ استعمال
کر رہے ہیں دس سال قبل عوامی موقف ایسا نہ تھا۔ اسٹیٹ بنک آف انڈیا کے عہدہ داروں
نے مسٹر بھومیا کی کافی ستائش کی ہے اور کہا کہ ان کا چیک کبھی مسترد نہیں کیا گیا اور انہوں نے
تمام قرضہ جات بروقت ادا کئے ہیں ••

اسٹیٹ بنک آف انڈیا نے بھومیا کی زندگی بدل ڈالی

(پی آئی بی فیچر)

سنگاریڈی ضلع میدک کے متوطن مسٹر کے بھومیا ولد مسٹر پنٹیا عمر 52 سال توجہ کے ساتھ محنتِ شاقہ کے لئے خود کو وقف کردینے کی بہترین مثال اور جیتی جاگتی تصویر ہے۔ کیونکہ تقریباً چودہ سال قبل وہ سنگاریڈی میں ایک کرانہ دکان چلایا کرتے تھے۔ اتفاقی طور پر ان کی ملاقات اسٹیٹ بنک آف انڈیا سنگاریڈی کے فیلڈ آفیسر سے ہوئی۔ جن کی دلچسپی اور رہبری کے نتیجہ میں بھومیا نے اسٹیٹ بنک آف سنگاریڈی سے پندرہ ہزار روپیہ کا قرض حاصل کیا تاکہ صابن، ڈٹرجنٹ اور کریم وغیرہ کی ڈیلرشپ حاصل کی جائے۔ اُس وقت کے بعد سے بھومیا نے کبھی بھی پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھا اور دن بہ دن اُس کی ایجنسی کو فروغ حاصل ہوا نیز انھوں نے بر وقت بنک کے قرض کی ادائی کی۔ بھومیا کے اس طرزِ عمل سے بنک کو اعتماد حاصل ہوگیا اور نتیجتاً بنک عہدہ داروں نے مختلف اوقات میں قرض کی مقدار بڑھا کر چالیس ہزار، ایک لاکھ، دو لاکھ، پانچ لاکھ کردی اور بالآخر بنک نے حال ہی میں بھومیا کو دس لاکھ روپیہ کا قرض منظور کیا۔ اس طرح بنک کے قرضوں اور بھومیا کی محنتِ شاقہ کی وجہ سے بھومیا کی کاروبار کو ہمہ جہتی فروغ حاصل ہوا۔ آج بھومیا سنگاریڈی کے تقریباً 70 مواضعات کو پیداواری تقسیم کا کام انجام دے رہے ہیں۔ اب اُن کے قبضے میں چار گاڑیاں ہیں جن میں سے دو کی خریدی سنگاریڈی بینک قرضوں سے کی گئی ہے۔ انھوں نے 24 لوگوں کو ملازمت دے کر روزگار فراہم کیا اور ایک چارٹرڈ اکاونٹنٹ کا بھی تقرر کیا ہے بھومیا ایک مستقل انکم ٹیکس ادا کنندہ ہیں ان کے کاروبار کا سالانہ ٹرن اوور تقریباً 2.5 کروڑ روپیہ ہے مسٹر بھومیا کے پانچ بچے ہیں جو سب کے سب اعلیٰ تعلیم حاصل (باقی صـ ۲۷ پر)



مولانا ابوالکلام آزاد ایک عظیم قوم پرست اور بلند پایہ عالم تھے وہ ہندوستانی تہذیب کے پروردہ تھے ان کی زندگی کا اولین مقصد اپنے مذہبی تشخص کو برقرار رکھتے ہوئے ملک کی خدمت کرنا چاہتے تھے وہ ہرگز اس بات کے قائل نہیں تھے کہ مسلمانوں کی خوشحالی اور ان کے وجود کی برقراری کے لئے ایک الگ ملک کی ضرورت ہے اس کے علاوہ مولانا مسلمانوں کی نجات کے لئے انگریزی سرکار کی سرپرستی کو بھی ضروری نہیں سمجھتے تھے۔

اس صدی کے تیسرے اور چوتھے تہلکہ خیز دہے کے دوران تنگ نظر قائدین نے جب مذہبی منافرت کا زہر پھیلانا شروع کیا تو وہ اپنے عقائد پر سختی کے ساتھ جمے رہے چنانچہ سنہ ۱۹۴۰ء میں رام گڑھ میں منعقدہ کانگریس سشن کے صدارتی خطبہ میں کہا کہ " میں ایک مسلمان ہوں اور مجھے اس پر فخر ہے۔ میں ۱۳ سو سالہ عظیم الشان اصلاحی روایات کا آمین ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ دیگر حقائق اور امور بھی میری زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اسلامی جذبات میرے احساسات کی راہ میں حائل نہیں بلکہ یہ میری پیش روائی میں رہنمائی کرتے ہیں۔ مجھے ہندوستانی ہونے پر فخر ہے۔ میں ہندوستانی قومیت اور اس کے اتحاد کا ایک اٹوٹ حصہ ہوں۔"

مولانا آزاد کا تعلق ممتاز علماء گھرانے سے تھا۔ وہ صوفی روایات اور روحانیت کے علمبردار تھے۔ ابوالکلام آزاد ۱۸۸۸ء میں مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے اور مصر کی جامعہ ازہر میں تعلیم حاصل کی جہاں انھوں نے پہلے پہل اپنے عالمانہ جوہر کا مظاہرہ کیا۔ وہ نہ صرف ایک ذہین الشان تھے بلکہ وہ مذہبیات کے فلسفہ عربی، فارسی، فلکیات اور کیمیا کے ماہر بھی تھے۔ انھیں فن خطابت میں بھی ملکہ حاصل تھا۔ مولانا شاعری اور صحافت کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے اس کے علاوہ وہ ایک ماہر مترجم بھی تھے ان کی تفسیر قرآن اپنی نوعیت کی ایک بہترین چیز تسلیم کی جاتی ہے۔

مولانا نے کئی جرائد شائع کئے جیسے المصباح اور لسان الصدق لیکن ان کے اخبار "الہلال"

کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ جیسے انھوں نے ۱۹۱۲ء میں جاری کیا تھا یہ اخبار قوم اور بالخصوص مسلمانوں میں سیاسی شعور بیدار کرنے میں ایک زبردست محرک ثابت ہوا۔ الہلال کے ذریعہ وہ مسلم لیگ کی قدامت پسندی اور غلط رہبری کا تدارک کرنا چاہتے تھے۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے " ڈسکوری آف انڈیا " میں مولانا کے متعلق لکھا ہے کہ

"یہ نوجوان ادیب اور صحافی نے مسلم دانشوروں کے حلقہ میں ایک سنسنی پھیلا دی ہے اگرچہ کہ بزرگ قائدین اس کی سرگرمیوں سے ناراض تھے لیکن اس کی تحریروں نے نوجوان نسل کے ذہنوں میں انقلاب پیدا کر دیا۔"

"الہلال" نے مسلم لیگ کی فرقہ وارانہ سیاست کی سختی کے ساتھ مخالفت کی اور مولانا کے ترقی پسندانہ نظریات کی وجہ سے کئی تعلیم یافتہ مسلمان کانگریس میں شرکت کرنے لگے۔

نومبر ۱۹۱۴ء کے دوران "الہلال" پریس ایکٹ کے عتاب کا شکار ہوا اور اسے بند کر دیا گیا۔ اس اخبار کا لب و لہجہ بھی " الہلال " کی طرح تیز و تند تھا "البلاغ" کو مولانا آزاد نے "الہلال" کے بند کرا دیئے جانے کے بعد جاری کیا تھا۔ مولانا نے البلاغ کو جاری رکھنے کے لئے بھرپور کوشش کی لیکن حالات ان کے مخالف تھے برطانوی حکومت نے اس الہامی صحافی کے خیال اور اظہار کی آزادی کو مزید برداشت نہ کر سکی اور مارچ ۱۹۱۶ء میں انھیں بنگال سے باہر نکال دیا گیا۔

جابرانہ رولٹ ایکٹ کی منظوری اور جلیانوالہ باغ کے سانحہ کے بعد مولانا عملی سیاست میں کود پڑے اس کے بعد وہ اپنی ساری زندگی قومی اور سیاسی مسائل کو حل کرنے میں صرف کر دی۔ کانگریس کے تنظیمی مسائل نئے پروگراموں کو شروع کرنے، جلسوں سے خطابت، مباحث اور کبھی کبھار جیل کی صعوبتیں ان کی زندگی کا معمول رہیں۔ انھوں نے گاندھی جی اور دوسرے قائدین سے بھی مباحث کیے۔

اُلجھے ہوئے مسائل کو حل کرنے میں مولانا کو کمال حاصل تھا اس وصف نے انھیں گاندھی جی سے قریب تر کر دیا۔ عدم تعاون تحریک کے دوران وہ گاندھی جی کے دست راست تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ہندوستانی مسلمانوں نے ترکی میں انگریزوں اور ان کے حواریوں کی جانب سے خلافت کے خاتمہ کے خلاف جو خلافت تحریک شروع کی تھی مولانا اس کے روح رواں تھے۔

مولانا آزاد بحیثیت صدر خلافت کانفرنس مسلمانوں کو تحریک عدم تعاون میں حصہ لینے پہ زور دیا۔ اس جد و جہد میں مسلمانوں کو پیچھے نہ رہنے اور بیرونی استبداد کو ختم کرنے کا مشورہ دیا چونکہ اسلام نے غلامی کو موت سے تعبیر کیا۔ مسلمانوں نے مولانا کی تقاریر سے متاثر ہو کر جوق در

جوق کانگریس میں شامل ہونے لگے اس طرح تحریک خلافت کانگریس تحریک میں ضم ہو گئی۔

۱۹۲۳ء کے دہلی سیشن کے دوران مولانا آزاد کانگریس کے صدر منتخب کئے گئے۔ اس وقت ملک سنگین دور سے گذر رہا تھا تحریک عدم تعاون کے واپس لے لینے کی وجہ سے عوام پست ہمت ہو چکے تھے اور فرقہ پرست طاقتیں برطانوی حکومت کی سرپرستی کی وجہ سے پورے زور و شور کے ساتھ سرگرم عمل ہو چکی تھیں۔ مولانا نے اپنے خطبۂ صدارت میں فرقہ پرستوں پر راست طور پر حملہ کیا انھوں نے کہا کہ " آج ہندوستان کو نہ تو ہندو فرقہ پرست اور نہ ہی مسلم فرقہ پرست قوتوں کی ضرورت ہے ہمیں صرف ایک ہی قوت کی ضرورت ہے اور وہ ہندوستانی قومی کانگریس ہے۔

مولانا آزاد کی صدارت میں ۱۹۱۷ء کے دوران کلکتہ میں ایک اجلاس منعقد ہوا تھا جس میں سمن کمیشن کے مقاطعہ کا فیصلہ کیا گیا۔ انھوں نے مقاطعہ کی تائید حاصل کرنے کے لیئے کئی مقامات کا دورہ کیا۔ مولانا نے گاندھی جی کے جانب سے ۱۹۳۱ء میں شروع کردہ سیول نافرمانی تحریک میں کلیدی رول ادا کیا تھا۔ گاندھی جی کی مشہور ڈانڈی مارچ نے سارے ملک کو متحرک کردیا۔ مولانا آزاد نے مسلمانوں کو ستیہ گرہ میں شامل ہونے پر زور دیا ان کی اپیل پر بنگال یوپی، پنجاب اور شمال مغربی صوبہ سرحد کے ہزاروں مسلمان اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کیا۔ حکومت نے مولانا کو فوری گرفتار کرکے نظر بند کر دیا۔ ان کی نظربندی کے خلاف پورے ملک میں ہڑتال کی گئی۔

۱۹۳۹ء میں دوسری دفعہ انھیں کانگریس کا صدر بنایا گیا۔ اس وقت نہ صرف کانگریس بلکہ پورا ملک سنگین حالات سے دوچار تھا۔ حالات نے کچھ ایسا رخ اختیار کیا کہ وہ ۱۹۴۶ء تک کانگریس کی صدارت پر فائز رہنے پر مجبور رہو گئے۔ گاندھی جی نے ۱۹۴۲ء میں " ہندوستان چھوڑو " شروع کی اس تحریک نے ہندوستانیوں کے ذہنوں میں ایک انقلاب برپا کردیا۔ مولانا آزاد اور کئی ممتاز کانگریسی قائدین کے ساتھ قلعہ احمد نگر میں تحریک کی قیادت کے جرم میں نظر بند کر دیئے گئے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد جب انگریز سرکار نے کینٹ مشن کی تجاویز پر غور کرنے ہندوستانی قائدین سے مذاکرات شروع کیئے مولانا آزاد اور ان کے رفقاء نے مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان پائے جانے والے اختلافات کو کم کرنے کے لیئے سچی لگن سے کوشش کی حتی کہ مسلم لیگ کی "راست اقدام" حکمت عملی جس کی وجہ سے کلکتہ میں شورش برپا ہو گئی۔ مولانا نے ملک کی تقسیم کو روکنے کے لئے اپنی کوشش جاری رکھیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد پابندِ ڈسپلن شخص تھے جب انھوں نے محسوس کیا کہ ان کے ساتھیوں نے ملک کی تقسیم کا فیصلہ کر لیا تھا تو انھوں نے پارٹی کے فیصلہ کے آگے اپنا سر تسلیم خم کر لیا۔ وہ اپنی کوششوں میں ناکام رہے جبکہ مذہب کا استحصال کرکے اور عوام کی غلط رہبری کرنے والے کامیاب ہو گئے۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ مولانا اپنے وقت سے پہلے پیدا ہوئے چونکہ اس وقت ملک کا سیاسی اور مذہبی شعور ناپختہ تھا۔

آزادی کے بعد ۱۹۴۷ء میں قائم شدہ عبوری حکومت میں انھیں وزیر تعلیم مقرر کیا گیا اس عہدہ پر وہ اپنی موت یعنی ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء تک فائز رہے۔ مولانا آزاد ایک بلند پایہ عالم اور عظیم دانشور تھے ان کا مزاج زندگی کے نشیب و فراز سے ہار ماننے والا نہیں تھا۔ چنانچہ وزارت تعلیم کا قلمدان ان کے لئے موزوں تھا۔

مولانا آزاد نے تعلیم بالغان پر بہت زور دیا اور اس کو نئی جہتیں عطا کیں۔ ان کی سرپرستی میں ہندی میں اصطلاحات سازی کا کام اعلیٰ پیمانے پر شروع کیا گیا۔ انھوں نے یونیورسٹی گرانٹ کمیشن قائم کیا جس کے ذریعہ جامعات کی خود اختیاری کا تحفظ ممکن ہوسکا۔

مولانا نے تعلیم نسواں کو مردوں سے کہیں زیادہ اہم قرار دیا چونکہ یہ ملک و قوم کو ایک نیا شعور عطا کرتی ہے۔

مولانا کی دوراندیشی نے ملک کے لئے ٹکنیکل تعلیم کو ضروری سمجھا۔ چنانچہ انھوں نے "آل انڈیا کونسل فار ٹکنیکل ایجوکیشن" قائم کیا۔

کھڑگ پور کا " انسٹیٹیوٹ آف ہائیر ٹکنالوجی ان کی درخشاں کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ بعد از کھڑگ پور اسی نہج پر قائم کئے گئے دیگر ٹکنالوجیکل ادارے جنھوں نے ملک کو عالمی معیار کا سائنسی عملہ عطا کیا اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ مولانا نے ملک کی ضرورت کا کتنا صحیح اندازہ لگایا۔

للت کلا اکیڈیمی، ساہتیہ کلا اکیڈیمی اور سنگیت ناٹک اکیڈیمی مولانا کی کاوشوں کا ثمر ہیں یہ ادارے فنونِ لطیفہ کی فروغ کیلئے قائم کئے گئے۔ مولانا کی رہبری میں ہندوستان یونیسکو کے بانی اراکین میں شامل ہوا۔ انھوں نے ہندوستان میں کونسل برائے ثقافتی تعلقات قائم کی اور دوسرے ممالک سے ثقافتی رشتے قائم کئے۔ مولانا آزاد ایک پُرعزم انسان تھے جنھوں نے بحیثیت ایک عظیم عالم اور بہترین مقرر اپنی شناخت منوائی۔ انھیں اس بات کا امتیاز حاصل ہے کہ جب ہندوستان فرقہ پرستی اور نفرت کی آگ سے تپ رہی تھی وہ وطن پرستی اور اعلیٰ اسلامی روایات کی زندہ مثال بنے رہے۔

رفیع احمد قدوائی

انتظامی مصلح

رفیع احمد قدوائی اتر پردیش کے ضلع بارہ بنکی میں مسولی مقام پر ۱۸ فروری ۱۸۹۴ء کو ایک متوسط زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ابتدائی درجہ کے بعد اپنے والد سے ایمانداری، سچائی اور محبت حاصل کی تو والدہ سے مستحکم کردار اور انتظامی صلاحیت سیکھی۔

رفیع احمد قدوائی ان لوگوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے آزادی کی جدوجہد کو اپنا لگائی اور نئے ہندوستان کی ترقی کے لیئے اپنا مساویانہ رول ادا کیا۔ حصول آزادی کی جدوجہد کے لئے درکار وسیع النظری، ہمدردی، سبقتی اقدام وغیرہ جیسی تمام صلاحیتیں کافی مقدار میں رفیع احمد قدوائی میں پائی گئی تھیں۔

جدوجہد آزادی کی کاوشوں میں کئی ملین لوگوں کی جانیں تلف ہوگئیں۔ اور کئی ملین لوگ اپنے ملک کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانے اور انگریزوں کے اقتدار کو بے دخل کرتے کرتے مختلف قسم کی قربانیوں کا شکار ہوگئے۔

نوجوان رفیع احمد قدوائی کی زندگی پر چچا ولایت علی کی مخالف فرنگی رجحانات کا بہت اثر پڑا۔ ولایت علی انڈین نیشنل کانگریس کے رکن اور ایک انقلابی مسلم سیاسی لیڈر تھے جن کی رہبری میں قدوائی میں قومی جذبات اور انگریز کے خلاف نفرت کے رجحانات پروان چڑھے اور ان کی مستقبل کی زندگی میں کردار سازی میں ممد و معاون ہوئے۔ انہوں نے ۱۹۱۶ء میں بی اے او کالج علیگڈھ میں شرکت کی جہاں قومی تحریک میں دلچسپی اور انگریزوں سے شدید مخالفت کی بناء پر خصوصی مقام حاصل ہوا کالج کے پرنسپل انگریزوں کے وفادار ہونے کی وجہ سے قدوائی کا نام بلیک لسٹ میں درج کیا گیا اور قبل اس کے کہ انھیں کالج سے خارج کیا جائے وہ خود بی اے میں کامیابی کے بعد قانون کی ڈگری حاصل کیئے بغیر ہی کالج ترک کر دیئے کیونکہ وقت سے پہلے انھوں نے عدم تعاون تحریک سے وابستگی اختیار کرلی تھی۔ ڈسمبر ۱۹۱۶ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کے مابین تاریخی معاہدہ طئے پایا قدوائی نے اپنے چچا کے ہمراہ ان اجلاسوں میں شرکت کی اور ۱۹۲۰ء میں خلافت تنظیم کے مستقل رکن ہوگئے

ضلع بارہ بنکی میں تحریک عدم تعاون کے پس پشت رفیع احمد قدوائی ایک اہم اور اصل طاقت تھے جہاں انھوں نے کثیر اجتماعات کو مخاطب کرکے اس تحریک میں شریک ہونے کی ترغیب دی جس کی بنا پر انھیں گرفتار کرکے قید با مشقت کی سزا دی گئی تھی۔ لکھنؤ جیل میں پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لال نہرو بھی ان کے ساتھ تھے۔ جیل میں ان دونوں بالخصوص پنڈت نہرو کے ساتھ دوستانہ تعلقات میں اضافہ ہوا۔ جو ان کے آخری دنوں تک جاری رہا۔ ضلع رائے بریلی میں کسانوں اور دیہاتیوں کو عدم ادائی لگان کے لئے اکسانے کی بنا پر انھیں جون ۱۹۳۰ء میں چھ ماہ کی سزا دی گئی اور دوبارہ جیل بھیج دیئے گئے مسٹر قدوائی۔ جی۔ بی پینت کی کابینہ میں وزیر بن گئے جبکہ ۱۹۳۷ء میں ملک میں کانگریس حکومتوں کا قیام صوبہ واری خود مختارانہ اسکیم کے تحت عمل میں لایا گیا۔ وزارت کے دوران قدوائی کو مالگزاری اور جیل کے قلمدان تفویض کیئے گئے جن کے بارے میں عوام بڑی توقعات رکھتے تھے۔ کاشت کاروں کے درمیان کام کرنے کی بنیاد پر قدوائی کسانوں کے مسائل سے واقف ہونے کے علاوہ اس بات سے بھی بخوبی واقف ہوسکے کہ زمیندار کاشت کاروں کے حق میں ایک اقتدار اعلیٰ بنے ہوئے ہیں چنانچہ رفیع صاحب کے ایجنڈے میں زمیندارا نظام کی برخواستگی کو اوّلیت دی گئی اور ان کی سرکردگی میں قدیم زمینداری نظام کی وجہ سے رونما تمام خرابیوں کو دُور کرنے کا باعث ہوا جو کہ رفیع احمد کا زبردست کارنامہ رہا ہے۔

اپریل ۱۹۴۶ء میں اُتر پردیش میں تشکیل شدہ کانگریسی وزارت میں رفیع احمد قدوائی کو پہلی بار مسلم وزیر کی حیثیت سے ہندو اکثریت کے علاقے میں وزیر داخلہ بننے کا اعزاز حاصل ہوا۔ انہوں نے جیل میں کئی انقلابی اصلاحات کیں اور قیدیوں کو بہترین شہری بنانے کے علاوہ جیلوں کو اصلاحی مراکز میں تبدیل کرنے کی سعی بلیغ کی۔ آزادی کے بعد جب انھوں نے وزارت داخلہ کا جائزہ حاصل کیا تو اس وقت کے صوبوں یعنی موجودہ اتر پردیش کے علاقہ میں حالات غیر یقینی اور ناسازگار تھے لیکن اتر پردیش کی خوش قسمتی تھی کہ فرقہ وارانہ کشیدگی اور تصادم پر قابو پانے کے لئے رفیع احمد قدوائی جیسے بہترین ماہر منتظم کی خدمات تقسیم ملک کے بعد حاصل ہوسکیں۔ انہوں نے غیر سماجی عناصر پر قابو پانے کے لئے فوری سخت اقدامات کیئے۔

سنہ ۱۹۵۲ء کے پہلے عام انتخابات کے بعد پنڈت نہرو نے رفیع احمد قدوائی کو اپنی کابینہ میں شامل کیا اور انھیں قلمدان زراعت و اغذیہ تفویض کیا گیا جبکہ ملک بھر میں راشننگ کا طریقہ رائج تھا۔ غذائی رسدات محدود تھے۔ قدوائی نے درپیش مسائل کا حل تلاش کرنے میں اپنی انتظامی صلاحیتوں

مرکوز رہا ۔ انہوں نے غذائی اجناس کی تجارت پر سے کنٹرول کو برخواست کر دیا اور ہمت کے ساتھ انہوں نے ذخیرہ اندوزوں کے حوصلے پست کر دیئے اور غذائی قلت پر قابو پانے کی کوشش کی جس کی بنا پر غذائی مارکٹ میں پائے گئے دباؤ میں کمی واقع ہوئی۔ کھلے بازار میں اجناس بغرض فروخت لائے جانے کی وجہ سے اجناس کی قیمتوں میں بھی کمی واقع ہوئی۔ انسان کی جانب سے پیدا کردہ قلت خود بخود انسانی کوششوں سے دور ہو گئی۔ رفیع احمد قدوائی کافی معلومات اور تجربے کے حامل تھے اور صرف درسگاہی تعلیم کی حد تک ان کی معلومات محدود نہیں تھیں انھیں کتابوں کی جگہ عوام سے دلچسپی تھی۔ دلیری، تخیلاتی نظریات اور انسانی روابط جیسے اہم نکات ان کے پیش نظر تھے۔ قدوائی ایک عملی انسان تھے اور پنڈت نہرو کے لیے سیاسی پارٹی اور حکومت کے میدان میں ایک بہترین مددگار کی حیثیت کے حامل تھے۔ مسلسل سخت کام، دل کا مرض، خون کا دباؤ مسلسل دورے اور روزآنہ ملاقاتیوں کا تانتا بندھا رہنا جیسی مصروفیات سے ان کی صحت پوری طرح متاثر ہو گئی۔ تنفس میں اضافہ کی وجہ سے اُن کی صحت مزید ابتری پیدا ہو گئی اور بالآخر ۲۴ / اکتوبر ۱۹۵۴ء کو دہلی کارپوریشن کے انتخابات کے سلسلہ میں پارٹی کا جلسہ کے بعد انہوں نے تنفس کی وجہ سے آخری سانس لی۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے رفیع احمد قدوائی کی وفات پر کہا کہ

" رفیع احمد کا نام سنہری حروف میں ان لوگوں کے ساتھ لکھا جائے گا جنھوں نے اپنی ساری زندگی ملک کی بہتری کے لئے جدوجہد آزادی کے لئے وقف کرتے ہوئے ملک کو آزادی دلاتے میں اپنی جان کی قربانی دی۔ ان کی موت سے حکومت ہند ایک باصلاحیت وزیر سے اور ملک اپنی سرزمین کے ایک سچے سپوت سے محروم ہو گیا۔ "



شاداب میں اشاعت کیلئے تخلیقات کا ٹائپ شدہ ہونا ضروری نہیں ہے۔ البتہ صاف، خوشخط اور صفحہ کے ایک جانب تحریر کی ہونی چاہیئے

ڈاکٹر حبیب نثار

برصغیر پر ازبک تہذیب کا اثر

[دکن میں موسیقی کے حوالے سے]

وسط ایشیاء اور ہندوستان کے آپسی باہمی تعلقات نے ہندوستانی تہذیب میں تصوف، ہندوستانی موسیقی اور اُردو زبان کے فروغ میں اہم حصہ ادا کیا۔ دکن کے عادل شاہی اور قطب شاہی حکمرانوں کے اجداد وسط ایشیا سے تعلق رکھتے تھے، ان دونوں ہی سلطنتوں میں تصوف، موسیقی اور اُردو زبان کو یکساں فروغ ہوا۔

ہندوستان کے معروف صوفیاء کا تعلق بھی وسط ایشیاء ہی سے تھا چنانچہ حضرت سید جلال الدین سرخ''، مخدوم جہانیانِ جہاں گشت''، حضرت حمید الدین ناگوری''، حضرت بختیار کاکی اوشی''، حضرت شیخ فرید شکر گنج، حضرت نظام الدین اولیا'' اور امیر خسرو''، ترک لاچین وغیرہ اجداد وسط ایشیاء ہی سے تشریف لائے تھے ان صوفیا کی تعلیمات نے بھی تصوف، موسیقی اور اردو کے فروغ کو جلا بخشی۔

ان صوفیاء کی خانقاہیں ہر مذہب کے ماننے والوں کی آمجگاہ بنی ہوئی تھیں۔ انہی خانقاہوں میں ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب نے فروغ پایا جو اردو کا مزاج ہے اور جو ہندوستانی موسیقی کی روح ہے۔

ہندوستان کے چشتی صوفیاء نے بخارا کے صوفیاء حضرت فضیل بن عیاض اور حضرت ابوبکر وراق کو نہ صرف اپنا مثالی نمونہ (IDEAL) بنایا بلکہ ان کی تعلیمات سے بھی فیض اُٹھایا اور سادگی و کسر نفسی کا سبق اپنی برگزیدہ صوفیاء بخارا سے حاصل کیا

سماع صوفیاء کے ذکر و فکر کا ایک اہم ذریعہ سمجھا اور مانا گیا ہے اس تناظر میں ہم ابتدائی چشتی صوفیاء کی محافل سماع کا جب جائزہ لیتے ہیں تو یہ دلچسپ حقیقت سامنے

آتی ہے کہ جس موسیقی کو ہم تاریخ کے اوراق پر ایرانی موسیقی کے نام نامی سے جانتے ہیں دراصل وہ ازبکستان کی موسیقی ہے یا ازبک اصل موسیقی ہے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اسحاق موصلی، رودکی اور ابن سینا جنہیں ہم ایرانی موسیقار قرار دیتے ہیں درحقیقت ازبکستان سے تعلق رکھتے ہیں۔

ہندوستان کے اصل باشندے ڈراویڈ تھے جن کی موسیقی کے بارے میں تاریخ خاموش ہے۔ ڈراویڈیوں کے بعد اور ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے قبل آریا نے ہندوستانی تہذیب کو فروغ دیا۔ آریا قوم کی موسیقی بھجن، گیت، دھروا اور پد پر مشتمل تھی۔ سازوں میں ڈمرو، وینا، بانسری اور مردنگ کے نام ملتے ہیں۔ آریا موسیقی کی ترقی یافتہ شکل ہم کرناٹک موسیقی میں آج بھی دیکھ سکتے ہیں جبکہ کرناٹک موسیقی کی ہم عصر ہندوستانی کلاسیکل موسیقی پر ازبکستان کا اثر واضح نظر آتا ہے یہ موسیقی کرناٹکی دلبستان موسیقی سے بالکل الگ اپنا وجود رکھتی ہے، سادگی اور صفائی جس کی بنیاد ہے۔

راقم الحروف کا خیال ہے کہ ہندوستانی کلاسیکل موسیقی کی اختراع بمقام ملتان، غزنوی عہد میں ہوئی۔ اپنے اس خیال کی تائید میں تاریخ ان کے سنہری عہد کی جانب اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جب ملتان میں عرب، ایران، ازبک، افغان اور ہندوستان کے شعراء موسیقار یکجا ہوئے تھے وسط ایشیاء سے ہندوستان آنے والے ابتدائی صوفیاء نے ملتان ہی میں ابتداً اپنی خانقاہیں تعمیر کیں اور اپنی تعلیمات کو عام کیا۔ حضرت بہاءالدین ذکریہ ملتانی، شیخ حمیدالدین ناگوری موسیقی کے سلسلے میں ایک اہم نام ہے۔ اسی زمانے میں شہزادہ محمد قاآن بن سلطان بلبن ملتان کا صوبہ دار تھا۔ امیر خسروؒ پہلے پہل شہزادہ محمد ہی کے مصاحب بنے اور یہیں ان کے ذوق موسیقی نے جلا پائی اور شہزادہ محمد ہی کے دربار میں انہوں نے بڑے ذوق و شوق سے اپنی غزلوں کی موسیقی کی دھنوں پر سجایا سنوارا۔ انہی اسباب و علل کی بناء پر ملتان ہند ازبکستان تہذیب کے فروغ کا اہم مرکز بن گیا تھا۔

ازبکستان اور ہندوستان میں موجود موسیقی کی ابتداء کے نظریات کے مطالعہ سے بھی یہ مترشح ہوتا ہے کہ دونوں ہی ممالک نے ایک دوسرے کے خیالات سے اخذ و ماخوذ کیا ہے۔

ازبک موسیقار موسیقی کی اختراع کا نظریہ حضرت موسیٰ علیہ السلام، فیثا غورث اور دوسرے یونانی موسیقاروں سے منسوب کرتے ہیں ہندوستانی موسیقی کے بعض محقق بھی ان نظریات کو مانتے ہیں جبکہ ہندو اساطیر میں موسیقی کی ابتداء کے نظریہ کو مختلف دیوتاؤں سے منسوب کیا

جاتا ہے ازبک موسیقی میں ایسا کوئی نظریہ نہیں ملتا۔

موسیقی کے بارے میں ابن سینا کہتے ہیں

" اصل چیز نہ نفس ہے نہ جسم نہ روح بلکہ آہنگ ہے اور آہنگ ہی موسیقی ہے"۔

ہندوستانی موسیقی کے پنڈت بھی موسیقی کا دارومدار "لے" اور "سُر" کو قرار دیتے ہیں

ہندوستانی موسیقی میں لئے ہی سب کچھ ہے جو نبض کی رفتار سے ماخوذ ہے۔

ہندو فلاسفر کا کہنا ہے کہ ساری کائینات کا وجود سُر (آواز) پر منحصر ہے

(قرۃ العین حیدر نے آگ کا دریا میں اسی کو ساری کائینات کے سا پا سا میں اسیر ہوتا لکھا ہے)

یہ نظریہ نادر شنی سے منسوب ہے۔ ابن سینا نے اس خیال یا نظریہ کو تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ پیش کیا ہے۔ کہتے ہیں۔

" اگر دنیا سے آواز نکال دی جائے تو کائینات بے معنیٰ ہے۔"

آمدم برسرِ مطلب، ہندوستان اور ازبکستان کی تہذیبوں کے درمیان اس میل جول نے ہندوستانی تہذیب پر بڑے خوشگوار اثرات مرتسم کئے۔ تصوف کے سلسلے میں یہ بات اہم ہے کہ دکن پر حضرت نظام الدین اولیاؒ کی تعلیمات کا خاصہ اثر ہوا اور حضرت خواجہ بندہ نوازؒ نے دکن میں تصوف کو توسیع دی۔ حضرت بہاؤ الدین غریبؒ اور نظام الدین اولیاء اورنگ آبادیؒ نے تصوف کو دکن میں مقبولِ عام بنانے میں اہم رول ادا کیا۔

تصوف کا ایک اہم جزو سماع ہے جس کے ذریعہ ہندوستانی موسیقی میں حضرت امیر خسروؒ، ترک لاچین، اہم ترین مقام کے حامل ہیں۔ انہوں نے کئی اصنافِ موسیقی اور چند ایک ساز اختراع کئے۔ امیر خسرو کی ان اختراعات کو زیادہ تر فروغ دکن میں ہوا۔ امیر خسروؒ نے اصنافِ نغمہ میں سہیلا، خیال (نقش) قولیانہ اور قوالی اختراع کی اور سازوں میں انہوں نے ستار (سہ تارہ) طبلہ اور ڈھول اختراع کیا۔ علاوہ ازیں انہوں نے ہندوستانی اور ایرانی (ازبک) لاگوں کے اشتراک سے نئے راگ بنائے یا اختراع کئے۔ راگ فرغانہ بھی انہی میں سے ایک ہے جسے آج بھی دکن کے موسیقاروں میں مقبولِ عام ہے

امیر خسروؒ کے اختراع صنف نغمہ سہیلا کو دکن میں حقیقت، جکری اور مکاشفہ کے نام دیئے گئے حالانکہ ان تمام کی نسبت سہیلا ہی کی ہے[1]

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو راقم الحروف کا مضمون "دکنی کی مخصوص شعری اصناف" مشمولہ " دکنی کی مخصوص شعری اصناف" (مجموعہ مضامین) ص ۳۱ سن اشاعت جنوری ۱۹۹۵ء

یہ امر تعجب خیز ہے کہ امیر خسروؒ کی ان اختراعات کا بیان تقریباً ڈیڑھ صدی تک شمالی ہندوستان کے کسی موسیقار نے نہیں کیا جبکہ دکن میں لکھی جانے والی تصانیف میں ان اختراعات کا تذکرہ تاریخی تسلسل کے ساتھ ملتا ہے۔ غنیۃ المنیہ (جو امیر خسروؒ کی وفات کے صرف پچاس برس بعد گجرات میں تصنیف ہوئی) میں طبلہ کی اصطلاحیں موجود ہیں۔ بہاء الدین باجن نے اپنے گجری کلام میں "خیال" موزوں کیے ہیں اسی زمانے میں حضرت بندہ نواز نے بھی خیال اور حقیقت موزوں کیے۔ حضرت بندہ نواز کے کلام کی زبان صاف اور ترقی یافتہ ہونے کی وجہ ان کا انتساب مشکوک ہے لیکن غنیۃ المنیہ اور باجن کی نظموں میں کسی کو کلام نہیں۔

بہمنی سلطنت کے خاتمہ کے بعد دکن میں جو پانچ سلطنتیں وجود میں آئی ان میں سے کم از کم تین سلطنتوں کے بانی ازبک نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان ازبک نسل کے حکمرانوں نے دکن میں ہندوستانی موسیقی سے نہ صرف دلچسپی لی بلکہ عملی اور نظری طور پر بھی موسیقی کو فروغ دیا۔

یوسف عادل شاہ وسط ایشیا سے تعلق رکھتا تھا اس نے اپنی جان بچانے کے لیے ہندوستان ہجرت کی اور بہمنی دربار میں رسوخ حاصل کیا۔ پچیس ۲۵ برس مختلف خدمات انجام دینے کے بعد اس نے خود مختاری کا اعلان کیا اور عادل شاہی سلطنت قائم کی۔ کہا جاتا ہے کہ یوسف عادل شاہ اس مہارت سے ستار بجاتا تھا کہ مقامی موسیقار بھی حیران رہ جاتے۔

عادل شاہی سلطنت ہی سے تعلق رکھنے والے حکمراں ابراہیم عادل شاہ ثانی اور علی عادل شاہ ثانی شاہی نے فارسی کے بجائے دکنی کو اپنی دربار کی زبان بنایا۔ ان حکمرانوں نے جکری، حقیقت، سہیلا اور دھرپد جیسے اصناف ہائے نغمہ کو فروغ دیا۔ صنف نغمہ خیال کے ساتھ دوہرہ پیوست کرنے کا عمل بھی دکن ہی میں شروع ہوا۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی، مغل شہنشاہ اکبر کا ہم عصر تھا اور تاریخ شاہد ہے کہ ابراہیم عادل شاہ ثانی نے موسیقی کے فروغ میں اکبر سے زیادہ اہم اور منفرد رول ادا کیا ہے۔ کتاب نورس، اس کی موسیقی نوازی کی زندہ مثال ہے۔ اس ترک الاصل بادشاہ نے ہندو دیوتاؤں اور اساطیر کی مدح نورس میں کی ہے۔ کتاب نورس میں موجود راگ مالا تصاویر ہندوستانی موسیقی میں اولیت کا درجہ رکھتے ہیں۔

یوسف عادل شاہ کے اعلان خود مختاری کے کچھ ہی عرصہ بعد سلطان قلی نے بھی بہمنی سلطنت سے بغاوت کی اور ۱۵۱۸ء میں اپنی آزاد سلطنت کی بنیاد رکھی۔ سلطان قلی کا تعلق ازبکستان کے قبیلے قراقونیلو سے تھا جس نے آقا قونیلو قبیلے کے ہاتھوں شکست اٹھانے کے بعد تقریباً ایک صدی تک

بغداد پر حکومت کی۔ سلطان قلی نے اپنے چچا حیدر قلی کے ہمراہ ہندوستان کا رُخ کیا۔

تاریخ گواہ ہے کہ سلطان قلی ایک اچھا موسیقار تھا اور چنگ بہت اچھا بجاتا تھا۔ چنگ آج بھی ازبکستان میں مستعمل ہے۔ ہندوستان میں اسی کو مور چنگ اور چنگ کہتے ہیں۔ یہ ساز عادل شاہی اور قطب شاہی درباروں میں مصروف تھا۔ چنانچہ ان سلطنتوں میں تخلیق پانے والے ادبی نوادر میں اس ساز کا خصوصی ذکر ملتا ہے حسن شوقی نے "میزبانی نامہ" اور احمد گجراتی نے "یوسف زلیخا" میں اس ساز کا تذکرہ کیا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گولکنڈہ میں خیال گائیکی پنپنے لگی تھی اور سراہی جاتی تھی۔ اس سلطنت کے حکمرانوں میں سلطان قلی اور سلطان محمد قلی قطب شاہ بانیٔ شہر حیدرآباد اس گائیکی کے اسیر نظر آتے ہیں۔ غواصی نے اپنی مثنویوں "طوطی نامہ" اور "سیف الملوک بدیع الجمال" میں غزل کا خصوصی طور پر تذکرہ کیا ہے۔ ملا وجہی نے سب رس میں قانون "شہنائی" "دف" بانسری اور ایک تارہ کا ذکر کیا ہے۔ ان میں قانون اور شہنائی اور ایک تارہ ازبکستان سے تعلق رکھتے ہیں۔ دف عرب سے آیا ہے اور بانسری ہندوستانی ہے۔ ہند ازبکستان تہذیب کے مشترک عناصر کی یہ ایک بہترین مثال ہے۔ یہاں ایک دلچسپ حقیقت یہ سامنے آتی ہے کہ ملا وجہی نے ہندوستان میں اختراع ہونے والے سازوں کا ذکر نہیں کیا ہے۔ یہاں نہ ستار ملتا ہے اور نہ طبلہ و مردنگ۔

علی عادل شاہ ثانی نے بھی چار دَر چار کی ہئیت میں نظم لکھی ہے جو دراصل موسیقی کی تال؛ تین تال سے مستعار ہے جس میں سولہ ماترے ہوتے ہیں۔

دکن کی خانقاہوں میں آج "دف" "دائرہ" "یک تارہ اور جھپٹا" کا استعمال ہوتا ہے۔ خصوصاً خانقاہ بندہ نوازؒ اور خانقاہ حضرت شاہ راجو قتالؒ کی محافل سماع اس کی اچھی مثالیں ہیں۔ مندرجہ بالا ساز اور محفل سماع کی نوعیت ازبک اثر کی دین ہے۔

دکن میں لکھی جانے والی موسیقی کی تصانیف میں ترکی تال اور ترکی تان کا یورہ کے مستعمل ہونے کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ ترکی تان یورہ کشمیر میں بھی استعمال ہوتا ہے اس ساز میں پانچ تار ہوتے ہیں۔

الغرض جکری، سہیلا اور حقیقت کی ہئیت میں لکھی جانے والی نظموں کو دکن میں فروغ حاصل ہوا اور ترک نسل حکمرانوں نے ان کو نہ صرف پسند کیا بلکہ ان کے ارتقاء کو بھی آگے بڑھایا۔ شاید ان ہی تمام عناصر اور مسلمانوں کی ترکی سے تعلق کی بناء پر تلگو بولنے والے مسلمانوں کو "ترکولو" کہتے ہیں۔

صحیح سُر جو دل سے نکلتا ہے سر چڑھ کر بولتا ہے اور سننے والوں کو مبہوت کر دیتا ہے
لحن داودیؑ اور کنہیا کی بانسری اسی کی مشہور مثالیں ہیں جو استعارہ و علامت کا روپ اختیار کر چکے
ہیں۔ ازبکستان کے شاعرِ اعظم رودکی کو بھی اس بات کا علم و اندازہ تھا چنانچہ اُس نے اپنی
غزل گا کر امیر ابو نصر سامانی کو میدانِ جنگ سے بخارا لوٹنے پر مجبور کیا تھا۔ رودکی نے بربط کی
سنگت میں گیت گایا تھا جس کا پہلا مصرع ہے۔

بوئے جوئے مولیاں آید ہمے ؎ یاد یارِ مہرباں آید ہمے

یہ گیت آج بھی ہندوستانی موسیقی کے راگ کرداں میں ادا کیا جا سکتا ہے۔ شہنائی آج
ہندوستانی موسیقی اور تمدن کا ایک اہم حصہ بن چکی ہے اس ساز کو ابن سینا نے اختراع کیا۔ اس ساز نے
ہندوستانی موسیقار اُستاد بسم اللہ خاں کی فنکاری کی بناء پر بین الاقوامی شہرت حاصل کرلی ہے
راقم الحروف نے ہند ازبکستان کے درمیان ہزار برس سے چلے آرہے تہذیبی تعلقات کے
تناظر میں اور دکن میں موسیقی کے حوالے سے اس مختصر مضمون میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مضمون
کو سمیٹتے ہوئے ہندوستانی اور ازبک موسیقی کے معاصرانہ حیثیت پر اظہار کرتے ہوئے اجازت
چاہتا ہوں۔

ہندوستانی موسیقی جو کہ ہند ازبک تہذیب کے میل سے ارتقار پائی آج بین الاقوامی
شہرت کی حامل ہے جبکہ ۱۹۲۵ء کے بعد ازبکستان کی موسیقی میں اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں اور ازبک
موسیقی نے مشرقی روایات سے منہ موڑ کر مغرب کے آہنگ SYMPHONIC TRADITION
کو اپنا لیا اور اس طرح اپنی روایتی اور اصل موسیقی سے دور ہو گئی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ
آج بھی ازبک شہنائی، رباب، بانسری اور دائرہ پھر ایک بار ازبک موسیقاروں کی جانب دیکھ
رہے ہیں کہ اپنی روحِ اصلی کو پا سکیں ■

سُمن سُمار لپُودار

اصل خطرہ

سابق وزیراعظم آنجہانی راجیو گاندھی نے ملک میں کرپشن کی صورت حال کا نقشہ کھینچتے ہوئے ایک بار کہا تھا کہ ہندوستان میں جو بھی پروجیکٹ شروع ہوتا ہے اس کے لئے مہیا کئے گئے فنڈ کا 80 فیصد حصہ بے ایمان افسران اور سرکاری عملہ کھا جاتا ہے اور پروجیکٹ پر 20 فیصد سے بھی کم رقم صرف ہوتی ہے اس وقت ملک میں 494 افراد ایسے پائے جاتے ہیں جن کی حفاظت پر سالانہ 68 کروڑ روپے خرچ کئے جاتے ہیں۔ یہ رقم سرکاری خزانہ سے ادا کی جاتی ہے حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے حکومت کو تو انتہائی اہم شخصیات کی حفاظت کا ذمہ لینا چاہئے جن میں صدر، نائب صدر، وزیراعظم وغیرہ کو شامل کیا جاسکتا ہے۔ مرکزی وزراء، عام ممبران پارلیمنٹ و ممبران اسمبلی کے لئے اس سہولت کی فراہمی فضول خرچی ہے کیونکہ وہ اپنی حفاظت آپ کرنے پر قادر ہوتے ہیں۔ ان کے پاس پہلے ہی کافی رقم موجود ہوتی ہے یہ کہا جاتا ہے کہ آبادی میں اضافہ سے معاشی ترقی کی رفتار نہ صرف یہ کہ سست پڑ جاتی ہے بلکہ معیشت پر اس کا الٹا اثر پڑتا ہے یہ صحیح ہے لیکن یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ صرف ایک ہی وجہ ہے۔ چین کی آبادی ہندوستان سے زیادہ ہونے کے باوجود اس کی سالانہ ترقی کی رفتار اور فی کس آمدنی یہاں سے زیادہ ہے، معیار زندگی بہت بلند ہے، عالمی تجارت میں چین کا حصہ بھی ہمارے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے 1947 میں ملیشیا، سنگاپور اور جنوبی کوریا کی حالت ہندوستان جیسی تھی مگر آج ہر میدان میں ہندوستان ان سے کافی پیچھے ہے حالانکہ یہ بات کہی جاتی ہے کہ اوسط ہندوستانی کی سمجھ بوجھ، صلاحیت اور توانائی دوسرے کسی بھی ملک کے اوسط درجے کے شہریوں سے زیادہ ہوتی ہے اس کے باوجود ہم دوسروں سے بہت پیچھے ہیں۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ اگر اس پر غور کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ اس کی اصل وجہ کرپشن ہے یہی وجہ ہے بس کی گانٹھ ہے جس کے خلاف ہمیں جنگ کرنی ہے۔

(پائنیر 28 فروری 1997)

رپورتاژ

کل ہند ادب اطفال سیمینار

م۔ ق۔ سلیم

نیا سال، نئی امنگیں، نئی امیدیں لئے قوس قزح کے رنگ بکھیرتا آیا۔ اس کی ابتداء پونے میں منعقدہ کل ہند ادب الاطفال سیمینار سے ہوئی جس کا اہتمام حاجی غلام محمد اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ کیا ملک گیر سطح پر اتنا بڑا "ادب اطفال" کا سیمینار پہلی مرتبہ منعقد کیا گیا۔ جس میں ملک کے مختلف علاقوں سے شرکا نے شرکت کی۔

۳ جنوری پونے کی تاریخ میں سنہری لفظوں سے لکھا جائے گا۔ پونے شہر میں پہلی مرتبہ شہر و مضافاتی علاقوں کے اردو مدارس نے "ادب اطفال" کے سلسلہ میں بچوں کی رنگارنگ ریلی کا اہتمام کیا کہ جو پونے شہر کی سڑکوں پر گشت کرائی گئی اس ریالی کو عالی جناب منور پیر بھائی نے جھنڈی بتا کر افتتاح کیا۔

۴ جنوری ۱۹۹۷ء کی صبح ۹ بجے "اعظم کیمپس" میں مدیر شمع یونس دہلوی صاحب نے اردو کا پرچم جو قوس قزح کے رنگوں سے مزین تھا اس کی رسم پرچم کشائی انجام دی اور ساتھ ہی ادب اطفال سیمینار" لکھا ہوا غبارہ فضاء میں چھوڑا۔ امن کی علامت کبوتروں کو بھی اس موقع پر فضاء میں چھوڑا گیا۔ تالیوں کی گونج سے سارا اعظم کیمپس گونج رہا تھا۔ مدیر شمع نے اس مختصر سی تقریب کو جس میں غلام محمد اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ سے چلنے والے تمام مدارس کے طلباء و طالبات نے شرکت کی مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ " کھلونا (بچوں کا رسالہ) میں نے اپنی خواہش پر نکالا اور اس دور میں اس کے لئے مجھے اپنے والد نے پانچ ہزار روپے دیئے۔ اس کا پہلا شمارہ ۵ ہزار کی تعداد میں شائع ہوا اور ہاتھوں ہاتھ فروخت بھی ہوا۔ کھلونے میں بچوں کی تحریریں حلووں کی طرح ہوتی تھی نہ کہ شکر میں لپٹی ہوئی کڑوی گولیوں کی طرح۔"

مہمانِ خصوصی جناب قاضی مشتاق احمد صاحب ایڈیشنل ڈائرکٹر حکومت مہاراشٹرا نے اپنی تقریر میں کہا کہ وہ اپنی مادری زبان سے محبت کریں ۔ اور رسالے خرید کر پڑھیں۔ انہوں نے مدیر شمع سے درخواست کی کہ وہ رسالہ کھلونا دوبارہ نکالیں۔ اس اجلاس میں منور پیر بھائی الیس افوامدار امین حزیں ۔ ڈاکٹر حفیظ صدیقی کے علاوہ شرکا نے شرکت کی۔

رسم پرچم کشائی کی تقریب کے ساتھ ہی جناب یونس دہلوی مدیر شمع نے ربن کاٹ کر " کتب اطفال " کی نمائش کا افتتاح کیا۔ اس میں کثیر تعداد میں مہمانوں نے شرکت کی ، کتابوں کو بڑی ہی خوبصورتی کے ساتھ سجایا گیا اور بچوں کے بارے میں اقتباسات کو جلی حرفوں میں لکھا گیا۔ جس میں علی سردار جعفری ، یوسف ناظم ، خواجہ احمد عباس ، م ۔ ق ۔ سلیم وغیرہ کے اقتباسات قابلِ ذکر ہیں ۔ اس نمائش میں ملک و بیرونِ ملک کے بچوں کے رسائل کے علاوہ ادبار و شعراء کی تخلیقات کو یکجا کیا گیا۔ یہ کام بڑی ہی خوش اسلوبی سے سیدہ واحد عبدالقادر و عظمیٰ تسنیم نے انجام دیا ۔

افتتاحی اجلاس جس کی صدارت یونس دہلوی نے کی بیرونی شرکار کا تعارف اور انہیں گلہائے عقیدت پیش کیے گئے ۔ پونے کے بچوں کے مشہور شاعر امین حزیں نے مہمانوں کا تعارف کروایا ۔ اور جناب منور پیر بھائی نے جو کہ حاجی غلام محمد اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ کے چیئرمین ہیں تعلیمی اداروں کی سرگرمیوں سے روشناس کروایا ۔ جناب قاضی مشتاق احمد رکن اردو اکیڈیمی مہاراشٹرا ، ڈاکٹر حفیظ صدیقی و امین حزیں مہمان خصوصی تھے ۔

دوسرے اجلاس کا پہلا حصہ مہاراشٹرا اردو اکیڈیمی کے زیرِ اہتمام " اردو میں بچوں کا ادب ، خیال و تجاویز " تھا جس کی صدارت مدیر شمع نے کی جبکہ اس اجلاس کی صدارت پروفیسر عبدالستار دلوی ، صدر شعبۂ اردو ممبئی یونیورسٹی کرنے والے تھے ان کے ساتھ حادثہ پیش آنے کی وجہ وہ شرکت نہ کر سکے ۔ اس اجلاس میں قاضی مشتاق احمد ، نذیر فتح پوری مدیر اسباق " سہ ماہی عباس حسین فطرت مدیر " صداقت " محترمہ عظمیٰ اقبال ، ڈاکٹر محبوب راہی اور امین حزیں نے اپنے تاثرات ، خیالات و تجاویز پیش کیے ۔ جناب عبدالاحد ساز نے اپنی مشہور نظم جو کہ سماسوں پر پیر ہے سنائی ۔

دوسرے دور میں محترمہ بانو سرتاج صاحبہ ریڈر جیوتی کالج آف ایجوکیشن چندر پور کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جس میں بحیثیت مہمانانِ خصوصی جناب غلام حیدر بچوں کا ٹرسٹ ، جناب ڈاکٹر محبوب راہی ، جناب م ق سلیم صدر شعبۂ اردو شیواجی کالج جناب محمد خلیل مدیر " سائنس کی دنیا " جناب

حیدر بیابانی، جناب متین اچلپوری، جناب خیال انصاری، جناب رشید قاسمی اور جناب تہذیب الدین خواجہ نے شرکت کی اور اردو میں بچوں کے ادب پر اظہار خیال کیا۔ وقت کی تنگی کی بناء پر چند مہمانوں نے ہی مخاطب کیا۔

۵ جنوری ۱۹۹۷ء ۱۱ بجے دن "ادب اطفال سیمینار" کا آغاز ہوا۔ محترمہ بانو سرتاج صاحبہ چندن پور نے صدارت کی اور اس میں ریاست و بیرون ریاست سے آئے ہوئے شرکاء نے اپنے مقالے پیش کئے جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

جناب سید غلام حیدر (امروہہ) جو کہ دلی سے تشریف لائے انہوں نے بچوں کے ٹرسٹ کے لئے کافی خدمات انجام دیں اور آج بھی وہ بچوں کے لئے دن رات کوشش میں لگے ہیں کہ اچھا ادب پیش کر سکیں۔ "بچوں کا ادب اور دوسری زبانوں میں بچوں کا ادب" کا جائزہ تفصیل کے ساتھ پیش کیا۔

جناب م۔ق۔ سلیم صدر شعبۂ اردو شاداں کالج حیدرآباد جو کہ اردو کے مایہ ناز افسانہ نگار و نقاد ہیں اور بچوں کی کتاب "آسان اردو خط و کتابت" کے خالق ہیں انہوں نے بچوں کے ادب کا سرسری جائزہ لیا اور بچوں کے ادب کے ارتقاء کے بارے میں نئی معلومات پیش کیں۔

جناب محمد خلیل مدیر "سہ ماہی سائنس کی دنیا" نے بچوں کا ادب اور سائنس کے عنوان پر مقالہ پڑھا اور بچوں کے ادب میں سائنس کی اہمیت کو پیش کیا۔

جناب ڈاکٹر محبوب راہی نے تفصیل سے "بچوں کے ادب" کا جائزہ لیا۔ وقت کی تنگی کی بناء وہ اپنا مقالہ مکمل نہ پڑھ سکے۔

جناب خلیل انصاری مدیر "خیر اندیش" جناب متین اچلپوری، جناب حیدر بیابانی اور مذہب الدین خواجہ نے بھی بچوں کے ادب پر روشنی ڈالی۔ صدر سیمینار محترمہ بانو سرتاج صاحبہ نے اجمالی خاکہ بچوں کے ادب پر پیش کیا۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر حفیظ صدیقی نے بڑے ہی حسن و خوبی سے انجام دی۔

سیمینار کے اختتام پر بچوں کی جانب سے کلچرل پروگرام پیش کیا گیا اس سے قبل تمام شرکاء کو حاجی غلام محمد اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ کی جانب سے مومنٹو پیش کئے گئے۔ انعامات کی تقسیم کے ساتھ اس سیمینار کا اختتام عمل میں آیا۔

اردو ادب میں "ادب اطفال" پر یہ پہلا کل ہند ادبی ادب اطفال (باقی صفحہ ۶ پر)

ڈاکٹر محمد منشاء الرحمٰن خان منشاؔ

سختیٔ زیست سے بیزار نہیں ہیں ہم لوگ
اپنی توہین کو تیار نہیں ہیں ہم لوگ

آبرو کے لئے ہم جان کھپا دیتے ہیں
اتنا ہو کر بھی زیاں کار نہیں ہیں ہم لوگ

جن اندھیروں کو جہاں والے سمجھتے ہیں عزیز
اُن اندھیروں کے پرستار نہیں ہیں ہم لوگ

جو نئی بات ہو اچھی اسے کرتے ہیں قبول
کہنہ رسموں کے گرفتار نہیں ہیں ہم لوگ

ہم کو امواجِ تلاطم میں مزا آتا ہے
لطفِ ساحل کے طلب گار نہیں ہیں ہم لوگ

بات جو سچ ہو وہی کرتے ہیں بے خوف و خطر
کسی غالب کے طرفدار نہیں ہیں ہم لوگ



شعر میں کرتے ہیں ہم زیست کی باتیں منشاؔ
مدح خوانِ لب و رخسار نہیں ہیں ہم لوگ

غزلیں

ابوالفاروق شعور　　　　نادر اسلوبی



حیات بخش تری یاد کی گھڑی آئی
وفورِ غم کے لئے عید کی خوشی آئی
اندھیرے چھا گئے جب یاد میں کمی آئی
ترے خیال سے آنکھوں میں روشنی آئی

چمن سے گزرے ہیں جس دم وہ مثلِ بادِ صبا
لبوں پہ کلیوں کے بے ساختہ ہنسی آئی
نہ ہوگا ختم کبھی انتشار آپس کا
انانیت میں نہ کچھ بھی اگر کمی آئی
خلوصِ دل سے جھکے جب بھی سر درِ حق پہ
نظر درِ دوں کو نظر شانِ بندگی آئی
وفا خلوص و محبت شعار تھا جن کا
چمن میں اُن کے خزاں بھی بہار سی آئی

نصیب ہو نہیں سکتی شعور دیدہ وری
اگر نہ دل میں بصیرت کی روشنی آئی

یہ رنگین فضائیں غزل کہہ رہی ہیں
نشیلی ہوائیں غزل کہہ رہی ہیں
ضیا بار ہے اُن کے رُخ کا اُجالا
یہ زلفی گھٹائیں غزل کہہ رہی ہیں
حسینوں کی محفل ارے توبہ توبہ
ادائیں ادائیں غزل کہہ رہی ہیں
تمہیں اور کیا دیں جفا کے عوض ہم
ہماری دعائیں غزل کہہ رہی ہیں
اسی طرح اُن تک رسائی ہے ممکن
دلوں کی صدائیں غزل کہہ رہی ہیں

کہی جن کی خاطر غزل میں نے نادر
وہی اپسرائیں غزل کہہ رہی ہیں

فارم نمبر ۴
تحت ضابطہ نمبر ا

تختہ بابتہ ملکیت وغیرہ برائے ماہنامہ شاداب حیدرآباد

مقام اشاعت : دفتر شاداب، مکان نمبر ۱۴۷-۵-۱۱ ریڈ ہلز حیدرآباد

وقفۂ اشاعت : ماہنامہ

ایڈیٹر : محمد قمر الدین صابری

پرنٹر، پبلشر اور مالک : محمد قمر الدین صابری

نام : محمد قمر الدین صابری

پتہ : ۱۴۷-۵-۱۱ ریڈ ہلز حیدرآباد اے پی

قومیت : ہندوستانی

میں محمد قمر الدین صابری اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و اطلاع کی حد تک بالکل درست ہیں

دستخط محمد قمر الدین صابری

یکم مارچ ۱۹۹۷ء

ماہنامہ

شاداب

حیدرآباد

جلد ۱۳

شمارہ ۴

اپریل سنہ ۱۹۹۷ء

قیمت دس روپے

زرِ تعاون

	سالانہ	دو سال کیلئے	تاحیات
ہندوستان	۱۰۰ روپے	۱۸۰ روپے	۱۵۰۰ روپے
خلیجی ممالک	۳۰۰ //	۵۵۰ //	۴۰۰۰ //
امریکہ	۵۰ ڈالر	۹۰ ڈالر	۹۰۰ ڈالر
انگلستان	۳۰ پونڈ	۵۰ پونڈ	۵۰۰ پونڈ
پاکستان	۲۰۰ روپے	۳۵۰ روپے	۴۰۰۰ روپے

ترسیل زر کا پتہ ماہنامہ شاداب ۱۴۷-۵-۱۱ ریڈہلز حیدرآباد

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمرالدین صابری نے نفیس فائن پرنٹنگ پریس میں چھپوا کر دفتر شاداب ۱۴۷-۵-۱۱ ریڈہلز حیدرآباد سے شائع کیا۔

فہرست

سپاس نامہ



"اُردو یونیورسٹی اور سہرابندی" کے عنوان سے مجتبیٰ حسین کا ایک دلچسپ مضمون نظر سے گزرا۔ راقم الحروف کے دل میں ایک عرصے سے یہ خیال جاگزیں تھا کہ ہم اُردو والوں کے مزاج کا ایک عامہ خلط مبحث ہے۔ فروعات ہمارے لیئے غیر معمولی کشش رکھتی ہیں، ہماری نگاہ ڈالیوں بلکہ ٹہنیوں اور پھنگیوں اور پتیوں میں الجھ کر رہ جاتی ہے۔ تنا ہمیں نظر ہی نہیں آتا اور جڑیں تو خیر (برگد کو چھوڑ کر) یوں بھی دبی رہتی ہیں۔ بے وقت کی شہنائی ہمیں ساہیرنون کے گانوں کی طرح مسحور کرتی ہے ہم اور ہماری فکر اور ہماری تدبیریں وقت کا ساتھ نہیں دے پاتیں۔ پیچھے پیچھے چلتی ہیں۔ مسائل کو ہم دھکہ دے دیتے ہیں اور شخصیات کو سر پر چڑھا لیتے ہیں، غیر مربوط اور غیر متعلق کو ہم آنکھوں پر بٹھا لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم رائے عامہ نہیں بنا پاتے اور ہمارے مطالبات ٹھکرا دیئے جاتے ہیں زندگی خواہ افراد کی ہو خواہ جماعتوں اور قوموں کی، اس میں بے ربطی، بے تناسبی اور بے محوری اور ناوقتی ہمیشہ ٹوٹے کا سودا بن جاتی ہے اردو یونیورسٹی کی پذیرائی ہم نے جس طرح کی اس نے اس خیال کو پختہ کر دیا اس خلش کو ہمکا دیا۔

اُردو یونیورسٹی کے تیئں بھی ہم نے اپنی دستوری روش کو اختیار کیا۔ سرکار کی طرف سے یونیورسٹی کا اعلان ہونا تھا کہ ایک کہرام مچ گیا۔ اُردو کی ابتدائی تعلیم کے لیئے توجو دراصل مزدرعلے ہے کچھ کیا ہی نہیں اور چلے ہیں اُردو یونیورسٹی بنانے۔ گویا جڑوں کو چھوڑ کر ٹہنیوں کو سینچا جا رہا ہے۔ اعتراض اپنی جگہ پر صحیح تھا لیکن اعتراض میں سر کھپانے اور وقت ضائع کرنے کے بجائے ہمارا سارا دھیان ماموز ہونا چاہیئے تھا مجوزہ یونیورسٹی کے ہیولی یا نقشِ اول کی تشکیل پر تاکہ جو یونیورسٹی بالآخر بنے وہ اُردو والوں کے لئے زیادہ سے زیادہ کارآمد ہو۔ ہماری رائے عامہ نے اس بنیادی اور تعمیری کام کی طرف توجہ ہی نہیں دی۔ فریاد اور واویلا، طنز، تنقیص اور استہزا میں وقتِ عزیز گنوا دیا غافل اس سے کہ وقت اپنے آپ کو دوہراتا نہیں۔ گیا وقت پھر آتا ہاتھ نہیں۔ اخباروں اور محفلوں میں

میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا لیکن اس بحث نے روپ اختیار کیا شکوہ سنجی اور گلہ مندی یا علاقائی رقابت کا، تشکیل اور تعمیر کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا۔

حکومت نے فرض کفایہ کے طور پر یا زیادہ نمائش اُردو کے اہل قلم اور اہل اثر کی ایک کمیٹی بنائی کہ وہ یونیورسٹی کی روپ ریکھا کی بابت اسے سمجھاؤ دیں۔ اس کمیٹی میں اس کم سواد کو بھی بیٹھنے کا موقع ملا۔ کوشش یہ کی گئی کہ یونیورسٹی کو اس طرح سے ڈھالا جائے کہ وہ اُردو زبان اور اسے بولنے والوں کے لئے فیوض کا سرچشمہ بن جائے۔ آزادی کے بعد کئی ریاستوں میں اُردو تعلیم کا جو سلسلہ ٹوٹ گیا یا توڑ دیا گیا وہ کسی طرح جوڑ جائے، انفرادی سطح پر جو لوگ تعلیم چھوڑ بیٹھے ان کو گھر بیٹھے اُردو میں تعلیم حاصل کرنے کے مواقع فراہم کر دیئے جائیں اور حرفتی تربیت کا سر و سامان بھی کیا جائے۔ چنانچہ طئے پایا کہ کمیٹی کی رپورٹ اس ڈھنگ سے بنے۔ اس کا مسودہ تیار کرنے میں راقم السطور کو جناب اللہ دیال قدوائی اور مالک رام صاحب کی رہنمائی اور پوری تائید حاصل رہی۔

کمیٹی کی اہم سفارشات کچھ اس طرح تھیں۔

(۱) مجوزہ اُردو یونیورسٹی عام یونیورسٹیوں سے مختلف ہوگی۔ اس کا ڈھانچہ عام یونیورسٹیوں کے لگے بندھے سکہ بند ڈھانچے سے بالکل الگ ہوگا اس میں لچک ہوگی اور بدلتی ہوئی ضروریات کے مطابق خود کو ڈھالنے کی پوری صلاحیت۔ یہ ایک جدید، کشادہ، توانا اور جاندار یونیورسٹی ہوگی جو جدید تعلیم کی چنوتیوں اور مطالبات سے بخوبی عہدہ برآ ہو سکے گی۔ یہ " اندرا گاندھی اوپن یونیورسٹی " کی وضع پر اپنی رسائی اور منفعت کو بڑھانے کے لئے، فاصلے سے تعلیم پر زور دے گی۔

(۲) ادب کے بجائے اُردو یونیورسٹی مادی، حیاتی اور سماجی علوم کو اپنے دائرہ تدریس و تحقیق میں شامل کرے گی۔ یہ بات اُردو زبان کے فروغ کے لئے ضروری بھی ہے

(۳) کئی ریاستوں میں آزادی کے بعد اُردو کی تعلیم کا سلسلہ ٹوٹ گیا تھا۔ اُردو یونیورسٹی کی کوشش ہونا چاہیئے کہ ان ٹوٹی ہوئی کڑیوں کو پھر سے جوڑے۔ خصوصاً ابتدائی اور ثانوی مراحل میں۔ یہ کام فاصلہ سے تعلیم کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے۔

(۴) اُردو یونیورسٹی کی تعلیم کو ایک محاذ پر صنعتی اور پیشہ ورانہ ٹریننگ کے ساتھ جوڑا جائے۔

(۵) اندرا گاندھی اوپن یونیورسٹی کی وضع پر اُردو یونیورسٹی کا فیض ہندوستان کی مختلف ریاستوں تک اسٹڈی سنٹرز (مطالعاتی مراکز) کے ذریعہ عام کیا جائے۔

(۶) اُردو یونیورسٹی بڑے پیمانہ پر جدید علوم کی کتابوں کے ترجمے کا کام اپنے ہاتھ میں لے گی۔

(۷) یونیورسٹی تین زبانوں، اُردو، انگریزی اور ہندی (یا علاقائی زبان) کو لازمی مضامین کے طور پر پڑھائے گی۔ اُردو کی تو بہر حال تدریسی زبان کی حیثیت بھی ہوگی۔

(۸) یونیورسٹی میں مستقل اساتذہ کی تعداد برائے بیت ہوگی۔ زیادہ تر اساتذہ کی ماموری معینہ مدتوں کے لئے کی جائے تاکہ یونیورسٹی اور ٹیچرس دونوں زنگ خوردگی اور بے حرکتی سے محفوظ رہیں

(۹) اُردو یونیورسٹی کو بعض شرطوں کے ساتھ کالجوں کے الحاق کا اختیار ہوگا۔

(۱۰) حفظانِ صحت، متوازن غذا، شہری ذمہ داری، قومی یکجہتی، ماحول کی حفاظت کو اس کے نظامِ تعلیم میں مناسب جگہ ملے گی۔

(۱۱) نیشنل کونسل فار ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ اور بیورو فار پروموشن آف اُردو اور اندرا گاندھی اوپن یونیورسٹی کے تعاون سے مجوزہ یونیورسٹی اُردو زبان میں مختلف علوم کی کتابیں تیار کرے گی۔

(۱۲) یونیورسٹی کا پہلا دور ۱۹۹۴ء میں شروع ہو جانا چاہیئے اور دو سال کے اندر اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔

(۱۳) مجوزہ یونیورسٹی ملک کی سماجی، اقتصادی صورت حالات کو برابر تحتِ نظر رکھے گی اور اس میں وقتاً فوقتاً رونما ہونے والی تبدیلیوں کے مطابق نصاب میں تبدیلی کرتی رہے گی تاکہ اس کے فارغین کے مبلغ علم و ہنر اور روزگار کے امکانات میں کسی قسم کا ٹکراؤ نہ ہو پائے۔

یہ بھی سفارش کی گئی تھی کہ جب تک یونیورسٹی کی اپنی عمارت نہیں بنتی، کرایہ کی عمارت میں کام چلایا جائے۔

آگے بڑھنے سے پہلے ملحوظ رکھیے کہ یہ سفارشات اس کمیٹی نے کی تھیں جو اُردو اور اُردو والوں کے مفادات کی ملک گیر سطح پر ترجمان تھی۔ لیکن یونیورسٹی گرانٹس کمیشن اور شعبۂ تعلیم نے ان سفارشات کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور یونیورسٹی کے امکانات اور اس کی ندرت، افادیت شادابی، لچک اور صلاحیت کو بہت محدود کر دیا۔ اگر ایسا ہی کرنا تھا تو ماہرینِ اُردو (ایک استثنا کے ساتھ) سے رائے ہی کیوں لی تھی؟ حکومت کی طرف سے ان کی تجاویز میں ترمیم صرف دو صورتوں میں جائز سمجھی جاتی۔ ایک وسائل کی کمی۔ دوسرے قومی مفاد سے انحراف، اُردو کمیٹی کی رپورٹ کو تسلیم کرنے کی راہ میں ان دونوں میں سے کوئی بات حائل نہیں تھی۔ حیرت ہے کہ کمیٹی کی متفقہ سفارشات کے ساتھ بے احترامی کا یہ برتاؤ کیوں کیا گیا۔ اُردو یونیورسٹی ایکٹ نے وہ

توانائی کھودی اور وہ پھیلاؤ بھی جو یونیورسٹی کا مقدر تھا اور جس کا تصور اُردو کے ترجمانوں نے کیا تھا۔ اُردو یونیورسٹی ایکٹ اس نقشہ کا ایک پھیکا خاکہ ہے جس میں آپ ورکنگ کمیٹی کی سفارشات نے بھرا تھا۔ یونیورسٹی کے لئے اب جو مقاصد متعین کیئے گئے ہیں ان میں سے چند نیچے دیئے جاتے ہیں

(۱) اُردو زبان کو فروغ اور ترقی دینا' اُردو زبان کے ذریعہ ٹکنیکل اور پیشہ ورانہ تعلیم دینا۔ ان طلبار کو جو اعلیٰ تعلیم اور تربیت کے خواہاں ہیں مطلوبہ تعلیم و تربیت دینا خواہ کیمپس یا احاطہ میں خواہ فاصلہ سے اور لڑکیوں کی تعلیم کو منصب اہمیت پر فائز کرنا۔

(۲) وزیٹنگ پروفیسروں' امیریٹس پروفیسروں کا تقرر' معاہدہ کی بنیاد پر اس کے بغیر۔

(۳) اُردو کی ترقی اور توسیع کے لئے اسکیمیں وضع کرنا اور انہیں عمل میں لانا تاکہ تعلیم میں تسلسل لا یا جاسکے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے فاصلہ سے تعلیم کا مناسب استعمال۔"

آگے چل کر یونیورسٹی کے وزیٹر کو اسٹیٹیوٹ (قوانین) بنانے یا ان میں ترمیم کردینے کا پورا اختیار دے دیا گیا ہے جو یونیورسٹی کی خود مختاری کے خلاف جاتا ہے۔

برا بھلا جیسا بھی ہے ایکٹ بن چکا ہے اس وقت اس کی صلواۃ سنانا یا اس میں ترمیم کی کوشش کرنا سعی لا حاصل ہوگا۔ خلش البتہ حسرت کے ڈنک مارتی ہے کہ کاش ہم اُردو والوں نے گلے اور زبان کی ساری توانائی یونیورسٹی کے قیام کے لئے مختلف مقامات کی تائید اور توجیہ میں صرف کرنے کی جگہ یونیورسٹی بل کے نقائص دریافت اور دور کردینے میں صرف کی ہوتی۔ بچی کھچی توانائی اب اس بات پر بغلیں بجانے میں استعمال ہورہی ہے کہ یونیورسٹی ہم نے بنوائی یا اس کے لیئے حیدرآباد کا انتخاب ہماری وجہ سے ہوا یا اس تحقیق پر صرف ہورہی ہے کہ یونیورسٹی کا یا محسن دراصل کسے سمجھنا چاہیئے۔ گویا اُردو یونیورسٹی بھی جامعہ ملیہ کی ردیف میں آگئی اور اس کے بانی کے بارے میں بھی اختلاف رائے سر اٹھانے لگا۔ واقعہ دراصل یہ ہے کہ اُردو یونیورسٹی کے قیام کی تجویز گجرال کمیٹی کی سفارشات میں کی گئی تھی اس پر بے شمار برساتیں گزرگئیں۔ یہ سفارش سیل چکی تھی شری ارجن سنگھ نے جو کانگریسی حکومت میں اس وزارت کے سربراہ تھے جس کا مقصد اور نام انسانی وسائل کا فروغ تھا۔ اس نم خوردہ سفارش کو تہہ خانے سے نکالا۔ اسے ہوا دی اور دھوپ دکھائی اور اپنی حکمت عملی سے اس میں جان ڈال دی۔ یہ فیصلہ دراصل انہی کا تھا جس میں ضابطہ کے مطابق وزیر اعظم اور مرکزی کابینہ کے دوسرے اراکین شریک تھے۔ رہی یہ بات کہ رامپور' پٹنہ

علی گڑھ، لکھنؤ، بمبئی، بھوپال دہلی بنگلور اور حیدرآباد میں سے جو یونیورسٹی کی میزبانی کے دعویدار تھے۔ حیدرآباد کو جتوانے کے ذمہ دار کون تھے تو بھی جواب سادہ اور صاف ہے شہری نرسمہا راؤ۔ ان کا گوشۂ خاطر حیدرآباد کی طرف نہیں ہوتا تو جو آوازیں اس کے حق میں اٹھیں صدا بہ صحرا ثابت ہوتیں۔ گویا سابق آندھرا پردیش وزیر اعظم کے نامہ اعمال کی سیاہی میں ایک اندراج نقرئی حروف سے بھی ہوگا۔ حیدرآباد کے انتخاب کے لئے مختلف اوقات میں جلیل پاشاہ صاحب سرگرم عمل رہے۔ لہٰذا ان کو یکسر فراموش کر دینا شاید اہل حیدرآباد کو زیب نہ دے پائے۔

ایک اور صاحب، یعنی جن کا ذکر نہ کرنا خیر فراموشی ہوگا۔ عزیز قریشی صاحب جو اردو یونیورسٹی کمیٹی کے سربراہ تھے۔ شری ارجن سنگھ کے نفس ناطقہ تو نہیں دست و بازو کی حیثیت ضرور رکھتے تھے یہ بات صیغہ راز میں ہے اور شاید رہے بھی کہ اردو یونیورسٹی کے قیام کا خیال عزیز قریشی صاحب نے انہیں دلایا، یا یہ بات پہلے ارجن سنگھ صاحب کے ذہن میں آئی اور اس کو پھیلانے عمل میں لانے اور مشتہر کرنے کے لئے انہوں نے اپنے رفیق کار عزیز قریشی صاحب کو منتخب کیا۔ وہ ارجن سنگھ صاحب کی خدمت میں بے باک تھے۔ قرائن یہ کہتے ہیں کہ اگر اردو یونیورسٹی کی مہم کے سلسلہ میں انہیں عزیز قریشی صاحب کی رفاقت خدمات اور یاوریاں دستیاب نہ ہوتیں تو شاید یونیورسٹی بھی ایسا آرزو کہ خاک شدہ کے لق و دق بیابان میں پہنچ جاتی۔ اس کا ہمیں اعتراف کرنا چاہیئے کہ عزیز قریشی صاحب نے یونیورسٹی کے پروجیکٹ کو بڑی طاقت اور جوش و خروش کے ساتھ آگے بڑھایا۔ اگر وہ قدم قدم پر پیش قدمی اور موانع ناپذیری اور جارحیت کا مظاہرہ نہ کرتے اور راہ گزاروں کی مخالفانہ موشگافیوں اور تاخیر آفرینیوں کو اپنے ہاتھ کی جنبش سے مکڑی کے جالے کی طرح ہٹا نہ دیتے تو اردو یونیورسٹی کا خیال عمل کی شکل اختیار نہ کر پاتا۔ انہوں نے حصول مقصد کی راہ میں خوشامدیں اور چاپلوسیاں بھی کیں اور ڈرایا دھمکایا اور دھمکیاں بھی دیں اور آڑے وقت میں خود کامیوں سے حاجت روائی بھی کی۔ ایک بڑے مقصد کے لگاتار حصول تک انہوں نے سیاسی حکمت عملی کا لگاتار مظاہرہ کیا۔ راقم السطور عزیز قریشی صاحب کا ثنا خواں نہیں ہے اور خود وہ ایک عرصہ دراز سے اس سے کبیدہ خاطر ہیں۔ اگر اسے یونیورسٹی کمیٹی کی رپورٹ کا مسودہ نگار یا کاتب سمجھا جائے تو سمجھ لیجئے کہ صدر اور کاتب کے مزاج، طور طریقوں، افکار اور خیالات میں اتنا ہی فاصلہ تھا جتنا تصور میں آ سکتا ہے لیکن صدر محترم کو داد دینی چاہیئے کہ اردو یونیورسٹی کے تصور کو پروان انہوں نے ہی چڑھایا۔ اس موقع پر ایک زمانہ میں ان کا مدھیہ پردیش میں وزیر رہنا بھی کام آیا مرکزی ایوان کی رکنیت اور اندرا گاندھی اور ین

یونیورسٹی ایکٹ کی تشکیل کا تجربہ بھی۔ غور فرمایئے کہ جس کمیٹی میں آل احمد سرور، جگناتھ آزاد، راز
بہادر گوڑ، مالک رام جیسے اکابرین اردو شامل ہوں، اس کے سارے (بیس سے زیادہ) ممبران مل
کر بھی کوشش کرتے تو جہاں تک اردو یونیورسٹی کی مہم کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کا تعلق ہے اس کا
عشر عشیر بھی نہ کر پاتے جو اس کے نسبتاً کم سواد صدر نے کر ڈالا۔ ہر کرے را اہل کارے ساختند
راقم ارجن سنگھ صاحب کا بھی کبھی معتقد نہیں رہا۔ ایک وقت وہ تھا جب وہ شری نرسمہا راؤ
کو بے دخل اور بے تخت کر سکتے تھے۔ انہوں نے ان پر یورش کئی بار کی لیکن ہر بار آخری پل میں ان
کی جرأت جواب دے گئی اور نرسمہا راؤ بھارت کو برباد کرنے کے لئے ستارہ روڑھ رہ گئے۔ لیکن
اردو یونیورسٹی کا جہاں تک تعلق ہے ارجن سنگھ کے ساتھ عزیز قریشی کی رفاقت قرآن السعدین ثابت ہوئی
اس کا افسوس ہے کہ اس احساس کے باوصف کہ ماضی کو کریدنا ایک بے مصرف مشغلہ ہے راقم السطور
کے پاؤں بھی اس طرف پھسل گئے ایک نتیجہ تو اس روداد سے نکالنا ہی پڑے گا۔ طاقت کے بنا بات نہیں
بنتی اور طاقت ہاتھ سیاست سے آتی ہے اسی سیاست سے جس کی گنگا ریوں نے ہمارے وطن عزیز
کو لہولہان کر رکھا ہے لیکن وہ تو سیاست کی بدترین شکل ہے جو اقتباسات اوپر دیئے گئے ہیں ان سے
قارئین کرام کو یہ اندازہ ہو گیا ہوگا کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی ایکٹ تعبیر و تفسیر کی بڑی گنجائش رکھتا
ہے جس وقت یہ بل زیر تشکیل تھا اس وقت ایک کوشش یہ کی گئی ہے کہ تسوید کے توسط سے یونیورسٹی
کمیٹی کی بعض اہم سفارشات کو جن پر محتسب کی قینچی معاندانہ چل سکتی ہے بازیاب کیا جائے،
چنانچہ اس سرمایہ میں سے بہت کچھ جو کمیشن اور وزارت میں نوٹ لیا گیا تھا۔ بل میں نقاب پہنے
ہوئے واپس آگیا۔ اب سوال روئے زیبا سے نقاب اٹھانے، ایکٹ کے امکانات و مضمرات
کو سمجھنے اور ارباب وزارت کو سمجھانے کا ہے آپ بھی جانتے ہیں اور یہ کم سواد بھی کہ یونیورسٹی پر اس
کے وائس چانسلر کی شخصیت کس طرح سے اثر انداز ہوتی ہے اور کسی یونیورسٹی کا پہلا وائس چانسلر اس کے
معمار تقدیر کے لئے غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ اردو یونیورسٹی پر یہ کلیہ اور زیادہ پورا اترتا ہے
کہ یہاں نقوش و سوابق راہ دکھانے کے لئے موجود نہیں ہیں۔ ایک نئی عمارت کھڑی کی جاتی ہے۔ ایکٹ
میں اجمال ہے، ابہام ہے، اخفا ہے، یہاں بے شمار مواقع ہیں تعبیر، تفسیر، تشریح اور انکشاف
کے یہاں یال و پر درکار ہیں اور خون جگر بھی۔

اگر پہلا وائس چانسلر لائق، دور اندیش، عالی حوصلہ، خود دار، روابط آفریں اور صاحب
بصیرت ہے تو سمجھ لیجئے کہ یونیورسٹی بہتر نہج اور معیار پر قائم ہوگی اور اپنے امکانات کو اپنی گرفت

رہے گی اور اگر بدقسمتی سے پہلا وائس چانسلر بے تخیل، تھوڑدل، کم حوصلہ، کمزور، مسکین اور ہچکچاہٹ پیشہ، سازش خو، سفارشی اور تنگ نظر ہوا تو یونیورسٹی اپنی خطوط پر اٹھے گی اور اپنی اوصاف کی آئینہ دار ہوگی۔ بنیاد اگر کج پڑ گئی تو عمارت کو ثریا تک لے جایئے تو بھی کج رہے گی اسی بنا پر ابتدائے داستان سے راقم السطور یہ فریاد کرتا رہا ہے کہ پہلے وائس چانسلر کی تلاش میں ملک کا چپہ چپہ چھان ڈالو اور اس کے انتخاب میں کسی سفارش، کسی دباؤ، کسی وقتی مصلحت کسی ذاتی مفاد، منفعت کو دخیل نہ ہونے دو۔ بدقسمتی سے ہمارے یہاں سفارش اور سیاست کا کاروبار زوروں پر ہے۔ تعلیمی اداروں کو اس نے گھائل کر رکھا ہے ان کو اور زیادہ جن سے اردو والوں کا تعلق ہے کہ آپس میں وہ جلب منفعت کے امکانات دیکھتے ہیں خدائے بزرگ و برتر کی وسیع کائنات میں مقابلہ کی بہت سی راہیں انہوں نے اپنے اوپر بند کر رکھی ہیں۔

یاد رکھیئے کہ پہلے سربراہ کا انتخاب اگر خدانخواستہ صحیح نہ ہوا تو ''... ...'' کا وہ خواب جو ایک مدت کے بعد تعبیر کے قریب پہونچا ہے ٹوٹ کر بکھر جائے گا ار ... نے ایکٹ میں احتمال، ابہام اور امکان شانہ بہ شانہ دکھائی دیتے ہیں۔ ایک حوصلہ مند، بالغ نظر، وسیع الخیال فراخ شانہ، منتظم، بصیرت خو، اقدامیت پیشہ اور بزرگ امیدوار وائس چانسلر کی طالب ہے اگر سازش یا سیاست کے زیر سایہ کسی مرجھائے ہوئے اور تنگ حوصلہ اور بیاوہ و یا قناعت پیشہ یا سازشی اور برخود غلط یا بے خبر اور کم سواد یا وظیفہ خوار اور سپر انداز انسان کو تعبیر، تنظیم، تعجیل اور ارتباط کا یہ عظیم الشان کام سپرد کر دیا گیا تو یونیورسٹی سکڑ کر رہ جائے گی جیسے بالی میں گیہوں کا نم خوردہ دانہ ناوقت ہواؤں سے سمٹ جاتا ہے، سکڑ جاتا ہے یونیورسٹی ایکٹ نے تعمیر کا سامان فراہم کر دیا ہے۔ یہ بات معمار (یعنی پہلے وائس چانسلر) کے ظرف پر منحصر ہے کہ وہ اس سے قصر تعمیر کرتا ہے یا گڑیا کا گھروندا گھروندا ایک بار بن جائے تو پھر ہمیشہ گھروندا ہی رہتا ہے۔ ہمیں درکار ہے کشادہ ذہن، فلک شگاف تخیل اور آہنی عزم۔ چاپلوسوں اور سانوسوں سے حذر اولیٰ۔ ان کا یہاں گزر بھی نہ ہونے دیجیے۔

زیادہ یونیورسٹیوں میں اردو ادب کی تعلیم اور اس پر تحقیق ہوتی ہے بیشتر توجہ تنقید کو دی جاتی ہے اردو کی تخلیقات کا غالب حصہ غزل اور افسانہ پر مشتمل ہوتا ہے اردو کا رشتہ علوم کے ساتھ سند والا گھر اور ان کے رفقا نے جوڑا تھا۔ وہ اب ٹوٹ چلا ہے آگے چل کر عثمانیہ یونیورسٹی نے ثابت کر دکھایا تھا کہ اردو کے ظرف میں علوم کی سمائی ہے لیکن اردو کی محفلوں میں علوم کی بات اب کون کرتا ہے ہماری بے حد با صلاحیت زبان علوم کے جان بخش عمل سے محروم ہوتی جا رہی ہے۔ اردو

یونیورسٹی کی شانِ نزول، اس کی وجہ وجود، اس کا سبب تاسیس صرف یہ ہے کہ اردو کا دامن پھر علوم سے بھر دیا جائے۔ اس لئے اس کی عمارت علوم یا سائنس اور ٹیکنالوجی کے ستونوں پر کھڑی ہونی چاہیئے۔ یہ روایت بنا لیجئے کہ اس یونیورسٹی کا وائس چانسلر زبان و ادب کے بجائے سائنس یا علوم کا پروردہ ہوگا اور پہلے وائس چانسلر کے لئے جو یونیورسٹی کی بنیاد ڈالے گا اس کی روپ ریکھا بنائے گا اس کی تشکیل اور تعمیر کے لئے ذمہ دار ہوگا علوم کی شرط اور زیادہ ضروری ہے ساتھ ہی ساتھ ایک گروپ بنائیے جو اپنے طور پر یونیورسٹی ایکٹ کی دفعات کی تشریح کرے اور متعلقہ وزارت کو اپنی تعبیر و تشریح سے باخبر کر دے۔ ایکٹ کے تلوں میں جتنا تیل ہے سب نکالنا ہوگا۔ کسی مبصر نے کہا ہے کہ زندہ رہنے کا ڈھنگ یہ ہے کہ مسائل کو مواقع میں بدل دیا جائے نہ کہ اس کے برعکس۔ دیکھنا یہ ہے کہ اردو یونیورسٹی کی نیو رکھتے وقت ہم اس زریں موقع کو مسئلہ نہ بنا بیٹھیں۔ محل یہ نہ یونیورسٹی کی تخفیف و تحقیر اور اس پر استہزا کا ہے نہ یہ تلاش کرنے کا کہ اس کی بنا کس نے ڈالی ہے نہ توانائی ساری شادیانے بجانے میں صرف کرنے کا۔ اس وقت کام کرنے کا یہی ہے۔ نمٹیں کرنا ہے یہی۔

کہ وائس چانسلری کے لئے موزوں ناموں کی نشاندہی کی جائے اور بالآخر جس کا انتخاب ہو اسے یونیورسٹی کو صحیح خطوط پر قائم کرنے کے لئے صحیح مشورہ دیا جائے اور رائے عامہ کی تائید سے اسے طاقت بخشی جائے۔ حکومت کو یہ احساس دلا دیجئے کہ اردو یونیورسٹی کی جو وسیع اور حوصلہ افزا روپ ریکھا اس کے پہلے وائس چانسلر نے بنائی ہے اسے اردو والوں کی اجتماعی دلی اور ذہنی تائید حاصل ہے اور یہ بھی کہ اگر حکومت نے اس کے پر کترنے کی کوشش کی تو اردو یونیورسٹی کے بنائے جانے کا اردو عوام پر الٹا اثر ہوگا۔ اگر آپ نے ایسا نہیں کیا تو حکومت شیخ الجامعہ کی بات نہیں سنے گی اور اس کی شخصیت اور تجاویز کو وہ احترام نہ دے گی جس کی وہ ہر آئینہ مستحق ہیں پھر تو وزارت اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن دونوں اس پیمان پیکر، اس زبردست اٹھان والے دار العلوم کی وسعتوں اور اس کے امکانوں کو تنگنائے میں بدل دیں گے اور اس کے سربراہ کی سفارشات کو اسی بے نیازی کے ساتھ رد کر دیں گے جو وہ عام بیادہ رو ہندوستانی یونیورسٹیوں کے لئے روا رکھتے ہیں۔ اس وقت جو کچھ دیا جا رہا ہے اسے لپک کر لے لیجئے تاریکی کا پیٹ چیر کر اس میں سے روشنی کی کرن برآمد کیجئے کہ زندگی عبارت ہے اسی سے ہے اور تابندگی کا سرچشمہ بھی یہی ہے۔

—٭—

خواجہ احمد فاروقی

تمہاری نیکیاں زندہ تمہاری خوبیاں باقی

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

اُردو کے بارے میں ہم لوگ اکثر یہ کہتے ہیں کہ اُردو محض ایک زبان ہی نہیں ہے' ایک تہذیب بھی ہے جب ہم اس کلیہ کے پیش نظر اس خیال سے چاروں طرف دیکھتے ہیں کہ اُردو کے کون کون سے اہلِ قلم ایسے تھے اور ہیں' جن کی بدولت اُردو تہذیب کو پھلنے پھولنے اور پنپنے کے مواقع ملے تو خاصی بڑی تعداد اُن اُردو والوں کی نظر آتی ہے جن میں ہم اُردو زبان والوں کی نظر آتی ہے جن میں ہم اُردو تہذیب کو مرئی صورت میں دیکھ سکتے ہیں اور ان مرئی صورت میں نظر آنے والے ایک بہت ہی باوقار اور دل کش شخصیت ہماری آنکھوں کے سامنے آتی ہے اور وہ شخصیت خواجہ احمد فاروقی کی ہے۔ بلکہ وہ شخصیت خود ایک مرقع ہے علم کا' ادب کا' تنقید کا' تحقیق کا' خوب صورت نثر نگاری کا' شرافت کا' سنجیدگی اور متانت کا' دنیا کے ہنگاموں سے دور اپنا علمی اور ادبی کام کرنے والے کا۔

خواجہ احمد فاروقی کے ساتھ میری السلام علیکم کی ابتداء ۱۹۴۷ء ہی میں ہو گئی تھی' جب میں اور میرے گھر کے لوگ' میرے والدِ محترم مرحوم صاحب' والدہ محترمہ اور میری دونوں بہنیں راولپنڈی اور لاہور سے ہجرت کر کے دہلی پہنچے تھے۔ اُس وقت خواجہ احمد فاروقی کالج میں لکچرر تھے اور اپنے کالج میں علمی اور ادبی پروگرام منعقد کرتے رہتے تھے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے' ڈاکٹر عبادت بریلوی بھی ان دنوں اسی کالج میں لکچرر تھے لیکن وہ بہت جلد پاکستان چلے گئے تھے اور کالج میں اُردو تعلیم کی ساری ذمہ داری خواجہ احمد فاروقی ہی پر تھی۔

اُس زمانے میں خواجہ احمد فاروقی کا قیام بھی کالج ہی کے ایک رہائشی حصے میں تھا دوسری منزل جس کے زیادہ تر حصے پر کتابوں' جرائد اور مخطوطوں کا قبضہ تھا اور باقی ماندہ حصے میں فاروقی صاحب مع اپنی فیملی کے ساتھ قیام پذیر تھے۔

خواجہ احمد فاروقی نے اُسی زمانے میں ایک بہت بڑے مشاعرے کا انتظام کیا۔ یہ ایک نظریاتی مشاعرہ تھا یعنی ملک کی تاریخِ ادب میں غالباً اپنی قسم کا پہلا اور آخری مشاعرہ تھا اور وہ یوں کہ ہر شاعر پہلے ادب کے بارے میں تفصیل سے اپنا نظریہ بیان کرتا تھا اور پھر اُس نظریے کے تحت کہی ہوئی اپنی کوئی تازہ نمائندہ نظم پیش کرتا تھا۔ میں نے ۱۳۸ اشعار پر مشتمل اپنی طویل نظم "میرا موضوعِ سخن" (یہ نظم اس وقت میرے مجموعۂ کلام "ستاروں سے ذرّوں تک" میں شامل ہے) اُسی زمانے میں کہی تھی میرا جی چاہتا تھا کہ میں اس مشاعرے میں یہی طویل نظم پڑھوں کیوں کہ میں نیا نیا ترقی پسند مصنفین کا FELOW TRAVELLER بنا تھا میں اُس زمانے میں پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن کا رکن تو نہیں تھا لیکن دل مارکسزم کی طرف کھنچتا تھا اور اب میں دل کا عالم وہی ہے۔

میں مشاعرے میں مدعو تھا لیکن چوں کہ میں وہ نظم پڑھنا چاہتا تھا جو ۱۳۸ اشعار پر مشتمل تھی اس لیئے کسی حد تک تذبذب کے عالم میں تھا کہ اتنی طویل نظم مشاعرے میں پڑھوں یا نہ پڑھوں۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر میں نے اپنی مشکل خواجہ احمد فاروقی کے سامنے رکھی۔ وہ یہ نظم پڑھ چکے تھے اور اس کا تعریفی الفاظ میں دو ایک بار ذکر بھی میرے ساتھ کر چکے تھے وہ بھی سوچ میں پڑ گئے کیوں کہ ایک طرف تو نظم نظریاتی اعتبار سے بخوبی میری ترجمانی کرتی تھی اور دوسری طرف سوال یہ تھا کہ اتنی طویل نظم مشاعرے میں چل بھی سکے گی یا نہیں۔ خواجہ صاحب کو خاموش دیکھ کر میں نے ان کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ اگر شروع میں سب سے پہلے مجھے پڑھوا دیا جائے تو نظم چل جائے گی۔ خواجہ صاحب کھل اٹھے۔ کہنے لگے میں بھی یہی تجویز کرنا چاہتا تھا لیکن مذبذب اس لیئے تھا کہ آپ شاید شروع میں پڑھنا پسند نہ کریں۔ میری بھی رائے یہی ہے کہ اگر اسی نظم سے مشاعرے کی ابتدا کی جائے تو بہت کامیاب رہے گی۔ اور ایک طرح سے سارے مشاعرے کے لئے ایک طرح کے ڈائرکشن کا کام دے گی اُن کی یہ رائے سُن کر مجھے جو مسرت ہوئی الفاظ میں نہیں آ سکتی۔ چنانچہ اسی نظم سے مشاعرے کا آغاز ہوا اول سے آخر تک یہ نظم داد و تحسین کے ساتھ سُنی گئی۔

اس مشاعرے میں دہلی اور دہلی سے باہر کے شعرا کے علاوہ دہلی اور علیگڈھ کے متعدد اہلِ علم حضرات شریک ہوئے۔ اس وقت میرے سامنے ایک تصویر ہے جو بیگم حمیدہ سلطان احمد کی کتاب "جگن ناتھ آزاد اور اس کی شاعری" میں شامل ہے یہ اس مشاعرے کے فوراً بعد لی گئی تھی

اور اس میں مندرجہ ذیل حضرات نظر آ رہے ہیں ڈاکٹر عبدالحلیم، سید احتشام حسین، پرنسپل
یم ایم بیگ، پروفیسر آل احمد سرور، خواجہ غلام السیدین، علی سردار ج ، ثریا سلطانہ
خورشید الاسلام، گوپی ناتھ امن، خواجہ احمد فاروقی اور راقم التحریر

اُس زمانے میں خواجہ احمد فاروقی کے ساتھ میری اکثر ملاقاتیں رہتی تھیں۔ زیادہ تر میں ہی اُن
سے ملنے کے لیے اُن کے دولت کدے پر جاتا تھا۔ ہمارے گھر وہ بہت ہی کم آئے ہوں گے لیکن چوں
لہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور اُس زمانے میں جب دہلی آتے تھے غریب خانے پر ہی قیام کرتے تھے
س لیے ان کے دورانِ قیام میں خواجہ احمد فاروقی ہمیشہ ہمارے یہاں تشریف لاتے تھے ویسے چوں کہ
ہ پبلی کیشنز ڈویژن میں اکثر آتے تھے اور وہاں ان کی ملاقات اکثر و بیشتر جوش ملیح آبادی
ری چند اختر، عرش ملسیانی، بلونت سنگھ سے بھی ہو جاتی تھی اور ہم مذکورہ مقامی اہلِ قلم کے علاوہ
ن شعرا اور نثر نگار حضرات سے بھی ملاقات ہو جاتی جو دہلی آکر سب سے پہلے جوش صاحب سے
لنے کے لیے پبلی کیشنز ڈویژن یعنی "آج کل" کے دفتر آتے تھے۔

خواجہ احمد فاروقی کے مزاج کی نفاست ان کی بات چیت سے بھی نمایاں ہوتی تھی، ان کے
اس سے بھی، ان کی تحریروں سے بھی، ان کی نشست و برخاست کے انداز سے بھی اور اُن پر تکلف
دتوں سے بھی جن کا وہ اک ہتمام کرتے تھے اور جن میں شریک ہونے کا مجھے اکثر موقع ملتا تھا۔ دہلی کالج
اے مکان میں بھی اور پھر اس مکان میں بھی جو کیولری روڈ پر تھا۔ وہ دراصل نفاست کا ایک مرقع
، اور اس معاملے میں اپنے تمام احباب کے لیے نمونۂ تقلید۔

اُن کے دہلی کالج ہی کے زمانے کی بات ہے، ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے مجھے خط لکھا کہ میں
ن تاریخ کو دہلی آ رہا ہوں۔ ان کا قیام چوں کہ غریب خانے ہی پر رہتا تھا اس لیے میں ان کو
بنے گھر تک لے آنے کے لیے ریلوے اسٹیشن پر گیا صبح کا وقت تھا۔ وہاں کیا دیکھتا ہوں خواجہ احمد
روقی موجود ہیں۔ اب مجھے صحیح طور پر تو یاد نہیں لیکن خیال یہی ہے کہ اگرچہ زور صاحب ساہتیہ
ڈیمی کی کسی میٹنگ میں شرکت کے لیے آ رہے تھے لیکن ساتھ ہی اپنی تاریخوں میں پی ایچ ڈی
ے لیے خواجہ احمد فاروقی کا وائیوا ہونا تھا اور یا ان کے دہلی کالج سے ترقی پا کر دہلی یونیورسٹی میں
نے کے سلسلے میں ان کا انٹرویو کا معاملہ تھا۔ میں ان دونوں باتوں سے بے خبر تھا۔ مجھے صرف اتنا
علوم تھا کہ زور صاحب ساہتیہ اکیڈمی کے جلسے میں شرکت کے لیے تشریف لا رہے ہیں۔ میں نے
زا اپنے غریب خانے پر زور صاحب کے قیام کا انتظام کیا ہی تھا خواجہ صاحب نے اُن کے قیام کا

کیا ہی تھا۔ خواجہ صاحب نے اُن کے قیام کا انتظام دہلی کالج میں کر رکھا تھا چناں چہ ہم تینوں جب اسٹیشن سے چلے تو میں اس خیال میں تھا کہ زورؔ صاحب میرے ساتھ جا رہے ہیں لیکن خواجہ صاحب نے ٹیکسی والے سے دہلی کالج کا رخ کرنے کو کہا۔ وہاں ہم تینوں پہنچ تو گئے لیکن میں زورؔ صاحب کو اپنے گھر لے جانا چاہتا تھا۔ زورؔ صاحب کو چوں کہ اُسی قیام کے دوران میں دائوا دالا امتحان بھی لینا تھا یا سلیکشن کمیٹی میں بیٹھنا تھا اور وہ اس سمندر کے پرانے تیراک تھے اس لیے انھوں نے بھی خواجہ صاحب کا مہمان بننا مناسب سمجھا۔ تھوڑی دیر تک ہم تینوں خاموش رہے۔ لیکن آخر زورؔ صاحب نے اپنے دل کی بات خواجہ صاحب سے کہہ دی کہ زمانہ بہت خراب ہے' ایسے موقع پر میرا آپ کے یہاں مہمان رہنا مناسب نہیں ہے۔ خواجہ صاحب نے کہا کہ آپ دہلی کالج میں میرے مہمان نہیں ہوں گے بلکہ پرنسپل ایم ایم بیگ کے مہمان ہوں گے۔ لیکن زورؔ صاحب کو چوں کہ ان اُمور کا خاص تجربہ تھا اس لیے انھوں نے دہلی کالج میں قیام کرنا مناسب نہ سمجھا۔ خواجہ صاحب ہر وقت کتابوں میں غرق رہنے والے شخص تھے۔ میں ان کی سادگی بلکہ سادہ دلی کا یہ عالم دیکھ کے حیران رہ گیا۔ میں چوں کہ حکومت کی ملازمت میں تھا اس لیئے ان باتوں کو کسی حد تک سمجھتا تھا لیکن خواجہ صاحب کو اس صورتِ حال کے خطرناک پہلو کا کوئی اندازہ نہیں تھا تھا۔ اُن سے زورؔ صاحب نے اُسی وقت یہ کہہ دیا کہ آپ اپنی کتابوں کی دنیا میں اس قدر مصروف رہتے ہیں کہ آپ کو زمانے کی روش کے بارے میں کچھ معلوم ہی نہیں۔ آپ کسی وقت کتابوں کی دنیا سے باہر آ کر اصل دنیا کی تصویر دیکھیئے۔ آپ کو چاروں طرف خاص غلاظت نظر آئے گی۔ چنانچہ میں ان سے اجازت لے کر زورؔ صاحب کو اسی ٹیکسی میں اپنے گھر لے آیا۔ زورؔ صاحب کافی دیر تک خواجہ صاحب کی علمیت اور اس کے ساتھ ساتھ اس سادہ دلی کا ذکر کرتے رہے جو کتابوں کی دنیا میں گم رہنے والوں کی فطرتِ ثانیہ بن جاتی ہے۔

اس وقت تک دہلی یونیورسٹی میں اُردو کا شعبہ نہیں تھا۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے اس شعبہ کی پہلی اینٹ رکھی اور اس پر اپنے ہاتھوں سے جو بلند و بالا عمارت تعمیر کی وہ اس وقت سارے ملک میں اپنی مثال آپ ہے لیکن اس موضوع پر لکھنے کا حق مجھے نہیں ہے بلکہ اُن حضرات کو ہے جنھوں نے اس علمی اور ادبی عمارت کی تعمیر کو لمحہ بہ لمحہ دیکھا۔ خواجہ صاحب کے شاگرد رہے اور بعد میں کارگاہِ حیات میں اُن کے رفیقِ کار رہے۔

اگر خواجہ احمد فاروقی صاحب کی نیکیوں کو شمار کیا جائے تو وہ بہت ہیں خواجہ صاحب کی

پوری زندگی اُردو اور ان کے اپنے طالب علم تھے اُردو سے ان کی محبت اور اُردو کی توسیع اور ترقی کے لیے ان کی جدوجہد کا ذکر بہت سے حضرات نے کیا ہے۔ میں یہاں صرف طالب علموں کا اُن سے محبت کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

خواجہ صاحب اپنے طالب علموں کی فلاح و بہبودی اور ان کی ملازمت اور ترقی کے لئے ہمیشہ کوشاں رہتے تھے طالب علموں کی سفارش کرنے میں کبھی پس و پیش نہ کرتے۔ آج اُردو ادب میں بہت سی ایسی اہم شخصیتیں ہیں جن کا کیریر خواجہ صاحب کی شفقت کا مرہونِ منت ہے یہ اور بات ہے کہ ان میں سے بعض شخصیتیں خواجہ صاحب کے احسانات کو یکسر فراموش کر بیٹھی ہیں۔

میرے دہلی سے کشمیر چلے جانے کے بعد خواجہ احمد فاروقی سے میری ملاقاتیں کم ہو گئیں اب اس مدت میں ایک دوسرے کی تصانیف کے بدولت ایک دوسرے سے نصف ملاقاتیں ہوتی رہیں یا کسی سمینیار یا کسی ادبی جلسے میں ملاقات ہو جاتی تھی اس طرح سے مدت گزر گئی اور اخبارات میں خواجہ صاحب کی علالت کی خبریں آنے لگیں ایک دن کا ذکر ہے کہ میں اُردو گھر میں بیٹھا ڈاکٹر خلیق انجم سے باتیں کر رہا تھا کہ انھوں نے بتایا کہ ڈاکٹر فاروقی بیمار ہیں اور وہ جس مکان میں مقیم ہیں وہیں ان کے اعزاز میں ایک جلسہ منعقد ہونے والا ہے آپ چلیں گے۔ میں نے کہا ضرور چلوں گا۔ ان سے ملے ایک مدت گزر گئی ہے۔ اخبار میں ان کی علالت کی خبریں پڑھتا رہا ہوں عیادت کو نہیں جا سکا۔ چنانچہ خلیق انجم مجھے اپنے ساتھ اپنی کار میں لے گئے۔ گاڑی سے اُتر کر میں اس کمرے میں گیا جہاں خواجہ صاحب فرایش تھے۔ مجھے دیکھ کر ان کے چہرے پر ایک مسکراہٹ سی آئی لیکن نقاہت سے لبریز۔ وہ تو ظاہر ہے بیمار تھے، لیٹے ہوئے تھے۔ میرا جی چاہا کہ اُن سے بغل گیر ہو جاؤں لیکن اس خیال سے رک گیا کہ اس سے انھیں تکلیف ہوگی۔ اُن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ خاموشی کے ساتھ اپنے عقیدت کے مطابق اُن کی صحت کے لئے دُعا کی اور باہر آگیا۔ باہر خاصا ہجوم تھا دہلی یونیورسٹی اور دوسری یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور طلبا کے علاوہ شہر سے علم دوست حضرات جمع تھے مسز شاربؔ ردولوی صدر شعبۂ اُردو نے جلسہ کی صدارت کی۔ یہ خواجہ صاحب سے میری آخری ملاقات تھی دوسرے دن میں جموں آگیا چند روز میں اخبار میں خواجہ احمد فاروقی کے ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو جانے کی خبر شائع ہوئی انا للہ وانا الیہ راجعون

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے



میں نے ... مضمون ...

کسی بھی بڑے شاعر کے بارے میں لکھنا' آپ اپنے آپ کو آزمائش میں ڈالنا ہے خاص طور پر جب لکھنے والا شاعر بھی رہا ہو اور اُس سے ملتا بھی رہا ہو' کیوں کہ میل ملاپ ملاقات نقادانہ حس کو قدرے دبا دیتی ہے اور لکھنے والا موضوع کے ساتھ اتنا انصاف نہیں کر پاتا جتنا کہ اجنبی ہونے کے ناطے کر سکتا ہے۔ پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری سے میری ملاقات اُس وقت ہوئی تھی جب میں بھی تھوڑا بہت نام پا چکا تھا۔ پھر مرزا یگانہ چنگیزی اور جوش ملیح آبادی جیسی قابل صد احترام و قدر ہستیوں کے ساتھ بھی اچھے مراسم تھے۔ تب میں عمر میں مجاز لکھنوی سے چھوٹا تھا لیکن اتنا بھی نہیں کہ مجاز کو آپ کہتا "تم" کی گہری دکنی تھی مجاز سے۔

فراق سے میری ملاقات مجاز کے ہمراہ ہی ہوئی تھی۔ جیسے ہی مجاز نے فراق سے متعارف کراتے ہوئے میرا نام لیا تو فراق نے آنکھیں گھماتے ہوئے کہا تھا

"... یگانہ سے تعلق کے باعث بھی اور تمہاری غزلوں سے بھی میں تمہیں چچا" کے اُدریب کا سمجھتا تھا۔"

... بعد مجاز نے فراق سے جو کہا اُس کا یہاں ذکر بے کار ہے لیکن اُس پہلی ملاقات کے بعد اس بڑے شاعر کے لئے احترام اور بڑھ گیا اور پھر ملاقاتیں ہوتی ہی رہیں۔

اُردو شاعری میں لفظ "عظیم" جتنا بدنام ہے اتنا بدنام لفظ "رقیب" بھی نہیں ہے۔ اگر ہم اُس عہد کے' میری مراد ہے بیسویں صدی کے چار بڑے شاعروں کا نام لیں تو اقبال' یگانہ' جوش اور فراق کے بعد زبان عنوطہ کھا جائے گی۔ ہم آنکھیں بند کر کے میر اور پھر غالب کو عظیم شاعر کہہ سکتے ہیں۔ کیا اسی مفہوم میں ہم فراق کو عظیم شاعر کہہ سکتے ہیں اُس کا جواب میں آج بھی "نہیں" میں دوں گا۔ ہاں اتنا ضرور کہنا چاہوں گا کہ فراق میں عظمت کے آثار دکھائی دینے لگے تھے۔ بقول فراق

اکسیر بن چلا ہوں' اک آنچ کی کسر ہے

یہ اک آنچ کی کسر کب پوری ہوتی ہے کب ادھوری رہ جاتی ہے، اس کا فیصلہ ایک
سیاں ہی کرتی ہیں۔ وہی دور نہیں، جس دور میں شاعر موجود رہا ہو۔ عظیم
ع کون ہے، بلکہ اس کی تشریح کیا ہے؟ اس کے بارے میں خود فراق ایک جگہ
لکھتے ہیں۔

"کسی بھی ملک کے وزیر اعظم کی کرسی ایک منٹ کے لئے خالی نہیں
رہ سکتی لیکن ادب میں شاعر اعظم کی کرسی صدیوں خالی رہتی ہے۔"

فراق کو عظیم نہ بھی کہا جائے تو اس بات کا اعتراف کرنا ہی پڑے گا کہ اب اردو
کو کوئی دوسرا فراق بھی نہیں مل سکتا۔ فراق بھی جانتے تھے کہ وہ اس عہد کی بڑی آواز ہیں
اہل قلم آؤ یہ جاگیر سنبھالو — میں مملکت لوح و قلم بانٹ رہا ہوں
اور ایسا دعویٰ کرنا ایک بڑے شاعر ہی کا برتاؤ ہو سکتا ہے۔

ہاں دھیان سے سننا یہ صدی بول رہی ہے

فراق کی آواز ان کے منفرد لب ولہجے اور اسلوب کی آواز ہے۔ مرزا یگانہ کا بھی
لب ولہجہ تھا لیکن مرزا یگانہ کو صاحب اسلوب نہیں کہا جائے گا۔ فراق کا جداگانہ
ب ہی انہیں باقی سب شاعروں سے الگ کر دیتا ہے۔ اسلوب پر بحث کرتے
فراق ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"میر کی آواز تو ستر پردوں میں پہچانی جا سکتی ہے"

فراق کو صحیح معنوں میں میر اور مومن کا لاڈلا کہا جا سکتا ہے اور ان کے جیتے جی کہا بھی
ہے۔ لیکن فراق کے یہاں میر کی زخمی معصومیت نہیں ہے۔ مومن جیسے لطیف
ت بھی قدرے کم ہیں لیکن ان کا ہر مصرعہ، ہر شعر اپنے آپ بول اٹھے گا میں فراق
ہا ہوں۔ گھٹتے گھٹتے تیری عنایت
میری اوقات ہو گئی ہے

بزم طرب میں حیات بٹتی تھی — امیدواروں میں کل موت بھی نظر آئی
یاد آتی ہیں اس کی باتیں لیکن دل پر یہ نہیں کھلتا
کن باتوں پر اشک بہائیں، کن باتوں سے جی بہلائیں
سے چھوٹنے کی خبر رہے گی راز — لیکن یہ بات آج کسی سے چھپی نہیں

یہ اسلوب اپنے آپ پیدا نہیں ہو جاتا۔ یہ اسلوب گنگنانے یا غزل کہنے کے بجائے غزل گانے سے بھی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے لئے وسیع المطالعہ ہونا تو شرطِ اولین ہے ہی، زندگی سے تعلق اور بھرپور تعلق کا ہونا بھی بہت ضروری ہے۔

اُردو اور فارسی ادب کے کلاسیکی شعراء کے ساتھ ساتھ فراق نے الہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی ادب کے معلم ہونے کے ناطے انگریزی زبان کے کلاسیکی شعراء کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا عشق کے بارے میں کچھ ایسی ٹھوس دلیلیں پیش کر دیتے تھے کہ ایک بار تو سننے والا بھی سوچ میں پڑ جاتا تھا کہ کہیں اس کی زندگی میں کوئی کمی تو نہیں رہ گئی۔

قصہ مختصر یہ کہ ان کی غزلوں میں محبوب گوشت پوست کا جیتا جاگتا انسان نظر آتا ہے اور تعلق کسی ذہنی پیمانہ کی دین نہیں، بلکہ اپنے تمام تر درد و کرب اور سرور کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ انہی باتوں نے فراق کو دیگر سب شعراء سے ایک الگ پہچان دی تھی

اب دورِ آسماں ہے نہ دورِ حیات ہے
اے دردِ ہجر تو ہی بتا کتنی رات ہے

ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست ۔ ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی
گو حُسن کی قیمت ہے ازل ہی سے دو عالم ۔ اک جنسِ محبت ہے کہ انمول رہی ہے
قریب ہی کم ہے نہ دوری ہی زیادہ لیکن ۔ آج وہ ربط کا احساس کہاں ہے کہ جو تھا
تم نے پوچھا بھی نہیں ہم نے بتایا بھی نہیں ۔ راز وہ کو نسا ایسا تھا کہ جانا بھی نہیں

فراق کے یہاں کلاسیکی ادب جس لطافت اور معنویت کے ساتھ رچا بسا بلکہ سمویا ہوا نظر آتا ہے کم ہی شعراء کے یہاں ملتا ہے۔

بزمِ ساقی سے اُٹھا ہے کوئی یوں رات گئے ۔ پا بہ دستِ دگرے، دست بہ دستِ دگرے

ساز وہ قطرے قطرے میں سوز وہ ذرے ذرے میں
یاد تری کیسے نہ تھی، درد ترا کہاں نہ تھا

کچھ بھی عیاں نہاں نہ تھا کوئی زماں مکاں نہ تھا ۔ دیر تھی اک نگاہ کی پھر یہ جہاں، جہاں نہ تھا
منزلیں گرد کی مانند اڑی جاتی ہیں ۔ وہی اندازِ جہانِ گذراں ہے کہ جو تھا

بڑھتے بھی جاتے ہیں سب اہلِ جہاں سوئے عدم
عمرِ رفتہ بھی دیتے جاتی ہے آوازِ جُدا

اب یہ اور ایسے اَن گنت اشعار عشق کا نتیجہ ہیں یا کسی اور جذبے کا، میں اس بحث میں نہیں پڑوں گا کیونکہ بقول فراق بڑا عاشق ہونے کے لئے بڑے دل ہی نہیں بڑے دماغ کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ فراق کو اپنے دماغ پہ ناز تھا اور یہ ان کا بڑپن تھا کہ دوسرے ذہین انسان کی بھی قدر کرتے تھے۔

فراق کو شاعر جمالیات کہا گیا ہے بلکہ احمد ندیم قاسمی کے ایک مضمون کی سرخی تھی۔ " یہ نام نازک خیالاں' وہ فراق " جس کی ایک غزل پر ہندوستان اور پاکستان کے بیچ کھڑی سب دیواریں ڈھ جاتی تھیں، اس فراق کا ذکر ان کی رباعیات کے ذکر کے بغیر ادھورا رہے گا۔

فراق کی رباعیوں میں ہندوستان کی عورت ہی نہیں، ہندوستان کی کلچر سولہ سنگار کیئے نظر آتی ہے۔ فراق کی ایک رباعی کا ایک مصرعہ ہی اجینتا کی گپھاؤں میں بنی ہزاروں برس پرانی تصاویر اور جنوبی ہند کے مندروں میں جا بجا عورت کی مورتیوں کو ذہن میں تازہ کر دیتا ہے۔ سینے کے تناؤ میں پکھاوج کی ترنگ

عورت کے روپ کے متعلق ان کی کچھ اور رباعیات دیکھیئے۔

پنگھٹ پہ گگریاں چھلکنے کا یہ رنگ
پانی ہچکولے لے کے بھرتا ہے ترنگ

لہروں میں کھلا کنول نہائے جیسے
دوشیزہ صبح گنگنائے جیسے

ہر سج یہ دھج یہ نرم اُجالا یہ نکھار
بچہ سوتے میں مسکرائے جیسے

امرت وہ ہلاہل کو بنا دیتی ہے
غصے کی نظر پھول کھلا دیتی ہے

نکھری نکھری نئی جوانی دم صبح
آنکھوں میں سکوں کی کہانی دم صبح

آنگن میں سہاگنی اٹھائے ہوئے ہاتھ
تلسی پہ چڑھا رہی ہے پانی دم صبح

فراق ایک بڑے شاعر تھے۔ لیکن اپنے کلام کا انتخاب کرتے وقت ان کے اندر اچھا ہوا دانشور ان پر حاوی ہو جاتا تھا اور اچھے خاصے شعر میں حیات و کائنات کے مسائل سمونے کی کوشش کرنے لگتے تھے۔ حالانکہ ان کے جیتے جی ان کے بلند مرتبے کو چیلنج کرنے والا کوئی پیدا نہیں ہوا لیکن ۱۹۶۰ کے آس پاس وہ اپنے آپ کو شاعر جمالیات کے بجائے مفکر شاعر کہلانا اور کہے جانا پسند کرنے لگے تھے۔

۱۹۶۵ء میں جب وہ نئی دہلی میں نیتی باغ میں اپنے ایک وکیل دوست کے یہاں رہنے لگے تھے تو میں کیونکہ نیتی باغ سے صرف دو قدم پرے گل مہر پارک میں رہتا تھا تو فرصت کے وقت کئی بار ان سے ملنے چلا جاتا تھا ان کے آخری دنوں میں ان کے ساتھ میری یہ ملاقاتیں میرے لئے کافی بصیرت افروز ثابت ہوئیں۔ ایک بار میں پہنچا تو وہ ڈرائینگ روم میں ٹہلتے ہوئے کچھ گنگنا رہے تھے۔ میں نے کہا " فکر سخن کر رہے ہیں۔" " ارے نہیں! اردو زبان کے کمال پر حیران ہوں کہ ایک استاد شاعر نے، جس نے ساری عمر زاہد اور وعظ پر ہی شعر کہے، جان لیوا عشقیہ شعر کہہ گیا ہے سارے دیوان میں ایک ہی شعر ہے اور یہ اردو زبان کی دین ہے۔" فراق نے اپنے مخصوص ترنم میں وہ مطلع سنایا اور میں تڑپ کے رہ گیا۔ آپ بھی سنئیے۔

نہ یہ دامن ترے کوچے کا غبار آئے تو
پھول برسائے نہ برسائے، بہار آئے تو

فراق کچھ کہنے کے موڈ میں تھے لہذا میں یہ پوچھ نہ سکا کہ کس استاد شاعر کا شعر ہے لیکن میرے خیال میں یہ مطلع ریاض خیرآبادی کا ہونا چاہیئے۔ اس مطلع کے بعد وہ انگریزی ادب کے ممتاز شاعر ٹی ایس ایلیٹ پر آئے جو لوگ فراق سے مل چکے ہیں وہ اس بات کی گواہی دیں گے کہ فراق جب کچھ کہنے لگیں تو بیچ میں بولنا بہت مشکل ہوتا تھا اپنی بات انہوں نے مرزا یگانہ کے اس شعر پر ختم کی۔

بلند ہو تو کھلے تجھ پہ زور پستی کا
بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا

میں نے کہا ـــــ " لیکن یہ عمر تو ایک خاص انداز میں سوچنے اور شعر کہنے کا نتیجہ ہے لیکن اس شعر کے باوجود مرزا یگانہ کو اقبال کی طرح مفکر شاعر نہیں مانا گیا۔ اسی طرح بلند خیالی آپ میں بھی ہے لیکن . . . ."

انہوں نے ہوا میں ہاتھ کھڑا کرتے ہوئے کہا۔ "مثلاً —
اور میں نے ان کی دو رباعیاں انہیں سنا دیں۔

صحرا میں زماں مکاں کے کھو جاتی ہیں
صدیوں بیدار رہ کے سو جاتی ہیں
اکثر سوچا کیا ہوں خلوت میں فراقؔ
تہذیبیں کیوں غروب ہو جاتی ہیں

یا آپ کی وہ رباعی جس کے آخری دو شعر یوں ہیں۔

تو رازِ حیات پوچھتا ہی مجھ سے
وہ راز ہے شائستہ غم ہو جانا

اور فراقؔ نے ہولے ہولے ہال کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا تھا
"ارے میاں! یہ تو اندر کا درد ہے جو شعروں میں چھلک اٹھتا ہے۔ بس یہی پتہ نہیں چلتا وہ درد ہے کیا۔"

میرا خیال ہے اس سوال کا جواب نہ تو میر دے سکتے تھے نہ دنیا کے کسی بھی ادب کا کوئی عظیم شاعر۔ دراصل یہی درد شاعری کی فکر اور اس کی شاعری کا سرمایہ بلکہ منبع ہے اور فراقؔ کے یہاں در دبدرجہ اتم موجود تھا۔ فراق ایک نئے وجدان کے شاعر تھے جذبے کی سچائی، گہرائی اور داخلیت نیز ان کی آواز (بہ مراد لہجے) کی بے ساختگی ان کی شاعری کی خصوصیت رہی ہے۔ اُردو۔ فارسی اور انگریزی کے کلاسیکی ادب کے علاوہ، فراقؔ نے ہندی کے کلاسیکی ادب کا بھی بہت گہرا مطالعہ کیا تھا۔ ان کی رباعیات تلسی داس، سورداس، میرابائی کی آواز سے متاثر ہے۔ کالی داس، بھرتری ہری، بھبھوتی اور ودیاپتی کو فراق عظیم عشقیہ شاعر مانتے ہیں۔ کبیر کے بارے میں ان کا ایک جملہ ہی کافی ہے۔ "ارے بابا! کبیر کا کھونا زمین میں نہیں آسمان میں گڑا ہے۔" ایسی بات فراق کے علاوہ کوئی اور کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔

اُردو زبان اس بات پر فخر کر سکتی ہے کہ اگر انیسویں صدی میں میر اور غالب جیسے عظیم شاعر ہوتے تو بیسویں صدی میں اقبال، یگانہ، جوش اور فراقؔ جیسے دیو قامت سامنے آئے۔ کوئی بھی زبان اور ادب وقت سے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں مانگ سکتا۔

***

رام لعل یاد میں کچھ

رشید الدین

آنجہانی رام لعل کے اور میرے تعلقات کی بات دو چار دس برس کی بات نہیں ہے بلکہ لگ بھگ چالیس سال کا قصہ ہے۔ میں جب ۱۹۵۶ء میں اورنگ آباد دکن کے کالج میں پڑھ رہا تھا اور نیا نیا لکھنا شروع کیا تھا، اُس وقت رام لعل خاصے مشہور افسانہ نگار ہو چکے تھے اور ان کی ایک کتاب (افسانوں کا مجموعہ) "عورت جو ننگی ہے" بیسویں صدی پبلی کیشنز کی جانب سے شائع ہو چکی تھی۔

اُس زمانے میں (غالباً یہ ۱۹۵۶ء کی بات ہے) ہمارے ہم خیال دوستوں کا ایک بن چکا تھا جن میں اکثر نئے لکھنے والے تھے۔ ان میں میرے علاوہ بعد میں دو مشہور افسانہ نگار بنے۔ ایک رفعت نواز اور دوسرے الیاس ..... ہمارے ایک مشترکہ دوست سرنید کمار مہرا بھی تھے جو بڑی شخصیت کے مالک تھے اور اچھے افسانے لکھتے تھے۔ اسی زمانے میں مرحوم عرش ملسیانی کی ادارت میں ماہنامہ "آج کل" دہلی میں اُن کا ایک طویل افسانہ بھی چھپ چکا تھا۔

ہم لوگوں نے وہاں (اورنگ آباد) میں اس زمانے میں ایک ادبی ادارہ بنام "مطلع ادب" بھی قائم کر لیا تھا جس کا ہر ہفتہ اجلاس ہوتا تھا اور تمام اپنی اپنی تازہ تخلیقات سناتے تھے۔ کبھی کبھی ہم اس ادارہ کے اجلاس میں بڑے ادیبوں اور شاعروں کو بھی بلا لیتے تھے جیسے حضرت یعقوب عثمانی مرحوم، اختر الزماں ناصر، قاضی سلیم اور بشر نواز۔ اس ا[illegible] کے صدر ہم سے ذرا سینیئر شاعر جے پی سعید تھے جن کا بعد میں ایک شعری مجموعہ بھی شائع ہو چکا۔

ہمارے گروپ میں تین کا مثلث بہت مشہور تھا۔ میں، رفعت نواز اور سرنید کمار مہرا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس زمانے میں رام لعل نے ہم تینوں کے نام لکھ کر اپنا ایک تازہ افسانوی مجموعہ بھی بھیجا تھا جو غالباً اب بھی رفعت نواز کے پاس ہوگا۔ ہم تینوں کی رام لعل سے خط و کتابت تھی

وہ نئے ادیبوں کی ہمت افزائی کرتے تھے اور نہایت شفیق اور نیک نفس انسان تھے میری ان سے خط و کتابت ملازمت کے سلسلے میں میرے حیدرآباد آنے تک جاری رہی۔ اس کے بعد بند ہوگئی۔ میں نے مراٹھواڑہ یونیورسٹی اورنگ آباد سے گریجویشن کی تکمیل کی اور ایک انٹرویو میں محکمہ ترجمہ حکومت آندھرا پردیش حیدرآباد میں بطور جونیر مترجم (اردو) میرا تقرر عمل میں آیا اور دسمبر ۱۹۹۵ء میں بطور ڈپٹی ڈائرکٹر (اردو) اسی محکمہ سے سبکدوش ہوا اور حیدرآباد ہی کو اپنا وطن بنالیا۔

تو بات ہمارے مثلث کی چل رہی تھی۔ میں، رفعت نواز اور رسہ بندر کمار جو کھتری گھوٹ کے پنجابی تھے لیکن اردو اہلِ زبان کی طرح بولتے اور لکھتے تھے۔ بعد میں انھوں نے ناگپور یونیورسٹی سے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کیا اور ڈاکٹر بن گئے۔ لیکن افسوس کہ عین جوانی میں دوران ملازمت ان کا انتقال ہوگیا۔ شادی کی نوبت بھی نہ آسکی تھی۔ رفعت نواز ناندیڑ کے کلکٹر آفس میں ملازم ہو گئے۔ سالِ گزشتہ ان کے افسانوں کے دوسرے مجموعے کو (نام اب میں بھول رہا ہوں) مہاراشٹرا اردو اکیڈیمی سے افسانوں میں پہلا انعام سات ہزار روپیہ ملا۔

حیدرآباد آکر میری تحریری صلاحیتیں اور ابھر آئیں کیوں کہ حیدرآباد ایک وسیع و عریض ادبی، تہذیبی اور ایک لحاظ سے اردو کا شہر ہے، پھر میں نے جس محکمہ میں ملازمت کی تھی وہ بھی عام نوعیت کے محکموں سے الگ تھا اور یہاں سرکاری ضروریات کے طور پر اردو ترجمہ کا کام ہوتا تھا حیدرآباد میں رہ کر اب تک میری چار کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور چاروں کو آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی کے انعامات مل چکے ہیں۔ میری ایک کتاب " ذکرِ رفتگاں " فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی (لکھنؤ) کے مالی تعاون سے بھی شائع ہوئی ہے جس کے صدرنشین بعد میں رام لعل مرحوم بھی رہ چکے ہیں۔

خط و کتابت کے علاوہ رام لعل سے میری ایک بار شخصی ملاقات بھی ہو چکی۔ وہ حیدرآباد کسی کام سے آئے تھے۔ جیلانی بانو کے مکان پر ایک ادبی نشست ان کے اعزاز میں رکھی گئی تھی جہاں انھوں نے اپنا افسانہ "بے سر کا گوتم" سنایا تھا جو بعد میں ان کے کسی مجموعے میں شامل بھی ہوا۔ اس وقت میں نے پہلی بار اس شخص کو یا ادیب کو پہلی بار دیکھا۔ جس سے میری قلمی ملاقات تھی۔ رنگ گورا چٹا، گٹھیلا بدن، قد قدرے پست، سر کے بال سامنے سے غائب لیکن اس کے باوجود چہرہ پر ایک وقار اور ملاحت (جو عام طور پر گورے لوگوں کے چہرہ پر نہیں ہوتی) اجاگر

کے بعد میں ان سے ملا اور اپنا تعارف کرایا۔ مل کر بہت خوش ہوئے اور بولے
"اچھا آپ یہاں حیدرآباد میں ہیں۔"
جب میں نے اپنے محکمے کا نام بتایا تو تعجب سے بولے۔
"اچھا یہاں ایک ایسا محکمہ بھی ہے جہاں اردو میں ترجمہ کا کام ہوتا ہے؟"
بس یہی ان سے میری پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ اور بھی بہت سی باتیں ہوئیں جو یہاں طوالت کا باعث ہوں گی۔ اس چیز اس وقت میں نے محسوس کیا کہ وہ بے حد خلیق، ملنسار اور مخلص آدمی ہیں اور ان میں آداب گفتگو بھی موجود ہیں۔ ان میں غرور نام کو نہیں تھا جیسا کہ عام طور پر پنجابیوں کا خاصہ ہوتا ہے وہ نہایت نیک آدمی تھے اور ایک بار مجھے لکھا تھا کہ
دو پبلشر نے میری پہلی کتاب (عورت جو ننگی ہے) کے عنوان کا بہت استحصال کیا ہے۔ ان کی مراد خوشتر گرامی ایڈیٹر و مالک "بیسویں صدی" سے تھی۔"
اس مجموعے میں اس نام کا ایک افسانہ تھا جس میں عریانیت نام کو تھی بلکہ عورت سے ہمدردی کا اظہار کیا گیا تھا۔

رام لعل صاحب کی گھریلو زندگی نہایت اچھی تھی۔ ان کی بیوی، دو بچیوں اور ایک لڑکے سے وہ بہت محبت کرتے تھے۔ ان کی زندگی ان اسکینڈلوں سے پاک تھی جس کا شکار رہا رہے اکثر شاعر ادیب رہتے ہیں۔ ان کی نوکری ریلوے میں تھی جہاں اکثر تبادلے ہوتے رہتے ہیں لیکن ان کا زیادہ عرصہ دلی میں گزرا۔ بعد کی ان کی ملازمت کا زیادہ تر حصہ لکھنؤ میں گزرا اور اسی کو انھوں نے اپنا وطن بنا لیا اور وہاں گھر بھی تعمیر کر لیا۔ رام لعل کی زندگی جد و جہد سے پر ہے ذاتی زندگی بھی اور ملازمت کی بھی۔ ان کے کام کی نوعیت ایکزیکیٹو طرز کی تھی۔ وہ دفتر میں کبھی نہیں رہے اس طرح ان کی زندگی کا بیشتر حصہ ریلوں میں گزر گیا۔ کبھی یہاں تو کبھی وہاں۔ ظاہر ہے ایسی ملازمت میں بہت سے ناخوشگوار واقعات بھی رونما ہو سکتے ہیں۔
ایک بار خوشتر گرامی کو افسانہ بھجواتے ہوئے ایک خط میں لکھا تھا کہ
"ٹرین اسٹارٹ ہوتے وقت پلیٹ فارم پر کھڑے ایک اسٹوڈنٹ نے میری عینک اچک لی۔" اس زمانے میں (اور غالباً آج بھی) "بیسویں صدی" میں افسانوں کے ساتھ افسانہ نگاروں کے خطوط بھی بالالتزام شائع ہوتے اور نام کے ساتھ ڈگریاں بھی ہوتی تھیں۔

رام لعل صاحب کے نام کے ساتھ کوئی ڈگری نہیں چھپی کیوں کہ ڈگری ان کے پاس تھی ہی
ہیں۔ میٹرک کامیاب کیا ہی تھا کہ تقسیم کا سانحہ پیش آگیا اور انھیں اپنی تعلیم منقطع کر کے
ئی روزگار میں جٹ جانا پڑا۔ انھوں نے اپنی خود نوشت سوانح حیات میں تقسیم سے پہلے
ر تقسیم کے بعد کے حالات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ یہ خود نوشت قسطوں میں "بیسویں
دی" میں رحمٰن نیر (موجودہ اڈیٹر و مالک "بیسویں صدی") قسط وار شائع کر رہے تھے اسی میں
ے اس کی چند قسطیں پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ پتہ نہیں وہ کتابی شکل میں چھپی ہے یا نہیں۔

اوسلو (نیدرلینڈ) میں رام لعل صاحب کے ایک افسانہ نگار دوست ہرچرن چاولہ مستقلاً
باد ہو گئے تھے۔ انھوں نے ریٹائرمنٹ کے بعد رام لعل صاحب کو وہاں بلایا جو ان کا پہلا کسی
ے کا سفر تھا۔ اس سفر نامہ کی انھوں نے بڑی دلچسپ روئیداد لکھی جو اردو میں سفر ناموں کی
ایات کو مزید آگے بڑھاتا ہے۔ یہ سفرنامہ شائع ہو گیا اور بہت پسند کیا گیا۔ انھوں نے اس
رنامے کے علاوہ سُنا ہے کہ اور بھی سفرنامے لکھے ہیں۔ غالباً ایک سفرنامہ پاکستان کا بھی ہے
لعل صاحب نے سیکڑوں افسانوں کے علاوہ ناولیں بھی یادگار چھوڑی ہیں۔ ان کے پاس کوئی
ری نہیں تھی لیکن انھوں نے اپنا شمار دانش وروں میں کرا لیا تھا۔

رام لعل صاحب کا انتقال لکھنؤ میں ۱۶؍ اکتوبر ۱۹۹۶ء کو صبح ہی صبح اچانک ہو گیا۔ انتقال
وقت اُن کی عمر ۷۵ سال ہو گی۔ وہ پچھلے چار پانچ سال سے کینسر کے مرض میں مبتلا تھے لیکن
کا انتقال حرکت قلب بند ہونے سے ہوا۔ صبح اٹھنے کے بعد حسب معمول وہ اپنے گھر میں گملے
دوں کو پانی ڈال رہے تھے کہ اچانک روح پرواز کر گئی۔ اس طرح انھوں نے میانوالی
کستان) سے زندگی کا جو سفر شروع کیا تھا وہ لکھنؤ میں آکر ختم ہو گیا۔ وہ ممتاز شاعر، ماہر
لیات اور صدر انجمن ترقی اردو (ہند) پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے ہم وطن تھے اور ان سے
نیر تھے۔ میں بھی ان سے بہت جونیر تھا لیکن اپنے خطوط میں یا ملاقات میں انھوں نے
ے یہ ظاہر نہیں کیا کہ وہ مجھ سے عمر میں بڑے اور ادب میں بھی سینئر ہیں۔ یہ اُن کا بڑا پن تھا

اردو زبان رام لعل کی کمزوری تھی گو ان کی مادری زبان پنجابی تھی لیکن انھوں نے ہمیشہ
سے محبت کی اور اسے گلے لگایا۔ انھیں اعتراف تھا کہ وہ جو کچھ بھی تھے محض اردو کی بدولت تھے۔
ین لسانی عصبیت یا مذہبی تعصب بالکل نہیں تھا۔

باوجود کینسر کے مریض ہونے کے انھوں نے آخری سانس تک فعال زندگی گزاری۔ انھوں

نے لکھنؤ میں ہندو مصنفین و شعراء کی کل ہند عظیم الشان کانفرنس منعقد کی اور عملی طور پر یہ ثابت کیا کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے انھوں نے کل ہند اردو رابطہ کمیٹی کے ذریعہ جس کے وہ صدر تھے پورے اتر پردیش میں اردو کے لئے ایک بھرپور مہم چلائی۔ ان کی جو آخری تحریر تھی اور جو روزنامہ "قومی آواز" لکھنؤ کو موصول ہوئی تھی وہ صدر مقبول فدا حسین پر ہونے والی یلغار کے خلاف صدائے احتجاج تھی جو ایک اپیل کی شکل میں تھی جس پر ان کے ساتھ بہت سے دوسرے ادیبوں کے بھی دستخط تھے۔ یہ ان کی آخری تحریر ثابت ہوئی۔

تقسیم ہند کے بعد رام لعل نے جب افسانے لکھنے شروع کئے تو ان کا شمار بہت عرصہ تک کوئی بڑے افسانہ نگاروں میں نہیں ہوا لیکن رفتہ رفتہ اپنی تحریروں کے ذریعہ انھوں نے سنجیدہ حلقوں میں بھی جگہ بنالی اور "بیسویں صدی" اور "شمع" کے علاوہ ہندوستان اور پاکستان کے بڑے بڑے ادبی رسالوں میں ان کے افسانے شائع ہونے شروع ہوئے چنانچہ جب وہ ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو اس زمانے میں ان کا شمار اردو کے بڑے اور ممتاز افسانہ نگاروں میں ہونے لگا تھا بلکہ ہو چکا تھا

جب ان کا انتقال ہوا تو لکھنؤ میں وہ حیات اللہ انصاری کے بعد سب سے سینیئر افسانہ نگار کے علاوہ ایک دانشور کے طور پر بھی کرائی تھی۔ ان کی بعد کی تحریروں میں بڑی پختگی آچکی تھی۔ ان کی ہینڈ رائٹنگ بھی ان کی شخصیت کی طرح بہت خوبصورت اور پاک وصاف تھی۔ اس طرح عام طور پر جو مشہور ہے کہ ہینڈ رائٹنگ شخصیت کی آئینہ دار ہوتی ہے " اسے انھوں نے سچ کر دکھایا۔

رام لعل صاحب نے اردو ادب میں یقیناً اپنی ایک جگہ اور مقام بنا لیا ہے اور جب تک اردو زبان و ادب موجود رہیں گے، ان کا نام بھی باقی رہے گا یہ مقام اور نام انھوں نے اپنی مسلسل کوششوں اور نامساعد حالات کے باوجود بنایا۔ وہ یقیناً ایک سلیقہ مند انسان اور ادیب تھے اور مجھے فخر ہے کہ ایسے شخص سے میرے ایک طویل عرصہ تک ادبی تعلقات رہے



غنی نعیم

ماہنامہ "خوشبو کا سفر" کے "صف شکن" کے نام کھلا خط

[جناب غنی نعیم نے "صف شکن" کے نام یہ کھلا خط جناب ایڈیٹر صاحب ماہ نامہ "خوشبو کا سفر" کے نام ایک خط کے ساتھ بغرضِ اشاعت روانہ کیا۔ اسی خط میں ظاہر کردہ وجہ کی بنا پر ماہ نامہ "شاداب" کو بھی بغرضِ اشاعت بھجوادیا۔ دونوں خطوط قارئینِ شاداب کی نذر ہیں۔ — ایڈیٹر]

جناب ایڈیٹر صاحب ماہ نامہ "خوشبو کا سفر"
کہکشاں ۷/۸۲۴-۳-۱۱ حیدر بیلے پلی حیدرآباد (۵۰۰۰۰۱)

ذریعہ ہذا صف شکن کے نام ایک کھلا خط منسلک ہے جو آپ کے ماہ نامہ کے مضمون "کفش بردار" بقلم صف شکن کا جواب ہے۔

ایک ماہ نامہ کے مدیر اور ادارۂ روزنامہ اخبار "سیاست" کے دیرینہ تجربہ کار وابستہ سے یہ توقع بیجا نہ ہوگی کہ وہ صحافتی اقدار سے واقف ہوگا۔ اور اس میں اتنی اخلاقی جرأت ہوگی کہ وہ مضمون کے جواب شائع کرے۔

مجھے افسوس ہے کہ اس قسم کا جواب [illegible] پر مجبور کرتا ہے اگر آپ کو [illegible] گرفتار صف شکن ہی ہے [illegible] سیاہی ہے [illegible] اور [illegible] ہے اور [illegible]

ویسے جناب مدیر اس یقین کے ساتھ کہ آپ یہ مضمون شائع نہیں کریں گے اس زیراکس کا بیان آپ کے سرپرستوں، بہی خواہوں کے لیئے حیدرآباد اور بیرون حیدرآباد بذریعہ ڈاک بھجوائی جارہی ہیں۔ ماہ نامہ شاداب بھی اسے شائع کرے گا۔

فقط
اُردو ادب کا ایک قاری
غنی نعیم

-۲-

صف شکن ــ

نام رکھائی مبارک

-: (خارجاً مسموع ہوا کہ نام رکھائی پر "ہن ہنا آباد" کے الاوہ کے باڑے میں لڈو اور بتاشوں کی تقسیم عمل میں آئی) :-

جناب صف شکن! نام پڑھتے ہی سرشار کے "فسانۂ آزاد" کا وہ بیٹر صف شکن یاد آگیا جو لکھنؤ کی زوال پذیر تہذیب و معاشرہ کے نمائندہ نواب کا پروردہ تھا اور جس کی گمشدگی پر نواب بہت غمزدہ اور بے حد حساب پریشان تھا۔ اُس کے مصاحب اُسے دلاسہ دے رہے تھے۔ اب پتہ چلا کہ وہ گمشدہ بیٹر صف شکن لکھنوی علتوں کا مارا تنک بند کے قالب میں ہے جسے کاغذی پیرہن دے کر شہر حیدرآباد کی فضاء میں چھوڑ دیا گیا ہے۔

جناب صف شکن کے علاوہ مختلف شخصیتوں جیسے ضمیر الدین ضمیر، تمکین سیلانی وغیرہ نے بیش امام خاندان کو پریشان کن صورت حال اور قانونی پیچیدگیوں سے دوچار کردیا ہے۔ اور وراثت کے قضیوں کی شروعات ہوچکی ہیں۔ قانونی مشورے مذہبی فتوے لیئے جارہے ہیں۔ سورج گہن کی تاریکی ایک نئی سائینٹی جینیٹی " تاریخ بن رہی ہے خدا خیر کرے۔

جناب صف شکن مندرجہ بالا شخصیات نے "ہن ہنا آباد" بہر لحاظ سے پیمانہ کی ذلالتوں، ظلمتوں اور غلاظتوں کو اپنے وجود میں لیئے حیدرآباد جیسے شرافت و تہذیب کے مرکز کو نہ صرف "طائفہ" کی کمائی کا بازارِ روپ بنایا بلکہ اس شریف ترین اور تہذیب تمدن کے شہر کو "دشنام ناموں" اور "مغلظات" سے بدنام کیا۔ نوبت بہ ایں جارسید

ان ظلمتِ فکر و اذہان کے حاملاؤں سے شرفائے حیدرآباد نے ترکِ تعلق کر لیا کہ اُن کے دامنِ شرافت پر غلاظت کے چھینٹے اڑ کر داغ لگا دیں۔ اُن شریف ترین ہستیوں کا یہ احساس ہے کہ اگر کوئی مورخ حیدرآباد کے فحش نگاروں کی تاریخ قلمبند کرے گا تو حسبِ بالا دشنام نویسوں کے نام سرِ فہرست لکھنے پر مجبور رہے گا اور کوئی محقق ان فحش نگاروں کے اصلی نام مع حسب نسب ضرور لکھے گا۔

جنابِ صف شکن! آپ نے اپنا نام بہت ہی سوچ سمجھ کر مناسب اور موزوں رکھا ہے جو آپ کی فطرت اور جبلت کے عین مطابق ہے جو آپ کی شخصیت کا نمائندہ اور آپ کی حرکات کا حامل ہے آپ نے جہاں جہاں اپنا سبز قدم رکھا وہاں آپ نے اپنی مفسدانہ، شر پسندانہ فطرت کی "عملیات" کا مظاہرہ کیا۔ انجمنوں کے شیرازہ کو درہم برہم کرنے میں پیش امامی کا رول ادا کیا اپنے کالے کرتوتوں سے خاندانی روسیاہی میں اضافہ کیا۔ اپنی "باریک چالوں" سے لڑانے" کی موروثی روایت کو اپنا کر دوستوں کی صف شکنی، بھائیوں سے دشمنی، مخلصوں سے دل شکنی شریفوں پر تہمت تراشی، پرہیزگاروں کی بدنامی، معزز شہریوں کی کردار کشی جیسی مذموم حرکات سے شرافت اور شائستگی کا جنازہ اُٹھا کر اپنی فطری روباہی، فکری ظلمت، باطنی خباثت اور سیاست سے ادبی دنیا کو متعفن اور آلودہ کیا۔

جنابِ صف شکن! آپ کی فطری سیاہی، "کفش بردار" کے الفاظ میں گھری ہوئی جسے پڑھ کر یہ احساس ہوا کہ گندی گلیوں اور باڑے کے پروردہ ظلمت پوش ذہن اور فکر میں لیسے ہی کیڑے کلبلاتے ہیں۔ اپنی ذہنی فکری، دلی اور روحانی غلاظت کا بدبودار اخراج ماہواری رسالہ میں شائع کر کے یہ خیال کر لیتے ہیں کہ ایسی غلاظت طنز و مزاح ہے حقیقتاً ایسی کالی تحریر ذہنی بیمار نفسیاتی امراضِ خبیثہ کے مریض کی ہذیانی دماغی بخار کی غمازی کرتی ہے۔

جنابِ صف شکن! آپ کو غلط فہمی ہوئی کہ آپ کا دیا ہوا عنوان "کفش بردار" باعثِ ذلت ہوگا بلکہ یہ تو آپ کے لئے ہی سامانِ رسوائی ہوا ہے میرے لئے تو یہ عنوان باعثِ عزت و فخر ہے۔

مجھے اس بات پر فخر و ناز ہے اور آخری سانس تک رہے گا کہ میں کفش بردار ہوں۔ ایسی مفتخر اور فخرِ زمانہ ہستیوں کی جوتیوں کو اپنے سر پر رکھنے کا شرف مجھے حاصل ہے جن کی خاندانی شرافت، رتبہ و منزلت پر تاریخِ دکن کو فخر حاصل ہے جن کے اخلاق اور اخلاص عالمگیر شہرت

[illegible]

شریف ترین خانوادہ کا ہر فرد، نیک خو، پرہیزگار، مجسم اخلاق اور پیکرِ شرافت اور محبت ہے اس گھر کی فضا میں راحت ہی راحت، برکت ہی برکت۔ جہاں ہر لمحہ رحمتِ خداوندی برستی رہتی ہے۔ ذکرِ الٰہی ہر آن ہوتا ہے جہاں ہر ایک بارگاہِ الٰہی میں پنجوقتہ ہی نہیں بلکہ شب بیداری اور تہجد کی نماز میں جبینِ بندگی کی سجدہ ریزی سے روحانی، دلی معراج، تجلیات کے ساتھ اپنے پُرنور چہروں کی تابناکی سے اس حقیقت کو آشکار کرتا ہے کہ دولتِ دنیا کی فراوانی کے ساتھ ساتھ دین کی ثروتوں سے مالامال ہے۔

جنابِ صف شکن! یہ وہ نیک خو صاحبِ کردار معزز و معتبر شخصیتیں ہیں جنھوں نے قوم و ملت اور ملک کی بھلائی، بہبودی اور ترقی کے لئے اپنی زندگیوں کو وقف کر رکھا ہے جن کی جرأت و ہمت نے قوم و ملت کے اداروں کی ایک ایک اینٹ کی حفاظت اور صیانت کے لئے اپنی جانوں کی بازی لگا دی۔ ان باوقار پُرعظمت ہستیوں نے قوم و ملت کے مستقبل کو سنوارنے کے لئے جو کارنامے انجام دیئے ہیں وہ تاریخِ دکن کا روشن باب ہیں۔ میں اپنی ہر سانس میں اللہ پاک کا شکر ادا کرتا ہوں کہ ایسی بے لوث، خدمتِ خلق میں مشغول ہستیوں کی جوتیوں کو اپنے سر پر رکھ کر سرفراز بھی ہوا اور سرافراز بھی ان کی خاکِ پا کو بطورِ سُرمہ میں نے اپنی آنکھوں میں لگا کر بصارت ہی نہیں بصیرت بھی پائی ہے میں نے ان بزرگوں کی جوتیاں سیدھی کرتے ہوئے خلیفہ ہارون رشید کی پیروی کی ہے۔ ان محسنانِ قوم کی نظرِ کیمیائے اثر نے مجھے قوم و ملت کی خدمت کا سلیقہ سکھایا۔ ان خضرِ راہ اور مسیحا نفسوں کے نقوشِ پا کو اپنا رہبر اور رہنما بنا کر اپنی آخرت کا میں نے سودا کر لیا ہے اُن کی جوتیاں اپنے سر پر رکھنے کی سعادت حاصل کرتے ہوئے مجھے محمود "ایاز" ہونے پر فخر ہوتا رہتا ہے اور اس نسبتِ خاص کا احساس میری نگاہ و دل کو سلطانی عطا کرتا ہے مجھے اپنی اس کفش برداری پر یوں بھی ناز ہوتا ہے کہ تاریخ اولیائے کرام میں مذکور ہے کہ حضرتِ امیر خسروؒ نے حضرت نظام الدین محبوبِ الٰہی رحمتہ اللہ علیہ کی پاپوش مبارک سر پر رکھ کر حاضرِ دربارِ محبوب، پاک ہوئے تو ارشاد ہوا کہ "چہ ارزاں خریدی"۔ اُس درِ اقدس کی غلامی نے مجھے بھی یہ عزت و توقیر عطا کر رکھی ہے کہ میں "کفش بردار" ہونے پر فخر کرتا ہوں۔

جنابِ صف شکن! آپ تو حُسن پرستوں، بوالہوسوں اور عیاشوں کے لئے دلّالی کرتے ہوئے اربابِ نشاط کی کہکشاں سجا کر اپنی جیب گرم کرنے میں روز و شب مصروف رہتے ہیں شبستانوں کی باقی ماندہ مقویات کے استعمال کا جب چوری چھپے موقع ملتا ہے تو آپ کو جذبۂ رومان کی شدت،

دست درازی پر آمادہ کرتی ہے تو "افسر شاہی" پاپوش سے آپ کی "تاجپوشی" اس حد تک ہوتی ہے کہ آنکھوں کے آگے اندھیرا ہی اندھیرا ہو جاتا ہے۔ تیز روشن "کرن" بھی بہ کمالِ بُراقی خود پر آنچ نہ آنے کے لئے آپ کو نمونۂ عبرت بناکر برق رفتاری اختیار کرتی ہوئی نوازش اور پہچان سے گریز میں عافیت محسوس کرتی ہے تو پھر جناب صف شکن! میری کفش برداری اور جناب صف شکن آپ کی "کارگزاری" میں امتیاز کیجئے اور اگر آپ کے مردہ ضمیر میں رمق برابر بھی زندگی کے آثار ہوں تو اب بھی وقت ہے سنبھل جائیے۔

جناب صف شکن! اُس مردودِ ادب و شعر سے پوچھیئے جس کی بدنصیبی نے اُسی وقت اُس پر "جہنمی" ہونے کی مہر لگادی تھی جس وقت وہ اپنے اُستادِ محترم پر بھری محفل میں "جوتا" لے کر دوڑ پڑا تھا جس کی شاہد و گواہ حیدرآباد کی کئی شخصیتیں ہیں اور استاد بھی ایسا جس کی اوجِ فکر کی ابتدائی شاعری کے شہ پاروں نے کئی تُک بندوں کو صاحبِ دیوان شاعر بنادیا۔ جو حقیقتاً "ملک الشعراء" تھا جس کی فکر کی بلندی کو پہنچنا تو کجا اُس کی شعری فکر کی قوتِ پرواز کے ابتدائی تعاقب میں جناب صف شکن "بیڑوں" کے بازو اُکھڑ گئے۔ اور وہ تُک بند ہو کر رہ گئے۔ جناب صف شکن! میری خوش نصیبی کی معراج ہے کہ میں کفش بردار ہونے کا فخریہ اعلان کرتا ہوں کہ اپنے بزرگوں، استادوں کا احترام اور اُن کی عزت کرنا میرا جزوِ ایمان ہے وہ تو لعین اور "مردود" ہے جو اپنے استادوں اور محسنوں کے رتبۂ بلند سے ناواقف ہو کر خود کو دوزخ کا ایندھن بناچکا ہے یہ اُس کی جہلِ خرد ہے جو سرتاپا "بوجہل" بہ ذاتِ خود ہے اُس کی بوالہبی کا ثبوت تو اپنے استادِ محترم پر جو بمنزلۂ باپ ہے جوتا لے کر دوڑ پڑنا ہے۔ اُس کم عقل کی سوچ پر اس کا "طائفہ" حیران ہے کہ وہ دوسروں کو یہ نام دے رہا ہے؟

جناب صف شکن! یہ ایک حقیقت ہے کہ میں نے ایک تعلیمی اقلیتی ادارہ میں بحیثیت کلرک اپنی شبانہ روز خدمات قوم و ملت کے لئے وقف کی تھیں۔ میری اہلیت و صلاحیت یہ رہی کہ جامعہ عثمانیہ کے اربابِ مجاز نے خداداد و ودیعت کردہ میری قابلیت کو تسلیم کرتے ہوئے مجھے ایم اے اردو ادب میں گولڈ میڈلس کا حقدار قرار دیا۔ میری صلاحیت، اہلیت اور قابلیت کے مدِ نظر کالج کے جوہر شناسوں نے گزشتہ بارہ برسوں سے روزآنہ پانچ گھنٹے اردو ادب کی تدریس کا کام میرے تفویض کیا۔ الحمد للہ کہ میرے ہزاروں شاگرد ہیں اللہ بزرگ و برتر کا فضل و کرم میرے شاملِ حال ہے کہ دیگر جامعات نے بحیثیت ممتحن میری خدمات سے

استفادہ کیا اور کرتے رہتے ہیں اور آج بھی اُردو ادب کے کئی ریسرچ اسکالرز مجھ سے رجوع ہوتے رہتے ہیں۔ ہندوستان کی تقریباً تمام جامعات کے اُردو ادب کے شعبہ کے صدور اور پروفیسرز میرے قریبی دوست ہیں۔

جنابِ صف شکن ۔! ایک معمولی کلرک نے تو اپنی ادبی صلاحیتوں کا لوہا منوالیا۔ جس کا اعتراف دَرِ پردہ ہی نہیں بلکہ روزِ روشن کی طرح سنجیدہ ادب کے قارئین نے کیا جبکہ وں نے میرے وہ مضامین جو اُردو ادب کے ایک قاری کی حیثیت سے میں نے لکھے اور جن کی اشاعت پر ادب کے سجادوں کی نیند حرام ہوگئی۔ آپ اور آپ کے ساتھیوں کے لیئے وہ مضامین تلوے سے تالو تک دو شاخہ کرتی ہوئی سلگتی سلاخ کے مانند وہ دہ چرکے دیئے کہ اُن کی آہ و بکا، نالہ و زاری اور سینہ کوبی سے شہرِ ادب کی فضاء آلودہ ہوگئی۔

جنابِ صف شکن ! آپ کی سادہ لوحی پر مجھے رحم آتا ہے کہ شتر مرغ کی طرح آپ نے ریت میں اپنی گردن چھپالی اور اس حقیقت سے آنکھیں بند کرلیں کہ پیش امام خاندان (ددھیال ننھیال اور سسرال ہمہ خاندانِ پیش امامان) کا ایک دھتکارا ہوا ہفتم جماعت کامیاب کردہ فرد محکمہ سیول سپلائیز میں راشن کارڈ لکھنے کے معمولی کام پر مامور ہوا۔ جس کے پیش امام باپ کی تین بیویاں تھیں بقول اس تک بند کہ اس کا باپ اپنی دو بیویوں سے کوئی اولاد پیدا نہ کرسکا اور یہ تک بند اس پیش امام کی تیسری بیوی کے بطن سے پیدا ہوا۔ اس کے لکھے کو غلط کیوں خیال کریں۔ جب اُس نے لکھا ہے تو صحیح ہی لکھا ہوگا۔ جب وہ تک بند سلسلہ حماقتوں کا جاری رکھتے ہوئے فطری چاپلوسی، خوشامد، خدمت گزاری کے بل بوتے کلرک سے ہیڈ کلرک بن جاتا ہے اور تک بندی کرتے ہوئے عمر گزار کر اپنے مشفق و محترم استاد پر جوتا لے کر دوڑتا ہے اور بزعم خود "شاعر" کہلانے کے لئے دَر، دَر، قریہ، قریہ کا سہ لیئے پھرتا ہے تو جنابِ صف شکن آپ کی چیخ اور منہ میں کون سی شئے اٹک جاتی ہے کہ آپ کے حلق سے آواز تک نکل نہیں سکتی جب کہ یہ تک بند فنِ شاعری کی مبادیات سے تک ناواقف ہے "کچا چٹھا" کے حوالہ سے کھل کر سامنے آرہا ہے کہ اس تک بند کے قافیہ کا دائرہ اس قدر وسیع و عریض ہے کہ جس میں سنگلاخ "چوٹیاں" "چونٹیاں" بن گئی ہیں جن کی چبھن اور کاٹ کی وجہ اسے کسی پہلو قرار نہیں ہے اور اب کھسیانی بلی کھمبا نوچنے لگی ہے۔

جنابِ صف شکن ! میں اُردو ادب کا ایک قاری ہوں۔ میں اپنے اصلی نام سے صلاح الدین نیر

اور رئیس اختر کی "تک بندیوں" پر سنجیدہ، شائستہ اور شریفانہ ادبی زبان میں ماہ نامہ "شاداب" میں مضامین شائع کرائے۔ "شاداب" کے اس تنقیدی گرداب میں جب ان ہر دو کا دفتر بے معنی غرق ہونے لگا تو دیوانگی، مرگی، جھلاہٹ اور کھسیانہ پن کے دوروں اور درمعوں میں مبتلا ہو گئے اور جب کچھ بس نہ چلا تو "ساتویں درجہ کا نقاد" "انگشت شنغم" اور "جمہرو" کے عنوان سے انتہائی غیر شائستہ انداز میں مغویات کا اظہار کر کے مارے خوشی کے اس طائفہ نے پیروں میں گھنگھرو باندھ کر "مداری" کے اشارہ پر بندروں کا تماشہ شروع کیا اور ہوش و حواس سے بیگانہ چلا چلا کر گلے ملنے لگے کہ "واہ میرے شیر! کیا تیر مارا" میں نے جناب نیر اور جناب رئیس اختر سے ادب اردو کے قاری کی حیثیت سے جواب طلب کیا تھا۔ ان ہر دو کا ظرف، جناب صف شکن (جس سے آپ بخوبی واقف ہیں) جواب میں بس یہی شائع کرا سکے کہ "جواب جاہلاں باشد خاموشی" ظاہر ہے کہ دانشمند لہٰذا ادبی سوالات کے جواب "جاہل" بلکہ "جاہل مطلق" کیا دے سکتے۔ ان سوالات جواب کوئی سنجیدہ ذی علم واقف فن عروض ہی دے سکتا ہے۔

"تک بند"، بوجہلوں اور بولہبوں سے شائستہ شریفانہ اور ادیبانہ جواب کی توقع فضول تھی اور ہے

جناب صف شکن! آپ نے "کفش بردار" میں ۱۹۹۰ء کے جس واقعہ کا ذکر کیا ہے اس کی [illegible] یہ وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ ۱۹۹۰ء میں اردو اکادمی حیدرآباد نے ایک بلند مرتبت شاعر [illegible]ے مجموعۂ کلام کی عظمت تسلیم کرتے ہوئے اس شعری مجموعہ پر انعام اول دے کر اکادمی نے اپنے وقار میں [illegible]ضافہ کیا تھا۔ اسی اکادمی نے مصلحتوں اور سفارشوں سے مجبور ہو کر ایک تک بند کو انعام سے نہ صرف [illegible]وازا بلکہ سرفراز کیا۔ (ایسی تک بندیوں اور اسی قبیل کی کتابوں پر انعاموں سے نوازنا ہماری اردو [illegible]کادمیوں کی اردو ادب کی بدخدمتی کا ایک لغا نہ معترف ہے)

اس موقع پر میں نے بلند قامت شاعر کو اپنے غریب خانہ پر مدعو کیا تھا، اس شریف النفس [illegible]رد مومن باکردار، بلند قامت شاعر نے اس تک بند کے تھراتے، کانپتے، لرزتے جسم و ترنم والے [illegible] سفارش کی کہ اس تک بند کو میں اپنے گھر آنے کی عزت سے نوازوں اور سرفراز کروں۔ اس [illegible]رد مجاہد واقف رموز عروض، بلند قامت شاعر کی سفارش پر اس تک بند کو محض اور محض [illegible]یک "طفیلی" کی حیثیت سے اس بلند قامت شاعر کی جوتیوں کے صدقہ میں میں نے اپنے گھر بلوایا۔ [illegible]س تک بند کو اگر پاس نمک ہوتا تو اس عزت بخشی کا حقیقی احوال جناب صف شکن کے قلم سے [illegible]رتا۔ جناب صف شکن! اس تک بند کے چہرہ کی جھریوں میں آج تک بھی "خیابان" کی خاک

خادہ بنی ہوئی ہے وہ تنگ بند تو خیابال کے نہ صرف مکینوں کا بلکہ اُن کے عزیز و اقارب کا قدیم ترین نمک خوار ہے۔

جناب صف شکن! آپ کے مضمون "کفش بردار" میں آپ نے اس تنگ بند کی غلط اطلاعات پر مجھے چغل خور اور لگاؤ بجھاؤ کرنے والا لکھا ہے جس کے لئے آپ نے اپنے اور تنگ بند کی طرح فرضی نام "مشیر بابی" کا حوالہ دیا۔ کیونکہ آپ اور آپ کے طائفہ میں اخلاقی جرأت اور خود اعتمادی کا فقدان ہے اور یہ سرے سے مفقود ہے۔ میں نے ایک تعلیمی اقلیتی قومی ادارہ کے قوم دشمن' مفاد پرست افراد کے مکروہ چہروں کو بے نقاب کیا۔ اُن آستین کے سانپوں کو بلوں سے باہر نکال کر اُن کے زہر کی تھیلیاں نکالیں اور اس طرح اپنے ادارہ کی خدمت اور نمک حلالی کا ثبوت بہم پہنچایا۔ چغل خوری اور لگاؤ بجھاؤ تو جناب صف شکن آپ کی اور تنگ بندوں کی فطرت ہے حیدرآباد اور بیرون حیدرآباد چاہے وہ لندن کے بیرسٹر ہوں کہ جدہ سعودی عرب کے حیدرآبادی ہوں آپ اور آپ کے طائفہ کی فطرت اور طینت سے بخوبی واقف ہیں جس رکابی میں آپ اور آپ کا طائفہ کھاتا ہے اس میں چھید کرنے کے فن میں آپ کا ٹولہ ماہر اور طاق ہے۔

جناب صف شکن! آپ نے جس شخصیت کو "مجوبہ" کا نام دیا ہے آپ اور تنگ بند اُس کے نمک خوار ہیں وہ مجوبہ "جس کا اصلی نام ڈاکٹر فرید الدین صادق ہے یہ ایک اتفاق تھا کہ "اور بنٹ فنکشن ہال" مہدی پٹنم حیدرآباد کے روبرو جس مکان میں کرایہ سے مقیم تھا وہ مکان بیگم حامد علی صاحب انجینئر کی ملکیت ہے جو نواب عزیز جنگ ولا کے خاندان کی معتبر ہستی ہیں ویسے تو عزیز باغ نور خان بازار حیدرآباد کے آپ اور آپ کے طائفہ کے افراد قدیم نمک خوار ہیں۔ خیر تو اس سے معلوم کہاں ڈاکٹر فرید الدین صادق کا حلوکہ ہے۔ آپ کی غلط فہمی کے ازالہ کے لئے اتنا لکھنا کافی ہے کہ میرے ذمہ بیگم حامد علی صاحب کی کسی بھی قسم کی کوئی رقم بھی واجب الادا نہیں ہے۔ میں نے وہ مکان اپنی مرضی سے چھوڑا اور اب جس مکان میں بحیثیت کرایہ دار گزشتہ چار سال سے میں مقیم ہوں وہ بیگم قیصر دستگیر کا ہے جس کا نمبر 12-2-823/A/1/15 اسنتوش نگر مہدی پٹنم حیدرآباد ہے۔ آپ اپنی اور تنگ بند کی تشفی و تسلی کے لئے ہر دو مالکان مکان یا پھر اُن کے شوہر نامداران جناب حامد علی صاحب انجینئر اور جناب دستگیر سے ملیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ رقمی لین دین میں میری اصول پسندی اور بروقت ادائیگی اپنی مثال آپ ہے۔ آپ میں یا تنگ بند میں نہ تو اخلاقی جرأت ہے نہ ہی اتنی مردانگی کہ ان معتبر ہستیوں سے مل کر حقیقت معلوم

کریں کیونکہ آپ مہر دوکے ذہنی دیوالیہ پن اور کردارکشی کی خصلت نے آپ کو جھوٹ اور افترا کا یہ دفتر لایعنی لکھنے پر مجبور کیا۔ رقمی لین دین میں امانت میری صفت ہے جبکہ اس شخص مشاعرہ باز کو اعزازیہ کے لفافوں کے خرد برد اور بد دیانتی سے آپ اور آپ کا ٹولہ بہتر طور پر واقف ہے۔

جناب صف شکن ! آپ کو میرے خاندانی حالات سے آگاہی چاہیے تو تاریخ گلزار آصفیہ، صفحہ ۳۲۶، مستعد یار جنگ بہادر کا مطالعہ کیجئے۔ آپ کی اطلاع کے لئے میرے خاندان کے اسلاف حکومت آصفیہ کے وہ نمائندہ خطاب یافتہ شخصیتیں ہیں جنھوں نے شہزادگان والاشان کو تربیت دی۔ آپ اور ٹنگ بند اس کی تصدیق حیدرآباد کے شرفاء اور ڈاکٹر سید عبدالمنان صاحب سے شرف پابوسی کے بعد کر سکتے ہیں۔

میرے غریب خانہ میں آنے والے شرفاء حیدرآباد شائستہ، مہذب، بلند قامت ادبی شخصیتیں متفکر اور بیرونِ حیدرآباد کے ادیب اور شاعر بحمداللہ آتے رہتے ہیں اس مکان میں منعقد ہونے والی ادارہ اقلیم ادب (جس کے صدر ہونے کا مجھے اعزاز ہے) کے زیر اہتمام ادبی محافل اور اجلاس شہر حیدرآباد کی ادبی تاریخ میں اپنی انفرادیت، ارفع و اعلیٰ معیار کی وجہ دستاویزی حیثیت کی حامل ہیں۔

جناب صف شکن ! میری مبارکباد قبول کیجئے کہ ایک ٹنگ بند اپنی جیب سے حسب عادت قدیم صرفہ کثیر سے اپنی خدمات کے اعتراف کا جشن اپنے وطن مالوف کے قرب و جوار میں کرا رہا ہے۔ حضرت حافظ علیہ الرحمتہ نے جنھیں "لسان الغیب" بھی کہا جاتا ہے یہ پیشن گوئی فرمائی تھی کہ گردش زمانہ یہ دن دکھائے گی کہ " طوق زریں ہمہ در گردن خری بینم ۔"

جناب صف شکن۔ آپ بالکل مطمئن رہیں کہ آپ کی تحریر اور اس قبیل کی آئندہ شائع ہونے والی تحریرات سے میری صحت پر کوئی اثر ہوا ہے اور نہ ہوگا کیونکہ سورج کو چراغ بتانے کی کوشش عقل کے کورے کرتے ہیں۔

جناب صف شکن۔ صلاح الدین نیر، رئیس اختر اور ان کے رفیقان خاص کی نام نہاد شاعری پر شریفانہ شائستہ اور ادیبانہ انداز میں مضامین شائع ہوتے رہیں گے۔ جناب صف شکن آپ کے ٹولہ میں کسی ایک میں بھی شائستہ، شریفانہ ادبی تحریر کا سلیقہ اور فن شاعری سے واقفیت ہو اور کسی [illegible]

احمد منظور

ہندوستان میں سوپر کمپیوٹر کی تیاری

ہندوستان نے تیزی سے ترقی کرتے ہوئے کمپیوٹر کے شعبہ میں اپنی محدود معلومات کے ساتھ قدم رکھا۔ حکومت نے اس شعبہ کے فروغ کے لئے اگست ۱۹۸۸ء میں ایک مرکز سنٹر فار ڈیولپمنٹ آف اڈوانسڈ کمپیوٹنگ (C-DAC) قائم کیا۔ اس ادارہ نے دو سال کی مختصر مدت میں ۶۴ ابتدائی سوپر کمپیوٹر تیار کئے۔ ان کمپیوٹروں کو زیوریچ میں منعقدہ کانفرنس میں رکھا گیا۔ بین الاقوامی سائنٹفک برادری نے ان کمپیوٹروں کی کارکردگی کا مشاہدہ کیا جو اس زمانہ میں یورپ میں تیار ہونے والے متوازی کمپیوٹر سے کسی طرح کم نہیں تھے۔ اس کامیابی سے حوصلہ پاکر مذکورہ سنٹر نے اگست ۱۹۹۱ء میں مکمل عصری ٹکنا اور متوازی پروگرامنگ سے لیس ۲۵۶ کمپیوٹرس تیار کئے۔

سنٹر فار ڈیولپمنٹ آف اڈوانسڈ کمپیوٹنگ ایسے اعلیٰ ترقی یافتہ متوازی کمپیوٹروں کی تیاری کے مقصد سے قائم کیا گیا جس کی کارکردگی ایک ہزار میگا فلوپس ہو۔ ہندوستان سی۔ ڈی اے سی نے اپریل ۱۹۹۳ء کے دوران کمپیوٹروں کی تیاری کا دوسرا مرحلہ شروع کیا تاکہ عمومی مقصد کے لئے متوازی کمپیوٹرس تیار کئے جاسکیں۔

سنٹر فار ڈیولپمنٹ آف اڈوانسڈ کمپیوٹنگ (سی ڈی اے سی) کے تیار شدہ متوازی کمپیوٹر کو "پرم" نام دیا گیا جس کے معنی سنسکرت میں "عظیم" کے ہیں اور ان کمپیوٹروں میں استعمال کی جانے والی پروگرامنگ کو "پارس" کہا گیا۔ (یعنی ایسا تخیلاتی پتھر جس کے چھونے سے لوہا سونا بن جاتا ہے) یہ کمپیوٹر بے حد مستحکم اور اعلیٰ معیاری تھا ۱۹۹۲ء-۹۳ کے دوران ان کمپیوٹرز کو مزید ترقی یافتہ بنایا گیا اور انھیں پرم-۸۶۰۰ کہا گیا جس میں اسک پروسیسر اینٹیل ٹکنالوجی پر مشین پرم-۸۱۰۰ کے نام سے مشہور ہوتے۔

پرم ۸۰۰۰ اور ۸۶۰۰ کی تیاری نے مذکورہ کمپیوٹنگ مرکز کو اس شعبہ میں نئے چیلنجس

مقابلہ کرنے کی صلاحیت عطا کی اور یہ ادارہ نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا میں مشہور ہو گیا

بعد ازاں سنٹر فار ڈیولپمنٹ آف اڈوانسڈ کمپیوٹنگ کی ٹیم نے پرم ...۹" بہ نام کرناٹک درج کیا نومبر ۱۹۹۴ء کے دوران واشنگٹن میں ان مشینوں کی ہارڈ ویر کی نمائش کی گئی جس کی بڑے پیمانہ پر ستائش کی گئی۔

مذکورہ سنٹر نے سوپر اسپارک پروسیسر کے استعمال کے ذریعہ ۳۲ نوڈ پرم ...۹ تیار کیا جس کی صلاحیت ۲ گیگا فلوپس ہے اس کمپیوٹر کی کارکردگی اعلیٰ پیمانہ پر مظاہرہ کیا گیا اس سسٹم کو سی ڈی اے سی "پونے" میں نصب کیا گیا۔ فی الوقت ریسرچ کرنے والے نیز فروغی کاموں میں مشغول افراد اس سے مستفید ہو رہے ہیں۔

سی ڈی اے سی نے پارس ...۹ کے ذریعہ ایک سہل اور لچکدار سافٹ ویر سسٹم رائج کیا ہے۔ اس سسٹم کو آنا دورک اسٹیشنوں کا ایک مجموعہ ایک بڑا متوازی پراسسنگ سسٹم سمجھا جاتا ہے

سی اے ڈی سی نے ایک ہمہ لسانی اور ملٹی میڈیا کمپیوٹریل ایجاد کیا ہے جسے آئی ڈی کارڈس اور موشن پکچرس کے شعبہ میں استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ اس سے یو نکس اور زرشن کو بھی مدلل رہی ہے تبتی اور جنوبی ایشیائی زبانوں کے فروغ کے لئے اس سسٹم سے استفادہ کیا جا رہا ہے

سنٹر فار ڈیولپمنٹ آف اڈوانسڈ کمپیوٹنگ نے ہندوستانی زبانوں کے رسم الخط کے فروغ کے لئے جسٹ ...۹ اے یس آئی سی چپ کی ایجاد میں کامیابی حاصل کر لی ہے جسٹ ٹرمنل در جسٹ کارڈ کی ایجاد سے ہمہ لسانی الفاظ کی ترتیب کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اس ایجاد کی وجہ سے مختلف زبانوں کے الفاظ کی کمپیوٹر پر ترتیب کے لئے سہولت پیدا ہوئی۔

سی ڈی اے سی نے تقریباً تمام ہندوستانی زبانوں پر کام کیا ہے اور اب اس ادارہ کا عملہ فارسی اور عربی بشمول اردو رسم الخط پر کام کر رہا ہے اس کے علاوہ مختلف زبانوں کی تعلیم و تربیت نیز ترجمہ کے لئے آلات بھی تیار کئے گئے ہیں

سنٹر فار ڈیولپمنٹ آف اڈوانسڈ کمپیوٹنگ نے وڈیو ورک پراڈکٹس کے شعبہ میں بھی کامیابی حاصل کی ہے دہلی اور پونے کے مراکز کے علاوہ ترویندرم اور تھانے میں سی ڈی اے سی کے ٹریننگ مرکز قائم کئے ہیں اس طرح سی ڈی اے سی ملک کو ترقی یافتہ کمپیوٹر ٹکنالوجی میں خود انحصار بنانے کے کام میں مصروف ہے۔



پروفیسر وی ایس رام مورتی

ہندوستان میں سائنس و ٹکنالوجی کا موقف

سائنس و ٹکنالوجی کی ترقی تقریباً تمام شعبہ جات جیسے زراعت، صنعت و حرفت، صحت و طبابت، تعلیم، مواصلات اور توانائی کو متاثر کرتی ہے اس لئے سائنس و ٹکنالوجی کے فروغ کو قومی پالیسی کا جز لاینفک بنایا گیا ہے۔ سائنس و ٹکنالوجی کی ترقی کے لئے حکومت کے عہد کا اظہار ۱۹۵۸ء میں منظور کی گئی سائنسی پالیسی قرارداد سے ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ صحت، سمندری سائنس، کمپیوٹرس، ٹکسٹائیل، الکٹرانکس، تعلیم، ادویات سازی اور دھاتوں سے متعلق امور سے متعلق ۱۹۸۳ء میں منظور کی گئی ٹکنالوجی پالیسی سے بھی اس شعبہ کی آن کے لئے حکومت کی دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے حالیہ فراخدلانہ معاشی پالیسی کے پس منظر میں ایک نئی ٹکنالوجی پالیسی بھی حکومت کے زیر غور ہے تاکہ ملک اس شعبہ میں خود مکتفی ہو جائے۔

پچھلے چالیس برسوں کی ہمہ جہتی کوششوں کی وجہ سے اب ملک میں سائنس و ٹکنالوجی کی ترقی کے لئے بنیادی سہولیات موجود ہیں۔ مختلف شعبوں میں فروغی سرگرمیوں کے لئے درکار ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے مخصوص محکمے قائم کیے گئے ہیں۔ محکمہ سائنس و ٹکنالوجی ایجادات کے فروغ اور صنعتی تحقیقات کے لئے بھرپور امداد مہیا کر رہا ہے تاکہ سماجی ضروریات کو پورا کیا جا سکے۔ اس کے علاوہ ماہرین کو تربیت فراہم کرنے کے لئے بین الاقوامی تعاون کی راہیں ہموار کی جا رہی ہیں۔

سائنس و ٹکنالوجی کے لئے فراہم کردہ وسائل کا ہر دو سال میں ایک دفعہ جائزہ لیا جاتا ہے اور ۱۹۷۳ء سے اس خصوص میں مربوط رپورٹس بھی شائع کی جا رہی ہیں۔ چنانچہ ۹۵-۱۹۹۴ء میں شائع کردہ حالیہ رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مذکورہ مدت کے دوران تحقیقاتی اور فروغی سرگرمیوں کے لئے ۲۱,۶۸ ملین روپیے مختص کیے گئے۔ جس میں مرکزی سرکار اور عوامی دائرہ کار صنعتوں کی جانب سے مشغول کی گئی رقم ۷۵.۵٪ خانگی شعبہ کا حصہ ۱۴.۴ فیصد اور ریاستی ۸.۶ فیصد ریاستی حکومتوں کی جانب سے فراہم کیا گیا۔ اس کے برخلاف ترقی یافتہ ممالک میں عموماً صنعتی سکٹر میں تحقیقاتی و فروغی سرگرمیاں

لئے مختص کی جانے والی رقم ۵۰ فیصد سے زیادہ ہوتی ہے۔ خانگی شعبوں میں تحقیقاتی و فروغی سرگرمیوں کے لئے ۵۳۰ یونٹس پبلک سکٹر میں ۱۷۱ اس کے علاوہ سائنس و صنعتی تحقیقات کی ۱۵۱ یونٹس موجود ہیں۔ ۹۵-۱۹۹۴ء کے دوران صنعتی شعبہ نے اپنی آمدنی کا صرف ۰.۶۵ تحقیقاتی فروغ کے لئے مختص کیا۔

بہرحال تحقیقاتی فروغ کے لئے خرچ کی جانے والی رقم میں اضافہ ہوا۔ لیکن مجموعی قومی پیداوار کے تناظر میں تحقیقاتی فروغ کے لئے خرچ کی جانے والی رقم میں کمی آتی ہے۔ ۹۱-۱۹۹۰ء تا ۱۹۹۴ء حالیہ قیمتوں کے لحاظ سے قومی پیداوار کا فیصد ۰.۶ ۱۵ تھا جبکہ اسی مدت کے دوران تحقیقاتی فروغ کے لئے خرچ کی جانے والی رقم ۱۴.۰۵ فیصد تھی اس طرح تحقیقاتی فروغ کے لئے خرچ کی جانے والی رقم کے مقابلے میں مجموعی قومی پیداوار تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ دفاع، زراعت، ماہی گیری اور صنعتی فروغ کے شعبوں پر تحقیقاتی فروغ کے اخراجات کا نصف خرچ کیا گیا۔

۹۵-۱۹۹۴ء کے دوران بنیادی تحقیقات کا تناسب ۱۸.۰۱، اطلاقی تحقیقات کا ۳۸.۰۸ تجرباتی فروغ کا ۳۱.۲ اور دیگر تحقیقات کا ۱۱.۹ فیصد تھا۔ ۹۵-۱۹۹۴ء کے دوران ۲۰۴ جامعات اور ۱۱ قومی اہمیت کے حامل ادارے اور ۶۱۷۷ کالجس ملک میں اعلیٰ تعلیم کے لئے کوشاں رہے۔ سائنس و ٹکنالوجی میں داخلوں کا تناسب ۲۹.۲ فیصد کے ساتھ رہا۔

سائنس و ٹکنالوجی کے تربیت یافتہ افراد کی تعداد ۱۹۷۹ء میں ۳۹۳،۴۹،۱ تھی جو ۱۹۸۹ء میں بڑھ کر ۹۳۰،۳۱،۲ ہوگئی۔ انجینئرنگ ٹکنالوجی کے فارغ یافتہ افراد کی تعداد میں ۸۹-۱۹۷۹ء کے دوران ۷.۰۱ فیصد اضافہ ہوا۔

سائنس و ٹکنالوجی سرگرمیوں کے لئے اس شعبہ کی افرادی قوت اہمیت کی حامل ہے۔ برائے تحقیقاتی اطلاقی افرادی قوت کے سروے کے مطابق ۱۹۹۶ء کے دوران ۶.۰۳۱ سائنس و ٹکنالوجی علوم سے لیس افراد کی ضرورت ہوگی۔ ۱۹۹۴-۹۵ء کے دوران جملہ ۱۴۹۴۹ تحقیقاتی مضامین شائع کئے گئے۔ اسی مدت کے دوران جملہ ۱۸۵۰ سائنسی کتب اور ۱۴۳۱ سائنسی رپورٹس بھی شائع ہوئیں۔ ۹۴-۱۹۹۳ء کے پیٹنٹ حقوق کے لئے [illegible] ملک

(باقی صفحہ ۴۵ پر)

ایم ڈی سکھامنی

آئی آر ایس ۔ ایک سی

ملک کے لئے قابل فخر مصنوعی سیارہ

بھارت کے لئے خلائی پروگرام نے 1960 کے دہے میں اپنے آغاز کے بعد سے عظیم کامیابی حاصل کی ہے جس کا موازنہ خلائی ٹکنالوجی کے حامل دولت مند ممالک سے کیا جاسکتا ہے۔ بھارت نے دکھا دیا ہے کہ وہ قابل اعتماد طریقے اور کم اخراجات سے خود اپنے ریموٹ سینسنگ سٹلائیٹ چھوڑ سکتا ہے۔ یہ ریموٹ سینسنگ مصنوعی سیارے دنیا کے اعلیٰ ترین اور پیچیدہ ترین مصنوعی سیاروں میں شمار کیئے جاسکتے ہیں اور اس پر طرہ یہ کہ یہ سیارے امریکہ اور یوروپی ممالک کے مقابلے میں ایک تہائی لاگت پر خلاء میں چھوڑے گئے ہیں۔ بھارت نے ریموٹ سینسنگ کے ڈاٹا حاصل کرنے، اس کی پروسیسنگ اور تجزیہ کرنے میں بھی کافی مہارت حاصل کرلی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملکی اور بین الاقوامی استعمال کنندگان اس کے ڈاٹا پروڈکٹس کی عمدہ کوالٹی کی بڑی قدر کرتے ہیں۔ بھارتی ریموٹ سینسنگ سٹلائٹس (آئی آر ایس) قدرتی وسائل کے انتظام کے قومی نظاموں کا ایک اہم جزو ہیں اور وہ ملک کے قدرتی وسائل کے انتظام کے لئے مسلسل اور عملی ریموٹ سینسنگ ڈاٹا کی خدمات فراہم کرکے ایک اہم قومی نصب العین کی تکمیل کی کوشش کررہے ہیں۔

بڑھتے قدم :۔ پہلی نسل کے آئی آر ایس مصنوعی سیاروں کا ڈیزائن بنانے انہیں تیار کرکے خلاء میں چھوڑنے اور مدار میں ان کی عمدہ کارکردگی کی صورت میں حاصل ہونے والی کامیابی کے بعد بھارت کے قدم رکے نہیں ہیں۔ وہ اب دوسری نسل کے ریموٹ سینسنگ مصنوعی سیاروں سے بہتر اور اضافی ڈاٹا سروسیز فراہم کرنے کی کوشش کررہا ہے آئی آر ایس ایک سی جدید ترین سویلین ارتھ آبزرویشن سٹلائٹ ہے یہ مصنوعی سیارہ 28 ڈسمبر 1995ء کو خلاء میں چھوڑا گیا تھا۔ اسے زمین کا چکر لگانے میں صرف 93 منٹ لگتے ہیں۔ کرہ ارض کی پوری سطح کا سروے یہ صرف 24 دنوں میں کرتا ہے ہندوستانی ارتھ اسٹیشن سے نظر نہ آنے والے

قوں سے ڈاٹا اکٹھا کرنے کے لئے اس میں ایک "آن بورڈ ٹیپ ریکارڈر" کی سہولت موجود
ہے جو ڈاٹا ریکارڈ کر کے دنیا کے کسی بھی حصے میں بھیج سکتا ہے۔

اسٹیٹ آف دی آرٹ ٹکنالوجی: آئی آر ایس۔ ایک سی سٹلائیٹ میں
ویر لینے والے تین نہایت اعلیٰ درجے کے سینسر نصب ہیں۔ ان میں سے ایک پین کرومیٹک کیمرہ ہے
5.8 ایم کے بہت بلند فضائی ریزولیوشن کا ڈاٹا فراہم کر سکتا ہے۔ سٹلائیٹ میں لائینئر امیجنگ
ر سلف اسکیننگ (ایل آئی ایس ایس ۱۱) سینسر بھی لگا ہوا ہے جو چار بینڈس پر جمع کیا ہوا
اٹا فراہم کرتا ہے۔

تیسرا ریموٹ سینسنگ سینسر جو اس سٹلائیٹ میں لگا ہوا ہے، وائڈ فیلڈ سینسر (ڈبلیو آئی
ایس) کہلاتا ہے جو دو خاص بینڈس پر ڈاٹا اکٹھا کرتا ہے۔ یہ 810 کلومیٹر کے وسیع تر
اراضی کا احاطہ کر سکتا ہے۔ ڈاٹا ڈیجیٹل (عددی) اور فوٹوگرافک میڈیا کے ذریعہ مہیا
جا سکتا ہے۔

ٹھوس فائدے: 1988ء سے بھارت اپنی ضرورتوں کے مطابق پانچ
یموٹ سینسنگ سیٹلائٹ تیار کر چکا ہے جن سے ہندوستانی عوامی خدمات کو بہت فائدہ پہنچا ہے
ٹلائیٹ کی فراہم کی ہوئی تصاویر سے ملک میں پانی والے مقامات کا پتہ لگانا بہت آسان ہو گیا
سیٹلائیٹ کی تصاویر کی مدد سے محققین راجستھان میں 92 فیصد کامیابی کے ساتھ 18
وں کا پتہ لگا چکے ہیں جب کہ یہ کام روایتی طریقوں سے کرنے میں 40 فیصد کامیابی حاصل ہوتی تھی
ریموٹ سینسنگ سیٹلائیٹس نے جنگلات اور دیگر اراضی کے نقشے بنانے میں بہت اہم رول
کیا ہے ریموٹ سینسنگ ٹکنالوجی کی مدد سے پورے ملک کے جنگلات کا نقشہ بنانے میں سات
ل لگے، جب کہ یہی کام اگر سطح زمین پر سروے کے ذریعہ کیا جاتا تو 50 سال لگتے۔ ریموٹ
نگ سیٹلائٹس سے قحط زدہ علاقوں کا پتہ لگانے اور عوام کو امداد پہنچانے، معدنی ذخائر کی
ش نیز فصلوں اور پیداوار کے انداز سے مرتب کرنے میں بھی بڑی مدد ملتی ہے۔

یہ دو دہائیوں کی سخت محنت کا نتیجہ تھا کہ بھارت نے دسمبر 1995ء میں آئی آر ایس ایک سی اور
رچ 1996ء میں آئی آر ایس۔ پی 3 خلاء میں چھوڑنے میں کامیابی حاصل کی اس طرح بھارت ان
ندہ ملکوں کی صف میں شامل ہو گیا ہے جو اپنے خلائی مقاصد کی تکمیل کرنے کی درکار صلاحیت رکھتا ہے بھارت
ید گیارہ مصنوعی سیارے خلاء میں چھوڑنے کا ارادہ رکھتا ہے ▬

ہرجیت سنگھ

ماحولیات کے تحفظ میں غیر سرکاری تنظیموں کا حصہ

ساتویں دہے کے دوران یہ محسوس کیا گیا کہ ماحولیات کے تحفظ کے لئے حکومت کا کوئی بھی اقدام کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ سماجی اقدار سے ہم آہنگ نہ ہو۔ ماحولیات کے لئے طرزِ زندگی کو تبدیل کرنا ایک پیچیدہ اور سیاسی طور پر مشکل عمل ہے اس امر میں کامیابی اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جبکہ عوام انفرادی طور پر حکومت کی کوششوں کا ساتھ دیں۔ تاہم ماحولیات کے تحفظ کے سلسلہ میں عوام میں آگہی کو بڑی اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔

ماحولیات کے تحفظ کے ضمن میں مختلف گروہوں اور عوام میں راتوں رات آگہی نہیں پیدا کی جا سکتی نہ ہی وقتِ واحد میں اس کا حصول ممکن ہے گروہی سطح پر عوام کے ایک خاص طبقہ میں ماحولیات کے تحفظ کے لئے مسلسل خصوصی پروگراموں کی ضرورت ہے اس مقصد کے حصول کے لئے ایک عام آدمی تک رسائی کے لئے غیر سرکاری تنظیموں اور دیگر کمیونٹی گروپس کا تعاون ناگزیر ہے۔

ماحولیات کی برقراری کے لئے آلودگی کی روک تھام سے مختلف حکمت عملی کو لاگو کرنے کے لئے غیر سرکاری تنظیمیں اور عوامی جذبہ سے بھرپور اشخاص اہم رول ادا کر سکتے ہیں اس امر کو تسلیم کرتے ہوئے کہ ماحولیات کے تحفظ کے لئے عوامی سطح پر صرف غیر سرکاری تنظیمیں ہی تبدیلی لا سکتی ہیں وزارت نے کئی اہم پروگرام ترتیب دیئے ہیں جنہیں غیر سرکاری تنظیموں اور دیگر رضاکارانہ تنظیموں کے تعاون سے لاگو کیا جا رہا ہے۔

نیشنل اینوائیرمنٹ اویرنیس کیامپینس (این۔ ای۔ اے۔ سی) NEAC کے تحت عوام میں ماحولیات کی نسبت بیداری پیدا کرنے کے لئے ایک قومی پروگرام شروع کیا گیا ہے۔

۱۹۸۶ء کے دوران جب مذکورہ مہم شروع کی گئی تھی اس میں ۱۲۷ غیر سرکاری اور دیگر تنظیموں نے حصہ لیا تھا۔ ۹۶-۱۹۹۵ء میں ۲۵۰۰ سے زائد تنظیمیں اس مہم سے وابستہ ہو گئیں۔ ہر سال مختلف

غیر سرکاری تنظیموں کی جانب سے ماحول کی برقراری کے سلسلہ میں حکومت کو زیادہ سے زیادہ تجاویز وصول ہورہی ہیں جس سے اسکیم کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ این ای اے ایس مکمل طور پر غیر مرکوز مہم ہے۔ اس مہم کا اصل مقصد غیر سرکاری تنظیموں اور رضا کارانہ گروپس کی ہمت افزائی کرنا ہے غیر سرکاری تنظیموں کو ماحولیات کے تحفظ کے سلسلہ میں کسی بھی پہلو کو منتخب کرکے اسے مقبول بنانے کی آزادی دی گئی ہے مہم کی سرگرمیوں کی نگرانی اور اس کا جائزہ لینے کا کام بھی غیر سرکاری تنظیموں کے سپرد کیا گیا ہے۔

ماحولیات کے تحفظ کی سرگرمیوں میں حصہ لینے والے حقیقی لوگوں کی ہمت افزائی کے لئے ۱۹۹۲ء میں " پیریاورن واہنی " کی ہمت افزائی کی گئی اور ماحولیات کلب قائم کیے گئے۔ اور پیریاورن واہنی اسکیم سے وابستہ لوگوں کی جنگل بانی اور درختوں کی دیکھ بھال سے متعلق امور میں ہمت افزائی کی گئی۔ پانی کے معیار، آب وہوا اور گاڑیوں سے پیدا ہونے والی آلودگی سے متعلق معلومات فراہم کریں۔

اگرچہ مذکورہ اسکیم ہندوستانی باشندوں کے لئے شروع کی گئی لیکن غیر سرکاری تنظیمیں واہنی سے وابستہ ارکان کو تربیت اور جانکاری فراہم کرتی ہیں۔ اکثر غیر سرکاری تنظیموں کے کارکن واہنی کی ممبر شپ قبول کرتے ہیں۔ اضلاع کی نشاندہی کی گئی ۱۸۴ اضلاع کی نشاندہی سے اس اسکیم خاصی کامیابی حاصل ہوئی۔ وہاں پیریاورن واہنی قائم کی جاسکیں۔

خاص خاص علاقوں کے مختلف مدارس میں ایکو کلبس کے قیام کے لئے غیر سرکاری تنظیموں اور دیگر پیشہ ورانہ اداروں کو مالی اور ضروری تکنیکی امداد فراہم کی جاتی ہے ماحولیات کے تحفظ کے سلسلہ میں طالب علموں میں بیداری پیدا کرنے اور انھیں ایسی ہی کوششیں شروع کرنے پر آمادہ کرنے کے علاوہ یہ اسکیم غیر سرکاری تنظیموں اور مدارس کے درمیان خود انحصاری کا ایک رشتہ قائم کرتی ہے جس کے نتیجہ میں ماحولیاتی تحفظ کے کام کو آگے بڑھانے کے لئے ایجنسیوں کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا ہے ابھی تک ۴۰۰،۲ ایکو کلبس قائم ہوچکے ہیں۔ (ENVIS) ایک غیر مرکوز اطلاعاتی اسکیم ہے جس کا مقصد ماحولیات کے بارے میں ہر قسم کی اطلاعات اور معلومات کو ماحولیات کے تحفظ کے لئے کام کرنے والوں تک پہنچانا ہے ملک کے مختلف باوقار سائنسی اداروں، یونیورسیٹیوں اور غیر سرکاری تنظیموں کے دفاتر میں ENVIS مراکز قائم کئے گئے ہیں ENVIS مراکز نے ماحولیات کے تحفظ کے لئے کام کرنے والی ملک بھر کی غیر سرکاری تنظیموں کی ایک ڈائرکٹری ترتیب دی ہے اس میں تقریباً ۱۲۰۰ غیر سرکاری تنظیموں کے ناموں کو شامل کیا گیا جو مالیات کی برقراری کے مختلف شعبوں میں سرگرم عمل ہیں۔

عوام میں ماحولیات کی برقراری کے لئے بیداری پیدا کرنے اور ماحولیات کے اہم شعبوں میں

تحقیقات اور تربیت فراہم کرنے کی غرض سے ملک کی باوقار یونیورسٹیوں اور غیر سرکاری تنظیموں کے اداروں میں پانچ ماہرانہ مراکز قائم کئے گئے ہیں۔ مذکورہ پانچ مراکز میں سے تین مراکز غیر سرکاری تنظیموں کی جانب سے قائم کئے گئے ہیں ان تین مراکز میں سے دو مراکز خاص طور پر عوام میں ماحولیات کے سلسلہ میں بیداری پیدا کرنے کے لئے قائم کئے گئے ہیں۔ یہ مراکز احمد آباد اور چینائی میں عوام سے اعلیٰ پیمانے پر تال میل قائم کئے ہوئے ہیں۔

مذکورہ مراکز کے قیام کا مقصد بچوں، نوجوانوں اور فیصلہ ساز افراد اور عام لوگوں میں ماحولیات کے بارے میں بیداری پیدا کرنا ہے۔

سنٹرل پیولشن بورڈ (سی پی سی بی) اس امر کو تسلیم کرتے ہوئے کہ غیر سرکاری تنظیمیں نچلی سطح پر عوام میں بیداری پیدا کرنے میں اہم رول ادا کرتی ہیں ایک ایسے نٹ ورک کے قیام کے لئے کوشاں ہے جس میں یہ تنظیمیں عوام اور سرکار کے درمیان ماحولیات کے فروغ کے سلسلہ میں ایک پل کا کام دے سکیں۔

آلودگی کی روک تھام کے سلسلہ میں سنٹرل پیولشن بورڈ میں غیر سرکاری تنظیموں کی شراکت کو فروغ دینے کے لئے ایک "سیل" قائم کیا گیا ہے۔

پانی کو آلودگی سے بچانے کی خاطر سی پی سی بی نے آبی جانچ کا ایک KIT تیار کیا ہے جسے منتخبہ غیر سرکاری تنظیموں، مدارس اور کالجوں کو مفت سربراہ کیا جاتا ہے یہ KIT اس شرط پر سربراہ کیا جاتا ہے کہ مذکورہ ادارے مقامی عوام اور طلباء کو آبی جانچ کی سرگرمیوں میں شامل کریں۔

گنگا ایکشن پلان مرحلہ کے تحت تین پروگرام تشکیل دیئے گئے ہیں۔

۱) عوامی بیداری

۲) عوامی اشتراک اور

۳) ایکشن پلان کی کامیابی کے لئے عوام کا راست تعاون۔

گنگا ایکشن پلان کی کامیابی کے لئے زائرین، طلباء، غیر طلباء، نوجوانوں اور غیر سرکاری تنظیموں کا تعاون حاصل کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں SULABH INTERNATNIAL نامی ایک غیر سرکاری تنظیم کی خدمات سے استفادہ کیا جا رہا ہے۔

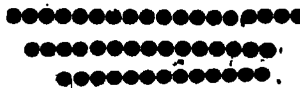
وزارت ماحولیات و جنگلات نے مربوط جنگل بانی، ماحولیات فروغ کے پراجکٹس، غیر چوبی جنگلاتی پیداوار نیز طبی افادیت کے حامل درختوں کی پیداوار کے سلسلہ میں (NAEB) قائم

وزارت کے اس اقدام میں غیر سرکاری تنظیموں کی شمولیت کے امکانات پائے جاتے ہیں۔
غیر سرکاری تنظیموں کو مختلف پراجکٹس کو لاگو کرنے کے لئے امداد فراہم کی جارہی ہے اس کے علاوہ NAEB مرکزی امداد سے جاری اسکیموں کی عمل آوری کے لئے بھی غیر سرکاری تنظیموں کا تعاون حاصل کررہا ہے مذکورہ تمام خصوصی اسکیموں اور پروگراموں کی عمل آوری میں غیر سرکاری تنظیموں اور عوام کا تعاون حاصل کیا جارہا ہے اس کے علاوہ حیاتیاتی تحفظ، آبی گذرگاہوں اور جھیلوں کے تحفظ، شیروں اور ہاتھیوں کے تحفظ، جنگل بانی اور عوامی بیداری کے پروگراموں کے سلسلہ میں غیر سرکاری تنظیموں کی خدمات سے استفادہ کیا جارہا ہے۔

(بقیہ: ہندوستان میں سائنس و ٹکنالوجی .... صہ ۳۹ سے آگے)
نے ۲۰۶ر۲ درخواستیں داخل کیں جس میں سے ہندوستان کی ۲۶۶ر۱ درخواستیں تھیں جن میں ۸ر۲۵ فیصد درخواستیں دہلی اور مہاراشٹرا سے، ٹاملناڈو سے ۲۰۸ فیصد، مغربی بنگال سے ۷ فیصد درخواستیں آئیں۔ ان چاروں ریاستوں سے موصول درخواستیں پورے ملک سے وصول ہونے والی درخواستوں کا ۴ر۷۳ فیصد تھیں اسی دوران ۱۹۲ و ۸ پراڈکٹس تیار کیئے گئے۔

(بقیہ "صف شکن کے نام کھلا خط" صہ ۴۵ سے آگے)
مضامین / خوشبو کا سفر کے مطالعہ اور رئیس اختر کی شاعری کا مہذبانہ اور شریفانہ جواب دیں۔
"رشتوں کی مہک" کا محاکمہ مزید پڑھیں اور شریفانہ جواب دہی کے لئے تیاری کریں۔ کیونکہ ابھی تو "تلمیح کام و دہن کی آزمائش" باقی ہے۔

فقط
غنی نعیم





دُنیا بہت حسین ہے مگر دیرپا نہیں
صرف اک خدا کی ذات ہے جس کو فنا نہیں

اِک برگ جھڑ کے شاخ سے یہ درس دے گیا
دُنیا کے گلستاں میں کسی کو بقا نہیں

کیسی ہوا چلی ہے یہ دُنیا کے باغ میں
پھولوں کا اژدھام ہے بُوئے وفا نہیں

اک ایسے آدمی سے ہیں ہم طالب وفا
جس کی نظر میں وقعت جنس وفا نہیں

اُس کا خیال میری رگِ جاں کے پاس ہے
مجھ سے جدا بھی ہو کے وہ مجھ سے جدا نہیں

اے دل غموں کی دھوپ میں ہونا نہ بیقرار
ایسی گھڑی حیات میں رہتی سدا نہیں

آنکھوں سے ڈھل گئے تو سکوں دل کو مل گیا
غم خوار آنسوؤں کی طرح دوسرا نہیں

اک جنس ہی سکون کی نایاب ہے اے دوست
ورنہ تمہارے پاس تو سب کچھ ہے کیا نہیں

جن کا خیال تجھ کو ستاتا ہے روز و شب
انور ترا خیال تو اُن کو ذرا نہیں

اکبر یوسفی

غزل

پا بہ زنجیر امنگوں کا سفر آج بھی ہے
صحنِ گلشن میں وہی رقصِ شرر آج بھی ہے

وہی جذبہ ہے وہی پیاس، وہی جبرِ یزید
دار کی زد میں ہر اک لختِ جگر آج بھی ہے

ظلمتِ شب کی سیاہی کے ستم گر سائے
اُن سے لڑتی ہوئی معصوم سحر آج بھی ہے

پُر سکوں لگتا ہے اوپر سے سمندر لیکن
دل کی دنیا میں وہی مد و جزر آج بھی ہے

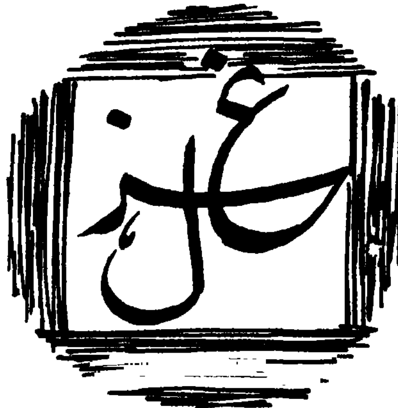
آج بھی کیوں ہے اُجالوں پہ اندھیرے حاوی
کہکشاں آج بھی ہے شمس و قمر آج بھی ہے

جس کے دامن پہ فرشتوں نے جھکائی تھی جبیں
سر بہ سجدہ وہ گنہگار بشر آج بھی ہے

کچھ نہیں بدلہ کہیں بھی نہیں بدلہ اکبر
اپنی تقدیر سے مجبور بشر آج بھی ہے

غزل

سعید اللہ خاں افق براری



بھولا ہوا سبق تھا مرا یاد آ گیا
غم اس قدر ملے کہ خدا یاد آ گیا

میری تو التجا تھی فقط اک نگاہ کی
کیوں رو دیئے حضور کو کیا یاد آ گیا

وہ درد، وہ تڑپ، وہ تمنا وہ آرزو
سب کچھ محبتوں کے سوا یاد آ گیا

طوفاں کی حیثیت مجھے معلوم کب ہوئی
جب میرے ناخدا کو خدا یاد آ گیا

مرکز سے اپنے دل بھی گریزاں رہا مگر
مسجد سے جب بھی آئی صدا یاد آ گیا

لَو تھرتھرا رہی تھی چراغِ حیات کی
فانوس بن گئی تھی ہوا یاد آ گیا

مرغِ سحر خدا تجھے عمرِ دراز دے
بر وقت مجھ کو وقتِ دعا یاد آ گیا

کیسے بھلاؤں بابری مسجد کا واقعہ
میں جب سجدہ ریز ہوا یاد آ گیا

اک شخص کی نمازِ جنازہ میں تھا شریک
منزل کا اپنی مجھ کو پتا یاد آ گیا

میں بھول ہی گیا تھا کسی کے وفا کا خواب
یاد آ گیا افق بخدا یاد آ گیا

جلد ۱۳

شمارہ ۵

مئی سنہ ۱۹۹۷ء

قیمت دس روپے

ماہنامہ

شاداب

حیدرآباد

زرِ تعاون

	سالانہ	دو سال کیلئے	تاحیات
ہندوستان	۱۰۰ روپے	۱۸۰ روپے	۱۵۰۰ روپے
خلیجی ممالک	۳۰۰ "	۵۵۰ "	۴۰۰۰ "
امریکہ	۵۰ ڈالر	۹۰ ڈالر	۹۰۰ ڈالر
انگلستان	۳۰ پونڈ	۵۰ پونڈ	۵۰۰ پونڈ
پاکستان	۲۰۰ روپے	۳۵۰ روپے	۴۰۰۰ روپے

ترسیل زر کا پتہ ماہنامہ شاداب ۱۴۷-۵-۱۱ ریڈ ہلز حیدرآباد

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلیشر محمد قمرالدین صابری نے نخیل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپوا کر دفتر شاداب ۱۴۷-۵-۱۱ ریڈ ہلز حیدرآباد سے شائع کیا۔

فہرست

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی

اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

جنوبی ہند کی معروف دینی درسگاہ، جامعہ اسلامیہ بھٹکل کے استاد مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی کی تصنیف کردہ کتاب "سیرت ٹیپو سلطان شہید" کے رسم اجراء کے موقع پر مولانا نے اپنے تاریخی ذوق اور تاریخ اسلام کے مطالعہ کی روشنی میں ایک تاریخ ساز اور اہم تقریر فرمائی افادۂ عام کی غرض سے ہم حضرت مولانا کی یہ تقریر ٹیپ سے نقل کی اور اصلاح و ترتیب کے بعد شائع کر رہے ہیں ——— (ادارہ)

حضرات! آپ میں سے بہت سے حضرات کو اس کا علم ہوگا کہ تاریخ نویسی میرا خاندانی موضوع بلکہ میراث ہے ہندوستان ہی نہیں! عالم اسلام کے ایک عظیم مورخ مولانا سید عبدالحیؒ نے پہلی صدی ہجری سے لیکر اپنی وفات کے وقت تک (۱۹۲۳ء) ہندوستان کے ساڑھے تین ہزار مشاہیر کا تذکرہ لکھا۔ اس سے پہلے ان کے والد ماجد مولانا حکیم سید فخر الدین خیالیؒ نے مہر جہاں تاب لکھی۔ تاریخ اسلام میں اعیان اسلام، فاتحین عظام، کشور کشا اور ملک کی قسمت بدل دینے والے اسلامی فاتحین کی تاریخ ہمارا خاص موضوع رہی، اس سلسلہ میں بعض اسلامی ملکوں کے فاتحین کے تذکرے ہم نے پیش بھی کئے۔ خاص طور سے سلطان صلاح الدین ایوبی کے کارناموں کا تذکرہ ہم نے اپنی کتاب تاریخ دعوت و عزیمت کے پہلے حصہ میں لکھا۔ وہی سلطان صلاح الدین ایوبی جنھوں نے بیت المقدس کو بازیاب۔ صلیبیوں کو شکست دی، پھر الظاہر بیبرس اور سیف الدین قطز نے ان تاتاریوں کو شکست دی جن کے متعلق یہ بات ضرب المثل بن چکی تھی کہ اگر تم سے کہا جائے کہ تاتاریوں کو شکست ہوگئی تو اس کو نہ

جاتا تھا۔ لیکن یہ تاتاری نہ صرف شکست کھا گئے بلکہ پوری تاتاری قوم مسلمان ہو گئی اور سو فیصدی اسلام میں داخل ہو گئی۔

حضرات! شام کے فاتح حضرت ابوعبیدہ و خالد بن ولید۔ عراق کے فاتح سعد بن ابی وقاص۔ فاتح مصر حضرت عمرو بن العاص۔ فاتح اندلس طارق بن زیاد، ہندوستان کے فاتح محمود غزنوی صلیبیوں اور تاتاریوں کو شکست فاش دینے والے سلطان صلاح الدین ایوبی اور الظاہر بیبرس اور سیف الدین قطز، فاتح قسطنطنیہ محمد الفاتح اور سلطان ٹیپو وغیرہ جیسے مجاہدین اور کشور کشاؤں کی زندگی کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے ان سپاہیوں میں مشترک طور پر جو صفات پائی جاتی تھیں وہ پانچ صفات یہ ہیں، ایک دینی حمیت و غیرت، دوسرے فراست و دور اندیشی، تیسرے شجاعت و بلند ہمتی، چوتھے استقامت، پانچویں شوق شہادت۔ اللہ تعالیٰ نے یہ پانچوں صفات سلطان ٹیپو کو عطا فرمائی تھیں۔

فراستِ ایمانی: یہ دینی غیرت و حمیت ہی تھی جس نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے یہ تاریخ ساز جملہ کہلوایا تھا "اینقص الدین وانا حیٌ" (کہ میرے جیتے جی دین میں کیسے کتر بیونت ہو سکتا ہے) یہ بات غور کرنے کی ہے لوگ تاریخ کے واقعات پڑھ کر سرسری طور سے گذر جاتے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جزیرۃ العرب کے مشرقی حصہ میں ارتداد کی آگ تیزی سے پھیل گئی ان لوگوں نے کہا کہ ہم اسلام کے دوسرے ارکان پر تو عمل کریں گے، حج فرض ہے، وہ ہم کریں گے، روزے بھی رکھیں گے، لیکن زکوٰۃ اس وقت کے لئے تھی جب اس کی ضرورت تھی۔ اب ہم زکوٰۃ نہیں ادا کریں گے۔ ایسے نازک موقع پر حضرت ابوبکر صدیق رضی کی زبان سے وہ انقلابی اور تاریخی جملہ نکلتا ہے جس نے پوری فضا بدل کر رکھ دی وہ سامنے آئے۔ اور انہوں نے کہا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم تخت خلافت پر مدینے میں بیٹھے رہیں اور عزت کی زندگی گزاریں اور ہمارے ہوتے ہوئے دین میں کمی ہو جائے آج زکوٰۃ کو لوگوں نے روکا ہے کل حج کے لیئے کہیں گے کہ دور کے لوگوں پر حج فرض نہیں ہے جیسا کہ حضرت سید احمد شہیدؒ کے زمانے میں ہوا تھا کہ بعض علماء نے فتویٰ دے دیا کہ حج کا راستہ مامون نہ ہو سکا اور درمیان وسیع سمندر حائل

ہونے کی وجہ سے حج فرض نہیں ہے۔ حضرت سید صاحبؒ کی دینی غیرت و حمیت اس کو کب گوارا کر سکتی تھی انھوں نے حضرت شاہ محمد اسمٰعیل شہیدؒ اور مولانا عبدالحیؒ سے خطوط لکھوائے اور اس موضوع پر وعظ کہلوائے، آپ نے اعلان فرما دیا کہ ہم نے حج کا ارادہ کیا ہے جو ہمارے ساتھ حج کے لئے جانا چاہے وہ چل سکتا ہے، ہمارے ذمہ اس کے تمام اخراجات ہوں گے چنانچہ بارہ سو[۱۲۰۰] شناس حج کے لئے تیار ہو گئے۔ یہ حضرات رائے بریلی سے کلکتہ گئے وہاں سے گیارہ یا سترہ جہازوں میں حج کے لئے روانہ ہوئے۔ پھر اس کے بعد سے کسی کو جرأت نہیں ہوئی کہ وہ فتویٰ دیتا، اللہ تعالیٰ نے اس فریضہ کو محفوظ فرما دیا اور ہمیشہ کے لئے راستہ کھل گیا یہی دینی غیرت اور حمیت سلطان صلاح الدین ایوبی، الظاہر بیبرس، سیف الدین قطز، سلطان محمد الفاتح، اورنگ زیب عالمگیر اور سلطان ٹیپو میں تھی۔

کلکتہ ہی کے دوران قیام سلطان ٹیپو کے خاندان کی شہزادیوں اور شہزادوں نے سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی، اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے عزیزی مولوی محمد الیاس ندوی سلمہٗ کو کہ انھوں نے ہمارے خاندان اور سلطان ٹیپو کے درمیان تعلقات کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے اور بتایا ہے کہ حضرت شاہ سعیدؒ، شاہ ابواللیثؒ اور سید نعمانؒ سے سلطان ٹیپو اور ان کے خاندان کے درمیان بیعت کا تعلق تھا اسی وجہ سے شرک و بدعات اور غیر اسلامی رسوم و رواج کا خاتمہ ہو گیا تھا۔

دینی غیرت و حمیت : حضرات اسلام کے مجاہدین اور فاتحین میں جو دوسری صفت مشترک طور پر پائی جاتی ہے وہ ہے فراست ایمانی یا دوراندیشی بھی یہ کہنا کہ اصل دشمن کون ہے اور خطرہ کہاں سے آرہا ہے مثلاً ہندوستان ہی کو لے لیجئے، حضرت سید صاحبؒ نے انگریزوں کے خطرات کو اچھی طرح سمجھا، حالانکہ وہ رائے بریلی جیسے دور دراز علاقے میں پیدا ہوئے جہاں دینی ماحول تھا قال اللہ و قال الرسول کے علاوہ کوئی آواز نہیں ہوتی تھی، رائے بریلی میں بیٹھ کر سید صاحبؒ نے مہاراجہ گوالیار کو خط لکھا " این بیگانگان بعید الوطن و این تاجران متاع فروش ملوک زمین و زمان گردیدند" یہ غیر ملکی، یہ سودا بیچنے والے اور دور دراز شہروں کے رہنے والے تاجران متاع فروش ہمارے ملک کے مالک بنتے جا رہے ہیں۔ آ گئے،

آپ اور ہم مل کر پہلے ان کا مقابلہ کریں اور اس خطرہ سے اپنے ملک کو محفوظ کریں پھر؛
ہوگا کہ کون سی ذمہ داری کس کے سپرد کی جائے۔

تاریخ نویسوں اور مورخوں نے اس حالت اور ماحول کو نظر انداز کر دیا ہے
یہ خط لکھا گیا تھا آپ اس وقت کا خیال کیجئے' ماحول اور تربیت کا اندازہ کیجئے۔
کا جو طرز تھا اور جو دعوت تھی پھر اس کا خیال کریں کہ سید صاحب نے کس فراست سے'
انگریزوں کا اصل خطرہ ہمارے سروں پر منڈلا رہا ہے وہ اس ملک پر قابض ہو جائیں
اس کے بعد اسلام بھی خطرہ میں پڑ جائے گا' پھر اس کے یہاں کے تمام مذاہب اور تہذیبیں
پڑ جائیں گی۔ یہ حقیقت ہے کہ سلطان ٹیپو کی یہ فراست ایمانی تھی اس لئے اس کو اولیت
اس نے اس خطرہ کی گہرائی کا اندازہ لگایا اور سب سے زیادہ بلند ہمتی اور دور بینی سے'
طرف تو سلطان ترکی کی حمایت حاصل کرنی چاہیئے۔ دوسرے یہ کہ نپولین کی مدد لینی چاہیئے'
کے لئے سلطان ٹیپو نے اپنے آدمی بھیجے' اس واقعہ کی تفصیلات عزیزی محمد الیاس ندوی'
میں ملیں گی آپ تصور کیجئے کہ ایک محدود علاقے اور محدود اثر و اختیار کا مالک انسان ایسا سو
اور اتنی دور بینی اور بلند ہمتی سے کام لے سکتا ہے بلکہ ہم اس کو فراست ایمانی اور الہام ربا
کر سکتے ہیں جس سے سلطان ٹیپو شہیدؒ کو اللہ تعالیٰ نے نوازا تھا اس کی دینی عزت و حمیت
بڑا محرک ثابت ہوئی۔ یہ دینی عزت و حمیت اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت ہے' یہ ہر ایک
ہوتی اور نہ ہر فاتح و قائد اور جرنیل میں ہوتی ہے یہ اللہ تعالیٰ کا خاص عطیہ ہے صحابہ کرام سے منتق

شجاعت = تیسری صفت شجاعت ہے کہ جم کر مقابلہ کرے' اپنی جان
آبرو کی بھی پرواہ نہ کرے نہ اپنے خاندان' اپنے رفقاء اور نہ ا
کی پرواہ کرے۔ یہ صفت تمام اسلامی قائدین و فاتحین میں مشترک طور پر پائی جاتی ہے
پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر معمولی شجاعت کا انھوں نے مظاہرہ کیا اور جنگ کا پانسہ
سلطان ٹیپو شہید نے بھی مسلمان فاتحین و مجاہدین کی طرح بڑی دلیری و شجاعت سے کام لیا' اتنی
اس کی دشمنوں کے دلوں پر ہیبت بیٹھی ہوئی تھی کہ انگریزوں کو یقین نہیں آرہا تھا کہ سلطان شہیدؒ ہو چکا۔

انگریز جنرل ہارس کو اطلاع ملی تو اس نے کہا کہ میں خود جاکر دیکھوں گا۔ چنانچہ اس نے اس لاش کو دیکھ اور کہا کہ آج سے ہندوستان ہمارا ہے۔

استقامت = چوتھی صفت جو انسان یا اسلامی قائدین و مجاہدین میں پائی جاتی تھی وہ شجاعت کے ساتھ استقامت کی صفت ہے کہ صرف شجاعت ہی کافی نہیں' اس کے ساتھ استقامت بھی ضروری ہے۔ برابر شجاعت کا مظاہرہ کرنا اس پر جمے رہنا۔ اس کے جو مصائب ہوتے ہیں اور جو اثرات و نتائج برآمد ہوتے ہیں ان سب کو برداشت کرنا' یہ ہے استقامت کی بات۔

شوقِ شہادت = پانچویں اور آخری صفت جو تمام مسلمان قائدین و مجاہدین میں مشترک تھی اور وہ اللہ تعالیٰ کا خاص الخاص عطیہ یا انعام ربانی ہے اور ہر ایک کو وہ نہیں دی جاتی اور نہ ہی اس خلعت سے ہر ایک کو سرفراز کیا جاتا ہے وہ شوقِ شہادت ہے۔ اللہ تعالیٰ جس کے لئے فیصلہ فرماتے ہیں اس کو یہ شہادت کی دولت نصیب ہوتی ہے یہ ضروری نہیں کہ تمام فاتحین کو شہادت کی نعمتِ عظمیٰ سے سرفراز کردیا گیا ہو' ایسے بھی فاتحین گذرے ہیں جنھوں نے ملک فتح کرلئے۔ پھر زندہ رہے اور اسلام کی دعوت دیتے رہے اور جو معاشرہ انھوں نے قائم کیا اس کا فائدہ لوگوں کو ہوا۔ دوسرے ممالک بھی اس سے متاثر ہوئے۔ مثلاً طارق بن زیاد' پھر آپ کے ہندوستان کے فاتحین جو ترکستان' افغانستان سے آئے۔ اللہ تعالیٰ نے سلطان ٹیپو کو شہادت کے خلعت سے بھی سرفراز فرمایا جو سب سے عزیز ترین متاع ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ سب سے پہلے انگریزوں کے خطرے کو سلطان ٹیپو نے محسوس کیا۔ یہ ان کی دینی غیرت و حمیت تھی جس نے اتنی بڑی طاقت کے مدمقابل ان کو لاکر کھڑا کیا۔

ٹیپو کی شہادت کے بعد حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کی جماعت سے انگریزوں نے زبردست خطرہ محسوس کیا اس لئے ۱۸۵۷ء کے بعد ان سب کا مظاہرہ جماعت مجاہدین پر ہوا' دہلی سے لے کر مرادآباد' میرٹھ کے علاقوں تک درختوں پر نوجوان مجاہدین کی لاشیں لٹکی ہوئی تھیں جیسا کہ نہرو نے اپنی کتاب "اماندین مسلمان" میں اس کا اعتراف کیا ہے۔

جنرل بخت خاں جو بہادر شاہ ظفر کی طرف انگریزوں سے لڑ رہا تھا۔ وہ سلطان پور کا رہنے والا تھا۔ جب مولانا کرامت علی جونپوری (خلیفۂ اجل حضرت سید احمد شہیدؒ) سے اس نے بیعت لی تو ان سے آپ نے فرمایا کہ اس کا عہد کرو کہ انگریزوں سے مقابلہ کروگے یہ سب باتیں تاریخ کے انبار میں دبی ہوئی ہیں۔ ان کا انکشاف کرنا اور انھیں منظر عام پر لانا صرف تاریخ کی خدمت نہیں بلکہ انصاف کی بات بھی ہے۔ یہ اعتراف کی بات بھی ہے اور صداقت کی بھی۔

اس بات کی شدید ضرورت تھی کہ سلطان ٹیپو پر ایک مستقل کام ہونا چاہیے۔ چاہیے تو تھا کہ ایک مستقل اکیڈیمی اور تحقیق اس مقصد کے لئے وجود میں آتا اور ایک پوری تنظیم اس کام کے لئے وقف ہو جاتی۔ یہ بہت افسوسناک بات ہے۔

اس کا اعتراف کرنا ضروری ہے کہ ابھی تک کی اس کی کسی کو توفیق نہیں ہوئی کہ سلطان ٹیپو کے خاندان، اس کے کارناموں اور ان کے ہمہ گیر اثرات کے بارے میں تحقیقی انداز سے کام کیا جائے اور خاصی مدت تک یہ کام ہوتا رہتا تاکہ تاریخ کے طبقے میں دبے ہوئے واقعات کو سامنے لایا جائے اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ جیسا کہ میں نے اس کتاب کے مقدمہ میں بھی لکھا ہے کہ یہ کام اللہ تعالیٰ نے اس علاقہ کے ایک ندوی فاضل سے لیا ہے یہ ایک طرح سے فقہا کی اصطلاح میں حق شفعہ تھا جو مولوی محمد الیاس ندوی سلمہٗ کو حاصل تھا کہ وہ پہلے اس موضوع پر کتاب لکھیں۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ کام انھوں نے پورا کیا۔ میں صرف ان کو یا جامعہ اسلامیہ بھٹکل ہی کو نہیں بلکہ سارے لوگوں کو دلی مبارکباد دیتا ہوں کہ یہ کارنامہ آپ ہی کے علاقہ کے ایک فرزند نے انجام دیا۔ اس پر خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے اور ان کی محنت کا اعتراف کرنا چاہیئے اور آپ کو پڑھنا بھی چاہیئے، لیکن میں ایک مصنف کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ کتاب کا صرف لکھا جانا اور بہتر سے بہتر طریقہ سے خوبصورت انداز میں اس کا چھپ جانا کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی عزم ضروری ہے اور یہ توقع بھی کہ آپ اس کو اپنے گھروں میں سنائیں۔ اس کوشش کریں کہ آپ کے اندر بھی سلطان ٹیپو کے جذبات اور ان جیسا ذوق، دینی غیرت وحمیت اور شوق شہادت پیدا ہو، شجاعت و استقامت کی صفات آپ کے اندر پیدا ہوں، تشکر کا جذبہ پیدا ہو اور آپ ان کے لئے دعا کریں، ان کی قدر دانی اس طرح ہو سکتی ہے

عزات! میں کھلے دل سے اور بغیر کسی تکلف و تحفظ کے کہتا ہوں کہ آپ کے اس علاقہ کے بسنے کا حق ہے کہ آپ نے وہ مرد شجاع پیدا کیا۔ وہ مرد غیور و جسور اور وہ صاحب عزم جس کے پیدا کرنے سے ہندوستان قاصر رہا۔ وہ سلطان ٹیپو شہیدؒ ہے۔ اللہ تبارک و بے شمار رحمتیں ان پر! دوسری بات یہ ہے کہ سب سے پہلے اس علاقہ سے پہلی مرتبہ پر تحقیقی انداز میں سلطان ٹیپو شہیدؒ پر کام ہوا۔ اسے ندوۃ العلماء کی طرف سے جس کا میں اور دارالمصنفین و مجلس تحقیقات کی طرف سے جن کا میں صدر ہوں اور تمام مسلمانانِ ہند سے شکریہ ادا کرتا ہوں اور اعتراف کرتا ہوں اس کارنامے میں سبقت کا جو ٹیپو سلطان ظاہر ہوا۔ اس کارخیر میں بھی سبقت جو اس وقت آپ کے سامنے سیرت ٹیپو کی کتاب کی موجود ہے۔

حضرات! اگر آپ ٹیپو سلطان شہید کا کارنامہ انجام نہیں دے سکتے اور حالات اس کے میں ہیں اور نہ ہی اس کے لیے وسائل مہیا ہیں اور اس کے امکانات بھی نہیں تو کم سے کم جو پ کے امکان میں ہیں مثلاً دینی غیرت و حمیت پیدا کیجئے، شہادت کا شوق آپ کے اندر ہونا۔ آپ کے اندر حمیت دینی کسی نہ کسی درجہ میں ہونا چاہیئے کہ کوئی بات آپ کے علاقہ میں ملاف، اسلام کے خلاف ہو تو آپ کے اندر حمیت پیدا ہو کہ یہ منکرات ہم ہرگز نہ ہونے دیں علاقہ میں یہ بدعت ہرگز نہیں ہوں گی۔ اس علاقہ میں غیر اسلامی تہذیب کی نقالی نہیں ہوگی یاہ میں ہم اسراف و فضول خرچی سے کام نہیں لیں گے۔ سلطان ٹیپو جیسی دینی غیرت و حمیت بجالت، استقامت اور ایک طرح سے ایمانی فراست ہونا چاہیئے۔ آپ یہاں بڑی دور بڑی تعداد میں آئے ہیں اس جلسہ کا حاصل یہ نہیں ہے کہ آپ کہیں کہ کتاب اچھی چھپی ہے۔ ام اس جلسہ کا یہ ہے کہ آپ کے اندر دینی غیرت و حمیت پیدا کی جائے۔ حضرت صدیق نا عنہ کا فقرہ آپ کے دل و دماغ پر نقش ہو۔ آپ یہ طے کرلیں کہ ہمارے جیتے اس علاقہ نہ رسم و رواج مسلمانوں میں گھسنے نہیں دیں گے اور اپنے علاقہ و حدود کے اندر کسی بدعت اور غیر اسلامی کو برداشت کریں گے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔ ○○

محمد عبد الباری

سیدنا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ الخ

اور نہ کہو جو مارے گئے خدا کی راہ میں مردے ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم کو خبر نہیں۔ جو اللہ کی راہ میں قتل کیا گیا اس کو شہید کہا جاتا ہے اور اس کی نسبت کو یہ کہنا کہ وہ مر گیا صحیح اور جائز ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتا بل احیاء عند ربھم یرزقون۔

اور تو نہ سمجھ ان لوگوں کو جو مارے گئے اللہ کی راہ میں مردے۔ بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس کھاتے پیتے ہیں۔ جو لوگ اللہ کے راستے میں (یعنی دین کے واسطے) قتل کئے گئے ان کو (اور مردوں کی طرح) مردہ مت خیال کرو بلکہ وہ لوگ (ایک ممتاز حیات کے ساتھ) زندہ ہیں اپنے پروردگار کے مقرب ہیں (یعنی مقبول ہیں) ان کو رزق بھی ملتا ہے۔ انسان کو شیطان کے شر سے بچانے اور دنیا میں حکومت الٰہیہ کے قیام کو آسان بنانے کے لئے حق تعالیٰ نے انبیاء و رسول بھیجنے شروع کئے۔ جو ہر دور میں آسمانی دستور کے مطابق دنیا میں حکومت الٰہیہ کی داغ بیل ڈالنے کے لئے مدد دیتے رہے اور اس بات کا تقاضہ کرتے رہے کہ اس عظیم مقصد کے لئے انسان کو جتنی بڑی قربانی دینی پڑی۔ بڑی سے بڑی مصیبت جھیلنی پڑی ہے۔ بڑی سے جابر و قاہر حکومت سے ٹکر لینی پڑے۔ بڑی سے بڑی رشوت ٹھکرانی پڑے یا اپنی جان عزیز جانِ آفریں کے حوالے کرنی پڑے تو وہ اس سے گریز نہ کرے بلکہ سب کچھ نہایت خوشی برداشت کرنا

نبوت کا دروازہ بند ہو جانے کے بعد جب خلیفہ چہارم حضرت سیدنا علی رضی اللہ عنہ اپنا کام مکمل کر کے یہاں سے رخصت ہونے لگے تو انھوں نے حکومت الٰہیہ کی ذمہ داری خاندانِ نبوت کے سپرد کرتے ہوئے ایک مشترکہ وصیت حضرت سیدنا امام حسن و حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو تاکید فرمائی۔

۱) قرآن کا خیال رکھنا تم سے بڑھ کر قرآن پر عمل کرنے والا کوئی نہ ہو
۲) خدا کی راہ میں اپنے جان و مال اور زبان سے جہاد کرتے رہنا
۳) نماز کا خاص طور پر خیال رکھنا کہ یہ تمہارے دین کا ستون ہے
۴) خلقِ خدا کو نیک اعمال کی ترغیب دینا اور بُرے اعمال سے روکنے سے باز نہ آنا کہ تم پر بُرے لوگوں کا اقتدار قائم نہ ہو۔

حضرت سیدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات کے بعد سیّدنا حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خلافت کی ذمہ داریاں سنبھال لیں تو آپ کے خلاف ریشہ دوانیاں شروع ہو گئیں۔ عوام نے آپ کا ساتھ نہ دیا آپ اپنے والدِ محترم کی وصیت کے مطابق خلافت سے دستبردار ہو گئے۔

عظمتِ سیّدنا حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت حسین رضی اللہ عنہ جو مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے ہر لحاظ سے ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں آپ بابُ العلم والحلم کے فرزندِ ارجمند، دخترِ رسول، خاتونِ جنت کے دل بند۔ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم شکل تھے۔ جب آپ پیدا ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے گود میں لے لیا۔ دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت فرمائی۔ کھجور چبا کر اس کا رس آپ کے منہ میں ڈالا اور حسین نام تجویز فرمایا۔

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ سے سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کو کتنا پیار تھا اس کا اندازہ لگانے کے لئے صرف اتنا جاننا کافی ہے کہ آپ جب صغر سنی میں گرتے پڑتے مسجد نبوی میں پہنچتے تو حضور ان کو دیکھ کر خطبہ موقوف کر دیتے اور منبر سے اُتر کر ان کو گود میں لے لیتے یا اپنے ساتھ منبر پر بٹھا لیتے۔ اگر وہ سجدہ کی حالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سر پر سوار ہو جاتے تو

آپ اس وقت تک سر نہ اٹھاتے جب تک وہ اوپر بیٹھے رہتے اور فرماتے جب تک وہ جی نہ بھر لیں، میں سر نہ اٹھاؤں گا۔ وہ جب آپ کی گود میں بیٹھتے تو آپ کی ریش مبارک میں انگلیاں ڈال کر کھیلتے رہتے۔

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے گھرانے میں ہی قرآن اترا۔ آپ کے والدِ ماجد سب سے پہلے قرآن پر ایمان لائے۔

جبرئیل امین مدتوں آپ کے گھرانے کی دربانی کرتے رہے اور خود سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو وقتاً فوقتاً ان الفاظ میں دنیا سے متعارف کرواتے رہے۔ "حسین تیرا گوشت میرا گوشت ہے اور تیرا خون میرا خون ہے۔ حسین مجھ سے ہے اور میں حسین سے ہوں۔" یا اللہ جو حسین کو محبوب رکھے تو اُسے محبوب رکھ۔ یا اللہ میں حسین سے محبت رکھتا ہوں آپ بھی اس سے محبت کریں اور اس شخص سے بھی جو حسین سے محبت کرے۔" جو کوئی حسین سے لڑے گا میں اس سے لڑوں گا جو ان سے صلح کرے گا میں اس سے صلح کروں گا۔ جو ان کو دوست رکھے گا میں اس کو جنت میں ساتھ لے جاؤں گا۔" حسین اس زمانے میں اہل آسمان کے نزدیک سارے اہلِ زمین سے زیادہ محبوب ہیں۔" "جو جنت کے سردار کو دیکھنا چاہے وہ حسین بن علی کو دیکھ لے۔"

سیدنا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ ۵ شعبان ۴ھ کو پیدا ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہد چٹایا اور ان کے دہن پاک کو اپنی زبانِ بابرکت سے تر کیا۔ ان کو دعائیں دیں اور حسین نام رکھا اور آپ کا جسمِ پاک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسدِ اطہر کے مشابہ تھا حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حیاتِ نبوی کے پانچ سال دیکھے۔

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا۔

"ایک روز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا حسن و حسین رضی اللہ عنہما دونوں آپ کے سینۂ مبارک پر چڑھے کھیل رہے تھے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ ان دونوں سے اس درجہ محبت رکھتے ہیں۔" فرمایا کیوں نہیں یہ دونوں دنیا میں

میرے پھول ہیں۔ اور حارث علی رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "حسن و حسین رضی اللہ عنہما جوانانِ جنت کے سردار ہیں۔
یزید بن ابی زیاد کی روایتوں میں ہے کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسین رضی اللہ عنہ کے رونے کی آواز سنی تو ان کی والدہ سے کہا ــ " کیا تم کو معلوم نہیں کہ ان کا رونا مجھے رنجیدہ کرتا ہے"

حادثۂ کربلا : رعایا ہمیشہ اپنے حکمرانوں کے کردار کا اثر قبول کرتی ہے یزید کے تخت نشین ہونے کے فوری بعد نتیجہ یہ نکلا کہ آج کل کی طرح مذہب کو نفرت و حقارت سے دیکھا جانے لگا اور ہر طرف عیش و عشرت کی گرم بازاری ہوگئی۔ جوں ہی اس نے حسین رضی اللہ عنہ کو اہل کوفہ کے خطوط ملنے لگے کہ ہم یزید کے ہاتھ پر بیعت نہیں کرتے۔ آپ جلد آجائیں تاکہ آپ کے ہاتھ پر بیعت کریں۔ آپ نے اپنے معتمد چچازاد بھائی مسلم بن عقیل کو کوفہ روانہ کیا جب انھیں یقین ہوگیا کہ اہل کوفہ آپ کی بیعت کرنے پر آمادہ ہیں اور حکومت یزید کی بجائے حکومت الٰہیہ قائم کرنا چاہتے ہیں تو انھوں نے امام حسینؓ کو کوفہ آنے کی دعوت دی ایسے حالات میں آپ کا کوفہ جانا لازمی ہوگیا۔
آپ نے لوگوں کو حقیقتِ حال سے آگاہ کرنے کے لئے مکہ معظمہ سے روانگی سے ایک دن قبل حمد و صلوٰۃ کے بعد یہ تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا۔ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔
موت اولادِ آدم کے گلے کا ہار ہے۔ میں اسلاف کی ملاقات کا اسی طرح مشتاق ہوں جس طرح یعقوب علیہ السلام، یوسف علیہ السلام کی ملاقات کے مشتاق تھے۔ میرے لیے وہ جگہ بہتر ہے جہاں میں قتل کر کے گرایا جاؤں گا۔ جب میرے جوڑ اور بند وحشی درندے قطع کر رہے ہوں گے میرے قتل سے اپنی پیاس بجھا رہے ہوں گے اور اپنی حسرتیں میرے خون سے نکال رہے ہوں گے۔ وہ منظر میرے پیش نظر ہے اس دن سے کوئی چارہ کار اور عذر نہیں۔ جو قلم تقدیر نے لکھ دیا ہے جو خدا کی مرضی ہے اسلام اہلِ بیت کی مرضی ہے ہم اس کی آزمائش پر صبر کرتے ہیں جو انجام میرے ساتھ وفا کرنا چاہتا ہو۔

آپ کی شہادت کے بعد اُن کے جسم اطہر کو دیکھا تو اس پر ۳۳ نشان نیزوں کے، ۳۴ نشانات دوسری ضربوں کے آئے۔ حضرت حسینؓ کے ساتھ ۷۲ آدمی شریک ہوئے اور محمد بن حنیفہ کا بیان ہے کہ آپ کے ساتھ سترہ افراد شریک ہوئے۔ وہ سب حضرت فاطمہؓ کی اولاد میں سے تھے۔ بہرحال آپ نے اپنی شہادت سے دنیا پر ثابت کر دیا کہ انسان اپنی خواہشوں اور نفس کے تقاضوں سے آزاد ہو جاتا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت یا کوئی جابر و ظالم و قاہر حکمراں اسے غلام نہیں بنا سکتا۔ آپ کی عمر شریف ۵۴ سال ساڑھے چھ ماہ تھی۔

۱۰ محرم ۶۱ھ کو جو خونیں سانحہ فرات کے کنارے دشت کربلا میں پیش آیا اپنی نوعیت کے اعتبار سے اتنا اندوہ ناک ہے کہ زیادہ تر یہی پہلو مسلمانوں کی نظر میں رہ گیا اور اس کے دوسرے تمام پہلو ان کی نگاہ سے اوجھل ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے ایک گروہ نے نالہ و شیون کا مسلک اختیار کیا۔ چنانچہ اس حادثہ کو تیرہ سو سال سے زائد عرصہ گزرنے کے بعد بھی ادھر چاند طلوع ہوتا ہے ادھر گھروں میں صف نوحہ و ماتم بچھ جاتی ہے آنکھیں اشکباری کرتی ہیں اور ہاتھ سینہ کوبی زبان پر رقت آمیز مرثیہ ہوتے ہیں۔ اس طرح سراپا ماتم بن کر اس خونی سانحہ کی یاد منائی جاتی ہے جو لوگ اس اہتمام کے قائل نہیں وہ بھی اپنے انداز میں اپنی محفلوں اور اجتماعات میں اس سانحہ کا ذکر اذکار کرتے ہیں مگر جس مقصد کی خاطر سر کٹانے والے نے اپنے جگر گوشوں، عزیزوں اور ساتھیوں سمیت سر کٹایا اس مقصد کو پہلا گروہ کوئی اہمیت دیتا ہے نہ دوسرا گروہ نالہ و شیون برپا کر کے اور محفلوں کی بساط بچھا کر سمجھ لیا جاتا ہے کہ انھوں نے محبت کا حق ادا کر دیا جو انہیں لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے سے اور ان کے اہل بیت سے ہے۔

حضرت سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی قربانی دے کر ہمیشہ کے لئے یہ طے کر دیا کہ اسلام میں شخصی آمریت، ملوکیت، کسرائیت کی کوئی گنجائش نہیں۔ حضرت حسینؓ کی یہ قربانی ملت بیضا کو ماتم و نوحہ سرائی میں ڈوب جانے اور زندگی کا کاروبار معطل کر دینے کی دعوت نہیں دیتی بلکہ سبق دیتی ہے کہ مسلمانوں کو اپنے نظام حیات کے اصولوں پر کس طرح ثابت قدم رہنا چاہئیے۔ کربلا کا سانحہ اپنے دامن میں یقین و ایمان جذبہ و سوز اور امید و رضا کا عظیم سرمایہ رکھتا ہے ⚫⚫

ڈاکٹر عبدالعزیز عتیق ترجمہ محمد ثناء اللہ عمری

استاذ احمد امین
۱۸۸۶ — ۱۹۵۴ء

[مشہور مصری فاضل استاذ احمد امین نے "حیاتی" کے نام سے آپ بیتی لکھی ہے بیروت کے صاحب قلم ڈاکٹر عبدالعزیز عتیق نے اس پر مقدمہ لکھا ہے جس میں اس خود نوشت سوانح عمری کا خلاصہ آگیا ہے افادیت کے پیش نظر اس مقدمہ کا ترجمہ ہدیۂ ناظرین ہے۔
(محمد ثناء اللہ عمری)]

دارالکتاب العربی نے جو استاذ احمد امین کی کتابیں چھاپ کر شائع کر رہا ہے مجھ سے خواہش کی کہ فاضل استاذ کی کتاب حیاتی (میری زندگی) کے لئے مقدمہ لکھوں، میں نے خوش آمدید کہتے ہوئے بات مان لی۔

ممکن ہے میں نے ان کی طول طویل زندگی کے بعض پہلو فراموش کر دیئے ہوں اس لئے ان کی یاد تازہ کرنے کو کتاب کا مطالعہ شروع کیا ہی تھا کہ مجھ پر ہیبت سی طاری ہوگئی۔

جوں جوں ورق گردانی کرتے لگا۔ ہیبت بڑھتی گئی یہاں تک کہ بارہا خیال آیا کہ ناشر سے معذرت چاہ لوں باوجودیکہ استاذ مرحوم سے میرے بڑے فکری، روحانی اور خاندانی روابط تھے پھر میری اپنی حد تک معاملہ ہیبت ہی کا نہیں، ادب و احترام کا بھی تھا، میری ہستی ہی کیا جو استاذ احمد امین کو لوگوں کے سامنے پیش کروں ؟ کیا میرے پاس ان کے بارے میں ایسی کوئی نئی بات ہے جو ان کے شاگرد ان کے قاری اور ان کے قدرداں نہیں جانتے ؟

کیا یہ واقعہ نہیں کہ خود ان کی ہر کتاب اپنے قارئین کو مصنف کے بارے میں بہتر طریقے پر بتائے دیتی ہے کہ خالص اور عمدہ تصنیف و تالیف کے عناصر پر انھیں پوری قدرت اور پیدا قابو حاصل تھا؟

فاضل استاذ اور ان کے قلم و ادب کے قدر شناسوں کے درمیان ایسے "معقولات" سے رکاوٹ کیوں پیدا کی جارہی ہے جو ان سے راست استفادے اور روابط سے روکتے ہیں؟

ابتداء میں دل ہی دل میں اسی طرح سوچنے اور بحث کرنے لگا اسی بنا پر ناشر سے معذرت کرنی چاہی مگر یہ بات مجھ پر گراں گزری کہ طالب علمی کے زمانے سے جس بہترین استاذ کی صحبت میں رہا گیا! اس سے متاثر ہوا اور بہت کچھ سیکھا، اس کی بابت کچھ لکھنے کو کہا جائے، اور اس کو میں ٹال جاؤں!

اس ٹال مٹول کے لئے وجہ جواز کہاں سے لاؤں؟ خود میرا نفس مجھے ناشکری کا الزام دے رہا، موقع ملنے پر میں اپنے استاذ کے ساتھ چند لمحے گزارنے سے کیوں کر محروم رہ جاؤں عین ممکن ہے ان ہی چند ساعتوں میں میں ان کی زندگی سے کچھ ایسے سبق حاصل کرؤں جو چھوٹ گئے تھے۔

تب تو..... ناگزیر بات سے پہلو تہی نہیں کیا جاسکتا۔

اس مقدمہ کے آغاز میں غالباً سب سے پہلا سوال جو ذہن میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کتاب "حیاتی" کی اہمیت کیا ہے جس میں مصنف نے بقلم خود اپنی پرائیوٹ اور پبلک زندگی کے سبھی پہلو بیان کر دیئے ہیں۔

ہم ایسے سوال کا جواب دینا چاہیں گے تو سائل کے ساتھ انصاف نہیں کریں گے۔ اس لئے کہ کتنا ہی کیوں نہ لکھیں جواب جامع اور مانع نہیں ہوگا، کتاب بذات خود پڑھ لیں تب کہیں جاکر کتاب کی اہمیت واضح ہوگی۔

اس حقیقت کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ یہ کتاب اس شخص کے حق میں بہترین ماخذ ہے جو اصلاح و تجدید اور جدید عرب کی فکری تحریک کے ایک رہنما کی حیثیت سے استاذ احمد امین کا مطالعہ کرنا اور جائزہ لینا چاہتا ہو، چنانچہ یہ کتاب ایسے شخص کو ان اسباب و عوامل کے سمجھنے میں مدد دے گی جو اس شخصیت اور اس کی ثقافت کی تعمیر میں ممد و معاون ثابت ہوئے تھے، اس کی سیرت و کردار کی صورت گری کی تھی، پھر آخر کار ایسے حالات بہم پہنچائے کہ فکر و قلم کے جس میدان میں بھی وہ گام زن ہوا۔ قائدانہ حیثیت حاصل کرلی۔

اسی طرح یہ کتاب ایک تاریخی ماخذ ہے جس میں انیسویں صدی کے اواخر سے بیسویں صدی کے وسط تک کے مصری انقلاب کی کیفیت درج ہے، کیوں کہ استاذ احمد امین اپنی زندگی کے نشیب و فراز قلم بند کرتے ہوئے بسا اوقات ان تحریکوں کی بابت خامہ فرسائی کرتے ہیں جن کے قدم بہ قدم وہ چلے تھے۔ چاہیے یہ تحریکیں سماجی ہوں، سیاسی ہوں یا فکری ہوں۔ وہ بیان و تذکرہ ہی پر بس نہیں کرتے، بلکہ آگے بڑھ کر یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ وہ ان تحریکوں میں شریک تھے۔ ان سے متاثر تھے ان پر اثر انداز تھے اپنی صوابدید کے مطابق ان کی تنظیم کرتے تھے، ایک ریسرچ اسکالر کا اس سے واقف ہونا بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

بلاشبہ یہ کتاب ہمارے عرب نوجوانوں کے لئے اس زمانے میں بہترین تحفہ ہے اس کی روشنی میں وہ معلوم کرلیں گے کہ مستقبل کی تعمیر اور انفرادی ترقی خوابوں، آرزوؤں، جمود اور ٹال مٹول سے ممکن نہیں، یہ ہفت خواں تو حالات کا سامنا کرتے، لگاتار دوڑ دھوپ کرنے اور تمام میدانوں پر چھا جانے ہی سے طے ہو سکتا ہے۔

اس کتاب کی روشنی میں ہماری نئی نسل یہ حقیقت بھی پالے گی کہ علم و معرفت کے معاملے میں نفس کو دھوکا دیتے رہنے سے کام نہیں چلنے کا اس کے برعکس طالب علم کے لئے ناگزیر ہے کہ خود اپنے نفس کے ساتھ امانت داری سے کام لے اور ذاتی تعلیم و تربیت میں جتا رہے۔

زندگی کے لئے اپنے آپ کو صحیح خطوط پر تیار کرنے میں امانت داری کسی بھی شخص سے تقاضا کرتی ہے کہ جو بات معلوم نہ ہو اسے معلوم کرے، جو نقص محسوس کرے اسے دور کرے۔ اس کا فرض ہے کہ اپنے نفس پر ترس نہ کھائے، اسے ڈھیل نہ دے دے کیونکہ یہ بات حقیقت سے بہت دور ہے کہ علم اپنے خزانوں کے دروازے بجز اس شخص کے کسی اور پر کھول دے جو تن من دھن کی گراں قیمت ادا کرتا ہو۔

یہ باتیں ہم اپنے نوجوانوں سے کسی نظریہ، وعظ و نصیحت کے طور پر نہیں کہہ رہے ہیں بلکہ یہ تو ایک آخری عملی سبق ہے جو استاذ احمد امین نے اپنی اس کتاب میں اپنی قوم کے نوجوانوں کو دیا ہے کیونکہ وہ اپنی زندگی کے حالات کی عکاسی کرتے ہوئے دیکھنے والے کو یہ بات دکھاتا اور جاننے والے

کو یہ معلوم کرانا چاہتے ہیں کہ اپنے آپ کو زندگی کے لئے تیار کرنے کے لئے انھوں نے کس قدر مشقت برداشت کی۔

اس سبق کی اہمیت کے ساتھ وہ اس سے بھی اہم درس کی طرف منتقل ہوتے ہیں کہ حصولِ بنات خود کوئی چیز نہیں وہ تو ایک ذریعہ ہے جو اشاعتِ علم اور انسان کی ترقی کی شکل میں جلوہ گر ہوتا ہے۔

ان کا یہی حال تھا اپنے علم کو اپنے ہی لیئے سینت کر نہیں رکھا۔ جو کام ان کے سپرد کیا گیا یا جس کام میں وہ شریک رہے اس میں اپنے علم سے کام لے کر قوم کو فائدہ پہنچایا۔ یہ ہر وقت اور ہر جگہ کے بڑے لوگوں کی ایک علامت ہے۔ اللہ نے انھیں علم کی جو دولت عطا کی ہے۔ اسے وہ بڑی فیاضی سے ساری انسانیت کے لئے صرف کرتے ہیں۔

اول و آخر یہ کتاب ایک پُر رونق زندگی کی کہانی ہے۔ یہ ہمارے اندر ایک نوجوانوں کے لئے رشک، تعجب اور پسندیدگی کے جذبات پیدا کرتی ہے جو اگرچہ طبقۂ سے تھا تاہم بڑے ناگوار حالات میں اس نے اپنی راہ آپ نکال لی اور اپنی بہت سی امیدیں اور خوابوں کو سچ کر دکھایا۔

اسی طرح یہ کہانی ہمارے دلوں کے اندر اس بات کا یقین بھی جاگزیں کر دیتی ہے کہ اصول پسند لوگ اپنے اصول کے بل بوتے پر اپنی زندگی کا نصب العین پا لیتے ہیں چاہے ان کی کتنی ہی مخالفت ہو، کتنی ہی گزند کیوں نہ پہنچے، راہِ عمل طول طویل ہی کیوں نہ ہو، روڑے اور رکاوٹیں ان کے قدم کیوں نہ روک لیں۔

ہر کام کی ایک غرض و غایت ہوا کرتی ہے اپنی تاریخ زندگی کی اوٹ سے استاذ احمد امین کی غرض و غایت کے لئے کوشاں نظر آتے ہیں۔

اس سوال کے جواب میں وہ رقمطراز ہیں ممکن ہے میری زندگی ہماری نسل کی زندگی کا ایک پہلو پیش کرے، ہماری زندگی کا ایک طریقہ واضح کرے جو آج قاری کے کام آئے کل مورخ کو دئیے جائے، چنانچہ میں نے اس کا اہتمام کیا ہے کہ ماحول سے اپنا ادبیہ سے ماحول کا عطوں تاثرات

بیان کروں۔

مصنف نے یہاں تین حقیقتیں واضح کی ہیں جو خصوصی توجہ اور غور و فکر کی محتاج ہیں۔
پہلی بات اس کتاب کی ترتیب و تالیف سے ان کے انتہائی خوف و ہراس سے متعلق ہے۔ بانچہ وہ کہتے ہیں۔ کسی کتاب کی تصنیف سے مجھے اتنا ڈر نہیں لگا جتنا اس کتاب کی تصنیف سے۔ کیونکہ اس سے پہلے میں نے جو کچھ لکھا اس کا موضوع کچھ اور تھا۔ پیش کرنے والا میں تھا۔ بیان کسی اور کا تھا۔ بیان کرنے والا میں تھا مگر اس کتاب کا موضوع بھی میں ہی تھا اور مصنف بھی میں ہی۔ ہم اپنے آپ کو عینک ہی سے دیکھنے کے خوگر ہیں چیز جتنی نزدیک ہو گی، اسے دیکھنا اتنا ہی دشوار ہو گا۔ ہم اپنے آپ کو کسی دوست یا دشمن ہی کے قبول کی روشنی میں پرکھ سکتے ہیں، یا ایسے تعلق ہو کر شخصیت کو دو حصوں میں بانٹ دیا کرتے ہیں وہ جو دیکھتا اور حکم لگانے والا ہے اور وہ جو دیکھی جا رہی ہے اور جس پر حکم لگایا جا رہا ہے اور یہ کس قدر مشکل بات ہے؟

دوسری بات اس اعتراف کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے کہ مصنف نے اس کتاب میں سچائی پوری کی پوری بیان نہیں کی ہے مگر جو کچھ لکھا ہے سچ سچ ہی لکھا ہے۔ بعض سچی باتوں کا کہنا ناگوار گزرتا ہے، لوگ اس کی طرف کان نہیں دھرتے، جب ہم پورے جسم ہی کی عریانی پسند نہیں کرتے تو پورے نفس کا ننگا پن کیونکر گوارا کر سکیں گے۔

رہی تیسری بات تو وہ خود نوشت سوانح عمری سے متعلق ہے، اس میں جو قسم ان کی پسندیدہ ہے اس کی بابت ہے، دیکھئے کیا فرماتے ہیں کسی کا خود اپنی آپ بیتی لکھنا پسندیدہ اور بوجھل معاملہ ہے کیونکہ انسان کو خود اپنے آپ سے محبت ہوتی ہے جو اسے اکثر و بیشتر اس بات پر اکساتی ہے کہ آپ بیتی میں اپنے منہ میاں مٹھو بنے، یہ از راہ انکسار اشارے کنایہ میں بھی ہوتا ہے یہ خود ستائی اس کی اپنی بڑائی و بزرگی کا پتہ دیتی ہے اور پڑھنے سننے والے پر انقباض طاری کر دیتی ہے لہٰذا کسی کا خود اپنے بارے میں کچھ لکھنا یا کہنا بڑی مہارت اور لیاقت کا طالب ہے ان تمام کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم اس کتاب زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تاکہ صاحب کتاب کی بابت مزید معلومات حاصل کریں۔ (باقی دوسری قسط میں)

پروفیسر عبدالمغنی



زبان و ادب کی تاریخیں اس رائے پر اتفاق کرتی ہیں کہ اُردو برصغیر ہند پاک و بنگلہ دیش کے ملے جلے کلچر کی زبان ہے یہ بات بالکل صحیح ہے اس لیے بھی کہ تقریباً ہر زبان اپنے خطے کے مختلف طبقات کے خیالات و احساسات کا ذریعہ اظہار ہوتی ہے اور اس کا خمیر انہی خیالات و احساسات سے اُٹھتا ہے۔ اس سلسلے میں اُردو کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک بہت بڑے علاقے کے مختلف طبقات کے صدیوں پر مشتمل میل جول اور تبادلۂ خیال سے پیدا ہوئی، پروان چڑھی اور ترقی کرتے کرتے آج ہندوستانی کے نام سے بولنے والوں کی تعداد کے اعتبار سے چینی کے بعد دنیا کی دوسری بڑی زبان بن گئی ہے اس کے ادب کا معیار بھی اتنا بلند ہے اور دائرہ اتنا وسیع کہ نہ صرف ہر فرقہ و مذہب کے افکار و واقعات وسیع پیمانے پر اس میں پائے جاتے ہیں بلکہ دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کی کتابوں کے ترجمے ایک مدت سے ہو رہے ہیں۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے "عرب و ہند کے تعلقات" جیسی دستاویزی تصنیف ثابت کر دیا ہے کہ زبانِ اُردو کی تشکیل جنوبی ہند کے ساحلوں پر عربوں اور ہندوستانیوں کے روابط کے عہد قدیم سے شروع ہو گئی تھی جبکہ دوسری طرف یہ معلوم ہے کہ شمالی ہند میں دورِ غلبہ جب آریوں کے بعد ایرانیوں کے قافلے آنے لگے تو یہ یک وقت سرائیکی کے پنجابی علاقے سے لے کر برج بھاشا کے اودھی علاقے تک سنسکرت اور فارسی کی کھچڑی پکنے لگی یعنی اس طرح ایک دوسرے گلے ملیں کہ ان کے درمیان محبت کی جو بول چال ابھری وہ ریختہ، ہندی، ہندوی، ہندوستانی اور اُردو کے نام سے یاد کی گئی، یہاں تک کہ ۱۸۶۹ء میں وفات پانے والے اُردو شاعر غالب نے اپنے خطوط کے مجموعے کا نام "عودِ ہندی" رکھا تو دوسرے مجموعے کا "عودِ ہندی"۔ اس سے صاف مطلب یہ ہے

انیسویں صدی کے اواخر تک برصغیر کے مشترکہ کلچر کی رائج الوقت اور مقبولِ عام زبان اُردو ہی تھی۔ مولوی عبدالحق کی مشہور کتاب "اُردو کی نشوونما میں صوفیائے کرام کا حصہ" کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ دورِ قدیم سے ہندوستان کے مختلف خطوں میں جو مسلم صوفیائے کرام تشریف لائے اور قیام پذیر ہوئے انھوں نے عوام کے درمیان اپنے مشن کی تبلیغ اور اسلام کے پیغام صلح و آشتی کو پھیلانے کے لئے فرقہ و طبقہ کے امتیاز کے بغیر سب کے لیئے جس ملی جلی زبان کا استعمال کیا وہی آگے چل کر بالآخر اُردو کہلائی۔

عصرِ حاضر میں حسبِ ذیل دو سوالات اُٹھتے ہیں۔

(۱) برصغیر یعنی غیر منقسم ہندوستان کی کس زبان میں ہر فرقے کا لٹریچر سب سے زیادہ ہے؟

(۲) ہندوستان کی کونسی زبان پورے برصغیر میں آج بھی رابطے کی زبان ہے؟

ایک تیسرا سوال یہ بھی اُٹھنا چاہیئے:

(۳) کونسی زبان سب سے زیادہ فراخ دلی اور وسعت کے ساتھ دوسری زبانوں اور نئی اصطلاحوں کے الفاظ اپنے لغت میں قبول اور جذب کر رہی ہے؟

سوالوں کے جواب اس طرح ہیں کہ اسلام کے علاوہ ہندو دھرم، بودھ مت، عیسائیت اور یہودیت، سکھ مت، آریہ سماج اور پارسی مذہب کی ادبیات کا وافر ذخیرہ اُردو میں ہے یہ چیز ملک کی دوسری زبان میں نہیں ہے اس سے اُردو کی رواداری اور قومی سے بھی بڑھ کر انسانی یکجہتی کے لیئے عظیم الشان خدمات کا قطعی ثبوت ملتا ہے۔ یہ وسیع النظری اُردو زبان و ادب کی سرشت میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غیر منقسم ہندوستان میں رابطے کی واحد عوامی زبان اُردو ہے اس نمایاں حقیقت کی ایک دلیل اُردو فلموں یا فلموں کے اُردو مکالموں اور گیتوں کی بے پناہ مقبولیت ہے پورے ایشیاء و افریقہ میں ہوائی اڈوں، بندرگاہوں اور ریلوے اسٹیشنوں پر یا بازاروں میں اُردو کے ذریعے کام چل سکتا ہے یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں بھی اُردو کے شعبے اور ادارے کام کر رہے ہیں۔ اُردو شاعری اور افسانے کی پذیرائی عالم گیر ہے۔ اقبال، کا شمار دنیا کے عظیم ترین شاعروں میں ہونے لگا ہے وہ پورے جنوبی اور مرکزی ایشیاء کے مقبول ترین شاعر ہیں جب کہ مغربی ایشیاء بھی ان کو اپنا ترجمان تسلیم کرتا ہے یورپ اور امریکہ میں بر وقت سب سے

زیادہ چرچا جس ہندوستانی شاعر کا ہے وہ اردو و فارسی کے سب سے بڑے شاعر علامہ اقبال
ہی ہیں اس لیئے کہ عصرِ حاضر میں وہ دنیا کے اہم ترین بین الاقوامی شاعر ہیں جنھوں نے عام انسانی
اخلاقی قدروں کو فروغ دیا ہے اور انسانیت کے فروغ و عروج کے وجد آفریں نغمے گائے ہیں
نئی دنیا یا دورِ جدید میں ہمہ گیر صالح انقلاب کا نعرہ و ترانہ آج کے انسان اور نئی نسلوں کو
اقبال ہی نے دیا ہے۔

تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ اردو ایک وسیع المشرب زبان ہے شروع سے اس
نے دوسری زبانوں اور بولیوں کے الفاظ قبول کیے ہیں۔ مسلمان ہندوستان میں عربی و فارسی جیسی انتہائی
ترقی یافتہ اور مروج و مقبول زبانیں لے کر وارد ہوئے اور انھوں نے یہاں کی قدیم ترین کلاسکی زبان
سنسکرت کے ساتھ مختلف خطوں میں رائج پراکرتوں ـــ سرائیکی، برج بھاشا، پالی، دکھنی
پالونی، اودھی، پنجابی وغیرہ ـــ کے لفظوں کو بلا تکلف قبول کرنے کے ساتھ ساتھ ترکی، پرتگالی
پھر انگریزی کے الفاظ بھی ضرورت، موقع اور مناسبت کے مطابق اختیار کر لیے۔ یہی وجہ ہے کہ
عصر حاضر میں جب مغرب سے سائنسی، تکنیکی، سیاسی اور صنعتی اصطلاحات پوری دنیا میں پھیلیں تو
ہندوستان کی زبانوں میں سب سے آگے بڑھ کر اردو نے انھیں تقریباً جوں کا توں اپنے لغت میں
جگہ دی اور اپنے روزمرہ استعمال میں جذب کر کے جزو زبان بنا لیا۔ یہ رواداری اور وسیع النظری
کے ساتھ ساتھ صحیح اور موثر لسانی اصول بھی ہے چنانچہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ دنیا کی جدید
زبانوں میں سب سے زرخیز اور ثروت مند اردو ہی ہے۔

حروفِ تہجی کے لحاظ سے خالص لسانی و صوتی طور پر دیکھا جائے تو ہر قسم کی آوازوں کی
ادائیگی اردو زبان کر سکتی ہے اس میں عربی و فارسی کے شین قاف سے لے کر بھاشا کے بھ، پھ اور
ٹ تک ہیں۔ اس طرح یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اردو کا رسم خط اردو ہی ہے نہ کہ فارسی یا عربی اس
لیے کہ اس کے حروف دونوں عظیم ترین کلاسکی زبانوں سے زیادہ آوازوں کی ادائیگی کرتے ہیں اردو حروفِ
تہجی کی یہ وسعت بھی ایک قسم کی رواداری کہی جا سکتی ہے جس سے اس زبان کا دائرہ ایک ذریعہ اظہار
کی حیثیت سے وسیع ہوا ہے اور یہ کم از کم جنوبی ایشیا اور شمولاً غیر منقسم ہندوستان کی عوام کی تمام

ہونٹوں کی ترجمانی انداز کے لسانی احساسات کی عکاسی کرتے تھیں ۔۔۔ دوسری زبانوں کے مقابلے میں اُردو کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کا ایک راز یہ بھی ہے ۔

بہرحال، یہ سوال اٹھانے کو جی چاہتا ہے کہ اُردو نے ہندوستان کے مختلف طبقوں، فرقوں، علاقوں اور حلقوں کے جذبات کی آئینہ داری میں جس رواداری کا ثبوت دیا ہے کیا وہی رواداری دوسری زبانوں کے شیدائی خاص کر شمالی ہند میں اُردو کے ساتھ برت رہے ہیں؟ شاید اس سوال کا جواب نفی میں ہے ورنہ کیا وجہ ہے کہ اُردو کے گہوارے کو فقط ہندی کا علاقہ کہا جا رہا ہے؟ ظاہر ہے کہ شمالی ہند پر جتنا حق ہندی کا ہے اس سے کسی طرح کم اُردو کا نہیں ہے۔ عام استعمال کے اعتبار سے اودھی اور برج بھاشا کا پورا علاقہ سب سے پہلے اور سب سے زیادہ اُردو ہی کا ہے، اس کے بعد اور اس کے ساتھ ہندی کا بھی کہا جا سکتا ہے اُردو تو ہندی کو بھی اپنے وسیع دامن میں لیئے ہوئے آگے بڑھ رہی ہے ۔

(بقیہ صفحہ ۲۷ سے آگے)

تو اس کی نشو و نما کی فکر کیجئے ۔ سوچیئے کہ اسے آباد کیسے کیجئے گا ۔ اپنے اس دیرینہ مطالبہ اور حکومت کے حالیہ فیصلے کی لاج رکھنی ہے تو نکل پڑیئے اور ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا یونیورسٹی کے شایان شان انتظام کیجیئے ۔

جدید تعلیم کا حصول اُردو والوں کی پس ماندگی دور کر سکتا ہے اُردو والوں کو اپنے تئے لائحۂ عمل میں بہتر و برتر تعلیمی معاشی اور سماجی طور سے اوپر اٹھنے کے لئے عوامی تحریک چلانی ہوگی ۔ علاقائی زبانوں اور تہذیب پر بھی زور دینا ہوگا ۔ علاقائی زبان سیکھنے سے جہاں بہتر معاشی مواقع فراہم ہوتے ہیں وہاں مقامی طور پر فرقہ پرستی بھی کمزور ہوتی ہے ۔

"شاداب" کا زرِ سالانہ روانہ فرماتے ہوئے اپنی خریداری کی تجدید فرمائیں

(ادارہ)

اُردو یونیورسٹی کا قیا

پروفیسر قیوم صادق

اُردو کا بنیادی ڈھانچہ اگرچہ مقامی خمیر سے تیار ہوا ہے لیکن یہ اپنی ساخت کے اعتبار سے بین الاقوامی مزاج کی زبان ہے۔ ہندی، عربی، فارسی زبانوں اور مقامی بولیوں کے الفاظ اس سے داخل ہیں کہ ان کا شمار کرنا محال ہے اس کے علاوہ اس میں انگریزی، اطالوی، پرتگالی، جرمنی، چینی سکنڈ سے نیوین، فرانسیسی، ولندیزی اور یونانی اور دیگر زبانوں کے الفاظ بھی ا تعداد میں موجود ہیں یہ الفاظ روزمرہ کی تقریر و تحریر میں بے کھٹکے بولے اور لکھے جاتے ہیں تک کہ دور افتادہ دیہاتوں میں بھی برابر مستعمل ہیں۔ وہ طلبہ جو پنجاب یونیورسٹی اور نیشنل کالج شعبۂ اُردو میں اُردو سیکھنے کی غرض سے ایران، چین، جاپان، کوریا، تھائی لینڈ، مصر، سعود اُردن، عراق، آسٹریلیا، امریکہ اور برطانیہ وغیرہ سے آتے ہیں اُردو کی کتابیں پڑھ لیتے ہیں اور اُ سیکھ جاتے ہیں۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق اس وقت اُردو میں عام طور پر استعمال ہونے الفاظ کی تعدا لاکھ سے زیادہ ہے جب کہ اصطلاحی الفاظ کی تعداد اس کے علاوہ ہے الفاظ کی اتنی بڑی تع سوائے انگریزی کے غالباً دنیا کی کسی اور زبان میں موجود نہیں ہے چنانچہ اُردو کا یہ رنگا رنگ ذ الفاظ اس کا بین الاقوامی مزاج، مصدر سازی کے بعض عمدہ اصول، افعال معاون۔ استعمال کی سہل صورتیں، ہم معنی مترادف اور متضاد الفاظ کی کثرت وغیرہ ایسی خصوصیات ہیں اُردو کو دنیا کی تمام زبانوں میں ممتاز اور مشرف کرتی ہیں اور اس کی مقبولیت کی نئی راہیں کھو ہیں یہی باتیں اُردو سمجھنے، بولنے اور لکھنے والوں کے وجۂ افتخار ہیں۔

بچوں کو تعلیم اس لیئے دی جاتی ہے کہ آئندہ چل کر وہ نہ صرف ان کی ذات بلکہ ملک کے

بھی مفید ثابت ہوں اس لیے ان کو شہریت کی تربیت دینا ضروری ہے ترقی یافتہ ممالک کی
ترقی یافتہ ممالک کی ترقی یافتہ تاریخ پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قومی اتحاد اور حب الوطنی کی نشوونما
ان ممالک کے نظام تعلیم کا بڑا حصہ ہے فرقہ وارانہ تعلیمی اداروں سے یہ مقصد حاصل نہیں ہوسکتا۔ قومی
اتحاد کی بنیاد اسی وقت مضبوط ہوسکتی ہے جب کہ وہ بچپن میں ڈالی جائے جو بڑا ہی نقش پذیر
زمانہ ہوتا ہے اس لیے سب سے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ ابتدا ہی سے ہندو اور مسلمان بچوں کو
ایک ساتھ پڑھنے لکھنے اور کھیلنے کا موقع دیا جائے۔

نصاب تعلیم ایسا ہونا چاہیئے کہ ایک طرف تو وہ مختلف فرقوں کی ضروریات کو پورا کرے
اور دوسری طرف ان میں اتحاد اور اتفاق پیدا کرے۔ ہندو اور مسلمان طلبہ میں یگانگت پیدا کرنے
کے لیئے یہ ضروری ہے کہ وہ ایک دوسرے کی زبان سیکھیں۔ بلجیم میں دو زبانیں رائج ہیں اور فرانسیسی
لیکن ہر مدرسہ میں دونوں زبانوں کی تعلیم دی جاتی ہے۔

تعلیمی معیار کو بلند کرنے کے لیے سب سے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ طلباء اپنی ذمہ داریوں
کو محسوس کریں۔ بحالت موجودہ اس کی بڑی کمی پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے نہ صرف تعلیمی معیار بلکہ ڈسپلین
بھی متاثر ہو رہا ہے طلباء کی اصلاح تعلیم اور ترقی کے لئے محض اساتذہ اور تعلیمی اداروں کی کوشش
ناکافی ہے والدین کا تعاون نہایت ضروری ہے ان کو چاہیئے کہ اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت میں زیادہ
دل چسپی لیں۔

ابتدائی درجوں سے اردو کی تعلیم کا انتظام کرنا ہوگا۔ بچوں کے اسکول نونہال کو جنوبی ہند میں
پھول بن کا نام دیا گیا ہے اسے ایک تحریک کی شکل دی گئی ہے اس تحریک کے بانی محترم جناب
محمد اکبر خان ریٹائرڈ ایجوکیشن آفیسر جو اردو میڈیم پرائمری ٹیچرس ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ بنیانی،
شیموگہ، گلبرگہ اور منگلور کے بانی تھے صرف یہی کہنا ہے کہ اردو یونیورسٹی کے بانی سچ پوچھیئے تو نونہال
ماہوں گے۔

ہندوستان میں پچیس ریاستیں اور چھ یونین ٹریٹریز ہیں چار سو سے زائد اضلاع ہیں کم و بیش
۸۰ فیصد آبادی چھ لاکھ گاؤں میں رہتی ہے یعنی پانچ سو ملین سے زیادہ ۲۵ ملین ۲.۵ بڑے شہروں

اور چار ہزار چھوٹے شہروں میں سے پندرہ لسانی حلقے ہیں جن میں ہندی بولنے والوں کی تعداد ۲۶۵ ملین ہے ۵۵ ملین لوگ تلگو بولتے ہیں، بنگلہ بولنے والے ۵۳ ملین ہیں، مراٹھی ۵۰ ملین افراد کی زبان ہے تمل بولنے والے ۴۵ ملین ہیں اردو بولنے والے ۳۵ ملین، ملیالم ۳۵ ملین، اڑیا ۲۳ ملین، پنجابی ۱۹ ملین اور کشمیری ۳ ملین۔

بہرحال یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ ہندوستان کی اگر کوئی قومی تہذیب ہے تو اس کا ذریعۂ اظہار قومی سطح پر سب سے زیادہ اردو ہی ہے اور جو لوگ اس ہند اسلامی تہذیب کو اپنی تہذیب مانتے ہیں وہ اردو کو فنا نہیں ہونے دیں گے۔

اردو کو فروغ دینے کے لئے حسب ذیل نکات کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

(۱) نصابی کتابیں (۲) اردو اساتذہ کے کریڈٹ (۳) تعلیم بالغاں (۴) مراسلاتی کورس (۵) لائبریریاں (۶) کالجوں میں اردو تعلیم (۷) اردو کے تحقیقی ادارے (۸) جامعہ ملیہ اسلامیہ (۹) اردو کے ذریعہ تعلیم دینے والے کالج (۱۰) سرکاری مقاصد کے لئے اردو کا استعمال (۱۱) قواعد و ضوابط کا ترجمہ (۱۲) اردو ٹائپ رائٹر اور اردو ٹائپسٹ (۱۳) عدالتوں میں اردو (۱۴) سرکاری ملازمین کے لئے اردو سیکھنا (۱۵) سرکاری ملازمت اور اردو (۱۶) ووٹروں کی فہرست (۱۷) یونین پبلک سروس کمیشن (۱۸) ڈاک اور تار کے محکمے (۱۹) ریلوے (۲۰) سائن بورڈ اور ناموں کی تختیاں (۲۱) آل انڈیا ریڈیو (۲۲) بمبئی (۲۳) بھوپال (۲۴) ٹیلی ویژن (۲۵) پریس انفارمیشن بیورو (۲۶) فلمیں (۲۷) آئینی تحفظات کی تعمیل (۲۸) صحافت کے لئے ملی امداد (۲۹) نیوز پرنٹ (۳۰) عوامی مہم (۳۱) ڈاک خرچ (۳۲) چھوٹے اخباروں کے لئے مشاورتی سروس (۳۳) صحافت کی تربیت (۳۴) تحقیق اور حوالے کی کتابیں (۳۵) بڑھاپے کا وظیفہ (۳۶) اعزازی اسکالرس (۳۷) مختلف زبانوں کا آپس میں لین دین (۳۸) کتابوں کے جعلی اڈیشن (۳۹) اردو ٹائپ میں طباعت کا استعمال (۴۰) سستے اڈیشن (۴۱) بنکوں سے قرض اور ایڈ کی سہولتیں (۴۲) کتابت کی سیاہی (۴۳) ریلوے بک اسٹال

(۱۲) اُردو کتابوں کی برآمد۔

اُردو محض زبان ہی نہیں بلکہ تہذیب بھی ہے۔ اُردو کا زیاں سب کا زیاں ہے۔ حکومت یونیورسٹی قائم کرسکتی ہے اگر ہم نے اسکولوں کی سطح پر اُردو کے حق کو منوالیا تو اُردو محفوظ ہے ورنہ اس کی مثال اس عالی شان عمارت کی ہوگی جس کی دیواریں بنیادوں سے اپنا رشتہ توڑ چکی ہیں کہ کوئی بھی دھکا عمارت کو زمین بوس کرسکتا ہے۔ اُردو والوں کو ایک پلیٹ فارم کی ضرورت ہے جہاں وہ اپنی زبان اور کلچر کا تحفظ کرسکیں تمام اختلافات کو نظر انداز کرکے صرف ایک پوائنٹ اتحاد کو اپنا نصب العین بنائیں تو یہ بہت بڑی کامیابی ہوگی۔

اُردو بھی ایک ایسی ہی قومی زبان ہے اور کسی بھی دوسری قومی زبان سے کم استعداد اس کے اندر ذریعۂ تعلیم بننے کی نہیں ہے بلکہ عملاً اور حقیقتاً قومی زبانیں واحد زبان اُردو ہی ہے جس نے آزادی سے قبل ہی پرائمری سے یونیورسٹی تک تمام علوم و فنون کی اُردو کے ذریعہ تعلیم کا کامیاب تجربہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں کرکے بہترین اُردو داں، سائنٹسٹ، فلاسفر، ڈاکٹر اور انجنیر وغیرہ پیدا کیئے اب صرف سیاسی احوال کے دگرگوں ہوجانے سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ ذریعۂ تعلیم بننے کے لیئے اُردو کی صلاحیت اور افادیت میں کوئی کمی واقع ہوگئی ہے خاص کر ثانوی سطح پر اُردو کے علمی و فنی تعلیم کے مواقع باقی ہیں۔

اگر اُردو صرف مسلمانوں کی زبان ہوتی تو ہندوستان کے تمام مسلمانوں کی زبان اُردو ہوتی لیکن ایسا نہیں ہے پنجاب کے مسلمان پنجابی بولتے ہیں، گجرات کے مسلمان گجراتی، بنگال کے مسلمان بنگالی، تامل ناڈو کے مسلمان کی مادری زبان تامل ہے اور کیرالا کے مسلمانوں کی ملیالم اُردو ہندوستان کی سیکولر روایات کی علم بردار ہے۔

ہمیں یونیورسٹی بہرحال مبارک ہو لیکن یہ بات کچھ انوکھی سی ضرور لگتی ہے کہ ہم دیواریں کھڑی کرنے کے بجائے ہوا میں ایک چھت بنا کر چھوڑ دیں۔

بہرحال یونیورسٹی کی اپنی افادیت کچھ نہ کچھ ضرور ہے اس سے اُردو والوں کا گرتا ہوا حوصلہ ٹھہرتا ہے ناامیدی کے دور میں اعتماد پیدا ہوجائے تو یہ کیا کم ہے یونیورسٹی بنائی ہے (باقی صفحہ ۲۲ پر)



مسلم ایسوسی ایشن فار دی اڈوانس مینٹ آف سائنس (M.A.A.S.) اور سنٹر آف اسٹڈیز آن سائنس (C.S.S.) علی گڑھ نے کھنڈالا (پونے) میں ۳ تا ۸ نومبر ۱۹۹۶ء کو ایک سائنس اورینٹیشن ورک شاپ کا انعقاد کیا جس میں دیگر اور حضرات کے علاوہ پونا کالج کے ڈاکٹر رفیق سرخوا کی کوششوں کا نمایاں ہاتھ تھا۔ ذیل میں کچھ تفصیل کی ایک مختصر رپورٹ پیش کی جاتی ہے۔

ورک شاپ کا افتتاح ہماری زندگیوں میں سائنس کو برتنے اور فروغ دینے کے روایتی پیغام سے ہوا، جس کی وضاحت پروفیسر محمد اقبال، ڈین فیکلٹی آف سائنس، جامعہ ہمدرد دہلی اور ڈاکٹر نائیک ڈائرکٹر اسلامی ریسرچ فاونڈیشن ممبئی نے کی۔ اس کے بعد مختلف حضرات نے سائنس کا تنقیدی جائزہ لیا۔ ان ارشادات کا فرداً فرداً اقتباس مختصراً درج ہے۔

پروفیسر محمد اقبال :- تعلیم بالخصوص مسلمانوں کے لیے آج کل اسی قدر ضروری جتنا کہ ایمان یا اتحاد یا تنظیم وغیرہ۔ تعلیم کو عصری تقاضوں کو پورا کرنے والا ہونا چاہیئے علم سے مراد اگر سائنس لیں تو غلط نہ ہوگا۔ آج جو قومیں سائنس اور ٹکنالوجی سے لیس ہیں وہ فتح یاب اور کامران ہیں اس لیے اگر یہ کہیں کہ حصول علم سے خوش حالی اور اقتدار کی راہیں استوار ہوتی ہیں تو غلط نہ ہوگا۔

ڈاکٹر نائیک : سائنس کو فروغ دینے کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ ہم اپنی روزمرہ کی زندگیوں میں سائنسی طریقوں کو برتیں اور سلجھے ہوئے انداز میں فکر و عمل کو اپنائیں۔ اسی سے یہ:

بھی نکلتا ہے کہ ہمیں آج کل خواتین کی تعلیم پر خصوصی توجہ دینا چاہیئے اور باہمی رسم و رواج کو فروغ دینے کے طور طریقوں کو اپنانا چاہیئے اور اپنی زندگیوں کو سادہ ہی سہی مگر با اصول مناہج پر منظم کرنا چاہیئے۔

ڈاکٹر محمد ذکی کرمانی ۔ ڈائرکٹر سنٹر فار اسٹڈیز آن سائنس، علی گڑھ

لکچر (۱) ٹکنالوجی کے استعمال کے مضر اثرات اکثر بعد میں واضح ہوتے ہیں جس کی جانچ سے پتہ چلتا ہے کہ عوام سے پوری بات معلوم ہوتے ہوئے بھی دانستاً چھپائی جاتی ہے اس سلسلے میں یوکلپٹس کے پیڑوں کی وسیع پیمانے پر شجرکاری سے پیدا نقصانات یا ایسی دواؤں جیسے تھیلوڈیا ئڈ یا میکسافارم کے استعمال سے پیدا مضر اثرات کی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ ٹکنالوجی کے استعمال کا سلسلہ اقتصادیات کے علاوہ خاص سیاسیات اور سماجیات سے بھی جڑا ہوا ہے۔ اس لیے سائنس کے استعمال میں دیگر محرکات کا جائزہ لینا ایک ضروری اور بروقت عمل ہے۔

لکچر (۲) یورپی اقتدار اور سائنس کے فروغ کا جائزہ علماء اور مفکرین پر ضروری اثر پڑا اور اس کا ردعمل سامنے آنے لگا۔ عبدالقادر جون پوری نے فرانسیس بیکن کی تصانیف کا تنقیدی جائزہ لیا اور تفضل الحسین نے نیوٹن کی پرنسپیا کا ترجمہ کیا۔ یہاں موصوف نے فتح اللہ شیرازی، عبدالرحیم دہری اور ایک نو مسلم کو نوم شیخ عبدالواحد اور میر حسن عسکری کی طرف بھی اشارہ کیا۔ ۱۹۶۰ء کے بعد "اسلامی سائنس" کی اصطلاح رائج کی گئی جس کی وضاحت سے حسب ذیل فوائد حاصل ہونے کی امید کی جا سکتی ہے۔

(۱) ریسرچ کرنے کے لیے مناسب موضوعات کا انتخاب

(۲) ہماری نا دنوش، صحت، مکان وغیرہ سے متعلق ضروریات کا مناسب حل اور ازالہ

(۳) سماجی ضروریات جیسے سڑکوں، تالابوں، نہروں وغیرہ کے مناسب ڈیزائن

(۴) ہماری دفاعی ضروریات کی مناسب تکمیل

(۵) ہماری اقتصادی حالت کا سدھار اور

(۶) ہمارے غور کے جمالیاتی تقاضوں کی تسکین وغیرہ

ڈاکٹر محمد ریاض کرمانی = سنٹر فار اسٹڈیز آن سائنس، علی گڑھ

(لیکچر ۱) اسلام کو نہ صرف در قول بلکہ در عمل اپنانا ضروری ہے قرآن میں سائنس کی تلاش یوں غلط ہے کہ خود ثبوتیت پسندی کے مطابق مابعد الطبیعیاتی باتیں ثبوتی سائنس کے دائرے سے ماوراء ہوتی ہیں۔ البتہ ظن سے یقین تک پہنچنے کے سائنس کے علاوہ بھی کچھ اور طریقے ہو سکتے ہیں یہاں عقل کے ساتھ وجدان کی اہمیت کو بھی تسلیم کرنا ضروری ہے۔ بعض تجربے یا معجزے ایسے یکتائے زمانہ ہو سکتے ہیں کہ سائنس کی طرح ان کی بار بار دہرا کر تصدیق کی امید بے معنی ہو سکتی ہے۔

(لیکچر ۲) اسلامی سائنس کی طرح کی "دیگر سائنس" یا تکمیل یافتہ سائنس" کا نمونہ ہے۔ ایک تعریف کے مطابق فطرت کے کسی بھی موضوع سے متعلق قرآن حکیم کا پیغام "اسلامی سائنس" میں شامل ہے۔ (النجار، کتانی، غنیم، زین، ذکی کرمانی وغیرہ) ایک اور تعریف کے مطابق اسلامی سائنس وہ سائنس ہے جو اسلام کی شریعت کے اصولوں کے مطابق منظم اور متشرح کی گئی ہو (وقار الحسینی) موخر الذکر تعریف میں اس کا امکان باقی رکھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ سائنس کی تولید بہر حال سیکولر (مذہبی یا لامذہبی) دونوں قسم کے لوگوں اور طریقوں سے ہو سکتی ہے لیکن پھر عمل کو نیت سے جوڑنا بھی نہایت ضروری ہوتا ہے۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ عہد وسطیٰ کی سائنس اسلامی سائنس ان معنوں میں تھی کہ وہ اسلام کے وسیع تر پس منظر میں کی گئی تھی (سید حسین نصر) اور اسلامی سائنس کے لئے ضروری ہے کہ سائنس کی منہاجیات یا طریقہ ہائے تفتیش وغیرہ بھی اسلامی اصولوں کے مطابق ہو۔ بعض اور حضرات کا کہنا تھا کہ جہاں قرآن اللہ کا کلام ہے تو فطرت اللہ کا کام ہے اس لیے ہر طرح کی سائنسی تفتیش اسلامی عبادت میں داخل ہے (سر سید احمد خان) موخر الذکر سے جہاں مغربی سائنس کی پر زور تائید کی گئی وہیں اسلامی عقائد پر قائم رہنے پر بھی زور دیا گیا۔

ڈاکٹر محمد افضال۔ لیکچرر شعبۂ حیاتیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ہولس کے مطابق بیکن کی دنیا میں اخلاق انسان ایک خطرناک انسان ہوتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ آیا سائنس داں اپنے کیے کا اخلاقی طور سے جوابدہ ہے یا نہیں؟ کیا یہ صحیح نہیں کہ سائنس کے استعمال سے امیر قومیں زیادہ امیر اور غریب قومیں زیادہ غریب ہوتی جا رہی ہیں؟

کیا واقعی سائنس صرف تلاش حق کا ہی دوسرا نام ہے اور کیا مذہب کے عقائد جیسا کہ کہا جاتا ہے توہمات پر مبنی ہیں؟ ویسے تو بیکن ایک انقلابی بت شکن بن کر ابھرا تھا۔ اس کے مطابق لوگ قبائلی بت' بازار کے بت' غار کے بت اور تھیٹر کے بت وغیرہ گڑھ لیتے ہیں اور ان کی تقلید میں گھر جاتے ہیں' جب کہ سائنس ایسے سارے توہماتی بتوں کو توڑ دیتی ہے) لیکن سائنس کے استعمال سے جو عدم توازن' تشدد اور زیاں ہوا اور انسان کے طغوی میں بے رحم اضافے ہوئے اس کی ذمہ داری بھی سائنس کی اپنی بے دینی' لا اخلاقی ہی پر عائد ہوتی ہے۔

جناب جمشید اختر۔ انجینئر۔ فیض آباد۔ یو پی

قرآن حکیم میں دیئے گئے واقعات کی وضاحت میں تاریخ اور آثار یات (آرکیالوجی) کی مدد لینا چاہیئے۔ مثلاً طوفانِ نوح کو لیجئے یہ سیلاب کوئی دس ہزار سال قبل وسیع عالمی پیمانے پر برف کے ٹوٹنے اور برفانی عہد کے ختم ہونے کا نتیجہ تھا۔ ایسا ہی ایک سیلاب چند دن پہلے آئس لینڈ میں چھوٹے پیمانے پر آیا۔ برف کے گلیشیر جو سائبیریا سے لے کر نیچے تک جمع تھے زمین سے آتش فشاں پہاڑوں سے نکلنے لاوے کی گرمی سے رفتہ رفتہ اندر ہی اندر پگھلتے رہے اور جیسے جیسے برف کے نیچے پانی کا زور بڑھتا گیا ہر طرف یہ خدشہ واضح ہونے لگا کہ جب بالآخر برف پھٹے گی تو زبردست ریلا پانی کا آئے گا۔ چنانچہ یہی ہوا۔ تیزی سے بدلتی آب و ہوا کے نتیجے میں جھکڑ' بارش' طوفان آئے۔ اس کے علاوہ ترکی کے کوہ ارارات پر ایک بڑی کشتی نما چیز کے آثار پتھر میں بدلے ہوئے ملے ہیں۔ مزید تحقیق کے لئے یہ اشارے کافی ہیں۔

ڈاکٹر رحمٰن طبی ماہر ممبئی اور چینائی

موصوف نے ہندوستان میں اسلامی یونیورسٹی برائے سائنس اور ٹکنالوجی قائم کرنے کی ضرورت پر زور دیا جس کے لئے پانچ سو ایکڑ زمین حاصل کرنے کے لئے بات چیت رہی ہے موصوف نے تفصیلی اعداد و شمار کے ذریعہ واضح کیا کہ سائنسی تحقیق میں عالمی سطح پر مسلمانوں کا رول ان کی تعداد کی نسبت سے بہت کم ہے۔ ایک طرف خارجی عوامل نے مسلمانوں کو تعلیم اور اثر و رسوخ سے دور کرنے کی کوشش کی تو دوسری طرف مسلمان خود بھی جدید تعلیم سے گریز کرتے رہے۔ اب بھی امیر

عرب ممالک کو تکمیل شدہ مال خرید نے سے زیادہ دلچسپی ہے بہ نسبت یہ کہ خود ریسرچ کروا کر
نئی دریافتوں میں دوسروں سے سبقت لے جائیں۔ موصوف کے مطابق تعلیمی اداروں میں تدریس
کے ساتھ تحقیق پر بھی زور ہونا چاہیئے۔ دینی مدارس میں سائنسی مضامین پڑھانا چاہیئے۔ عورتوں
کو سائنسی مضامین پڑھنے پڑھانے کی ترغیب دینی چاہیئے۔ ساتھ ہی قرآن حکیم کو مقامی زبانوں
میں سمجھا کر بتانا چاہیئے' مغربی علوم و فنون کو مقامی زبانوں میں لاکر اپنانا چاہیئے۔ مسلمانوں کی تعلیمی
سماجی' معاشی پس ماندگی دور کرنے کے ہر قدم کا خیر مقدم کرنا چاہیئے اور حکومت اور دیگر
اداروں سے اس سلسلے میں تعاون کرنا چاہیئے۔

ڈاکٹر رئیس احمد سنٹر فار اسٹڈیز آن سائنس' علی گڑھ

اس پُر آشوب دور میں قرآن حکیم کے پیش کردہ " امانت" اور " توازن" کے تصورات
سائنسی انسان کی بھرپور رہبری کر سکتے ہیں امانت میں خدا کا عطا کردہ علم' جائیداد'
دیگر صلاحیتیں اور املاک وغیرہ سبھی کچھ آجاتا ہے۔ توازن کے مفہوم میں میزان یا مقداری
توازن' سیمٹری یا تماثل' عدل و انصاف' اصراف یعنی بے جا صرف سے بچاؤ' لالچ سے پرہیز
اور طلائی متوسط طرزِ زندگی اپنانا یہ سب کچھ آسکتا ہے۔ ان معنوں میں قرآن قابلِ
برداشت ترقی یا نمو' قدرتی نظام میں عدم توازن سے گریز اور سائنس اور ٹکنالوجی کے دور
اندیشانہ استعمال کا علم بردار ہے۔

ڈاکٹر محمد حبیب الحق انصاری : شعبۂ طبیعات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

مقالہ نگار نے طبیعات کے شہرۂ آفاق نظریئے کوانٹم میکانیکس میں غیر محلی اثرات کے
پائے جانے سے متعلق امور کا جائزہ لیا اور سائنس میں حقیقت پسندی اور مظاہر پسندی کے
پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ موصوف نے کہا کہ توحید کی جستجو اسلامی فکر کا خاصہ رہی ہے سپر اسٹرنگ
نظریہ جو بنیادی جسیمات' قوات اور فضا و وقت تسلسل کو متحد کرنے میں قدرے کامیاب
ہے۔ ہندوستان کے قدیم ادویتا ویدانتا اور صوفی وحدت الوجود کے فلسفے سے کسی قدر نظریاتی
ہم آہنگی میں ہے۔ موصوف نے علامہ اقبال کی شاعری میں حیاتیت کے اثرات سے متعلق اپنے خیالات

علاوہ کیا کہ کس طرح شاعری اور سائنس (۱) کائنات کی حرکت پذیری (۲) کرۂ حیات کی وحدت (۳) ذرائع حیات کی گردش (۴) ارتقاء کے دوران جدوجہد اور فطری انتخاب (۵) انسان کے اپنے ارتقائی مرغولے کے راس پر ہونے اور (۶) کرۂ ہوش کے فروغ کے ضمن میں بڑی حد تک ملتے جلتے خیالات کے عکاس ہو سکتے ہیں۔ آخر میں مقالہ نگار نے نرگس کی مثال لے کر سائنسی نظریوں کو وضع کرنے میں مدد انکشافی اصولوں کو بھی وضاحت فرمائی۔ جیسے کہ :۔

۱۔ قابلِ مشاہدہ ہونے کا اصول

۲۔ نظریاتی سادگی کا اصول

۳۔ ریاضیاتی خوب صورت کا اصول اور

۴۔ جو منطقی طور سے سوچا جا سکا وہ واقعتاً وجود بھی رکھتا ہو، کا اصول وغیرہ

مقالہ نگار نے کئی مثالیں دے کر واضح کیا کہ سائنس، ادب، فلسفہ اور مذہب کے باہم مطالعے سے ایک آفاقی اور اخلاقی نظام فکر و عمل کیسے مرتب کیا جا سکتا ہے جو امن عالم کے نفاذ میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔

اس طرح یہ ورک شاپ کئی کامیاب نتیجے اخذ کرتے ہوئے اور مستقبل کے لیے ایک لائحۂ عمل مرتب کرتے ہوئے بخیر و خوبی اختتام کو پہنچی۔



پسماندہ طبقات کا مسیحا امبیڈکر

ہمارے دستور کے معمار اور غریبوں کے مسیحا امبیڈکر جنھوں نے آزاد ہندوستان کی تشکیل میں اہم رول ادا کیا سماج کے کمزور طبقات سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی شخصیت کے زور، جدوجہد، ایثار اور قربانی کی وجہ سے ترقی کی معراج پر پہنچ گئے اور ہماری قومی زندگی اور سیاست پر ان مٹ نقوش چھوڑے۔

ڈاکٹر بھیم راؤ رام جی امبیڈکر جنھیں پیار سے بابا صاحب کہا جاتا ہے۔ مدھیہ پردیش کے مہوہ مقام پر ایک غریب مہار گھرانے میں ۱۴ اپریل ۱۸۹۱ء کو پیدا ہوئے۔ امبیڈکر صوبیدار میجر رام جی ملوجی کی چودھویں اولاد تھے۔ صوبیدار میجر رام جی ملوجی ایک جفاکش اور پرجوش شخصیت کے مالک تھے جبکہ ان کی بیوی بھیم بائی ایک خوددار خاتون تھیں۔

امبیڈکر اپنی ابتدائی تعلیم ستارا میں مکمل کی۔ پچھڑے ہوئے طبقہ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے وہ مصائب اور بے عزتی کا شکار ہوئے۔ انھیں سب کے لئے استعمال کئے جانے والے پانی کے برتن سے پانی پینے کی اجازت نہیں تھی۔ انھوں نے زبردستی فارسی پڑھی چونکہ سنسکرت کے استاد نے انھیں پڑھانے سے انکار کر دیا۔ امبیڈکر ان تمام مصائب کا پامردی سے مقابلہ کرتے ہوئے اپنی تعلیم جاری رکھی اور ۱۹۰۷ء میں میٹرک کا امتحان کامیاب کیا۔

پہلی دفعہ ایک "مہار لڑکا" کی یہ کامیابی پورے مہار فرقہ کے لئے ایک اعزاز تھا جسے انھوں نے جشن کے روپ میں منایا اور امبیڈکر کو گوتم بدھ کی سوانح بطور تحفہ پیش کی گئی۔ اس کتاب نے امبیڈکر کی زندگی میں زبردست انقلاب پیدا کیا۔ میٹرک کے امتحان میں کامیابی کے کچھ عرصہ بعد رام بائی سے ان کی شادی کر دی گئی۔

اسی دوران سر نارائن گنیش چنداورکر نے سماج کے کمزور اور پچھڑے ہوئے طبقات کے فروغ کے لئے پہلی مرتبہ ایک منظم کوشش شروع کی۔ یہ تحریک امبیڈکر کے لئے ایک نادر موقع ثابت ہوئی اور انھوں نے بمبئی کے الفنسٹن کالج میں داخلہ حاصل کر لیا۔ گریجویشن کی تکمیل کے بعد امبیڈکر نے بڑودہ میں ملازمت حاصل کر لی۔ لیکن حصولِ علم کی انمٹ پیاس نے انھیں زیادہ عرصہ تک بڑودہ میں رہنے نہ دیا۔

امبیڈکر کے ہاتھ زندگی کا سنہری موقع اس وقت ہاتھ آیا جب مہاراجہ بڑودہ نے دیگر تین ہونہار طالب علموں کے ساتھ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے انھیں جولائی ۱۹۱۳ء کے دوران امریکہ کی کولمبیا یونیورسٹی روانہ کیا جس کے عوض امبیڈکر تعلیم کی تکمیل کے بعد دس برسوں تک بڑودہ کی سرکاری ملازمت کے معاہدہ پر دستخط کئے۔

امریکہ کی آزاد جمہوری فضا، اور علمی ماحول نیز کتب بینی کے شغف نے ان کی ذہنی صلاحیتوں کو جلا بخشی اور ان کے ذہن کو حصولِ علم کے ایسے سفر کی جانب موڑ دیا جو ذات پات کی بندشوں سے آزاد تھا۔ اسی دوران ان کی ملاقات مشہور قوم پرست لیڈر لالہ لجپت رائے سے ہوئی جو امریکہ میں جلا وطنی کی زندگی گذار رہے تھے دونوں نے ہندوستان کی جدوجہد آزادی کے موضوع پر گفتگو کی۔ اس طرح بھیم راؤ کے دل میں حب الوطنی کے جذبات پھوٹ پڑے۔ مغرب کی فراخدلانہ جمہوری فکر نے انھیں ایک کٹر قوم پرست اور انسانی حقوق کا پرجوش محافظ بنا دیا۔

قیام امریکہ کے دوران امبیڈکر دو چیزوں سے بے حد متاثر ہوئے ایک امریکی آئین اور اس کی ۱۴ ویں ترمیم جس نے سیاہ فام حبشیوں کو آزادی دلائی اور دوسری نیگرو طبقہ کے عظیم مصلح اور ماہرِ تعلیم بوکر ٹی واشنگٹن کی زندگی۔ واشنگٹن کی وجہ سے نیگرو طویل غلامی سے نجات حاصل کی۔

کولمبیا میں پوسٹ گریجویشن کی تکمیل کے بعد اکتوبر ۱۹۱۶ء میں امبیڈکر نے لندن اسکول آف اکنامکس و پولیٹیکل سائینس میں داخلہ حاصل کیا۔ لیکن اسی دوران ان کے وظیفہ کی

معیاد پوری ہوگئی۔ اور معاہدہ کا رو سے انھیں مہاراجہ بڑودہ کا ملٹری سکریٹری مقرر کیا گیا اور وہ ہندوستان لوٹنے پر مجبور ہو گئے۔ امبیڈکر اپنے شخصی وقار کے باوجود ہندو مذہب کے بھید بھاؤ سے بچ نہ سکے۔ خود ان کے ماتحتین نے ان کے ساتھ بدسلوکی۔ اس نفرت انگیز ماحول کو خیر باد کہہ کر وہ بمبئی چلے آئے یہاں ایک کالج میں کچھ عرصہ تدریسی فرائض انجام دینے کے بعد قانون اور معاشیات کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے وہ لندن روانہ ہو گئے۔

۱۹۱۸ء کے دوران تقریباً اسی وقت ساؤتھ برو کمیٹی جو مونٹاگو، چیمسفورڈ اصلاحات کی روشنی میں حق رائے دہی پر غور کر رہی تھی امبیڈکر کو شہادت دینے کے لئے طلب کیا انھوں نے پسماندہ طبقات کے لئے علیحدہ الکٹوریٹ اور محفوظ نشستوں کا مطالبہ کیا۔ کمیٹی نے ان کے اس مطالبہ کو قبول نہیں کیا۔

۱۹۲۳ء میں لندن سے واپسی کے بعد انھوں نے محسوس کیا کہ وہ اپنے آپ کو چھوت جیسی سماجی لعنت سے الگ نہیں کر سکے۔ امبیڈکر نے پچھڑے ہوئے طبقات کے سماجی و معاشی فروغ کے لئے کام کرنے کا تہیہ کر لیا اور بمبئی ہائیکورٹ میں وکالت شروع کر دی۔ امبیڈکر نے اپنی ذات برادری میں بیداری پیدا کرنے کی غرض سے پندرہ روزہ مراٹھی جریدہ "مک نائیک" جاری کیا۔ ان کے خیال میں غیر برہمنوں کی پسماندگی کا سبب تعلیم کی کمی تھا انھوں نے پسماندہ طبقات کو دائمی غلامی، غربت اور کم فہمی سے نجات دلانے کے لئے حصول تعلیم کو ضروری قرار دیا۔ ایک دوسرے معنوں میں انھوں نے کہا کہ ہندوستان کے لئے صرف آزادی کا حصول کافی نہیں بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے عوام کو مذہبی سماجی اور سیاسی معاملات میں مساویانہ حقوق کی ضمانت دے اور ہر فرد کو ترقی کے مواقع فراہم کرے۔

جب دوسرے تمام لیڈر ملک کی سیاسی آزادی کے لئے لڑ رہے تھے امبیڈکر نے پسماندہ طبقات کو انسانی سطح پر لانے کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ یہ ایک نفسیاتی تحریک تھی۔

انھوں نے ۴ جولائی ۱۹۲۴ء کو "بہشکرت ہتکارنی سبھا" نامی ایک سماجی تحریک شروع کی۔ اکولہ ضلع میں مہاڈ کے مقام پر ایک تالاب سے اچھوتوں کو پانی حاصل کرنے کا حق دلانے کی خاطر انھوں نے ستیہ گرہ کی۔ ہندوستان میں یہ تحریک سماجی انصاف کی شروعات تھی ۱۹۲۷ء میں امبیڈکر نے بہشکرت ناٹک شروع کی۔ اس کے بعد ایکوالیٹی EQUALITY اور بہشکرت بھارت "جاری کیا۔ اس کی تنظیم "سماج سماتا" نے بین فرقہ جاتی شادیوں اور ڈنرس کی ہمت افزائی کی۔

لندن میں منعقدہ گول میز کانفرنس کے دوران سیمن کمیشن نے ڈاکٹر امبیڈکر کو اچھوتوں کی نمائندگی کے لیئے طلب کیا۔ انھوں نے ایک بار پھر پسماندہ طبقات کے لئے علیحدہ فہرست رائے دہی کے مطالبہ پر زور دیا۔ اسی دوران انھیں بمبئی لیجسلیٹیو کونسل کا رکن نامزد کیا گیا جس پر وہ ۱۹۳۴ء تک برقرار رہے۔ اپنی رکنیت کے زمانہ میں انھوں نے کونسل میں کسانوں، محنت کش طبقات اور اچھوتوں کی بہبود کے لئے مختلف بلز پیش کیئے۔

۱۹۳۷ء میں امبیڈکر نے انڈیپینڈنٹ لیبر پارٹی قائم کی جس نے بمبئی میں ۵ انتخابی نشستوں پر کامیابی حاصل کی اس طرح انھوں نے اپنے آپ کو ایک پختہ کار پارلیمنٹیرین منوالیا۔ جب امبیڈکر کو پہلی مرتبہ بنگال اور دوسری دفعہ بمبئی کی قانون ساز اسمبلی کے لئے منتخب کیا گیا تو انھیں ایک قومی فائدہ قانون داں، ماہر آئین کے طور پر تسلیم کر لیا گیا۔ اگسٹ ۱۹۴۷ء میں انھیں دستور کی مسودہ سازی سے متعلق کمیٹی کا رکن منتخب کیا گیا اور بعد میں اس کمیٹی کا صدر نشین بنایا گیا۔

ڈاکٹر امبیڈکر پسماندہ طبقات کو دستوری طور پر مساویانہ سلوک کی ضمانت کے لیئے پوری کوشش کی۔ انھوں نے دستور میں بنیادی حقوق سے دفعات کو شامل کیا جسے ہندوستانی قوم کو ان کی جانب سے ایک بیش بہا تحفہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ آئین میں ان دفعات کی جس طرح وسیع طور پر وضاحت کی گئی ہے وہ امریکی دستور یا کسی اور ملک کے دستور سے زیادہ مربوط اور جامع ہے۔

ہندوستان کے پہلے وزیر قانون کی حیثیت سے امبیڈکر نے اپنے اختیارات کے ذریعہ ملک کو مساوات اور خوشحالی کی راہ پر گامزن کردیا۔

وہ ایک ماہر تعلیم بھی تھے ان کی شخصیت کا یہ پہلو پوری طرح روشن نہ ہوسکا۔ انہوں نے فرد کی زندگی میں تعلیم کی اہمیت کو محسوس کیا اور اسے اولین اہمیت دی۔ امبیڈکر نے تین ہاسٹلس قائم کئے اور پسماندہ طبقات کے طالب علموں کے لئے مفت درسی کتب فراہم کیے۔ انہوں نے سدھارت کالج سے ہوئی۔ ۱۹۴۵ء میں پیپلز ایجوکیشن سوسائٹی قائم کی۔

ایک ماہر قانون و تعلیم نیز چھوت چھات کی لعنت نے انھیں ہندو سماج کا ناقد بنا دیا۔ چنانچہ ۱۹۵۶ء میں انہوں نے بدھ مذہب قبول کرلیا۔ جب انہوں نے محسوس کیا کہ بدھ مذہب کی بنیاد مساوات پر ہے تو اس مذہب پر ان کے ایقان میں اضافہ ہوتا گیا۔

یہ عظیم سپوت ۶ر ڈسمبر ۱۹۵۶ء کو اس دنیا سے اٹھ گیا۔ حکومت ہند نے امبیڈکر کی عظیم خدمات کو تسلیم کرتے ہوئے انھیں بعد از مرگ ملک کے سب سے اعلیٰ ایوارڈ "بھارت رتن" سے نوازا۔ قوم اس عظیم مصلح کی ہمیشہ احسان مند رہے گی اور اسے یاد رکھے گی۔

(باقی صفحہ ۱۲ سے آگے)

22.45 لاکھ طالب علموں کو فائدہ پہنچنے کی توقع ہے اس کے علاوہ 326.60 کروڑ روپے خصوصی کمپونینٹ پلان کے لئے خصوصی مرکزی امداد کی مد میں رکھے گئے ہیں جس سے 98-1997ء کے دوران 30 لاکھ شیڈولڈ کاسٹس کنبوں کو فائدہ پہنچنے کی امید ہے۔ مزید برآں 67 کروڑ روپے نیشنل شیڈولڈ کاسٹس / ٹرائبس / فینانس اینڈ ڈولپمنٹ کارپوریشن کے لئے مختص کئے گئے ہیں جس سے 98-1997ء کے دوران 30 ہزار ایس سی / ایس ٹی افراد کو فائدہ پہنچنے کی امید ہے۔

——*

شاداب حیدرآباد

آئی جے فیچر

مرکزی بجٹ، سماجی انصاف کے ساتھ ترقی

مشترکہ کم سے کم پروگرام (سی ایم پی) سب کے لئے انصاف کی فراہمی کے مقصد سے سماجی شعبہ کی ترقی کے لئے حکومت کے مستحکم عزم کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس پروگرام میں سماجی شعبہ کو بنیادی شعبہ کا درجہ دیتے ہوئے ریاستی سطح پر اقتصادی وفاقیت کی بنیاد پر خدمات فراہم کرنے کا وعدہ کیا گیا ہے 97-1996ء کے اقتصادی جائزے کے مطابق '96-1995ء کے اقتصادی جائزہ میں جن تین کلیدی چیلنجوں یعنی مالی استحکام، بنیادی ڈھانچہ کی ترقی' روزگار کی فراہمی اور غریبی ختم کرنے کے مقاصد کی نشاندہی کی گئی تھی' انہیں کو مرکزی توجہ کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔

سروے میں مزید کہا گیا ہے کہ ان لوگوں کے لئے جو منڈی پر مبنی معیشت کے حاشیوں پر ہیں' کم سے کم سماجی خدمات کے سلسلے میں موثر انتظام کرنے نیز روزگار کی فراہمی اور غریبی دور کرنے کے خصوصی پروگرام بنانے کی بنیادی ضرورت ہے۔ غریبی کے خاتمے پروگراموں کے مفید اثرات کو زیادہ سے زیادہ وسعت دینے کے لئے استحکام پیدا کرنا اور اعتدال لانا نیز کچھ تراش خراش کرنا بھی مناسب ہوگا۔ اس طرح بنیادی مقصد سماج کے غریب ترین طبقہ کو دیرپا فوائد پہنچانے کے ساتھ ساتھ انتظامی خرابی کو دور کرنا نیز ان خامیوں کا سدباب کرنا ہوگا' جن سے سب اچھی طرح واقف ہیں۔

اس عزم کا اظہار سماجی خدمات کے لئے مرکزی حکومت کے منصوبہ جاتی اور غیر منصوبہ جاتی تصرفات سے ہوتا ہے جن میں 97-1996ء (بی ای) میں مجموعی اندرون ملک پیداوار کے 0.1 فیصد کا ریکارڈ اضافہ کیا گیا ہے یہ اضافہ 96-1995ء میں 0.96 فیصد تھا۔ ریاستوں و مرکز کے زیر انتظام علاقوں کو 2466 کروڑ روپے کی اضافی رقم 97-1996ء کے بجٹ میں

بھی بنیادی کم سے کم خدمات پر خرچ کرنے کے لئے مختص کی گئی تھی۔

1997-98ء کے مرکزی بجٹ میں سماجی شعبہ کے لئے تصرفات میں 33 فیصد کا اضافہ کیا گیا اس عزم کو مزید آگے بڑھایا گیا ہے سال رواں کے بجٹ میں 5707 کروڑ روپے سماجی خدمات کے لئے رکھے گئے ہیں جب کہ گذشتہ سال کے نظر ثانی شدہ تخمینہ میں یہ رقم 1785 کروڑ روپے تھی یہ رقم دیہی علاقوں اور روزگار کی وزارت کے ذریعہ زیر عمل لائی جائے گی۔ غربت کے خاتمہ اور روزگار کے مزید مواقع فراہم کرنے کے تحت شروع کیئے گئے پروگراموں پر یہ رقم خرچ کی جائے گی اور سال رواں میں اس پروگرام کے تحت مزید 127 کروڑ روپے کی مزید رقم دی گئی ہے۔

لازمی بنیادی ضروریات فراہم کرنے والے پروگرام کے لئے مختص کی جانے والی رقم کو رواں مالی سال میں 2466 کروڑ روپے سے بڑھا کر 3300 کروڑ روپے کردیا گیا ہے اس میں گندی بستیوں کی بہتری کے لئے 330 کروڑ روپے کی رقم شامل ہے۔

غریبی کے خلاف لڑائی

بجٹ میں نشاندہی کی گئی ہے کہ غریبی کے خلاف لڑائی بالکل نچلی سطح کی لڑائی ہے۔ غریب وہ ہیں جن کے پاس زمین، پانی یا تعلیم کے مواقع نہیں ہیں۔ متحدہ محاذ سرکار اس بات پر ٹھوس یقین رکھتی ہے کہ غریبی کے خلاف لڑائی میں غریبی ختم کرنے کے پروگرام کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان پروگراموں کے لئے بڑی رقم کی تخصیص کو برقرار رکھتے ہوئے یہ بھی ضروری ہے کہ ان کی تعداد کو معقول بنایا جائے نیز انہیں زیادہ نمایاں اور موثر بنایا جائے۔ فی الوقت منصوبہ بندی کمیشن جامع اقدامات کر رہا ہے اور غریبی ختم کرنے کے پروگراموں کے نظر ثانی شدہ پورٹ فولیو پر یکم اپریل 1997ء سے عمل ہوگا

آج جتنی بھی خود روزگار کی اسکیمیں چل رہی ہیں، مثلاً وزیراعظم کی روزگار یوجنا (پی ایم آر وائی) اور مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام (آئی آر ڈی پی) اور جن کا تعلق مختلف منتخبہ گروپوں سے ہے ان پر ہنر پر مبنی ٹریننگ، کاروباری ترقی اور سبسیڈی سے جڑے ہوئے بینکوں کے قرضوں کی فراہمی کے لئے از سر نو زور دیا جائے گا۔ مقصد یہ ہوگا کہ دس لاکھ نوجوانوں کو خود اپنا منفعت بخش کاروبار شروع کرنے کے قابل بنایا جائے۔

جواہر روزگار یوجنا (جے آر وائی) روزگار فراہم کرنے والی ایک اور اہم اسکیم ہے جس سے 1997ء میں لگ بھگ 520 ملین افرادی دنوں کے مساوی روزگار کے مواقع پیدا ہونے کی امید ہے۔ ایمپلائمنٹ انشورنس اسکیم کے تحت 1970 کروڑ روپے کی منظوری دی گئی ہے تاکہ ملک کے تمام بلاکوں میں کم زراعتی سیزن میں 100 دنوں تک کے لئے غیر ہنر والے روزگار کے خواہاں افراد کو روزگار فراہم کیا جاسکے۔

بنیادی خدمات کی توسیع : بجٹ کی کوشش بنیادی کم سے کم خدمات کے منصوبہ پر سختی سے عمل کرنے کی خدمات کے منصوبہ پر 1997-98ء میں 3800 روپے کا اضافہ شدہ خرچ کے ساتھ اس کا مقصد پینے کا پانی سب کے لئے صحت، پرائمری تعلیم، ہاؤسنگ، سڑکیں اور پوری آبادی کے لئے سرکاری نظام تقسیم کی 2000 تک فراہمی ہے۔

اس سلسلے میں ایک قدیم گاؤں میں پانی کی سپلائی کا تیز رفتار پروگرام ہے جس سے مارچ 1998ء تک 90 ہزار بستیوں کو پینے کا صاف پانی فراہم کرنے کی توقع ہے اس اسکیم کے لئے آئندہ مالی سال میں 1302 کروڑ روپے کی رقم فراہم کی گئی ہے اس کے علاوہ 448 کروڑ روپے لاکھوں کنوؤں کی اسکیم کے لئے مختص کیے گئے ہیں۔

ایک اور پروگرام جس کا نام کستوربا گاندھی شکشا یوجنا رکھا گیا ہے 15 اگست 1997ء کو لڑکیوں کے لئے خصوصی اسکول قائم کرنے کے مقصد سے وزیر اعظم کے ذریعہ شروع کیا جائے گا۔ 1997-98ء کے بجٹ میں اس اسکیم کے لئے 250 کروڑ روپے فراہم کئے گئے ہیں 1960 کروڑ روپے پرائمری تعلیم کے سلسلے میں غذائی امداد کے لئے فراہم کیے گئے ہیں۔ اور 651.31 کروڑ روپئے ضلعی پرائمری ایجوکیشن پروجیکٹ کے لئے مختص کئے گئے ہیں۔

دیہی علاقوں میں مکانات کی قلت دور کرنے کے لئے دیہی مکانات کے سلسلے میں قرض کی ایک اسکیم کا اعلان کیا گیا ہے اپنی ملکیت کی زمین پر اپنا مکان بنانے یا اپنے پرانے مکان کو بہتر بنانے یا اس میں اضافہ کے لئے عام شرح سود دو لاکھ روپئے قرض تک کسانوں کو دیا جائے گا بشرطیکہ مکان کی لاگت کے ایک تہائی حصہ کا انتظام قرض لینے والا کرے۔ اس اسکیم

کی تیاری میں آج کل قومی ہاؤسنگ بنک مصروف ہے جس میں دوسری تنظیمیں بھی حصہ لیں گی۔ اس اسکیم کا افتتاح بھی آئندہ یوم آزادی کے موقع پر وزیر اعظم کریں گے اور پہلے ہی برس کے دوران 5000 قرضے دیئے جائیں گے۔ اس کے علاوہ دیہی غریبوں کے لئے اندرا آواس یوجنا کے تحت لگ بھگ سات لاکھ مکانات کا نشانہ طے کیا گیا ہے۔

حال ہی میں ایک نئے نشانہ شدہ سرکاری نظام تقسیم پر عمل شروع ہوا ہے اس نظام کا مقصد رعایتی شرحوں پر غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گذار رہے لوگوں کو ضروری اناج فراہم کرنا ہے اس اقدام سے لگ بھگ 32 کروڑ لوگوں کے استفادہ کرنے کی توقع ہے اس سلسلہ میں 98-1997ء کے بجٹ میں اناجوں اور چینی کی سبسیڈی کے لئے 7500 کروڑ روپیے رکھے گئے ہیں کہ 97-1996ء کے نظرثانی شدہ تخمینوں کے مطابق اس مد میں 5066 کروڑ روپئے رکھے گئے تھے وزیر خزانہ نے ضرورت پڑنے پر نشانہ شدہ سرکاری نظام تقسیم (ٹی ڈی پی ایس) کے تحت راشن کارڈ کے دوہرے نظام پر عمل درآمد کے لئے مزید سرمایہ فراہم کرنے کا بھی یقین دلایا ہے۔

بنیادی کم سے کم خدمات کے پروگرام اور بنیادی ڈھانچہ کی ضروریات کے لئے فنڈ کی فراہمی سے متعلق اندازی کی کوشش کے تحت مرکز کے 22.5 فیصد فنڈ کے حصہ کو جو کالا دھن استعمال کرنے کے لئے رضاکارانہ طور پر انکشاف کرنے کی اسکیم کے ذریعہ حاصل ہوگا۔ پیداواری مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے گا۔

سماج کے انتہائی کمزور طبقات کی امداد کے لئے بجٹ میں قومی سماجی امدادی پروگرام کے تحت 700 کروڑ روپئے کی رقم مختص کی گئی ہے اس فنڈ کے ذریعہ 49.52 لاکھ معمر لوگوں کو معمرافراد کی پنشن کی قومی اسکیم کے دائرہ میں لایا جائے گا۔ کنبے کی بہبود کی قومی اسکیم سے 3.19 لاکھ ان کنبوں کو فائدہ پہنچے گا جو روزی روٹی کمانے والے اپنے واحد ذریعے سے محروم ہو چکے ہیں۔ ماؤں کی بہبود کی قومی اسکیم کا مقصد آئندہ سال میں 29.15 لاکھ متوقع ماؤں کو فائدہ پہنچانا ہے۔

بجٹ میں کمزور طبقات کی بہبود کے لئے بھی انتظام کیا گیا ہے مثلاً 66 کروڑ روپئے میٹرک کے بعد کے تعلیمی وظائف کے لئے رکھے گئے ہیں جس سے 98-1997ء کے دوران لگ بھگ

(باقی صفحہ ۳۷)

ایک انسائیکلوپیڈیا

عصر حاضر میں پہلی بار عرب دنیا میں ایک ایسا ضخیم انسائیکلوپیڈیا تیار کیا گیا ہے جس میں مغرب کے برعکس دنیا کو اسلامی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس گلوبل عربک انسائیکلوپیڈیا کی تیس جلدیں ہیں اور اس کی طباعت کے اخراجات سعودی شہزادے اور وزیر دفاع سلطان بن عبدالعزیز السعود نے برداشت کیے ہیں جو سعودی عرب کے موجودہ حکمراں شاہ فہد کے بھائی ہیں۔ اس انسائیکلوپیڈیا کی نمائش گزشتہ دنوں قاہرہ کے بین الاقوامی میلے میں کی گئی۔ سولہ ہزار سے زیادہ صفحات پر مشتمل اس انسائیکلوپیڈیا میں بیس ہزار آٹھ سو مندرجات اور ساڑھے تین ہزار نقشے چارٹ اور فوٹو گراف ہیں۔ ایک سعودی شہری احمد مرادی الشویکت نے اس کام کی نگرانی کی ہے۔ یہ اسٹین فورڈ کے تعلیم یافتہ ہیں انہوں نے بتایا کہ عربوں کی علمی ضروریات کو اور عرب قارئین کو مدنظر رکھتے اسے ترتیب دیا گیا ہے ایک ہزار سے زیادہ ماہرین نے ساڑھے چھ برس کے عرصے میں جو کام کیا ہے اس کے مندرجات کسی بھی مستند انسائیکلوپیڈیا جیسے ہیں البتہ اس کے سائنسی حصے میں عربوں کے تعاون کا خصوصی تذکرہ ہے بالخصوص ابتدائی علم نجوم، ادویات اور ریاضی کے میدانوں میں۔

عرب دانشوروں اور مترجمین کا یہ پہلا کارنامہ نہیں بلکہ ماضی میں انہوں نے اس طرح کی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں نویں صدی عیسوی میں خلافت عباسیہ کے دوران حکومت بغداد میں بیت الحکمت کی تعمیر عربوں ہی کا کارنامہ ہے جنہوں نے ایک ایسے دور میں جب یورپ جہالت کی انتہائی تاریکیوں میں ڈوبا ہوا تھا نہ صرف یونانی علوم اور فلسفے کو عربی زبان میں منتقل کر کے اس کی حفاظت کی بلکہ انہیں ترقی کی نئی نئی منزلوں سے کرایا۔ موجودہ طرز کے اولین انسائیکلوپیڈیا فرانسیسی اور انگریزی زبانوں میں اٹھارہویں صدی میں وجود میں آئے جبکہ عربی کا پہلا انسائیکلوپیڈیا دسویں صدی عیسوی میں وجود میں آیا۔

محمد اسد اللہ خان زائر



مکتب شاداب، اور مرکز ادب، حیدرآباد کے زیر اہتمام ۲۵ اپریل ۱۹۹۷ء کو مشاعرے کا انعقاد عمل میں آیا تھا۔ اس طرحی مشاعرے کی کچھ غزلیں قارئین "شاداب" کی خدمت میں پیش ہیں۔ (ادارہ)

کیا قافیہ ردیف کی تہمت اٹھائیں ہم
تم خود غزل ہو تم کو غزل کیا سنائیں ہم

کیا کیا تمہارے ساتھ مزے اب اڑائیں ہم
ہولی منائیں ہم کہ دیوالی منائیں ہم

اک غول ہو حسینوں کا، آموں کے پیڑ ہوں
ساون میں وہ جو آئیں تو جھولا جھلائیں ہم

وفا ہمارے حق میں زلیخا سے کم نہیں
کیسے اب اس کے ہاتھ سے دامن چھڑائیں ہم

طفلانِ خوش سخن کو سلیقہ نہیں ذرا
جی چاہتا ہے اب انھیں لوری سنائیں ہم

ہم پارسا نہیں ہیں تو کچھ تم بھی کم نہیں
تنہا کہاں تلک کوئی تہمت اٹھائیں ہم

مژگاں کے تیر کر گئے چھلنی میرا بدن
جو زخم رس رہے ہیں انھیں کیا دکھائیں ہم

اپنوں کی بھی معاف کریں گے خطائیں ہم
جب دشمنوں کو دینے لگے ہیں دعائیں ہم

زائر یہ جبر و جور، یہ ظلم و زیادتی
اب دیکھتے ہیں چار سو جلتی چتائیں ہم

طرحی غزلیں

ڈاکٹر سید حسن

★

تیری گلی سے اٹھ کے نہ مایوس جائیں ہم
اس شہرِ بامراد میں مقصود پائیں ہم
ردکش بھی اُس کے ہو کے نہ اُس کو سنائیں ہم
کہنے کی بات دل میں لیئے لوٹ جائیں ہم
افسردگی تاسف و خفت مٹائیں ہم
دانتوں میں رکھ کے اپنا انگوٹھا چبائیں ہم

ق

بازو لگائیں پیڑ پھر اک پینگ ڈال دیں
اپنی گلی میں صحن کے آثار لائیں ہم
مغرب میں بکھری زلفِ گرہ گیر کی حدیث
"کب تک سنے گی رات کہاں تک سنائیں ہم"
بچے تھے کتنے سادے سے ہم اپنے عہد کے
ان کو وہ پرانی کہانی سنائیں ہم
انساں ہزاروں سالوں سے سب کچھ ہے لکھ گیا
قسمت میں تھا حسن بہت بعد آئیں ہم

قمر صابری

ممکن ہی نہیں ہم سے آپ سے بھول جائیں ہم
ایسا جگر کہاں سے محبت میں لائیں ہم
صدیوں پہ مشتمل ہے فسانہ فراق کا
"کب تک سنے گی رات کہاں تک سنائیں ہم"
کہنے کو اک ہجوم ہے ہمدرد کون ہے
کوئی سنے تو درد کی بپتا سنائیں ہم
کیا نذر دیں قبول ہو ان کی جناب میں
اربابِ اقتدار سے کیا دل لگائیں ہم
دیر و حرم کے خانۂ ویراں میں کچھ نہیں
دل کی طرف بھی دیکھ لیں کیوں دور جائیں ہم
اہلِ وفا کو کعبۂ مقصود مل گیا
اب آستانِ یار سے کیا دور جائیں ہم
رخسارِ لالہ فام، مئے احمریں کے ساتھ
زاہد کو آج اک نئی دنیا دکھائیں ہم
شکرانہ کچھ تو خنجرِ قاتل کا ہو ادا
ہر زخم پہ گلوں کی طرح مسکرائیں ہم
طے مرحلہ ہو جہدِ مسلسل کے زور پہ
مریخ کی فضاء میں قمر گنگنائیں ہم

طرحی غزلیں

بے حس الہ آبادی

یہ ہلاں ہیں رستے درد کہاں تک دکھائیں ہم
دل سے یہ نقشِ آرزو کیسے مٹائیں ہم

رودادِ زندگی ہے مسلسل تباہ کن
کیسے سنے گی رات، کہاں تک سنائیں ہم

خوابِ حسیں تو نظروں میں مثلِ سراب ہے
کیونکر تصورات کے ایواں نہ ڈھائیں ہم

ہر اک قدم پہ جراتِ مردانہ ہے حیات
آلام و غم میں غیر کو کیونکر بلائیں ہم

اس دورِ انقلاب میں خاموش کیوں رہیں
ہنگامہ ہو بپا کوئی فتنہ اٹھائیں ہم

پھیلا کے ہاتھ اپنا گنوائیں نہ آبرو
بے حس جہاں میں اپنی نہ وقعت گھٹائیں ہم

اطیب اعجاز

اک انقلاب ایسا بھی دنیا میں لائیے
اپنی انا کے کفر کو خود توڑ پائیں

جو دیکھتا نہیں ہے اسے کیا دکھائیے
جو مانتا نہیں ہے اسے کیا منائیے

کچھ کام ایسے بھی تو یہاں کر کے جائیے
بدلے میں جس کے جنتِ فردوس پائیے

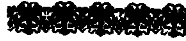
پہلے پہل ملی ہے یہ سوغاتِ غم
دل کہہ رہا ہے جشنِ عنایت منائیے

ہم اس پہ جان دیتے ہیں یہ جانتے ہوئے
اپنی طرف سے اور اسے کیا بتائیے

اطیب نہ مل سکے گی اماں دو جہاں
ممتا سے ماں کی فیض اگر کچھ نہ پائیے

(طرحی غزلیں)

محمود حسینی **لئیق شبنم**



نغمے مسرتوں کے جہاں بھر میں گائیں ہم
غم دوسروں کے سہہ کے چلو مسکرائیں ہم

ظلمت کدوں میں نور کی شمعیں جلائیں ہم
آؤ کہ تیرگی کو اجالے بنائیں ہم

یارو تصوروار فقط رہنما ہی کیوں ؟
اپنے قدم بھی سوچ سمجھ کر اٹھائیں ہم

کب تک رہے گا یونہی غلط فہمیوں کا دور
آؤ بلند و پست کے جھگڑے مٹائیں ہم

ہم کو تو صرف جاگنے والوں سے کام ہے
سونا جو چاہتے ہیں انہیں کیوں جگائیں ہم

ہنگامہائے دہر میں محمودؔ کیوں نہ اب
الفت کے گیت پیار کے نغمے سنائیں ہم

پاتے ہیں کتنی جرم وفا کی سزائیں ہم
بولیں تو شرم آتی ہے اب کیا بتائیں ہم

دل پارہ پارہ اور جگر خاک ہوگیا
اب اے نگاہِ یار کہاں چوٹ کھائیں ہم

گر ہونٹ چپ رہیں تو نگاہیں بیاں کریں
جو راز چھپ نہ پائے اسے کیا چھپائیں ہم

کتنے فریب کھائے ہیں دل پھر بھی ہے مصر
پھر سے امید بندھیں انھیں آزمائیں ہم

مژدہ اے دل کہ وہ ہی پس مرگ آگئے
جی چاہتا ہے موت کی لے لیں بلائیں ہم

آزارِ عشق سے کبھی شبنمؔ مفر نہیں
کرتے رہیں گے یوں ہی جفا وہ، وفائیں ہم

طرحی غزلیں

الفت شرعی

الفت کا بوجھ دوستو کب تک اٹھائیں ہم
گھر اک سکوں کا دل میں بھی آؤ بنائیں ہم

ماہر ہیں ایسے فن میں ذرا آزما تو لو!
تم کو ہنسائیں یا کہ بتاؤ رلائیں ہم

ہر ایک مردہ دل نظر آتا ہے آج کل
احساس زندگانی کا کس کو دلائیں ہم

گردن ہی اپنی آج کٹانے میں ہے سکوں
ہاتھ سے بڑھ کے ہاتھ کہاں تک ملائیں ہم

سوچا ہے نفرتوں کی ڈگر سے نکل پڑیں
اب تو خلوص پیار کی شمع جلائیں ہم

ہم کو تو دوستوں نے کبھی کچھ نہیں دیا
دشمن کو کیوں نہ سینے سے بڑھ کر لگائیں ہم

الفت ہماری داستاں کافی طویل ہے
کب تک بسوز گریہ [illegible] سنائیں ہم

سید حسن علی شاہ محسن قادری



بے وجہ تلخیوں کو بھلا کیوں بڑھائیں
دانستہ اس کو دیکھ کے کیوں مسکرائیں

ہر غم کو زندگی کے گلے سے لگائیں
کچھ حوصلہ حیات کا اپنی بڑھائیں

ہے ضبط کا تقاضہ زباں پہ نہ لائیں
اب حال دل تمہیں کہو کیسے سنائیں

تو چارہ ساز ہے تو مداوا لے درد
اپنی زباں سے اپنا مرض کیوں بتائیں

سربستہ حیات میں کچھ تو عمل رہے
ورنہ بروز حشر کیا صورت دکھائیں

افسانۂ حیات بہت ہی طویل
کب تک ستمگر رات کہاں تک سنائیں

محسن تو بری نگاہ سے بچنا ہو گر
بہتر ہے اپنے آپ کو سب سے چھپائیں

ماہنامہ

شاداب حیدرآباد

جلد : ۱۳
شمارہ : ۶
جون ۱۹۹۷ء
قیمت ۱۰ روپے

زرِ تعاون

ملک	سالانہ	دو سال کیلئے	تاحیات
ہندوستان	۱۰۰ روپے	۱۸۰ روپے	۱۵۰۰ روپے
خلیجی ممالک	۳۰۰ ،،	۵۵۰ ،،	۴۰۰۰ ،،
امریکہ	۵۰ ڈالر	۹۰ ڈالر	۹۰۰ ڈالر
انگلستان	۳۰ پونڈ	۵۰ پونڈ	۵۰۰ پونڈ
پاکستان	۲۰۰ روپے	۲۵۰ روپے	۴۰۰۰ روپے

(ترسیلِ زر کا پتہ)

ماہنامہ شاداب ۱۴۷-۵-۱۱ ریڈ ہلز ۔ حیدرآباد

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپوا کر دفتر شاداب ۱۴۷-۵-۱۱ ریڈ ہلز حیدرآباد سے شائع کیا۔

فہرست

شاداب کے جن خریدار صاحبان کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے یا ہونے والی ہے براہ کرم وہ تجدید فرمالیں یا اپنی رائے سے آگاہ فرمادیں۔



میں اخبار کیوں پڑھتا ہوں؟

اندر کمار گجرال
وزیر اعظم
ہندوستان

آزاد ہندوستان میں آزادیٔ تحریر تو بنیادی حق مان لیا گیا تھا اس لئے صحافت بھی جلد بلوغت کو پہنچ رہی تھی ملک میں چوٹی کے دانشور اور صاحبِ قلم سرکردہ اخباروں کے کالموں کو زینت دے رہے ہیں۔ اخبار پڑھنا جذبات اور ذہن کو تسکین دینے لگا تھا بیشتر ایڈیٹر اور تبصرہ نگار سرکار کی کارکردگی پر آزادانہ رائے دینے لگے تھے صحافت جمہور میں اپنا رول بنانے لگی تھی۔ یوں تو اس دور میں انگریزی اخبار خاص کر بنگالی اور ملیالم میں ثابت قدم تھے ہندی کے اخباروں کو اپنا کردار بنانے اور جگہ حاصل کرنے میں وقت لگ رہا تھا بنیادی زبان تو اردو تھی۔ تقسیم وطن کی چوٹ اس زبان کی صحافت برداشت نہیں کر پا رہی تھی پھر بھی اردو کے دو ایک اخبار میں دیکھتا تھا لیکن یہ رشتہ رسمی بن گیا تھا نہ تو خبر کے لحاظ سے اردو نہ ہی کوئی پر اثر ذہنی INTELLECT UAL مواد ان سے ملتا تھا اور نہ ہی کوئی پُر اثر ذہنی اثر انداز ہونے والی خبر کے لحاظ سے۔ ہاں کبھی کوئی اچھا شاعرانہ کلام یا کسی والے کی بھولی بسری یاد ہی تو نظر آجاتی تھیں اور بس۔

اردو کے صحافیوں کے ساتھ میرے رشتے تو وزارت اطلاعات و نشریات کے دوران میں مضبوط اور خوش گوار ہوئے۔ ان میں سے اکثر کو یہ احساس ہونے لگا کہ سرکاری ایوانوں میں ان کے ساتھ ہمدردی بھی ہے اور دلچسپی بھی۔ یہ میرا بھی اثاثۂ حیات بن گیا لیکن ان کے درپیش مسائل تو سماجی مالی اور ذہنی شدید تھے ان میں سے اُبھر کر اپنی جگہ بنانا کسی کو سہل نہیں تھا۔

اس مضطرب دور کے دوران اور آج بھی ملک کے بیشتر اردو کے اخبارات کو حاصل

کرتا ہوں اور پڑھتا ہوں۔ اس سے اُردو پڑھنے والوں کے احساسات اور مشکلات کو سمجھنے میں کارآمد مدد ملتی ہے۔

بعض اوقات میرے ذہن میں ایک بزرگ رشتہ دار کا برسوں پہلے پوچھا ہوا سوال کرید تا رہتا ہے۔ "تم اخبار کیوں پڑھتے ہو؟"

میری عمر کوئی ۱۰، ۱۱ برس کی ہوگی جب میں پہلی دفعہ شملہ گیا تھا میری خالہ زاد بہن کا خاوند پنجاب گورنر کے سکریٹریٹ میں کام کرتا تھا اسی ناطے وہ بارنس کورٹ BARNAS COURT کے وسیع احاطے میں رہتے تھے۔ سامراج شاہی کا وہ زمانہ سرکاری ملازموں کی روزمرہ کی زندگی پر نظر رکھتا تھا۔ اس لیئے ان کے یہاں کسی ہندوستانی زبان کے اخبار کے آنے کی اجازت نہیں تھی۔ اپنے گھر کے ماحول کی وجہ سے مجھے اُردو کے اخبار دیکھنے کی عادت سی ہوگئی تھی اس لیئے انجانے میں میں نے پوچھا۔ "آپ کے ہاں اخبار کیوں نہیں آتا؟" ان کے جواب نے مجھے مخمصے میں ڈال دیا "اخبار پڑھنا کیوں ضروری ہے؟" اخبار کی دنیا سے شناسائی کی بھی ایک داستان ہے میرا پیدائشی گھر ... میں تھا اور یہیں میری ابتدائی تعلیم بھی ہوئی۔ یہاں میرے والد ایک کامیاب وکیل تھے ان کا اور میری ماں کا آزادی کی جدوجہد کے ساتھ گہرا رشتہ تھا اسی لیئے گھر کا ماحول سیاسی تھا لیکن یہ ضلع تو انگریزی فوج کو کثیر بھرتی دیتا تھا اس لیئے آزادی پرستوں کی تعداد محدود تھی۔ ہمارے اس شہر میں ایک نوجوان رام لال کا سودیشی واد کا پیغام پہنچانے کا ایک انوکھا ڈھنگ تھا ہر شام دریا کے کنارے تخت پر بیٹھ کر وہ سریلی آواز میں اخبار پڑھا کرتا تھا۔ بیس پچیس لوگ ان کے ساتھ بیٹھ کر خبریں، تبصرے اور ایڈیٹوریل سنا کرتے تھے۔ کم عمری سے ہی میں کان رس تھا۔ میری ماں اکثر کہا کرتی تھی کہ "اسکول سے آنے کے بعد بجائے کھیل کود کے یہ رام لال کی بات سننے بھاگ جاتا ہے۔" لاہور میں چھپے اخبار شام تک یا کئی دفعہ اگلے روز جہلم پہنچ پاتے تھے۔ اس طرح گھر میں اخبارات کو پڑھا کرتے تھے۔ میرے والد انگریزی اخبار ٹریبون پڑھتے تھے لیکن میری ماں اُردو اخبار ملاپ یا پرتاپ منگوایا کرتی تھی کئی دفعہ وہ مجھے کوئی نہ کوئی خبر یا تبصرہ سناتی تھی۔ ان دونوں اخباروں کے ایڈیٹوریل کی طرز انوکھی تھی۔ ملاپ میں مہاشہ خوشحال چند جی اور پرتاپ کے مہاشہ کرشن چند جی پڑھنے والوں سے ... تھے ان کی یہ ذاتیانہ اسٹائل ہر قسم کے گھریلو حالات سے بھی روشناس کرو... ا۔ جب مہاشہ ... جی کی لڑکی کی شادی ہوئی تو کئی ہفتوں تک وہ پاٹھکوں کو اس کی تفصیل

بتاتے رہے اس طرزِ بیان کا ایک فائدہ ہوتا تھا کہ پڑھنے والا اپنے کو ان کے خاندان کا ایک فرد ماننے لگتا تھا آہستہ آہستہ یہ لکھنے کا ڈھنگ پنجاب میں چھپنے ہر اردو ہندی اخبار نے اپنا لیا۔ ملاپ اخبار کے مالک، مہاشہ خوشحال چند جی کا بڑا لڑکا رنبیر گورنر پر گولی چلانے کے الزام میں پکڑا گیا۔ عدالت نے پھانسی کی سزا کا حکم سنایا تو سارے ملک میں ایک سنسنی پیدا ہو گئی۔ ہائیکورٹ نے فیصلہ بدل دیا بعد میں وہ کئی مہینوں تک "پھانسی کی کوٹھڑی میں سے" سلسلہ وار مضامین لکھتے رہے۔ جن کا میری سوچ پر گہرا اثر تھا اور اسی ناطے اس اخبار کے ساتھ رشتہ بھی مضبوط ہو گیا لیکن ہر وقت بڑا اخبار پڑھنا اور اپنے سے بڑے عمر کے لوگوں کی باتیں سے متاثر ہونا میرے والدین کو اکثر پریشان کر دیتا تھا کافی حد تک میری ذہنی ضرورت کو وہ خود پورا کرتے تھے لیکن بدقسمتی سے اس زمانے میں بچوں کے لئے لٹریچر نایاب تھا لاہور سے ماہواری میگزین "پھول" اردو میں چھپتا تھا باقاعدگی سے وہ میرے لئے اور میرے چھوٹے بھائیوں کے لئے منگوایا جاتا تھا۔ لیکن مجھے وہ کبھی پسند نہیں آتا تھا پتاجی جب بھی لاہور جاتے تو سادہ زبان میں لکھی سوانح عمریاں لے آتے تھے۔ لالہ لاجپت رائے کو عام فہم طریقہ سے لکھنے کی خاص مہارت تھی۔ ان کی لکھی ہوئی اطالوی لیڈروں کی جیون کہانیاں مجھے پسند آئی تھیں میری پہلی ذہنی ملاقات منشی پریم چند سے بھی اسی طرح ہوئی تھی میدان عمل، چوگان ہستی اور کہانیوں کے مجموعے "پریم پچیسی" وغیرہ میں نے اردو میں پڑھی تھیں اسی زمانے ۔ جواہر لال نہرو جی کی ایماء پر اردو میں ایک اخبار "ہندوستان" کا لکھنو سے اجراء ہوا تھا یہ ہمارے گھر میں شوق سے پڑھا جاتا تھا۔ چھٹی کے دن میرے والد صاحب کو عدالت سے فراغت ہوتی تھی اس لئے اس میں سے تبصرے سنایا کرتے تھے ہٹلر اور مسولینی کی سیاست سے متعلقہ مضامین کو عام فہم ڈھنگ سے کہاتا اور ہفتہ واری اخبار کی خاص خصوصیت تھی۔ گاندھی جی کا اپنا ویکلی ہریجن تو انگریزی میں چھپتا تھا۔ ہمارے گھر میں اس کی خاص تعظیم تھی بعض اوقات ان کا پورا مفہوم تو پلے نہیں پڑتا تھا۔ خاص کر ان خیالات کا جن کا تعلق ذاتی زندگی کی الجھنوں سے ہوتا تھا مثلاً اس کم عمری میں برہم چریہ کے ذریعہ خاندان کے محدود رکھنے کی بات میری سمجھ سے باہر تھی لیکن ذہنی اور جذباتی رشتہ تو گاندھی جی سے قائم ہو چکا تھا۔ اس لیئے ان کے اخبار کی عزت دل و دماغ پر چھا گئی تھی میرے یونیورسٹی میں پہنچنے تک قومی تحریک اور میرا

ذہنی ارتقاء کی منزلیں طے کر چکا تھا اب انگریزی کے اخبار، رسالے اور کتابیں میری دماغی
بھوک کو پورا کرنے میں مددگار ہو رہی تھیں لیکن اردو رسائل کے ساتھ ایک اور رشتہ جڑ گیا
تھا ترقی پسند مصنفین کی تحریک ابھر رہی تھی۔ بیشتر نئے لکھنے والوں کے ساتھ ذاتی دوستی
اور راہ رسم ہو گئی تھی۔ اس لئے جس اخبار یا رسالے میں بھی وہ لکھیں میں وہ باقاعدگی سے پڑھنے
لگا۔ ہر تبصرے اور رائے کو میں لیفٹ اور رائٹ کے زاویہ سے دیکھنے لگا تھا۔ گاندھی جی کے
مقابلے میں جواہر لال نہرو زیادہ پسند آنے لگے تھے اور کانگریس کے مقابلے میں کمیونسٹ پارٹی
سے زیادہ رغبت ہو گئی تھی اسی ناطے اخبار و رسائل کے متعلق نظریہ بدل رہا تھا۔ اسٹوڈنٹس یونین
میں جب میرا درجہ بڑھنے لگا تو پارٹی کے نظریات کو میں بند آنکھ سے دیکھنے لگا تو پارٹی کے نظریات کو
دیکھنے لگا۔ اندھ وشواس چاہے وہ مذہبی ہو یا نظریاتی ذہن کی کیفیت پر حاوی ہو جاتا ہے اس
کے ساتھ ہی ساتھ کتاب، اخبار مضمون کو صحیح طرح پر کھنے کی صلاحیت میں کمی آنے لگی اب پارٹی
کے ہفتہ واری اخبار کو احترام کے ساتھ پڑھنا اور اسے گلی کوچوں میں کھڑے ہو کر بیچنا زندگی کا
معمول بن گیا۔ صرف وہی رائے اور وہی تبصرے پسند آنے لگے جو ان اعتقادات کی موافقت کے
عام اخبار دیکھنا تو زندگی کا معمول تھا لیکن ان سے کچھ پالیٹکل اہلیت کم ہونے لگی تھی۔ اس پر
تصور صحافت کا بنیں تھا۔ آہستہ آہستہ مجھے ایک تضاد کا احساس ہونے لگا۔ سمجھ میں نہ
آ رہا تھا کہ بیشتر ترقی پسند مصنف کس طرح اس گتھی کو کیسے سلجھا رہے تھے ایک طرف تو ان کا سماجی
نظریہ پرانے روایتی بندھن اور قدروں کو توڑ رہا تھا دوسری طرف ایک ہی رنگ کی عینک نا
پر رکھی تھی۔ پھر بھی میرے جیسے نوجوانوں کے لئے یہ بڑا رومانی دور تھا عصمت چغتائی ا
سعادت حسن منٹو کے نقطہ نظر میں اور اسٹالن پرستی میں تضاد کبھی کبھار دکھتا تو بھی اس کا تجز
کرنے کی قابلیت نہیں تھی اور نہ ہی اس نظریہ کو خیرباد کہنے کی ہمت۔ آہستہ آہستہ
سیاسی رشتہ ذاتی رشتوں اور بندھنوں کی شکل میں لے لیتا ہے۔ اس کی جکڑ مضبوط ہوتی
وقت کے ساتھ ملک میں مذہب کے نام پر بٹوارے کا ماحول بننے لگا۔ جنون پرستی کی تند ہوا
صحت مندانہ صحافت کا چراغ بجھ رہا تھا ہر اخبار خاص کر اردو زبان آہستہ آہستہ اپنی ترجیحیں
تھا یا تو ہندو تھا یا مسلمان آزادی آئی تو خون کی طغیانی بڑھنے لگی۔ یہ تو کبھی سوچا نہیں تھا کہ

اور میرے جیسے لاکھوں لوگوں کو مذہب کے نام پر کئے گئے بٹوارے کے تحت وطن بدر ہونا ہوگا
اس یگ میں اورادلسعیں کی طرح جرنلزم کے بوداپن کا احساس ہونے لگا تھا۔ اخبار پڑھنے
کی عادت کسی حد تک چھوٹ رہی تھی ساتھ ہی ساتھ لکھنے والوں کے لئے ذہنی تخلیق بھی گھٹ
رہی تھی نئے ماحول میں آکر تو نئے سوال نئے مسائل ذاتی بھی اور سماجی بھی توازن کی تلاش
میں تھے پرانے پسندیدہ اخبارات ان ابھرنے والے نئے منظر کو دیکھنے اور سمجھنے اور سمجھانے
میں قاصر نظر آتے تھے آخر وہ بھی تو اپنی ذہنی جڑوں سے کٹ گئے تھے ان کا نئی زمین میں پھر سے
پودا لگانے کا جتن بار آور نہیں ہو رہا تھا مجھے ذہنی جلاوطن کا احساس بہت دنوں تک
نہیں رہا نیا جمہوری ہندوستان میرے احساسات اور اعتقادات کو تسکین دے رہا تھا
ہمارا منشور بننے کا ڈیموکریٹک طریقہ صدیوں کی دبی ہوئی تخلیقی قوتوں کو بڑھاوا دے رہا
تھا اس ماحول کا شہری ہونے میں فخر کا احساس ہونے لگا۔

پارلیمنٹ میں داخل ہونے کے ساتھ ہی میرا تعلق اطلاعات ونشریات سے
جڑ گیا اندرا جی اس زمانے میں انفارمیشن منسٹر تھیں میرا ذاتی لگاؤ ان کی شخصیت کے ساتھ
گہرا بھی تھا اور پرانا بھی۔ ان کے آس پاس جلد ہی چند INTELLECTUAL اور
فن کاروں کا دائرہ بن گیا تھا وہ اپنی وزارت کی سوچ اور فکر کو نیا موڑ دینا چاہتی تھیں اس نئے
اس محدود سے دائرہ میں میڈیا کے متعلق پر مغز باتیں ہوتی تھیں۔ بیشتر اخبار والے اس
زمانے میں تو اندرا جی کی پالیسیوں کے مداح تھے۔ تھوڑے ہی دنوں بعد جب وہ پرائم منسٹر چنی گئیں
تو انہوں نے یہ محکمہ مجھے دینے کی تجویز کی یہ کیوں کیسے اور کب ہوا۔ یہ تو میری سوانح حیات کا ایک
اہم باب ہے اس منصب میں میری ذمہ داری اور میڈیا کے ساتھ رشتہ اور اس کے نشیب و
فراز کے متعلق تو کبھی علیحدہ سے لکھنے کی کوشش کروں گا لیکن اخبارات کو تو اب میں ایک نئی عینک
لگا کر پڑھنے پر مجبور تھا دہلی کے سرکردہ صحافیوں سے تب تک میرے ذاتی تعلقات تو بن چکے تھے
لیکن اب میرا زاویہ نگاہ دوسرا تھا اخبار اور مضمون کو میں ان کی اوصاف پر کم اور اس
کے سیاسی رجحان پر زیادہ توجہ دینے لگا۔ کونسا ایڈیٹوریل اندرا جی کا مخالف اور کونسا ان
کے موافق یہ ایک انوکھی قسم کا معیار میری سوچ پر عکس پذیر ہوتا رہتا تھا پھر بھی مجھے شدید

احساس تھا نہ ہی میرا کوئی قدم اور نہ ہی کوئی پالیسی پریس کی آزادی کو سلب کرنے کا اشارہ کرے۔ جرنلسٹ برادری کے ساتھ دوستانہ دائرہ وسیع ہوتا گیا اسی ناطے بحث اور گفت گو خاص کر ان لوگوں کے ساتھ جو حزبِ مخالف کہلاتے تھے زیادہ کارآمد اور مفید ثابت ہو رہے تھے۔ کئی دفعہ پارٹی کے اندر میرے ہم خیال اور مخالف میری اس سوچ کو بیکار سمجھتے تھے اور بعد میں میرا CREDIBILITY (مقبولیت) پر زور میری پولیٹیکل مشکلات کو بڑھاتا گیا اور ساتھ ہی ساتھ اندرا جی سے فاصلہ بھی" میرے لئے" میں نے بارہا پارلیمنٹ میں کہا کہ پریس کی آزادی اعتقاد ہے۔ محض کھوکھلی اور وقتی سہولت نہیں PEDIENCY
اُردو کے صحافیوں کے ساتھ جو میرے رشتے تو اس دوران میں مضبوط اور خوشگوار ہوئے ان میں سے اکثر کو احساس ہونے لگا کہ سرکار کے ایوانوں میں ان کے ساتھ ہمدردی بھی ہے اور دوستی بھی۔ یہ میرا بھی اثاثۂ حیات بن گیا۔

گو کچھ اخبار لیکن صرف چند ان دکھ بھری مشکلات کے باوجود بھی اپنی شخصیات نمایاں کرنے لگے تھے لیکن یہ تھے تو آٹے میں نمک سے بھی کم۔ اس سوچ اور فکر کو میں نے گجرال کمیٹی برائے "فروغ اُردو" کی رپورٹ میں تفصیل کے ساتھ کہنے کی جرات سے اسی وقت کی لیکن ہمارے معاشرے کی کم نظری اسے سمجھنے سے دور ہی رہی کہ کمزور اخبار پڑھنے والوں کو کم بین اور دقیانوسی بنا دیتے ہیں اور سماج کا ایک اہم عنصر ملک کی ترقی میں ہمرکاب نہیں ہو پاتا۔ اس منصبی دور کے دوران اور آج بھی میں ملک کے بیشتر اُردو کے اخبارات کو حاصل کرتا ہوں اور پڑھتا ہوں۔ اس سے اُردو پڑھنے اور بولنے والوں کے احساسات اور مشکلات کو سمجھنے میں کارآمد مدد ملتی ہے۔

فکر تونسوی کا کالم " پیاز کے چھلکے" تو میں باقاعدگی سے پڑھتا تھا اور آج بھی اس خلا کا احساس کرتا ہوں جو ان کی ناگہانی موت نے ہمارے اُردو ادب میں چھوڑا ہے۔

(سیاست انٹرنیشنل سے ماخوذ)

گجرال ہی وزارتِ عظمیٰ کیلئے موزوں ترین شخصیت

معین نقوی

بہت ساری خوش فہمیوں کا اظہار کیا جا سکتا ہے لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ ایک خوش فہمی پوری ہو جائے
ـٹر اندر کمار گجرال کی حکومت بقیہ پوری میعاد مکمل کرے گی۔ دیوی گوڑا کی زیر قیادت یونائیٹڈ
ـٹ حکومت کو جن عوامل نے دس ماہ تک برقرار رکھا تھا اب اس سے کہیں زیادہ طاقتور عوامل
ے ہیں جو کہ گجرال حکومت کی برقراری اور استحکام کا موجب بنیں گے۔ کیونکہ ارکان لوک سبھا کی
ـف تعداد انتخابات کے غیر یقینی نتائج کا سامنا کرنے کے لئے تیار نہیں۔ پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ
کان پارلیمنٹ انتخابات کا سامنا کرنے سے کترا رہے ہیں۔ حد یہ کہ بھارتیہ جنتا پارٹی بھی انتخابات
سامنا کرنے سے کترا رہی ہے۔ کسی بھی سیاسی جماعت کو ایسا یقین نہیں کہ انتخابات میں ان کی
یابی کے مواقع کچھ بہتر بنیں گے۔

کانگریس پارٹی کے پریسیڈنٹ سیتارام کیسری نے تین ہفتے کے بحران کے دوران اس بھی کا
کھول دیا کہ یونائیٹڈ فرنٹ اور اس کی حلیف پارٹیاں بھارتیہ جنتا پارٹی کی جتنی کٹر مخالف
وہ کانگریس پارٹی کی بھی ایسی ہی کٹر مخالف ہیں۔ گجرال کا ارتقاء دراصل دوہری اصلاح ہے
۔ گجرال جس انداز سے کانگریس پارٹی سے میل جول اور تال میل بڑھانے لگے ہیں وہ ان کے پیشرو
ی گوڑا کی روش سے یکسر مختلف روش ہے گجرال کی قیادت میں فرقہ واریت کے خلاف لڑائی صرف
بی جے پی سے ہی نہیں بلکہ ہر نوع اور ہر رنگ کی فرقہ واریت کے خلاف لڑائی لڑی جائے گی۔

گجرال نے اگرچہ کہ اس لڑائی کے لئے اپنے نظریئے اور اپنی حکمت عملی کو ظاہر نہیں کیا ہے
نا بائیں بازو کا پروجیکٹ تھا یہ تھا کہ ملائم سنگھ یادو کو وزیر اعظم بنا کر بھارتیہ جنتا پارٹی سے

اتر پردیش میں جگہ جگہ ہر گلی ہر کوچے میں لڑائی لڑی جائے۔ بابیاں بازو اپنے مقصد میں کامیابی کی منزل سے بہت قریب پہونچ گیا تھا لیکن اتر پردیش میں اگر بھارتیہ جنتا پارٹی سے اس طرح کی لڑائی شروع ہو جاتی تو اس کے نتیجے میں یہ ہوتا کہ ہندوستانی سماج فرقہ وارانہ اور ذات پات کی بنیاد پر الگ الگ مستحکم گروہوں میں بٹ جاتا۔

گجرال کا نظریہ حقیقت پسندی پر مبنی ہے۔ اسی نظریئے کی بنیاد پر بنگلہ دیش اور پاکستان سے تعلقات بہتر بنانے کے عمل شروع ہوئے ہیں۔ دونوں ملکوں کے تعلقات خوشگوار اور بہتر بننے ہی یہ ہوگا کہ فرقہ واریت کو بھڑکانے اور بڑھانے والے زہریلے جراثیم کا ہی خاتمہ ہو جائے گا۔ اس طرح نہ صرف بھارتیہ جنتا پارٹی کی فرقہ واریت بلکہ ہر نوع اور ہر رنگ کی فرقہ واریت اپنی موت آپ مرجائے گی۔ دوسرے الفاظ میں یہ بات یوں بھی کہی جا سکتی ہے کہ گجرال کے ارتقائے فرقہ واریت کے خلاف لڑائی لڑنے کے لئے ایک زبردست قوت اور طاقت یونائیٹڈ فرنٹ کو فراہم کی ہے اسے خدا کا کرم ہی کہا جانا چاہیئے۔ گجرال کے اطراف کے لوگوں کو اس بات کا اندازہ ہے کہ بحیثیت وزیراعظم گجرال کی حکمرانی کتنی کچھ طاقتور اور کیسی کچھ موثر رہے گی

تحریک اعتماد پر مباحث کے دوران گجرال نے آدان پردان کے لئے ایک عام فہم انگلش میں تھی اس میں وہ موقع بہ موقع ہندوستانی زبان کے جملے بھی استعمال کرتے رہے۔ گجرال اپنی اکھڑ پنجابیت کو اپنے خاندان کے لوگوں اور اپنے دوستوں کے حلقوں تک ہی محدود رکھتے ہیں اس طرح وہ ہندوستان کے کسی بھی علاقے میں ایک اجنبی جیسے نہیں لگتے۔ گجرال نے اپنی ایک ہمہ پہلو شناخت بنائی ہے۔

نہرو، اندرا گاندھی، راجیو گاندھی کے بعد گجرال وزیراعظم کے عہدے کیلئے نہایت زیبا شخصیت ہیں۔ گجرال کی پنجابیت نے بھی انکی شائستگی کو مزید ابھار دیا ہے۔ ہندوستان کو مستقبل میں بھی ایسے ہی شائستہ پرکشش وزیراعظموں کی ضرورت ہے۔ اقتدار کی گدیوں پر اکھڑ اور اجڈ افراد کو بٹھانے کی رومانوی روایت لوہیا راج نرائن کا ورثہ ہے یہ بات اپنی جگہ درست کہ جمہوریت کی جڑیں گہری اتر کر جس طرح مضبوط بنیں گی تو دراصل ہند سے بھی اچھے اور سچے افراد کو منتخب کر کے دستور ساز اداروں میں بھجوائیں گے۔ لیکن اقتدار کی گدیوں پر جب اکھڑ اور اجڈ افراد براجمان ہو جاتے ہیں

تو پھر شہروں کے طبقہ اشراف، دانشور طبقات، صحافتی برادری اور بیوروکریسی اور عوام کے منتخبہ نمائندوں کے مابین دوریاں بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ ان افراد کی طرز حکمرانی سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ منتخبہ عوامی نمائندے ایک مملکت کے نظام کو عہد جدید کے معیارات کے مطابق چلانے کی اہلیت اور صلاحیت کے حامل نہیں ہیں۔ ایک فلاحی مملکت کی تشکیل کی منزلیں طئے کرنے کے لئے سماج کو بہر صورت ایک بھاری قیمت ادا کرنی ہی پڑے گی۔ یہ بڑی بد بختی ہے کہ سماج ابھی تک عبوری عہد سے ہی گذر رہا ہے۔

گذشتہ پچاس برس اسی عبوری عہد سے گذرنے میں گذر گئے۔ لیکن یہ توقعات پوری نہیں ہوئی کہ عوام کے منتخبہ نمائندے اتحاد و اتفاق سے کام کریں گے۔ "اکھڑپن" "اُجڈپن" اتحاد اور اتفاق بنانے میں آڑے جو آجاتا ہے۔ پچاس برسوں میں بھی عوام کے منتخبہ نمائندے اس ملک کے، اس ملک کے عوام کے مسائل کو حل کرنے اور عہد جدید کے معیارات کے مطابق مملکت کا کاروبار چلانے کے قابل نہ بن سکے۔ سیاسی پارٹیاں کسی اسکول کے جیسی ہوتی ہیں لیکن سیاسی پارٹیوں نے اپنے طلباء کو ملک کا نظام چلانے کی تعلیم و تربیت دینے کے لئے کچھ نہیں کیا۔ کانگریس پارٹی کے ڈھانچے اور کانگریسی نظام کے زوال کے بعد ملک میں کوئی سیاسی پارٹی ایسی نہیں جو کہ ملک کو اچھے لیڈر اور باصلاحیت قیادت فراہم کر سکے۔ مارکسٹ کمیونسٹ پارٹی، کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا اور بھارتیہ جنتا پارٹی بھی صرف سیاسی نرسری کے جیسی ہیں۔

جو خلا رہا ہے۔ اس میں گجرال جیسی شخصیت اُبھر آئی ہے۔ گجرال کو اس بات کا بخوبی اندازہ اور احساس ہے کہ سیاسی پارٹیوں کے مختلف مجرموں میں مثبت پہلو کیا ہیں، منفی پہلو کیا ہیں۔

گجرال نے سیاسی زندگی کی ابتدائی تربیت کمیونسٹ دانشگاہ میں حاصل کی تھی وہ کمیونسٹ تحریک سے وابستہ تھے۔ لاہور کے ہمہ رنگی کلچر کا وہ حصہ تھے۔ بٹوارے کے کربناک واقعات کو انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ شریمتی اندرا گاندھی سے وہ بہت قریب رہے۔ ماسکو میں ہندوستان کے سفیر رہے۔ وہ دوبار وزیر خارجہ رہے۔ مرکزی وزیر برائے اطلاعات و نشریات رہے۔ مرکزی وزیر برائے تعمیرات و امکنہ رہے۔ کئی افراد اس بات کو فراموش کر بیٹھے ہیں کہ ۱۹۶۰ء کے دہے میں نیو دہلی میٹرو پولیٹن کونسل NDMC کے وائس پریسیڈنٹ کی

حیثیت سے انہوں نے ایک بڑے اور اہم میٹرو پولیٹن شہر کے ایڈمنسٹریٹر کے فرائض بحسن و خوبی انجام دیئے تھے۔

ضرورت ہے کہ جی کے موپنار، ملائم سنگھ یادو، لالو پرساد یادو اور رام ولاس پاسوان اپنی سیاسی اَنا کے خول سے باہر نکل آئیں اور اس بات کو محسوس کریں کہ وزیر اعظم کے عہدے کے لئے گجرال سے بہتر کوئی شخصیت نہیں تھی کہ جس کو اس عہدے کے لئے منتخب کیا جا سکتا تھا

ہندوستان روایتی طور پر تین طبقات میں بٹا ہوا ہے۔ ایک جاگیردار طبقہ اشراف دوسرا میکالے کا تیار کیا گیا سیاسی طبقہ اشراف اور تیسرا برہمنیت کا طبقہ اشراف جاگیردار طبقہ اشراف نے تو ایک فلاحی مملکت کی تشکیل کے لیئے اپنی قربانی دے دی۔ گذرے برسوں میں مقامی کلچر اس زور اور طاقت سے ابھرا اور پھیلا کہ میکالے کا تیار کردہ سیاسی طبقہ اشراف سکڑ سمٹ کر رہ گیا۔ اب جو کچھ ہے وہ برہمنیت کا طبقہ اشراف ہے جو کہ ذات پات کے ڈھانچوں کے اندر اپنی حکمرانی چلا رہا ہے۔ لیکن منڈل اور سماجی انصاف کی امنگتی لہروں نے اس حکمران طبقہ کے پاؤں بھی اکھاڑنے شروع کر دیئے ہیں یہ بات اپنی جگہ بالکل صحیح کہ اب نئے نئے سیاسی سنگھٹن اور سیاسی جھرمٹ بنائے جانے لگے ہیں۔ لیکن ملک کے کسی گوشے میں ابھی تک یہ موثر نہیں بن سکے۔

کسی بھی سماج کیلئے وہ دن بہت بدتر اور منحوس ہوتا ہے جبکہ وہ ایک متحدہ طبقہ اشراف سے محروم ہو جائے۔ ہمارے سماج کی موجودہ سب سے بڑی کمزوری یہی ہے کہ ہمارے سیاسی طبقات میں اشراف کی بجائے اکھڑ اور اجڈ افراد کی بہتات ہو گئی ہے لیکن گجرال کے بقول دیہات دیہات صوبوں صوبوں تک اپنی بات پہونچاتے آدان بیردان کے لئے ایک عمومی زبان کا وسیلہ اختیار کرنا از حد ضروری ہے گجرال ملک کے ایک نہایت حرکیاتی اور فعال صوبے پنجاب کے سپوت ہیں شہریت ان کے رگ و پے میں رچی ہوئی ہے اسی لیئے گجرال کا خیر مقدم ایک عبوری وزیر اعظم کی طرح نہیں بلکہ ایک مستقل وزیر اعظم کے طور پر کیا جانا چاہیئے۔ گجرال کی وزارت عظمیٰ اسوقت تک برقرار رہے گی جب تک کہ کانگریس پارٹی اور بھارتیہ جنتا پارٹی علاقائی سطحوں پر اپنے سنگھٹن جمانے میں کامیاب نہیں ہو جاتیں۔ اس طرح ہم ایک پائیدار اور مستحکم وفاقی نظام کی سمت ارتقائی سفر شروع کر سکیں گے۔

جی۔ڈی۔چندن

آزمائش اور سنہری موقع

حال ہی میں اعتماد کا ووٹ حاصل کرنے کے لئے ایک ہی ایجنڈے پر پارلیمنٹ کے دو خصوصی اجلاس ہوئے۔ پہلے ۱۱ر اپریل کے اجلاس میں نزاعی وزیر اعظم دیوے گوڑا نے دو گھنٹے تک معترض ممبروں کے سوالوں کے جواب دیئے۔ لیکن اپنا مقدمہ جیت نہ سکے۔ دوسرے ۲۲ر اپریل کے اجلاس میں نامزد وزیر اعظم اندر کمار گجرال نے ان سے آدھے وقت میں اپنے جوابات دیئے اور بڑی شان سے کامیاب ہو گئے۔ گجرال کے سامنے بھی تقریباً وہی سوالات اور وہی اعتراضات تھے لیکن انہوں نے ترکی بہ ترکی جواب دینے یا کیلا نہ بحث کرنے کی بجائے تحریک آزادی کے مقاصد اور عزائم کو نمایاں کیا اور سال رواں میں حصول آزادی کی ۵۰ ویں سالگرہ کے وقوع کو اپنی غزل کا مصرع طرح بنایا۔ انہوں نے کہا کہ قومی تحریک آزادی کے عظیم رہبروں اور مجاہدوں نے جس روشن مستقبل کے خواب دیکھے تھے آج انہیں حقیقت میں بدلنا ہے۔ اس تحریک میں ملک کی مختلف پارٹیاں اور ان سے لاتعلق لاکھوں لوگ بھی شریک تھے۔ کانگریس تو ایک پلیٹ فارم اور وسیلہ تھی جس نے سامراج کو شکست دینے اور جمہوری نظام رائج کرنے کے اسباب، اور مقاصد کی وضاحت کی۔ انہوں نے گاندھی جی کے نظریوں کا بالخصوص ذکر کیا اور کہا۔

"آج ہمیں دلوں کو جوڑنا ہے اور انسان کو انسان کا احترام دینا ہے۔"

ان کا انداز غیر نزاعی اور دلنشیں تھا۔ اس میں فیض، فراق اور اقبال کے اشعار نازل ہوتے رہے جن سے پارلیمنٹ کے ممبر بہت محظوظ ہوئے۔

یہ ایک ایسی ادا تھی جو ایک قلندر صفت سیاستداں ہی اختیار کر سکتا ہے اور یہ قلندر تقریباً 58 سال تک سیاست کے دشت کی سیاحی کر چکا ہے۔ وہ ایک ایسے خاندان کا چشم و چراغ ہے جس کے بزرگ تحریک آزادی میں شریک ہوئے۔

یہ ایک ایسی ادا تھی جو ایک قلندر صفت سیاست داں ہی اختیار کر سکتا ہے اور یہ قلندر تقریباً مولد جہلم تو اب پاکستان میں ہے لیکن یہ اس کے صوبہ پنجاب کی تاریخ حریت سے بخوبی واقف ہے۔ اس صوبے نے ۱۸۵۷ء کی نامکمل جنگ آزادی کی ۵۰ ویں سالگرہ پر یعنی ۱۹۰۷ میں اپنی سرزمین پر نوزائیدہ بھارت ماتا سبھا کی آواز پر اس جنگ کی تکمیل اور فرنگی راج کے خاتمے کی مجاہدانہ کوشش کی تھی۔ یہ باتیں پرانی ہوگئی ہیں اور بعض لوگ انہیں بھول بھی گئے ہیں لیکن تاریخ تو تاریخ ہے اور یہ تاریخ تو تاریخ حریت ہے جسے ہمارا قلندر سیاست داں کبھی بھول سکتا۔

اس سبھا کی نشست پر پنجاب کی اردو صحافت تھی جس میں ہندوستان (لاہور) انڈیا (گوجرانوالا) جھنگ سیال (جھنگ) آزاد (لاہور) اور ایک انگریزی اخبار "دی پنجابی" (لاہور) پیش پیش تھے۔ ان کے ایڈیٹروں نے جرمانے اور جیل کی صعوبتیں جھیلیں۔ ان کی سرگرمیوں اور تحریروں سے فرنگی حکام کی نیندیں بھی حرام ہوئیں لیکن ان اخباروں نے بیسویں صدی کے پہلے دہے میں پنجاب کے شہروں کے ساتھ ساتھ صوبے کے دیہات تک میں بیداری پیدا کی جس کی بدولت گلی گلی میں کسان یہ گیت گا رہے ہیں۔

پگڑی سنبھال اوئے جٹا پگڑی سنبھال اوئے

اس سے عین قبل ۱۹۰۴ء میں نوجوان اقبال نے۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

کا ترانہ لکھا جو حب الوطنی کی نہ ختم ہونے والی حرارت کا ابدی سرچشمہ بن گیا۔

گجرال صاحب نے اسی حرارت کے سیاق میں آزادی کے عزائم کو اجاگر کیا۔

ان کے انتخاب سے پنجاب ہی کے جہاد آزادی کی یاد سرسبز نہیں ہوتی بلکہ ملک کی تقسیم کی وجہ سے ان گنت عوام پر ٹھونسی جانے والی مہاجرت کے زخم کو بھی مرہم عطا ہوا۔

۱۹۴۷ء میں جب ملک تقسیم اور آزاد ہوا اور ان کو آبائی وطن چھوڑ کر ہندوستان آنا پڑا تو ان کی عمر تقریباً ۲۸ سال تھی۔ ان کے ساتھ ان کے والدین اور نو بیاہتا بیوی محترمہ شیلا گجرال تھیں جنھوں نے ۱۹۴۵ء میں پنجاب یونیورسٹی سے جرنلزم کا ڈپلوما حاصل کیا تھا اور اپنا

ق کر پر سنوار رہا تھیں۔ خود گجرال صاحب پنجاب یونیورسٹی لاہور سے بی کام اور ایم اے کی
ڈگریاں لے کر آئے تھے۔ اس کے علاوہ وہ اُردو ادب اور فنونِ لطیفہ کے بھی رسیا تھے۔ بہر حال
ہندستان میں انہوں نے کوئی ملازمت کرنے کی بجائے اپنی کوششوں سے اپنے پاؤں پر کھڑے
ہونے کی تدبیریں کیں۔ یہاں تقریباً گیارہ سال تک عام شرنارتھیوں کی طرح معاش اور بحالی
کے لئے جدوجہد کرتے رہے۔ اس دوران انہوں نے امپورٹ، ایکسپورٹ اور عمارتی ٹھیکوں کے
روبار کئے۔ ساتھ ہی ساتھ سیاسی سرگرمیوں کے برابر دلچسپی لیتے رہے اور 1950ء میں کانگریس
میں شامل ہو گئے۔ 1959ء میں نئی دہلی میونسپل کمیٹی کے نائب صدر مقرر ہو گئے۔ اسی سال وہ فلم سوسائیٹیز
شمالی ہند کے فیڈریشن کے خازن مقرر ہوئے۔ اس وقت محترمہ اندرا گاندھی اس فیڈریشن کی نائب
صدر تھیں۔ یہیں سے وہ گجرال صاحب کے علم و شعور کی گرویدہ ہوئیں۔ 1964ء میں وہ پارلیمنٹ
کے ممبر منتخب ہوئے۔ اس کے بعد انہوں نے مڑ کر نہیں دیکھا بلکہ مرکزی وزارت سفارت اور وفود
قیادت کے مختلف عہدوں پر فائز ہوتے رہے۔ جو کچھ پایا اپنی لیاقت اور خدمات سے پایا۔
اسی لیاقت کی بدولت انہوں نے ۲۲ اپریل کو پارلیمنٹ کے تاریخی اجلاس میں اعتماد کا
ووٹ جیتا۔

بعض سیاسی مبصران کے مستقبل کو مخدوش بتا رہے ہیں کیونکہ انہیں کسی پارٹی کا سہارا نہیں
ہے لیکن یہ ایک بازاری دلیل ہے۔ کونسٹی ٹیوشن تہذیب کے موجودہ دور میں پارٹی سے زیادہ لیڈر کی دانش
و حکمت کی ضرورت ہے۔ گجرال صاحب کا انتخاب بالظہور کسی پارٹی سے ان کی وابستگی کے سبب
میں ہوا۔ صرف ان کی شخصیت، اہلیت، مصالحت پسندی اور بزرگی پیش نظر رہی۔
اس کے ساتھ ان کی بے جماعتی بھی کام آئی۔

یہ سب وجوہ اب بھی ان کے ساتھ ہیں جن پر پہنچوں نے انہیں چھانٹ کر منتخب کیا وہ اپنا
دامن جھٹک سے انحراف کر کے کہاں جائیں گے؟ اگر انہوں نے انحراف کرنے کی جسارت کر بھی لی
تو آگے وہی خندق ہے جس سے بچنے کے لئے انہوں نے گجرال صاحب کا انتخاب کیا۔ گجرال صاحب اپنی
مثال آپ ہیں۔ اگر چند حلقے انہیں بیدخل کرنے پر تل ہی جائیں تو انہیں اپنی بیدخلی سے کسی نقصان
کا اندیشہ یا خوف نہیں۔ وہ آزاد منش قلندر ہیں۔ برسوں پہلے انہوں نے اندرا گاندھی کے ایمرجنسی کے نفاذ

کی مخالفت کی تھی اور غیر متعلق اور غیر سرکاری فرد سینے گاندھی کو ریڈیو ملیشین اور سرکاری متن اس کے نشر ہونے سے قبل دکھانے کے مطالبے کو رد کر دیا تھا۔ آج ان پر کیفاً گروہی دباؤ یا قہر بڑا تو امکان غالب ہے کہ یہ قلندر کوئی ناجائز بات ماننے کے بجائے روزگارانہ مستعفی ہو جائے گا اور اطمینان سے جلالی باغ کے اپنے آشیانے میں اپنی سوانح عمری رقم کرے گا۔ ان کی سوانح عمری بھی نئے ہندوستان کی تاریخ کا ایک اہم باب ہوگی۔

ہر سیاست داں کا حقیقی سرمایہ حمایت عوام کا اعتماد ہوتا ہے۔ گجرال صاحب کے پاس یہ سرمایہ ہے۔ اس میں اضافہ ان کے کارناموں سے ہوگا۔ جماعتی سودا بازیوں سے نہیں۔

آزادی کے ۵۰ ویں سال میں بھی ملک کے نامکمل کام کی فہرست بہت طویل ہے اس کا ایک خاکہ موجودہ حکومت کے کم سے کم مشترکہ پروگرام میں موجود ہے۔ اس کے ساتھ ہی قومی تعمیر کے حامل ملک کی زبانوں کے معاملات جن میں اُردو سرِ فہرست ہے بڑے دگرگوں ہیں۔ اُردو وطن عزیز اور خود گجرال صاحب کی محبوب زبان ہے انہوں نے اپنی والدہ سے جو اُردو جانتی تھیں پالنے میں اس سے عشق استوار کیا تھا۔ پھر جہلم کے ہائی اسکول میں سبقاً سبقاً اُردو پڑھی۔ مزید تعلیم کے لئے لاہور گئے اور ڈی اے وی کالج میں اعلیٰ تعلیم پائی لیکن اپنے اولین عشق سے دستبردار نہ ہوئے اور اُردو اخبار ہمیشہ بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے رہے ان کے مضامین اُردو اخباروں میں چھپتے رہے ہیں۔ ان کا ایک مجموعہ " ذرا نم ہو تو یہ مٹی ..." کے عنوان سے کتابی شکل میں چھپ چکا ہے۔

مرکزی حکومت کی فروغ اُردو سے متعلق کمیٹی کی جس کے وہ صدر مقرر ہوئے اور جو بعد میں گجرال کمیٹی کے نام سے مشہور ہوئی۔ رپورٹ میں انہوں نے اس زبان کی بقا و ترقی کے لئے نہایت اہم سفارشات رقم کیں۔ یہ رپورٹ قریب بیس سال سے طاقِ نسیاں پر رکھی ہے۔ چودہ سال کے بعد تو بھگوان رام کا بن باس بھی ختم ہو گیا تھا۔ لیکن یہ رپورٹ ابھی تک سرد خانے میں پڑی ٹھٹھر رہی ہے۔ آج یہ ان کے دستِ شفا کا مطالبہ کر رہی ہے۔

اُردو کی ترقی کے لئے قائم کردہ بھارت سرکار کا اپنا سربراہ ادارہ جسے اب نیشنل کونسل برائے فروغ اُردو کہا جاتا ہے۔ اپنے اعلیٰ افسروں سے محروم ہے۔ اس کی ساری اہم کارکردگی التوا میں پڑی ہے۔ ڈکشنریاں، انسائیکلوپیڈیا اور دیگر اہم کتب شائع کرنے کا اس کا دیرینہ تساہل کا شکار ہے

وزیراعظم کی توجہ اسے معدوم ہونے سے بچا سکتی ہے

مرکزی ساہتیہ اکاڈیمی اُردو کی مطبوعات سے دور سے دور تر ہوتی جارہی ہے پریم چند ایسے موجد اور عبقری ادیب کے افسانوں کا اُردو زبان میں مکمل مجموعہ آج تک شائع نہیں ہوا اس لافانی ادیب نے کل ۲۹۷ کہانیاں لکھیں ان میں سے تقریباً ۱۸۰ ہی متفرق مجموعوں میں ملتی ہیں اور وہ بھی کسی تاریخ وار انداز میں نہیں ہیں بلکہ بکھرے ہوئے ڈھیر ہیں۔ آزادی کے ۵۰ ویں سال بعد تک بھی پریم چند جیسا شہرہ آفاق ادیب اپنے ہی وطن میں یتیم اور متروک ہے یہ کوتاہی ایک سنگین المیہ ہے۔

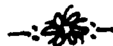
ہماری لسانی صحافت ملک کے مستقبل کی تعمیر کا اہم ترین ستون ہے لیکن اس کی اصلاح و ترقی کے لئے آج تک کوئی منصوبہ بند کام نہیں ہوا۔ ۱۹۶۵ء میں چھوٹے اخباروں کے مسائل سے متعلق ایک کمیٹی بنی تھی لیکن اس کی سفارشات بے فیض و بے برکت رہیں۔ اس کے بعد ان اخباروں کے لئے کوئی نیا کمیشن قائم نہیں ہوا۔ دوسرے نیشنل پریس کمیشن نے لسانی صحافت کی بہتری کے لئے ایک ترقیاتی ادارہ قائم کرنے کی سفارش کی تھی لیکن اس وقت کی حکومت نے اسے رد کردیا۔

اُردو یونیورسٹی کے قیام کا اعلان ہوئے عرصہ ہوگیا۔ لیکن اس کے خد و خال کی تشکیل و ترتیب آج تک اپنے ناظمین کی منتظر ہے۔

یہ صرف ایک اشاراتی فہرست ہے لیکن اگر یہ بقایا جات آزادی کی گولڈن جوبلی کے دن یعنی ۱۵ اگست ۱۹۹۷ء تک تعمیر اور تکمیل کے مرحلے میں آجائیں تو اس جوبلی کی یاد با معنی ہو جائیگی

آج گجرال حکومت کو صرف حکومت اور وزارت ہی نہیں چلاتی بلکہ ملک کی تاریخ کے اس باب کو مکمل کرنا ہے جس کی بشارت تحریک آزادی کے ایام میں مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو اور مولانا آزاد نے کی تھی۔ ان بزرگوں نے جمہوریت، مساوات اور سماجی انصاف سے مملو ایک ترقی پسند ہندوستان کا وعدہ کیساتھ مہاتما گاندھی نے تو کہا تھا کہ " اصل آزادی تو وہ ہے جس میں ہر آنسو کو ڈھارس مل جائے "

جلد ہی شروع ہونے والے ۲۱ ویں صدی کے ہندوستان کا تقاضا بھی یہی ہے جسے پورا کرنے کا مقدس فریضہ گجرال صاحب کے تجربے سے مضبوط کندھوں پر پڑا ہے



کیا کر سکتے ہیں گجرال صاحب اُردو کے لیئے؟

سوم آنند

گجرال صاحب نے جب سے وزیرِ اعظم کا عہدہ سنبھالا ہے اُردو حلقوں کو گجرال کمیٹی کی رپورٹ پھر سے یاد آنے لگی ہے۔ بار بار کہا جا رہا ہے کہ اس رپورٹ کے مصنف چونکہ وزیرِ اعظم ہیں اس لئے اب تو اس رپورٹ کی سفارشات پر ضرور ہی عمل ہونا چاہیئے۔ وزیرِ اعظم نے خود بھی ایک انٹرویو میں کہا ہے کہ اُردو کی ترقی سے متعلق اس رپورٹ میں جو کچھ بھی ہے اسے عملی جامہ پہنایا جانا چاہیئے مگر اس انٹرویو میں انہوں نے جو دوسری بات کہی اس سے مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ رپورٹ تیار کرنے کے بعد اب تک حالات میں تبدیلی آچکی ہے۔ اس پر گجرال صاحب کی نظر نہیں ہے اس سلسلے میں سب سے پہلی بات جاننے والی یہ ہے کہ اس رپورٹ کی سفارشات میں آخر ایسی کیا بات ہے جس پر عمل کئے جانے کا اس قدر اصرار کیا جا رہا ہے دوسری بات جاننے والی یہ ہے کہ جس سرکار نے گجرال کمیٹی قائم کی تھی وہ اس کی سفارشات پر عمل کیوں نہیں کر سکی۔ یہ دو بنیادی قسم کے سوال جن کا جواب ملنے کے بعد ہی ہم صحیح رائے قائم کر سکتے ہیں۔

اندرا گاندھی کی سرکار نے اُردو کے مسائل کا جائزہ لینے کے لئے گجرال صاحب کی سرکردگی میں جو کمیٹی قائم کی تھی اس نے مئی 1975ء میں اپنی رپورٹ پیش کی۔ اس بات کو 22 سال ہو چکے ہیں۔ اس کے کئی برس بعد سردار جعفری صاحب کی سرکردگی میں ایک اور کمیٹی اس بات کا جائزہ لینے کے لئے قائم ہوئی کہ مسٹر گجرال کی سفارشات پر کہاں تک عمل ہوا ہے۔ اس سردار جعفری والی کمیٹی نے ستمبر 1990ء میں اپنی رپورٹ پیش کی جس نے کہا کہ حکومت گجرال کمیٹی کی رپورٹ پر کوئی واضح فیصلہ لینا چاہیئے اور ایک قرارداد کی شکل میں اس کی سفارشات منظور کرنے کا باقاعدہ اعلان کرنا چاہیئے۔

گجرال کمیٹی کی رپورٹ 451 صفحات پر مشتمل ہے جن میں سے 378 صفحات میں تو صرف اُردو

زبان و ادب و کلچر کی تاریخ بیان کی گئی ہے اور صرف آخر کے 3 صفحات ایسے ہیں جن میں اُردو کی ترقی کے متعلق 87 کے قریب سفارشات ہیں۔ یہ بات یاد رکھنے والی ہے کہ ان سفارشات میں کہیں بھی یہ بات نہیں کہی گئی کہ اُردو کو اتر پردیش یا کسی اور ریاست میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ دے دیا جائے۔ ان سفارشات میں صرف اتنا کہا گیا ہے کہ جس علاقے میں اُردو بولنے والے دس فیصد یا اس سے زیادہ ہوں وہاں سرکاری کاموں کے لئے اُردو کا استعمال بھی کیا جائے اور سہ لسانی فارمولے میں اُردو پڑھانے کی گنجائش نکالی جائے۔

مگر ان معمولی سی سفارشات کو بھی حکومت ماننے سے انکار کرتی رہی ہے۔ گجرال کمیٹی کی رپورٹ جنوری ۱۹۷۹ کو پارلیمنٹ میں پیش کی گئی مگر کابینہ نے کوئی فیصلہ نہیں لیا۔ اس وقت تو خیر جنتا پارٹی کی حکومت تھی۔ سوال یہ ہے کہ اندرا گاندھی کی سرکار کمیٹی کی رپورٹ پر کیوں نہ عمل کر سکی۔ اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ کابینہ کے اندر اس وقت اُردو کے بہت مخالف تھے اور جو مخالف نہیں تھے انہیں بھی اُردو کی بقاء یا ترقی سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی کافی عرصہ ہوا گجرال صاحب نے خود اپنے ایک بیان میں اس بات کا اقبال کیا تھا کہ اُردو کمیٹی کی سفارشات کا معاملہ جب کابینہ کے سامنے پیش ہوا تو وزارت کے ایک سینیر وزیر نے دھمکی دی کہ ان سفارشات پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا گیا تو اپنے عہدے سے مستعفی ہو جائیں گے اس لئے آپ اُردو کی مخالفت کا الزام صرف بھارتیہ جنتا پارٹی یا راشٹریہ سیوئم سنگھ والوں کو ہی نہ دیں۔ اُردو کے خلاف تعصب تو کانگریس کے اندر بھی ویسا ہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُردو بیچاری کو اس کے مخالفوں اور حامیوں نے دونوں نے اپنے سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کیا۔ اتر پردیش اور بہار میں جب بھی اُردو کو قانونی درجہ دینے کا قانون منظور کرانے کی کوشش کی گئی تو بی جے پی اور اس کے ہمنواؤں نے زبردست ہنگامہ آرائی کی۔ یہ سب اس لئے کیونکہ اُردو کے خلاف ہنگامہ آرائی سے بی جے پی اور اس کے ہمنواؤں کا ووٹ بنک مضبوط ہوتا ہے۔ ادھر کانگریس نے ہر الیکشن کے نزدیک اُردو اقلیت کے ووٹ لینے کی خاطر زبان کی ترقی کے بڑے وعدے کئے۔ ابھی دو سال کی مہلت ہے کہ بہوجن سماج پارٹی کے قائد کانشی رام صاحب کو جب اتر پردیش کی اُردو بولنے والی اقلیت میں اپنی پارٹی کو مضبوط کرنے کا خیال آیا تو بہوجن سماج پارٹی کے کارکنوں کو فرمان جاری

کہ وہ اُردو سیکھیں۔

مگر جو لوگ سیکولر ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور اُردو کے ہمدرد سمجھے جاتے ہیں ان کی حکومت آئی تو وہ بھی کچھ نہ کر سکے۔ اتر پردیش میں ملائم سنگھ صاحب کی بھی حکومت رہی۔ مگر اُردو کے حوالے سے ان کے دور میں بھی کوئی خاص بات نہ ہوئی بلکہ انہوں نے تو ہندی کو زیادہ ثقیل اور سنسکرت آمیز بنا دیا۔ مغربی بنگال میں مارکسٹ کمیونسٹ پارٹی کی حکومت جو بہت بڑے سیکولر ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں مگر ان کی سرکار بھی اعلانات کے باوجود کوئی سرکاری درجہ نہ دے سکی۔ اگر کسی سرکار نے کبھی بے دلی سے اُردو کو کوئی رعایت کا اعلان کیا تو سرکاری عملے نے اس پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ ایسی ہزاروں مثالیں اگر ان کی تفصیل بیان کی جائے تو ایک کتاب ہو جائے۔

سوال یہ ہے کہ اکیلا وزیر اعظم ایسے زبردست تعصب کا کیسے مقابلہ کر سکتا ہے گجرال صاحب کا کہنا ہے کہ اُردو کے لئے علیٰحدہ اسکول نہیں ہونے چاہیں اور اُردو نہ صرف ایک ہی اسکول میں ساتھ ساتھ پڑھائی جائیں بلکہ ایک ہی ٹیچر دونوں زبانیں پڑھا معلوم ہوتا ہے کہ گجرال صاحب ۴۰ - ۵۰ سال پہلے کی بات کر رہے ہیں۔ یہاں شمال ہندو میں تو اُردو کے ٹیچر کو عام طور پر ہندی آتی ہے کیوں کہ ہندی سیکھنا لازمی ہے مگر ہندی وا کو اُردو پڑھنے پر کیسے مجبور کیا جا سکتا ہے۔ گجرال صاحب کے ذہن میں غالباً آزادی سے پ تصور ہے کہ اُردو اور ہندی کو اس قدر آسان بنا دیا جائے کہ ان میں بہت کم فرق رہ جائے مگر ہندی والوں نے تو پچھلے 50 برسوں میں اپنی زبان کو اس قدر مشکل بنا دیا ہے کہ بول ح کی ہندوستانی سے اس کا صرف دور کا رشتہ رہ گیا ہے۔

ہند سرکار نے اُردو کے سلسلے میں جو کچھ بھی کیا اس کا بڑا مقصد یہ تھا کہ ایک طبقہ جو بہت زیادہ شور مچانے کی حیثیت میں ہے اسے خاموش رکھا جائے۔ ریاستو اُردو اکیڈیمیوں کو قائم کر دیا گیا۔ ان اکیڈیمیوں کا ایک بڑا کام اُردو مصنفوں کو انعا تقسیم کرنا ہے اس سے کچھ لوگ تو خوش ہو جاتے ہیں مگر اُردو کی ترقی میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ م کو انعام سے زیادہ اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ کوئی پبلشر اس کی کتاب سلیقے سے چھاپ

اسے پڑھنے والوں تک پہنچائے۔ یہاں اب نہ ڈھنگ کے پبلیشرز ہیں اور نہ ایسے پڑھنے والے ہیں جو کتاب خرید کر پڑھتے ہوں۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ اُردو کا مصنف عام طور پر سرکاری اداروں سے مدد لے کر خود ہی کتاب چھاپتا ہے اور بیچنے کا فن چونکہ اسے نہیں آتا اس لئے زیادہ تر کاپیاں اس کے واقف کاروں اور دوستوں میں تقسیم ہو جاتی ہیں۔ کچھ زیادہ ہمت والے لائبریریوں کو بھی اپنی کتاب بیچ دیتے ہوں گے۔ مگر ایسی کتاب کے بہت سے نسخے تو آخر میں ردی والے ہی اُٹھا کر لے جاتے ہیں۔ اُردو اکیڈیمیاں سرکاری ادارے ہیں اور ان کے ایوارڈز تقسیم کرنے کے طریقے بھی عجیب و غریب ہیں مثال کے طور پر دلی کی اُردو اکیڈیمی نے کچھ عرصہ ہوا اُردو صحافت کے لئے ایسے صاحب کو ایوارڈ دیا جو دینیات کے آدمی ہیں اور صحافت سے جن کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ مرکزی سرکار نے ایک ترقی اُردو بورڈ بھی قائم کر رکھا ہے مگر آج کل اس کا کوئی ڈائرکٹر نہیں ہے اور چونکہ کام کی نگرانی کرنے والا کوئی آفیسر نہیں اس لئے وہاں کچھ ہو ہی نہیں رہا۔ یوں بھی اس ادارے نے آج تک کوئی ایسا کام نہیں کیا جس کا فخر سے ذکر کیا جاسکے۔

حقیقت یہ ہے کہ سیاسی سطح پر اثر قائم کرنا ہو تو مرکزی سرکار چلانے والی پارٹیاں اعلانات کرنے میں پیچھے نہیں رہتیں۔ اُردو یونیورسٹی کا بہت عرصہ سے مطالبہ ہو رہا تھا۔ اعلان کر دیا گیا کہ اُردو یونیورسٹی قائم ہوگی۔ پارلیمنٹ میں بل بھی منظور ہو گیا اور یہ بھی فیصلہ کر لیا گیا کہ اُردو یونیورسٹی حیدرآباد میں قائم ہوگی۔ مگر اس کے بعد طویل خاموشی ہے اس یونیورسٹی کے قاعدے قانون اور طریقہ کار طے کرنے سے متعلق ابھی تک کوئی کام نہیں ہوا۔ کچھ پتہ نہیں کہ یہ صرف حیدرآباد تک محدود ہوگی یا اس کا دائرہ کار زیادہ وسیع ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ اُردو والوں کو ڈگریاں تقسیم کرنے والے کسی ادارے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے لئے ہندوستان میں بہت سی ایسی یونیورسٹیاں ہیں جہاں اُردو میں ایم اے۔ پی ایچ ڈی کی ڈگریاں دی جاتی ہیں۔

ہمیں تو ایسی یونیورسٹی کی ضرورت ہے جو سارے ہندوستان میں نیچے سے لے کر اُوپر تک اُردو پڑھانے والے اسکول اور کالج قائم کرے اور جہاں کا معیارِ تعلیم دوسروں کے لئے قابلِ تقلید ہو۔ اس وقت حالت یہ ہے کہ بہار، مہاراشٹرا، مغربی بنگال اور کچھ دوسری ریاستوں میں جن اسکولوں میں ذریعہ تعلیم اُردو ہے وہاں کا معیار بہت ہی پست ہے اور مشکل سے 30 فیصد طلبہ

اور طالبات پاس ہوتے ہیں۔

اردو یونیورسٹی اگر ہمارے ملک میں اردو کے ذریعے تعلیم دینے والے اداروں کا جال کے پڑھائی کا ایک اعلیٰ معیار قائم کرے تو اس زبان کا ضرور کچھ بھلا ہو سکتا ہے اس طرح یونیورسٹی تو اردو بولنے والی اقلیت میں خواندگی بڑھانے میں بڑا اہم رول ادا کر سکتی۔ گجرال صاحب اگر اپنی ترجیحات میں اردو یونیورسٹی کے کام کو شامل کریں اور صحیح لوگوں کو پر لگائیں تو یہ یونیورسٹی اردو کی ترقی کے لئے بہت کچھ کر سکتی ہے۔ اس وقت جہاں تک ہند کا تعلق ہے اردو بس دینی مدرسوں میں محدود ہوتی جارہی ہے اور یہ پسماندگی کی بہت بڑ علامت ہے۔

اس وقت حالت یہ ہے کہ جن ریاستوں میں اردو کو کسی حد تک سرکاری حیثیت دے د ہے وہاں بھی اس کی ترقی کے آثار نظر نہیں آتے۔

بہار میں کئی برسوں سے اردو ہندی کے ساتھ دوسری سرکاری زبان ہے بتایا گیا ہے اردو جاننے والا عملہ بھی سرکاری دفتروں میں بھرتی کیا جاتا ہے یہ لوگ اردو کے سلسلے میں کا جو نہ کے باعث دوسرے محکموں میں بھیج دیئے جاتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ والوں کا کوئی ادارہ بہار کی صورت حال کا جائزہ لے کر وہاں کیا ہوا۔ کیا نہیں ہوا کیا ہو سکتا ہے اس جائزے کی اگر ایک مفصل رپورٹ تیار ہو تو باہر کی دنیا کو کم از کم اتنا معلوم ہو جائے گا کہ بہار میں جہاں کہ اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ یہ ز کیوں اب تک پسماندہ حالت میں ہے۔ اس طرح کا جائزہ تیار کرنے کا کام انجمن ترقی اردو ادارے کو کرنا چاہئیے۔ مگر افسوس تو اس بات کا ہے کہ انجمن والے بھی صرف سیمینار منعقد کر سب سے اہم کام تصور کرتے ہیں۔ ●

(سیاست ۱۱ / ۵ / ۶۹ء (دلی ڈائری) سے شکریہ کے ساتھ ماخوذ)

اردو لکھیئے ۔ اردو پڑھیئے ۔ اردو بولیئے

اردو کی بقاء و ترویج کیلئے کام کیجئے

گجرال کمیٹی کی سفارشات بہ یک نظر

موجودہ وزیر اعظم مسٹر اندر کمار گجرال نے آج سے تقریباً ۲۲ سال قبل ملک میں اردو زبان و ادب کے فروغ اور اردو لسانی اقلیت کی بالواسطہ ہمہ جہتی ترقی پر بڑی باریک بینی سے کوئی تین سال تک جائزہ لیا اور بڑی عرق ریزی کے بعد ۱۹۷۵ء میں اپنی رپورٹ حکومت ہند کو پیش کر دی۔ اس وقت یہ مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات اور اردو کی ترقی کے سلسلہ میں ایک کمیٹی کے صدر نشین تھے۔ اس وقت کے وزیر تعلیم سماجی بہبود و ثقافت پروفیسر سید نور الحسن کو انہوں نے اپنی رپورٹ اس یقین کے ساتھ پیش کی تھی کہ اس پر عمل ہوگا۔ نظر اندازی کا ایک طویل عرصہ دو دہوں پر محیط ہو گیا۔ سفارشات پر عمل آوری کے موجودہ حالات میں تطابق کا جائزہ لینے کی غرض سے جناب سردار جعفری کمیٹی تشکیل دی۔ اس نے بھی اپنی رپورٹ پیش کر دی اور اب ۲ سال بعد وہی محب اردو وزارت عظمیٰ کے جلیل القدر عہدہ پر فائز ہیں۔

تمام اردو والوں کو اور ممکن ہے خود انھیں یہ امید ہو کہ ان سفارشات کو ان کے ہاتھوں عمل میں لائی جائیں۔ ع لوٹ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

دونوں کمیٹیوں کی سفارشات بہ یک نظر پیش ہیں۔

گجرال کمیٹی کی سفارشات

تعلیم :۔ لسانی اقلیتی گروپ کے لئے ان کی اپنی مادری زبان میں دفعہ ۸۔ ۳۵۰ کی رو سے تعلیم کی سہولت فراہم کرنا ہر ریاست میں مقامی اقتدار کا فریضہ ہے اس لئے یہ ضروری ہے کہ پرائمری سطح پر اردو مادری زبان رکھنے والے طلباء کا انتظام حکومت کرے۔

ہر جماعت میں ۱۰ اور اسکول میں ۴۰ طلبار کی تعداد اُردو پڑھنے والی ہو تو انھیں اُ
میں تعلیم کا انتظام چونکہ ہدف تنقید بنایا جارہا ہے اور یہ طلبار کی ضرورت اور تقاضوں
مطابق بھی نہیں اس لئے ضروری ہے کہ دیہی علاقوں کے شہری حصے گاؤں ٹاؤن یا بلدی و
میں جہاں دس فیصد اُردو بولنے والوں کی آبادی ہو ایک پرائمری اسکول قائم کیا جائے
میں اُردو اور غیر اُردو میڈیم طلباء کے داخلے کی گنجائش بھی فراہم کی جائیں۔ اور ایسے علا
میں جہاں دس فیصد سے کم آبادی ہو وہاں مدرسوں میں کم از کم ایک اُردو ٹیچر ہو۔ اس
علاوہ ایسے مدارس میں غیر اُردو داں اساتذہ کو اُردو سیکھنے کے لئے الاونس یکمشت انعا
انکریمنٹ دیئے جائیں۔

دوسرے میڈیم کے مدارس میں اُردو کی متوازی جماعتیں قائم کی جائیں۔ ہر آٹھ
پرائمری اسکولس کے گروپ کے لئے ایک ہائر سکنڈری اسکول کے قیام کو یقینی بنایا جا۔
اُردو مادری زبان بولنے والوں کی جانب سے چلائے جارہے اُردو میڈیم ہائر سک
اسکولس کا معیار تعلیم بڑھایا جانا چاہئیے۔ اس کے لئے قابل سے قابل اساتذہ کے تقررات
یقینی بنایا جائے تاکہ ان مدارس کے طلبار دیگر میڈیم کے طلبا سے تعلیم میں کم نہ ہوں۔

سہ لسانی فارمولہ ـــ قومی پالیسی۔ ریزولیوشن ۱۹۶۸ء کے مطابق ہندی ریاستو
میں سہ لسانی فارمولہ ہو ترجیحاً ہندی، انگریزی اور کوئی جدید ہندوستانی زبان (ترجیحاً جنو
کی زبان) اور غیر ہندی ریاستوں میں سہ لسانی فارمولہ کے تحت ہندی، انگریزی اور علاقائی ز
ہو۔ اس فارمولہ کے انطباق میں کئی ریاستوں میں اُردو بولنے والوں کو شدید مشکلات کا
کرنا پڑ رہا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ اس فارمولہ کو اس طرح عمل میں لایا جائے کہ طالب
کو اپنی مادری زبان، اس کی اپنی ریاستی سرکاری زبان کے ساتھ سیکھنے پڑھنے کا موقع دیا جائے
اسے اس طرح بنایا جاسکتا ہے۔

ہندی بولنے والی ریاستوں کے لئے (۱) ہندی (سنسکرت ایک ملے جلے نصاب کا
(۲) اُردو یا کوئی جدید ہندوستانی زبان (ہندی کے علاوہ) (۳) انگریزی یا کوئی جدید یو
زبان ـــ

غیر ہندی ریاستوں کے لئے۔ (۱) علاقائی زبان (۲) ہندی
(۳) اردو یا کوئی جدید ہندوستانی زبان (علاقائی اور ہندی کو چھوڑ کر)
(۴) انگریزی یا کوئی جدید یوروپی زبان

اردو اساتذہ کی ٹریننگ : اساتذہ کی مانگ اور فی الفور غیر تربیتی اساتذہ کی بھرتی کی صورت میں انہیں مقررہ مدت میں تربیت یافتہ ہونے کا لزوم رکھا جائے اس کے لئے ریاستوں کے مختلف مقامات پر تربیت کی سہولتیں فی الفور فراہم کی جائیں۔ تربیت یافتہ اساتذہ کی قلت کے پیش نظر آندھرا، بہار، گجرات، کرناٹک، مدھیہ پردیش، مہاراشٹرا، راجستھان، اتر پردیش اور مغربی بنگال حکومتوں کی جانب سے فی الفور مختصر مدتی تربیتی کورسس کے ادارے قائم کئے جانے چاہئیں جیسا کہ مرکزی حکومت نے سولن میں ۷۴-۱۹۷۳ء سے ایسا ادارہ قائم کردیا ہے۔ اس کے علاوہ ان ضرورتوں کے صحیح اور مکمل علم کے لئے ریاستی حکومتوں کی جانب سے ماہرین تعلیم اور اساتذہ پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی جائے جو مبسوط سروے کرکے تربیت اور اساتذہ کی قلت کا جائزہ لے سکے اور اساتذہ کو گریڈ دینے کا بھی جائزہ لیا جائے اور انہیں معقول گریڈ دیئے جائیں۔

نصاب اردو والوں کی جانب سے نصابی کتب نہ ہونے کی شکایات مسلسل آرہی ہیں اس کے لئے ریاستی حکومتوں کی جانب سے اسے ذمہ داری سمجھ کر کام کرنا چاہیئے اور اس بات کو یقینی بنایا جانا چاہیئے کہ تعلیمی سال کے آغاز سے قبل تمام نصابی کتب نہ صرف چھاپی جائیں بلکہ اردو والوں کے لئے مارکٹ میں یہ دستیاب بھی ہوں۔ اس سلسلہ میں ترجمہ اور ترتیب و طباعت کی کوالٹی پر خاص نظر رکھی جائے اور چونکہ عام طور پر اردو والے معاشی طور پر کمزور ہوتے ہیں اس لئے نصابی کتب رعایتی قیمت پر فراہم ہوں۔

تعلیم بالغان ریاستی حکومتوں آندھرا پردیش، مہاراشٹرا اور اتر پردیش میں بالخصوص شکایات ہیں کہ تعلیم بالغان مرکز میں اردو نہیں پڑھائی جاتی۔ ان مقامات پر جہاں اردو والوں کی قابل لحاظ آبادی ہے ایسے سنٹر میں اردو پڑھانے کی سہولتیں فراہم کی جائے۔

فراہم کیا جائے۔

فاصلاتی / مراسلاتی کورسس۔ ریاستی حکومت اپنی ریاست کی کم از کم ایک یونیورسٹی میں اُ میں مراسلاتی کورسس شروع کرے اور آندھرا پردیش، بہار، ہریانہ، ہماچل پردیش، کرن اور مدھیہ پردیش، مہاراشٹرا، پنجاب اور مغربی بنگال ریاستوں میں یہ سہولت فی الفور ہو۔

دارالمطالعے — مدارس اور کالجوں کی لائبریریوں میں اُردو طالب علموں کے لئے ا کی وافر تعداد میں کتب مطالعے کے لئے فراہم کی جائیں۔ اس کے لئے لائبریریوں میں اردو اسٹاف تقرر کیا جائے۔ اُردو کتابوں کی نگہداشت کے اقدامات کئے جائیں۔ اس کے لئے ریاستی حکومت بجٹ کرے۔ یونیورسٹیوں اور ریاستی حکومت کی لائبریریوں میں اُردو کتابوں کی تعداد بڑھائی جا خانگی اُردو لائبریریوں کی گرانٹ کی منظوری کی جائے۔

ایسے مقامات پر جہاں اُردو بولنے والوں کی قابلِ لحاظ تعداد آباد ہو قائم یونیورسٹیو اُردو شعبے قائم کیئے جائیں۔ جہاں گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن کی سہولتیں فراہم ہوں۔

اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹس۔ اُردو زبان وادب میں تحقیق کے فروغ کے لئے جنو اور شمال میں دو ریسرچ سنٹرز قائم کیئے جائیں۔ جنوب میں یہ سنٹر حیدرآباد میں قائم کیا جائے اور اسے سنٹرل یونیورسٹی یا عثمانیہ یونیورسٹی سے ملحق کیا جا سکتا ہے اور شمال میں یہ علی گ بھوپال، لکھنو یا دہلی میں قائم کیا جا سکتا ہے ملک کے دیگر اسی طرح کے ریسرچ سنٹر زیلی فر کردہ فیلوشپ کے خطوط پر ان مراکز میں بھی فیلو شپ فراہم کی جائے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ — فی الحال تین کالجوں میں حیدرآباد میں دو مہاراشٹرا میں ایک اور جامعہ ملیہ اسلامیہ اُردو میڈیم میں ہیومانیٹرز اور سوشیل سائنس کی تعلیم دی جارہی ہے ان کے گرا اور سہولتوں میں اضافہ کیا جانا چاہیئے۔

اُردو میڈیم کالجس کم از کم ایک ریاست میں ایک اُردو میڈیم کالج قائم کیا جس میں گریجویشن کی سطح تک اُردو میں تعلیم کی سہولت

ترقی اردو بیورو ۔ بیورو جو حال ہی میں مرکزی وزارت تعلیم اور سماجی بہبود تحت کام کر رہا ہے اسے مزید مضبوط کرنے کی ضرورت ہے اور اسے مزید مضبوط کرنے کی ضرورت۔

تعلیمی اُردو میں ریاستوں میں ترقی کا کام بھی انجام دینا ہے اور اس کی ذمہ داریوں میں ترقی اور اُردو کے تربیتی کاموں کی نگرانی کا بھی اضافہ کیا جائے۔

انتظام مرکزی حکومت اور ریاستی چیف منسٹروں نے ۱۵ فیصد کی آبادی کے علاقوں میں سرکاری سہولتوں سے اتفاق کر لیا ہے لیکن اُردو جیسی وسیع زبان کے لئے رعایتی انداز میں سہولیتیں فراہم کی جانی چاہیئے اور لزوم میں لچک پیدا کی جانی چاہیئے۔

قوانین اور شرائط کا ترجمہ۔ اس فیصلے کو عملی شکل دینے میں سب سے بڑی مشکل قوانین اور شرائط کا ترجمہ ہے۔ اس کی سہولیتیں فراہم ہونی چاہیئے۔ حالانکہ آندھرا پردیش، اترپردیش اور بہار میں ترجموں کے شعبے قائم ہیں لیکن ان کے کام میں وسعت اور معیار کی ضرورت ہے۔ کمیٹی یہ سفارشات کرتی ہے کہ ایسے ادارے قائم کئے جائیں اور جہاں کہیں یہ ادارے ہوں انھیں مضبوط کیا جائے۔ اُردو مترجمین کے نئے پوسٹ نکالے جائیں۔ ان پر تقررات عمل میں لائے جائیں۔

اُردو مراسلت سرکاری کاموں کے لئے اُردو کے استعمال کا فروغ اُردو میں مراسلت کو منظور کیا جائے۔ سرکاری دفاتر میں ہر سطح پر اُردو سیل قائم کئے جائیں تاکہ اُردو میں شکایات، مراسلے اور نمائندگیوں پر اقدامات کئے جا سکیں۔

اس کے لئے افسروں اور سرکاری عہدیداروں کی اُردو سیکھنے کی ترغیب دی جائے انتظامی امور کی آسانی کے لئے انھیں اُردو سکھائی جائے (اقلیتی زبانیں) اس کے لئے انھیں کئی مراعات کا اعلان کیا جا سکتا ہے۔

سرکاری ملازمت اور اُردو۔ سرکار اس بات کو یقینی بنائے کہ سرکاری زبان سے عدم واقفیت کی بناء پر لسانی اقلیتوں کی ملازمتوں میں ٹھکرایا نہ جائے۔ تمام شعبہ جاتی ٹسٹ میں کامیابی کا لزوم رکھا جا سکتا ہے۔

انتخابی قوانین۔ جن مقامات پر ۱۰ فیصد اُردو بولنے والوں کی آبادی ہو وہاں انتخابی قوانین اُردو میں طبع کروائے جائیں۔

پوسٹ اور ٹیلیگراف محکمہ کی جانب سے تمام اشاعتی اشیاء اُردو میں بھی چھاپی جائیں۔

محکمہ ریلوے میں نام اور بورڈ اُردو میں بھی استعمال ہوں۔ کرایہ اور منزل کا نام اُردو میں لکھا جائے

(کم از کم اردو بولنے والی آبادی کے علاقوں کے لئے) اُردو میں سائن بورڈز، سنگِ میل وغیرہ پر اردو استعمال کی جائے۔

میڈیا اور ذرائع ابلاغ ۔ آل انڈیا ریڈیو کے اُردو پروگرامس بڑھائے جائیں، وقت بڑھایا جائے اور ذرائع ابلاغ کی زبان میں سدھار کے لئے ماہرین کی ایک کمیٹی تشکیل دی جائے۔ اُردو پروڈیوسرس کا تقرر کیا جائے۔ ترقیاتی فیچرز اور قومی پروگرامس کی اُردو میں نشریات ایک ضرورت ہے۔

ٹیلی ویژن میں مصنف / شاعر کا نام (مباحثہ میں) اُردو میں لکھا جائے۔

پی۔ آئی۔ بی۔ اردو بولنے والے سامعین، ناظرین اور قارئین کے لئے اور پبلسٹی ورک کیا جائے۔ امورِ خارجہ سے متعلق بھی معلومات و مواد کا اُردو ترجمہ اخبارات کے لئے فراہم کیا جائے اور اردو اخبار میں عدم گنجائش کے پیش نظر مواد کے تعلق سے اضافی ضروریات شائع کی جائیں۔

پبلیکیشنز ڈیویژن ۔ اُردو میں کتابوں کی اشاعت کے لئے توسیع کے لئے اسے کیا جائے۔ ۷۳-۱۹۷۲ء میں اس کے صرف دو کتابیں اُردو میں شائع ہوئی ہیں۔

فلمس ۔ فلم ڈیویژن کی جانب سے اردو میں اُردو بولنے والوں کی دلچسپیوں کے مطابق فلمیں بنائی جائیں۔

DAVP ۔ سائنٹفک اور معلوماتی کتابوں کی (اُردو میں نمائش کا ہر سال اہتمام کیا جائے)

سرکاری گزٹ ۔ اتر پردیش حکومت اور آندھرا پردیش گورنمنٹ اُردو میں مکمل گزٹ شائع کر رہی ہے یہ قابلِ تحسین اقدام ہے۔ اُردو بولنے والوں کی قابل لحاظ آبادی والی ریاستوں میں علاقوں میں اس طرز میں گزٹ شائع کی جانی چاہیئے۔

جرنلزم ۔ اُردو اخبارات کے محدود وسائل کے پیش نظر اخبارات چلانے کے لئے ایک چھوٹے امداد باہمی اداروں کی تشکیل کی منظوری دی جائے۔

اشتہارات ۔ عام تشہیر پر مبنی اشتہارات کم از کم ۶۰ فیصد چھوٹے اور متوسط اخبارات بشمول اُردو کو دیئے جائیں۔ اشتہارات کے بلوں کی ادائیگی میں بھی سرعت پیدا کی جائے اس کے لئے اُردو اخبارات عام طور پر طویل مدت بلوں کے انتظار سے مالی بوجھ نہیں اٹھا

اُردو اخبارات و رسائل میں بہترین مناسب اکاونٹنس، سیلس پروموشن ریونیو اور جنرل مسائل کی یکسوئی کے لئے پریس انفارمیشن بیورو میں ایک اسمال نیوز پیپرس CONSULTANCY قائم کی جائے۔

اُردو اکیڈیمیاں : اُردو اکیڈیموں کے قیام اداروں میں مقامی حدود کے مصنفین اور ادیبوں اور قلمکاروں کو مناسب نمائندگی دی جائے۔ اصل تحریروں کی اشاعت کے لئے رعایت اور مالی امداد دی جائے۔

وظیفہ معمرین ۔ مرکز اور ریاستوں کی جانب سے معمرین کے لئے دیئے جانے والے اسٹائیفنڈ میں اضافہ کیا جائے (۱۵۰ روپے بہت ہی کم ہے)

اسکالرس ایمیریٹس : اُردو کے معمر اور تجربہ کار اسکالرس کی خدمات سے استفادہ کے لئے ان کے ریسرچ کے کام کے فروغ کے لئے انھیں اسکالرشپس دیئے جائیں۔ یہ رقم ان کے تمام ممکنہ اخراجات کی پابجائی کرنے والی ہو۔

دیوناگری لپی : کسی بھی زبان کا خط نہیں بدلا جا سکتا تاہم اُردو کتابوں کی دیوناگری لپی میں بھی اشاعت لائی جا سکتی ہے تاکہ وسیع مطالعہ ہو سکے۔ اردو اور ہندی کی تواریخ ایک دوسرے خط میں تحریر کی جائیں۔

اُردو میں کتابوں کی اشاعت کے لئے ناشرین مصنفین و مترجمین کو بہتر سے بہتر سہولیتں فراہم کی جائیں۔ کانفرنس وغیرہ کے انعقاد کے لئے گرانٹس دی جائیں تاکہ ادب کا فروغ ہو۔

کمیٹی نے مذکورہ سفارشات پیش کرتے ہوئے یہ بات بھی کہی ہے کہ ان سفارشات کی عمل آوری سے نہ صرف مسائل کی یکسوئی کی حامل شکایات و مشکلات دور ہو سکتی ہیں بلکہ اس سے دیگر لسانی اقلیتوں کے مسائل کی یکسوئی کے لئے ایک بہتر طریقہ و راستہ فراہم ہو سکے گا۔

بعد وقت تمام حکومت ہند نے (۱۹۷۵ء سے ۱۹۸۹ء) تعطل کو توڑ کر ۱۹۹۰ء میں ایک اور کمیٹی تشکیل دی جو سردار جعفری کمیٹی سے موسوم تھی۔ اس کمیٹی کا اہم مقصد یہ تھا کہ آیا گجرال کمیٹی کی سفارشات اور موجودہ حالات کے مطابق ہیں۔ اُردو کی ترقی کے لئے گجرال کمیٹی کی سفارشات کا جائزہ لینے کی غرض سے مرکزی وزارت فروغ انسانی وسائل کے شعبۂ تعلیمات کے تحت علی سردار جعفری کمیٹی کی تشکیل کی گئی۔

اس کمیٹی کے چیرمین علی سردار جعفری نے اپنی رپورٹ کے ابتدائیہ میں لکھا کہ چونکہ گجرال کی سفارشات کو کوئی قانونی حیثیت نہیں دی گئی تھی نہ ہی اسے کوئی سرکاری حیثیت حاصل اور اسے اب تک صرف مرکزی و ریاستی وزیروں اور محکموں کے دست نگر رہنا پڑا تھا چنانچہ اب یہ ضروری ہو گیا ہے کہ مرکزی کابینہ اس رپورٹ پر کوئی قطعی فیصلہ کرے اور پارلیمنٹ کی منظوری کے ساتھ ٹھوس ریزولیوشن پیش کرے۔ کیٹی کا یہ ایقان ہے کہ اس طرح رپورٹ کے عملی انطباق کی راہیں ہموار ہو سکیں گی۔

اپنی ایک سو صفحات پر مشتمل رپورٹ میں کمیٹی نے یہ کہا ہے کہ ایک مدت کے تعین کے ساتھ گجرال کمیٹی کی سفارشات پر عمل آوری کی جائے۔ اس کے علاوہ اس کمیٹی نے یہ بھی صلاح دی ہے کہ سفارشات پر عمل آوری کے جائزہ اور نگرانی کے لئے ایک مستقل نگران کار کمیٹی ۔ PERMANENT IMPLEMENTATION COMMITTEE وزیراعظم کی زیر صدارت قائم کی جائے اور اس طرح کی دیگر ریاستی کمیٹیاں چیف منسٹروں کی زیر صدارت ہوں اُردو جاننے والا جوائنٹ سکریٹری اس کمیٹی کا رکن ہو) ریاستوں اور مرکزی زیر انتظام علاقوں میں تشکیل دی جائیں۔ اس کے لئے ایک مستقل سکریٹریٹ قائم کیا جائے گجرال کمیٹی کی سفارشات کی پیشکشی کو آج ۲۲ سال ہو گئے اور ان سفارشات کی عمل آوری کے جائزہ کے لئے سردار جعفری کمیٹی کی رپورٹ کی پیشکش کو آج ۷ سال گذر گئے لیکن عمل آوری کی صورت حال اظہر من الشمس ہے۔

گجرال کمیٹی ۵ رمئی ۱۹۷۲ء کو تشکیل دی گئی۔ اس نے رپورٹ مئی ۱۹۷۵ء کو پیش کر دی۔ اس کمیٹی پر ایک اور سردار جعفری کمیٹی ۱۵ رفروری ۱۹۹۰ء کو تشکیل دی گئی جس نے اپنی رپورٹ ۱۸ رستمبر ۱۹۹۰ء کو پیش کر دی۔

(سیاست انٹرنیشنل ۱۶ رمئی ۱۹۹۷ء سے ماخوذ)

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ

اقلیتوں کے مسائل

وعدوں، مایوسیوں اور توقعات کا مثلث

ہندوستان دنیا بھر میں واحد ملک ہے جیسا کہ قومی آبادی میں اتنا تنوع اور اتنی گوناگونی پائی جاتی ہے اور یہ بھی مسلمہ امر ہے کہ اس تنوع اور گوناگونی سے ایک قدر مشترک بھی ہے جو ہمیں ایک ڈور میں باندھے ہوئے ہے اور تنوع میں اتحاد کا ایک ایسا منظر ہے جبکہ دونوں ہی کی پائیداری ضروری ہے اور کسی کو گزند پہنچے تو ملک کا منظر نامہ مجروح ہو جائے۔

ہندوستان میں جتنی زبانیں بولی جاتی ہیں (اور پھر بولیاں الگ ہیں) اتنی دنیا کے کسی ایک ملک میں نہیں بولی جاتیں پھر مذاہب بھی (اور ان کی ذیلی شاخیں) بھی ان گنت ہیں۔ دنیا کا شائد ہی کوئی مذہب ہو جسکے پیرو ہندوستان میں نہ بستے ہوں۔ لیکن ایسے مذاہب مل جائیں گے جو صرف ہندوستان سے مخصوص ہیں اور دنیا میں کہیں ان کے ماننے والے نہیں رہتے۔ لسانی اور مذہبی گروپوں کے علاوہ نسلی گروہ بھی کئی ہیں جو قبائل کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ اسی تنوع اور تنوع کے باوجود ایک ہی ملک میں بسنے اور ایک ہی جمہوری نظام میں زندگی گذارنے کے اس قومی منظر کی حفاظت ضروری ہے۔ یعنی اس تنوع کی بھی مدافعت کرنی ہے اور اس اتحاد کو بھی مضبوط بنانا ہے یہی وہ حقیقت ہے جسے نظر انداز کرنے سے ملک بھی کمزور ہوگا اور ہماری جمہوریت بھی مجروح ہوگی۔

لسانی نقشہ ہی کو لے لیجئے ملک کی ہر زبان کہیں نہ کہیں اقلیت کی زبان ہے اور اردو تو ایسی زبان ہے جو ہر جگہ اقلیت میں ہے۔ اس لئے ملک کے استحکام کے لئے ایک منصفانہ لسانی پالیسی ضروری ہے تاکہ کسی لسانی گروہ کو یہ نہ محسوس ہو کہ اسے کمتر درجہ دیا گیا ہے اسی طرح مذہبی اور لسانی اقلیتوں کے لئے بھی انصاف ضروری ہے اور کسی کو کسی اور پر برتری نہیں دی جا سکتی۔

یہاں ہم اُردو لسانی اقلیت سے بحث کریں گے اور یہ ایسی اقلیت ہے جو ایک بڑی آبادی پر مشتمل ہونے
ہوئے بھی ہر جگہ اقلیت میں ہے اور پھر انہیں شہروں اور قصبوں میں بسنے کا رجحان زیادہ شدید ہے
جہاں تک زبان کا تعلق ہے اردو نے آزادی کی لڑائی سے بہت زبردست حصہ ادا کیا ہے اور یہ اس کی
تاریخ کا سنہری باب ہے۔

لیکن بدنصیبی سے بعض متعصب حلقوں میں اُردو کو آزادی کی نہیں بلکہ تقسیم کی ذمہ دار قرار
دیا جاتا ہے اور اس بناء پر اس کے ساتھ علحدہ اور غیر منصفانہ برتاؤ کیا جاتا ہے اس کی
بنا ... اور اس کے ارتقاء کو دیکھا جائے تو اُردو بالکلیہ ہندوستانی نژاد ہے یہیں کی کھڑی
بو ... ـار پائی ہے۔ ہند آریائی زبان ہے اور ہندوستان کی اور زبانوں کی طرح اس کا
... حوالہ اس کی اپنی تہذیب ہے اور پھر عصری ہندی اور عصری اُردو کے درمیان الفاظ کا وسیع
ذخیرہ مشترک ہے۔ محاورے وہی ہیں۔

اسے صرف مسلمانوں کی زبان کہہ دینا مسلمانوں اور اُردو دونوں ہی کے ساتھ ناانصافی کرنا ہے۔
ملک کے مختلف علاقوں میں اکثر مسلمانوں کی مادری زبان اُردو نہیں ہے۔ اور ایسے متعدد غیر مسلم ملیں گے
جن کی مادری زبان اُردو ہے ان سے زیادہ وہ لوگ ہیں جن کی مادری زبان چاہے کوئی ہو لیکن ادبی
اظہارِ خیال کی زبان اُردو ہے اسی لیئے ہندوستان کے آئین نے اُردو کو ملک کی ۱۵ ادبی زبانوں کی فہرست
میں شریک کیا ہے۔ اُردو لسانی اقلیت کو ملک میں ایک اہم مقام حاصل ہے اس لیئے اس تعلق سے
پالیسی اور پروگرام کو اہمیت حاصل ہے اور اس اعتبار سے غور کیا جائے تو اُردو اقلیتوں کو وعدوں
سے نوازا گیا۔ پھر ان پر عمل نہ کرکے انہیں مایوسیوں سے دوچار کیا گیا اور اس مثلث کی تکمیل کے
لئے اقلیتوں کے نئے توقعات کا بھی ایک زاویہ موجود ہے۔

آئین میں مادری زبان میں ابتدائی تعلیم بہم پہنچانے کی ذمہ داری حکومتوں پر عائد کی گئی ہے
اور آئین کے رہنمایانہ خطوط میں دس سال کے اندر سبھی کو پڑھا لکھا بنانے کا ذکر ہے۔ لیکن اردو
اقلیت کا کیا حال ہے؟ ذیل کے جدول سے ظاہر ہے۔

ریاست	اُردو بولنے والوں کی آبادی	اُردو ذریعہ تعلیم کے سرکاری مدارس
۱۔ اترپردیش	ایک کروڑ	ایک بھی نہیں
۲۔ بہار	۷۵ لاکھ	۵،۵۰۰

۳۔ کرناٹک	۴۰ لاکھ	۲٬۸۵۴
۴۔ مہاراشٹرا	۴۵ لاکھ	۲٬۱۰۳
۵۔ آندھرا پردیش	۵۰ لاکھ	۱٬۱۳۵
۶۔ راجستھان	۱۰ لاکھ	۱۵۰
۷۔ دہلی	۱۵ لاکھ	۹۵
۸۔ مغربی بنگال	۲۵ لاکھ	۲۴۰

ان اعداد و شمار سے یہ ظاہر ہے کہ اردو اقلیتوں کو ان کی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے کے بنیادی حق سے محروم رکھا جا رہا ہے۔ اسی لئے اردو اخبارات اور کتابوں کی اشاعت اور نکاسی پر اثر پڑ رہا ہے۔ آئین میں تو یہ کہا ہے کہ ہندوستان کا ہر شہری کسی بھی حکومت کو اپنی مادری زبان میں عرضی دے سکتا ہے لیکن عملاً یہ سہولت حاصل نہیں کیوں کہ مترجم موجود نہیں اور درخواست پر عمل ہی نہ ہونے کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔

یوپی اور بہار میں اردو کو ان علاقوں اور ان اغراض کے لئے جن کا حکمنامہ میں ذکر ہوگا دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے اور آندھرا پردیش میں آٹھ اضلاع میں جہاں اردو آبادی ۱۰ فیصد سے یا اس سے زیادہ ہے اردو کو دوسری سرکاری زبان تسلیم کر لیا گیا ہے لیکن وہ ذیلی قواعد ہی نہیں جن کی بناء پر ان قوانین پر عمل ہوگا اور یہ قانون محض زینت قرطاس بنے ہوئے ہیں۔ ریاستی تنظیم جدید کمیشن نے سفارش کی تھی کہ (۱۹۵۶ء میں) جن شہروں اور قصبوں میں اقلیتی زبان بولنے والے ۳۰ فیصد یا اس سے زیادہ ہوں ان علاقوں میں مقامی ریاستی اور اقلیتی دونوں زبانوں میں کام چلایا جائے۔ لیکن اس پر بھی کہیں عمل نہیں ہوتا۔

گجرال کمیٹی نے (۱۹۷۵ء) میں بہت اہم سفارشیں کی ہیں۔ محض چند کا ذکر کروں گا ایک سفارش یہ ہے کہ ریاستی حکومت کے عہدہ داروں اور کارکنوں کو ریاست میں بولی جانے والی اقلیتی زبانوں میں سے کم سے کم ایک سے واقف ہونا ضروری ہے اس پر کوئی عمل نہیں ہوتا۔ یوپی، بہار اور آندھرا پردیش کے ۸ اضلاع میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کہا گیا لیکن سرکاری عملے پر اردو کا علم حاصل کرنے کی کوئی شرط نہیں۔ گجرال کمیٹی نے اس غرض کے لئے ضروری ترغیبی مراعات کی سفارش کی ہے لیکن اس پر کہیں عمل نہیں ہوتا۔ یہی حال گجرال کمیٹی کی سہ لسانی فارمولے کی سفارش کا ہوا ہے گجرال

کمیشن نے یوپی سرکار کے اس عمل پر تنقید کیا کہ وہاں سنسکرت کو سہ لسانی فارمولے میں شامل کر کے اردو یا ہندوستانی کسی اور زبان سیکھنے کے دروازے بند کر دیئے گئے ہیں یعنی سہ لسانی فارمولے سے سنسکرت، ہندی اور انگریزی ہی شامل ہے۔ گجرال کمیٹی نے سفارش کی ہے کہ سنسکرت کی ہندی کے ساتھ مشترکہ نصاب میں رکھا جائے اور دوسری زبان کوئی ہندوستانی زبان ہو، اردو بھی ہے اور انگریزی تیسری ہو۔

غیر ہندی ریاستوں اور علاقوں میں اقلیتی طلباء پر چار زبانوں کا بوجھ پڑتا ہے اس لئے ہندی کو وسطانی تعلیم کی جماعتوں میں اردو کے ساتھ مشترکہ نصاب میں شامل کیا جائے۔ یہ مشورہ غالباً جعفری کمیٹی نے دیا ہے اردو والوں اور اردو دادارون کا یہ مطالبہ ہے کہ عدالتوں جیسا کہ گواہی قلمبند کی جاتی ہے اور اگر ان علاقوں میں اردو آبادی قابل لحاظ ہو تو گواہی قلمبند کی جائے اور ہر عدالتی فیصلوں کا اردو ترجمہ فراہم کیا جائے لیکن اس پر کوئی توجہ نہیں کی جاتی۔ غرض اردو اقلیتوں سے وعدے تو بہت کئے گئے اور آئین کی روح اور ملک کی جمہوریت کے بنیادی مزاج میں سماجی انصاف کو مقام دیا گیا لیکن ان پر عمل نہ ہونے سے ان عوام میں مایوسی پھیل رہی ہے لیکن ساتھ ہی اب جبکہ ملک کے ایک ممتاز دانشور اور سیکولر ذہن کے حامل انصاف پسند گجرال صاحب وزیر اعظم بنے ہیں اور جو گجرال کمیٹی کی سفارشات کی تدوین کے ذمہ دار ہیں تو اردو حلقوں کو جائز طور پر توقعات وابستہ ہیں کہ وعدوں پر عمل ہوگا۔ منصفانہ سفارشات لاگو ہوں گی اور اس لحاظ سے ملک کی جمہوریت اور بھی مستحکم ہوگی۔

(سیاست سے ماخوذ شکریہ کے ساتھ)

سید حامد



" اردو یونیورسٹی اور سہرا بندی " کے عنوان سے مجتبیٰ حسین کا ایک دلچسپ مضمون نظر سے گزرا۔ راقم الحروف کے دل میں ایک عرصے سے یہ خیال جاگزیں تھا کہ ہم اردو والوں کے مزاج کا ایک خاصہ خلطِ مبحث ہے، فروعات ہمارے لیے غیر معمولی کشش رکھتی ہیں؛ ہماری نگاہ ڈالیوں بلکہ ٹہنیوں اور پھننگیوں اور پتیوں میں الجھ کر رہ جاتی ہے؛ تنا ہمیں نظر ہی نہیں آتا اور جڑیں تو خیر د برگد کو چھوڑ کر یوں بھی دبی رہتی ہیں، چھپی رہتی ہیں۔ بے وقت کی شہنائی ہمیں ائرنوں کے کانوں کی طرح مسحور کرتی ہے ہم اور ہماری فکر اور ہماری تدبیریں وقت کا ساتھ نہیں دے پاتیں، پیچھے پیچھے چلتی ہیں مسائل کو ہم دھکہ دے دیتے ہیں اور شخصیات کو سر پر چڑھا لیتے ہیں۔ غیر مربوط اور غیر متعلق کو ہم آنکھوں پر بٹھالیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہم رائے عامہ نہیں بنا پاتے اور ہمارے مطالبات ٹھکرائے جاتے ہیں۔ زندگی خواہ افراد کی ہو، خواہ جماعتوں اور قوموں کی، اس میں بے ربطی، بے تناسبی اور بے محوری اور ناوقتی ہمیشہ ٹوٹے کا سودا بن جاتی ہے اردو یونیورسٹی کی پذیرائی ہم نے جس طرح کی اس نے اس خیال کو پختہ کر دیا اس خلش کو چمکا دیا۔

اردو یونیورسٹی کے تئیں بھی ہم نے اپنی دستوری روش کو اختیار کیا۔ سرکار کی طرف سے یونیورسٹی کا اعلان ہونا تھا کہ ایک کہرام مچ گیا۔ اردو اردو کی ابتدائی تعلیم کے لئے جو دراصل ضروری ہے کچھ کیا ہی نہیں اور چلے ہیں اردو یونیورسٹی بنانے گویا جڑوں کو چھوڑ کر ٹہنیوں کو سینچا جا رہا ہے۔ اعتراض اپنی جگہ پر صحیح تھا لیکن اعتراض میں سر کھپانے اور وقت ضائع کرنے کے بجائے ہمارا سارا دھیان:

مامور ہونا چاہیے تھا مجوزہ یونیورسٹی کے ہیولی یا نقشِ اول کی تشکیل پر تاکہ جو یونیورسٹی بالآ
بنے وہ اُردو والوں کے لئے زیادہ سے زیادہ کارآمد ہو۔ ہمارے دانشوروں نے اس بنیادی اور تعمیری کا
کی طرف توجہ ہی نہیں دی ؛ فریاد اور واویلا، طنز، تنقیص اور استہزا میں وقت عزیز گنوادیا، خا
اس سے کہ وقت اپنے آپ کو دوہراتا نہیں۔ گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں۔ اخباروں اور محفلوں
یہ مسئلہ زیرِ بحث آیا لیکن اس بحث نے روپ اختیار کیا، شکوہ سنجی اور گلہ مندی یا علاقا
رقابت کا، تشکیل اور تعمیر کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا۔

حکومت نے فرضِ کفایہ کے طور پر باذرہ نمائش اُردو کے اہلِ قلم اور اہلِ اثر کی ایک کمیٹی
بنائی کہ وہ یونیورسٹی کی روپ ریکھا کی بابت اسے سمجھاؤ دیا۔ اس کمیٹی میں اس کم سواد کو بھی بیٹھنے
کا موقع ملا۔ کوشش یہ کی گئی کہ یونیورسٹی کو اس طرح سے ڈھالا جائے کہ وہ اُردو زبان اور اسے بو
والوں کے لیے فیوض کا سرچشمہ بن جائے۔ آزادی کے بعد کئی ریاستوں میں اُردو تعلیم کا جو سلسلہ
گیا یا توڑ دیا گیا وہ کسی طرح جڑ جائے۔ انفرادی سطح پر جو لوگ تعلیم چھوڑ بیٹھے ان کو گھر بیٹھے
اُردو میں تعلیم حاصل کرنے کے مواقع فراہم کر دیئے جائیں اور حرفتی تربیت کا سر و سامان ہو
جائے چنانچہ طے پایا کہ کمیٹی کی رپورٹ اسی ڈھنگ سے بنے۔ اس کا مسودہ تیار کرنے میں راقم
کو جناب انور جمال قدوائی اور مالک رام صاحب کی رہنمائی اور پوری تائید حاصل رہی ۔
کمیٹی کی سفارشات کچھ اس طرح تھیں۔

۱۔ مجوزہ اُردو یونیورسٹی عام یونیورسٹیوں سے مختلف ہوگی اس کا ڈھانچہ عام یونیورسٹیوں کے
بندھے ٹکے بند ڈھانچے سے بالکل الگ ہوگا اس میں لچک ہوگی اور بدلتی ہوئی ضروریات کے
مطابق خود کو ڈھالنے کی پوری صلاحیت۔ یہ ایک جدید تعلیم کی کشادہ، توانا اور جاندار
یونیورسٹی ہوگی جو جدید تعلیم کی چنوتیوں اور مطالبات سے بخوبی عہدہ برآ ہو سکے گی۔ یہ
"اندرا گاندھی اوپن یونیورسٹی" کی وضع پر اپنی رسائی اور منفعت کو بڑھانے کے لیے فاصلے
سے تعلیم پر زور دے سکے گی۔

۲۔ ادب کے بجائے اُردو یونیورسٹی مادی، حیاتی اور سماجی علوم کو اپنے دائرہ تدریس و تحقیق
میں شامل کرے گی۔ یہ بات اُردو زبان کے فروغ کے لئے ضروری بھی ہے۔

۳ ۔ کئی ریاستوں میں آزادی کے بعد اردو کی تعلیم کا سلسلہ ٹوٹ گیا تھا۔ اردو یونیورسٹی کی کوشش ہونی چاہیئے کہ ان ٹوٹی ہوئی کڑیوں کو پھر سے جوڑ دے۔ خصوصاً ابتدائی اور ثانوی مراحل میں۔ یہ کام فاصلے سے تعلیم کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے۔

۴ ۔ اردو یونیورسٹی کی تعلیم کو ایک محاذ پر صنعتی اور پیشہ ورانہ ٹریننگ کے ساتھ جوڑا جائے

۵ ۔ اندرا گاندھی اوپن یونیورسٹی کی وضع پر اردو یونیورسٹی کا فیض ہندوستان کی مختلف ریاستوں تک اسٹڈی سنٹرز (مطالعاتی مراکز) کے ذریعہ عام کیا جائے۔

۶ ۔ اردو یونیورسٹی بڑے پیمانے پر جدید علوم کی کتابیں کے ترجمے کا کام اپنے ہاتھ میں لے گی

۷ ۔ یونیورسٹی تین زبانوں، اردو انگریزی اور ہندی (یا علاقائی زبان) کو لازمی زبان کے طور پر پڑھائے گی اردو کی تو بہر حال تدریسی زبان کی حیثیت بھی ہوگی۔

۸ ۔ یونیورسٹی میں مستقل اساتذہ کی تعداد بہت ہوگی۔ زیادہ تر اساتذہ کی مامور معینہ مدتوں کے لیئے کی جائے گی تاکہ یونیورسٹی اور شعبے دونوں زنگ خوردگی اور بے حرکتی سے محفوظ رہیں۔

۹ ۔ اردو یونیورسٹی کو بعض شرطوں کے ساتھ کالجوں کے الحاق کا اختیار ہوگا۔

۱۰ ۔ حفظانِ صحت، متوازن غذا، شہری ذمہ داری، قومی یک جہتی، ماحول کی حفاظت کو اس کے نظام تعلیم میں مناسب جگہ ملے گی۔

۱۱ ۔ نیشنل کونسل فار ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ اور بیورو فار پروموشن آف اردو اور اندرا گاندھی اوپن یونیورسٹی کے تعاون سے مجوزہ یونیورسٹی اردو زبان میں مختلف علوم کی کتابیں تیار کرے گی۔

۱۲ ۔ یونیورسٹی کا پہلا دور ۱۹۹۴ء میں شروع ہو جانا چاہیئے اور دو سال کے اندر اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا جائے۔

۱۳ ۔ مجوزہ یونیورسٹی ملک کی سماجی۔ اقتصادی صورتِ حال پر برابر تحتِ نظر رکھے گی اور اس میں وقتاً فوقتاً رونما ہونے والی تبدیلیوں کے مطابق نصاب میں تبدیلی کرتی رہے گی تاکہ اس کے فارغین کے مبلغ علم و ہنر اور روزگار کے امکانات میں کسی قسم کا ٹکراؤ نہ ہو پائے

یہ سفارش کی گئی تھی کہ جب تک یونیورسٹی کی اپنی عمارت نہیں بنتی، کرائے کی عمارت سے کام چلایا جائے۔

آگے بڑھنے سے پہلے ملحوظ رکھئے کہ یہ سفارشات اس کمیٹی نے کی تھیں جو اردو اور اردو والوں کے مفادات کی ملک گیر سطح پر ترجمان تھیں۔ لیکن یونیورسٹی گرانٹس کمیشن اور شعبۂ تر ان سفارشات کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور یونیورسٹی کے امکانات اور اس کی ندرت، افا شادابی، لچک اور صلاحیت کو بہت محدود کر دیا۔ اگر ایسا ہی کرنا تھا تو اکابرین اردو (ا استثنا کے ساتھ) سے رائے لی ہی کیوں تھی؟ حکومت کی طرف سے ان کی تجاویز میں تر صرف دو صورتوں میں جائز بھی جاتی۔ ایک وسائل کی کمی، دوسرے قومی مفاد سے انحراف۔ کمیشن کی رپورٹ کو تسلیم کرنے کی راہ میں ان دونوں میں سے کوئی بات حائل نہیں تھی حیرت ہے کی متفقہ سفارشات کے ساتھ بے احترامی کا یہ برتاؤ کیوں کیا گیا۔ اردو یونیورسٹی ایکٹ نے توانائی کھو دی اور وہ پھیلاؤ بھی جو یونیورسٹی کا مقصد تھا اور جس کا تصور اردو کے ترجمانو کیا تھا۔ اردو یونیورسٹی ایکٹ اس نقشہ کا ایک پھیکا خاکہ ہے جس میں آپ وہ رنگ کمیٹی سفارشات نے بھرا تھا۔ یونیورسٹی کے لیے اب جو مقاصد متعین کئے گئے ہیں۔ ان میں سے نیچے دیئے جاتے ہیں۔

۱۔ اردو کو فروغ اور ترقی دینا۔ اردو زبان کے ذریعے ٹکنیکل اور پیشہ وارانہ تعلیم دینا: طلبار کو جو اعلیٰ تعلیم اور تربیت کے خواہاں ہیں، مطلوبہ تعلیم و تربیت دینا خواہ کیمپ یا احاطہ میں، خواہ فاصلہ سے اور لڑکیوں کی تعلیم کو منصب اہمیت پر فائز کرنا۔

۲۔ وزیٹنگ پروفیسروں، امیریٹس پروفیسروں کا تقرر معاہدہ کی بنیاد پر یا اس کے بغ

۳۔ اردو کی ترقی اور توسیع کے لئے اسکیمیں وضع کرنا اور انھیں عمل میں لانا تاکہ تعلیم میں تسلس لایا جا سکے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے فاصلے سے تعلیم کا مناسب استعمال۔"

آگے چل کر یونیورسٹی کے وزیٹر کو اسٹیچیوٹ (قوانین) بنانے کا، ان میں ترمیم کا پورا اختیار دے دیا گیا ہے جو یونیورسٹی کی خود مختاری کے خلاف جاتا ہے

بُرا بھلا جیسا بھی ہے ایکٹ بن چکا ہے اس وقت اس کو صلواۃ سنانا یا اس میں تر

کی کوشش کرنا مستحق لا حاصل ہوگا۔ یہ خلش البتہ حسرت کے ڈنک ملتی ہے کہ کاش ہم اردو
والوں نے کھلے دل اور زبان کی ساری توانائی یونیورسٹی کے قیام کے لئے مختلف مقامات کی تائید اور
توجہ میں صرف کرنے کی جگہ یونیورسٹی بل کے نقائص دریافت اور دور کرنے میں صرف کی ہوتی۔ یہی
کبھی توانائی اب اس بات پر بغلیں بجانے میں استعمال ہو رہی ہے کہ یونیورسٹی ہم نے بنوائی یا اس
کے لئے حیدرآباد کا انتخاب ہماری وجہ سے ہوا' یا اس تحقیق پر صرف ہو رہی ہے کہ یونیورسٹی کا
بانی یا محسن دراصل کسے سمجھنا چاہئے۔ گویا اردو یونیورسٹی بھی جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ردیف میں آگئی
اور اس کے بانی کے بارے میں بھی اختلافِ رائے سر اٹھانے لگا۔ واقعہ دراصل یہ ہے کہ اردو یونیورسٹی
کے قیام کی تجویز گجرال کمیٹی کی رپورٹ میں کی گئی تھی اس پر بے شمار برساتیں گذر گئیں۔ یہ سفارش
سیل چکی تھی۔ شری ارجن سنگھ نے جو کانگریسی حکومت میں اس وزارت کے سربراہ تھے جن کا مقصد
اور نام انسانی وسائل کا فروغ تھا اس نم خوردہ سفارش کو تہہ خانے سے نکالا۔ اسے ہوا دی اور
دھوپ دکھائی اور اپنی حکمت عملی سے اس میں جان ڈال دی۔ یہ فیصلہ دراصل انہی کا تھا' جس میں
ضابطہ کے مطابق وزیراعظم اور مرکزی کابینہ کے دوسرے اراکین شریک تھے۔ رہی یہ بات کہ رام پور
پٹنہ' علی گڑھ' لکھنو' ممبئی' بھوپال' دلی' بنگلور اور حیدرآباد میں سے جو یونیورسٹی کی میزبانی کے
دعویدار تھے۔ حیدرآباد کو چننے کے ذمہ دار کون تھے تو اس کا جواب سادہ اور صاف ہے کہ شری
نرسمہا راؤ۔ ان کا گوشۂ خاطر حیدرآباد کی طرف نہیں ہوتا تو جو آوازیں اس کے حق میں اٹھیں صدا بصحرا
ثابت ہوئیں۔ گویا سابق آندھرا پردیش وزیراعظم کے نامۂ اعمال میں ایک اندراج نقرئی حروف
سے بھی ہوگا۔ حیدرآباد کے انتخاب کے لئے مختلف اوقات میں جلیل پاشاہ صاحب سرگرم عمل رہے
لہذا ان کو یکسر فراموش کر دینا شاید اہل حیدرآباد کو زیب نہ دے پائے۔ ایک اور صاحب ہیں
جن کا ذکر نہ کرنا جرم فراموشی ہوگا۔ عزیز قریشی صاحب جو اردو یونیورسٹی کمیٹی کے سربراہ تھے شری
ارجن سنگھ کے نفسِ ناطقہ تو نہیں۔ دست و بازو کی حیثیت ضرور رکھتے تھے یہ بات صیغۂ راز
میں ہے اور شاید رہے بھی کہ اردو یونیورسٹی کے قیام کا خیال عزیز قریشی صاحب نے انہیں دلایا۔
یا یہ بات پہلے ارجن سنگھ صاحب کے ذہن میں آئی اور اس کو پھیلانے' عمل میں لانے اور مشتہر کرنے
کے لئے انھوں نے اپنے رفیقِ کار عزیز قریشی صاحب کو منتخب کیا۔ وہ ارجن سنگھ صاحب کی خدمت

میں بے باک تھے۔ قرائن یہ کہتے ہیں کہ اگر اُردو یونیورسٹی کی مہم کے سلسلے میں انھیں عزیز قریشی کی رفاقت، خدمات اور یاد دہانیاں دستیاب نہ ہوتیں تو شاید یونیورسٹی بھی اُسے بسا آرزو کہ خاک شدہ کے لق و دق بیابان میں پہنچ جاتی۔ اس کا ہمیں اعتراف کرنا چاہیئے کہ عزیز قریشی صاحب نے یونیورسٹی کے پروجیکٹ کو بڑی طاقت اور جوش و خروش کے ساتھ آگے بڑھایا۔ اگر قدم قدم پر پیش قدمی اور موانع ناپذیری اور جارحیت کا مظاہرہ نہ کرتے اور اہل کاروں کی مخالفانہ موشگافیوں اور تاخیر آفرینیوں کو اپنے ہاتھ کی جنبش سے مکڑی کے جالے کی طرح ہٹا نہ دیتے تو اُردو یونیورسٹی کا خیال عمل کی شکل اختیار نہ کر پاتا۔ انھوں نے حصولِ مقصد کی راہ میں خوشامدیں اور چاپلوسیاں بھی کیں اور ڈرایا دھمکایا اور بھبکیاں بھی دیں اور آڑے وقت میں لغفول خود گالیوں سے حاجت روائی بھی کی۔ ایک بڑے مقصد کے حصول کے لئے انھوں نے سیاسی حکمتِ عملی کا لگاتار مظاہرہ کیا۔ راقم سطور عزیز قریشی صاحب کا ثنا خواں نہیں ہے اور خود وہ ایک عرصہ دراز سے اس سے کبیدہ خاطر ہیں۔ اگر اسے یونیورسٹی کمیٹی کی رپورٹ کا مسودہ نگار یا کاتب سمجھا جائے تو سمجھ لیجئے کہ صدر اور کاتب کے مزاج، طور طریقوں، افکار اور خیالات میں آسمان ہی کا فاصلہ تھا۔ جو تصور میں آسکتا ہے لیکن صدر محترم کو داد دینی چاہیئے کہ اُردو یونیورسٹی کے تصور کو پروان انھوں نے ہی چڑھایا۔ اس موقع پر ایک ند ملنے میں ان کا مدھیہ پردیش میں وزیر رہنا بھی کام آیا اور مرکزی ایوان کی رکنیت اور اندرا گاندھی اوپن یونیورسٹی ایکٹ کی تشکیل کا تجربہ بھی۔ غور فرمائیے جس کمیٹی میں آل احمد سرورؔ، جگن ناتھ آزادؔ، راج بہادر گوڑ، مالک رام جیسے اکابرینِ اُردو شامل ہوں۔ اس کے سارے (۲۰ سے زیادہ) ممبران مل کر بھی کوشش کرتے تو جہاں تک اُردو یونیورسٹی کی مہم کو کامیابی سے ہم کنار کرنے کا تعلق ہے، اس کا عشرِ عشیر بھی نہ کر پاتے جو اس کے نسبتاً کم سواد صدر نے کر ڈالا۔ ہر کسے را بہر کارے ساختند۔ راقم ارجن سنگھ صاحب کا بھی کبھی معتقد نہیں رہا۔ ایک وقت وہ تھا جب وہ شری نرسمہا راؤ کو بے دخل اور بے تخت کر سکتے تھے، انھوں نے ان پر یورش کئی بار کی لیکن ہر بار آخری پل میں ان کی جرأت جواب دے گئی اور نرسمہا بھارت برباد کرنے کیلئے سنگھاسن پر رہ گئے، لیکن اُردو یونیورسٹی کا جہاں تک تعلق ہے ارجن سنگھ کے عزم و ذہانت اور رفاقت ..... قرآن، السعدون، ثابت ہوئی۔ (باقی آئندہ شمارے میں)

ڈاکٹر عبدالمعنی



اُردو یونیورسٹی کے نام سے کچھ لوگوں کو شاید وحشت سی ہو رہی ہے اور کچھ لوگ اسے نعوذ ایک مسلم یونیورسٹی یا پھر لسانی و ادبی یونیورسٹی سمجھ رہے ہیں۔ غالباً اس صورتحال کی وجہ لفظ اُردو ہے۔ یہ صورتِ حال تقسیم ہند اور اس کے فرقہ وارانہ اثرات کی پیداوار ہے جبکہ اس تقسیم کے ذمہ دار نہ تو مسلمان ہیں نہ اُردو۔ اُردو تو برصغیر میں صدیوں کی قومی یکجہتی کا ذریعۂ اظہار شروع سے آج تک رہی ہے اور مسلمان وہ ہیں جنھوں نے موجودہ دور یا بعدِ تاریخ کے ہندوستان کو ہندوستان بنایا اس تناظر میں اُردو اور اہلِ اُردو زبانِ حال سے کہہ سکتے ہیں۔

میرے نغموں سے تو بہ جنت نشاں بنتا گیا ؛ میں غبارِ خاطرِ ہندوستان بنتا گیا

آزادی سے قبل حیدرآباد کی عثمانیہ یونیورسٹی نے اُردو ذریعہ تعلیم سے تمام علوم و فنون کی مکمل اعلیٰ تعلیم ملک کی اس نسل کو بلا امتیاز فرقہ و مذہب دی تھی جس کے بعض نمائندے عصرِ حاضر میں بھی وزیر اعلیٰ، گورنر اور وزیر اعظم کے عہدوں تک پر فائز رہے ہیں۔ یہ کسی بھی ہندوستانی زبان کا وہ واحد کارنامہ بیسویں صدی میں ہے جس کی عظمت و افادیت کا اقرار مہاتما گاندھی نے بھی کیا تھا۔ یہ ہندوستانی زبان جو اب عام طور پر صرف اُردو سمجھی جاتی ہے یونسکو کے تازہ ترین سروے کے مطابق بولنے والوں کی تعداد کے اعتبار سے دنیا کی دوسری سب سے بڑی زبان چینی کے بعد ہے۔ اُردو دستورِ ہند کے شیڈول نمبر ۸ میں ایک قومی زبان بھی ہے اور بہار و نیز اتر پردیش کی دوسری سرکاری زبان بھی، باضابطہ اسمبلی کے ترمیمی ایکٹ کی منظوری کے ساتھ۔

ایسی زبان کی یونیورسٹی آزادی کے پچاس سال بعد بھی قائم کیوں نہیں کی گئی جب کہ آزادی سے قبل ایسی ایک یونیورسٹی حیدرآباد میں پوری شان سے نہایت نتیجہ خیز طور پر کام کر رہی تھی؟ اس سوال کا

کوئی جواب تقسیم ہند کی سیاست کے اثرات کے سوا نہیں۔ اس لئے کہ اردو میں ملک کی کسی
دوسری زبان سے زیادہ صلاحیت ایک مکمل یونیورسٹی کا ذریعہ اظہار بننے کی ہے۔ شاید یہی وجہ
کہ اردو کو نظرانداز کر دینے کے بعد دوسری کسی قومی زبان کی یونیورسٹی اب تک چلائی نہیں جا
دوسرا سوال یہ ہے کہ اب اردو یونیورسٹی کے قیام کا فیصلہ حکومت نے کیوں کیا۔ اور کیا اس
عمل ہو سکے گا؟ فیصلہ تو ظاہر ہے کہ اردو آبادی کے مطالبے پر اور اس کے احساس محرومی کو د
کرنے کے لئے کیا گیا۔ اس پر عمل حکومت کو کرنا ہے اگر ایسا ہوتا ہے تو نصاب کے مضامین ا
طریق کار وغیرہ کے سوالات اٹھیں گے۔

اردو دوستوں کو اس سلسلے میں کسی الجھن کا شکار نہیں ہونا چاہئیے اگر ایک اور مسلم یونیو
سامنے آتی ہے تو یہی سہی۔ اردو یونیورسٹی کی ضرورت ملک و ملت دونوں کو اس لئے ہے کہ
انگریزی ذریعہ تعلیم اب ممکن نہیں رہا۔ جب کہ دوسری کوئی ہندوستانی زبان انگریزی کی جگہ
لے سکتی اور اردو کے ذریعہ تمام علوم و فنون (آرٹس اور سائینس) کا کم از کم ایک کامیا
تجربہ آزادی سے قبل ہندوستان کی ایک ریاست آندھرا کے دارالسلطنت حیدرآباد میں ا
مدت تک کیا جا چکا ہے یہ ضرور ہے کہ مختلف علوم کی بالخصوص تکنیکی اصطلاحات کے تر
علمی ترقیات کی نصاب میں شمولیت کے سلسلے میں اردو کو اپنی روایتی رواداری اور مسلمہ وسعت
کام لینا ہوگا۔ ہر اصطلاح کا ترجمہ ضروری نہیں اور اگر کیا جائے تو اس کا انگریزی
مترادف بھی ساتھ ساتھ درج کیا جائے تاکہ آج کے بین الاقوامی دائرے میں زیادہ مؤثر
کا سامنا نہ ہو عثمانیہ یونیورسٹی کے گزشتہ نصابات میں توسیع اور نصابی کتابوں
تجدید کی ضرورت ہے اس لئے کہ زبان اور مضمون کسی میں بھی ہم پچاس برس پیچھے
لوٹ سکتے۔ رائج الوقت زبان اور مضامین کا استعمال لازمی ہے۔

اردو یونیورسٹی کے سند یافتہ طلبہ کی ملازمت و تجارت وغیرہ میں پزیرائی اس طرح ہو سکتی
جس طرح علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے طلبار کی ہو رہی ہے اس لئے کہ اردو
دیگر کسی یونیورسٹی سے کم جدید نہیں ہوگی وہ ترقی پذیر بھی ہوگی۔ لہٰذا اس کی اہمیت و ضرورت
ساتھ ساتھ افادیت بھی غیر مشتبہ ہے ان تمام باتوں کے لئے اہل اردو کو اپنی مادری یا تہذیبی

کے ساتھ ابتدائی تعلیم کی سطح سے روزمرہ کے استعمال تک وابستگی و رواداری کا ثبوت اپنے پیہم ہمہ جہتی عمل سے دینا ہوگا اسی عمل پیہم ان کی شناخت اور اجتماعی وجود کا انحصار بھی ہے۔ اہل ملک خاص کر اہل اقتدار کو اُردو کے خلاف تعصبات سے اپنا سینہ صاف کرکے مذہبی تہذیبی رواداری یعنی مروجہ اصطلاح میں سیکولرزم کا ثبوت دینا ہوگا۔ ہندوستان ایک کثیرالمذاہب اور کثیرالالسنہ جمہوریہ ہے جس میں اُردو کا ایک آئینی مقام تسلیم شدہ ہے اور شہریوں کے دیگر طبقات کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے بھی آئینی حقوق ہیں گرچہ مسلمان صرف اُردو داں یا اُردو نواز نہیں وہ ملک کے مختلف علاقوں میں وہاں کی زبانوں سے بھی واقف ہیں لیکن اُردو کا معاملہ قومی سطح پر مسلمانوں کی ہستی اور پہچان کا ہے گرچہ اُردو ایک سیکولر زبان ہے جس میں ہر مذہب و ملت کا لٹریچر ہے اور اس کی خدمت و ترقی میں بھی ہر مذہب و ملت کے افراد کا نمایاں حصہ رہا ہے۔

اُردو یا اُردو یونیورسٹی کی ترقی سے کسی دوسری قومی یا علاقائی زبان کو خطرہ نہیں اور اگر کسی کو اُردو کے مقابلے میں احساس کم تری یا احساسِ خوف ہو تو یہ اُس کی تنگ نظری اور کم ہمتی ہے اُردو نے ہندوستان کو جنت نشان بنایا ہے اور بناتی رہے گی اسے غبارِ خاطرِ ہندوستان نہیں بنایا جانا چاہیئے ورنہ اس کا یہ طعنہ صحیح ہوگا۔ ع

میکدے میں اپنی قسمت جام برداری رہی
اور اک اک مغ بچہ پیرِ مغاں بنتا گیا

محمد اسحاق
سابق پرنسپل کالجس آف ایجوکیشن

مولانا ابوالکلام آزاد قومی اُردو یونیورسٹی
(چند ابتدائی مراحل کی اہمیت)

کسی جج کا یہ ریمارک کہ جب بچہ پیدا ہو چکا ہے تو پھر یہ معاشرہ کی ذمہ داری ہو جاتی ہے اس کی پرورش، صحت اور تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ یہی بات اُردو یونیورسٹی کے قیام کے لئے بڑی حد تک درست معلوم ہوتی ہے گذشتہ پچاس برسوں میں کانگریسی حکومتوں نے ایک سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت اُردو کے چمن کو ریگستان میں تبدیل کر دیا اس صحرا میں محبانِ اُردو کا یہ خیال کہ ملک میں اُردو یونیورسٹی ہونی چاہیئے صدابہ صحرا کی طرح نظر آئی۔ اُردو کے ساتھ حکومتوں کا تاریخی ریکارڈ کی موجودگی میں کسی کو یہ توقع بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن پچھلی حکومت نے دو برس پہلے اُردو یونیورسٹی کے قیام کی بات چھیڑ دی تاکہ اُردو کے پرستاروں کی زبان کا ذائقہ قائم رہے۔ متحدہ محاذ حکومت نے اس یونیورسٹی کے قیام کی بات چھیڑ دی تاکہ اُردو والوں کو ایک عظیم تحفہ دیا ہے لیکن یہ تحفہ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی قحط زدہ علاقہ میں مرنے والوں کے لئے بجائے غذائی پیاکٹس کی سپلائی کے انہیں پھولوں کا گلدستہ دیدیا گیا ہے جناب سید حامد نے اُردو یونیورسٹی کا بل پاس ہونے پر یہ ریمارک کیا تھا کہ بغیر ستونوں کے پہلے چھت ڈالنے کا انتظام ہو رہا ہے۔ دہلی کے کسی دانشور نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ایک بڑے درخت کو بغیر جڑوں کے زمین پر ایستادہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے جب تک درخت کی جڑیں زمین کے اندر دُور دُور تک نہ پھیلی ہوں وہ کھاد اور پانی کو کیسے جذب کر سکے گا جو اس کی زندگی، پھول، پھل اور ہری پتیوں کے پھوٹنے کے لئے ضروری ہیں۔ یہی چند وجوہات ہیں کہ عام طور پر اُردو کے پرستاروں کی جانب سے آج تک یونیورسٹی کا کوئی پُرجوش خیر مقدم نہیں کیا گیا۔ بلکہ عام طور پر اس عظیم پیشکش کے ساتھ سرد مہری کا مظاہرہ ہے۔ کچھ اندیشے

ہیں اور کچھ شبہات ہیں وہ محض خیالی نہیں ہیں۔ یونیورسٹی بل میں جو اہم مقاصد بیان کئے گئے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) یہ یونیورسٹی مولانا ابوالکلام آزاد کے نام سے موسوم ہوگی۔ پہلی مرتبہ مولانا آزاد کی خدمات کا اعتراف اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا تھا۔

(۲) یہ یونیورسٹی حیدرآباد میں قائم ہوگی شاید حیدرآباد سے بہتر کوئی اور مقام ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ جامعہ عثمانیہ کے تاریخی کردار، ملک میں پہلی اردو ذریعہ تعلیم جامعہ، تالیف و ترجمہ کا ورثہ اور اردو زبان میں اعلیٰ تعلیم پائے ہوئے باقیات الصالحات ابھی شہر حیدرآباد میں موجود ہیں۔ تہذیبی اور جذباتی لحاظ سے بھی شہر حیدرآباد کو حق تھا کہ اس جامعہ کو اس کی گود میں پھلنے پھولنے کا موقع ملے۔

(۳) روایتی مضامین کے علاوہ فنی، حرفتی اور صنعتی تعلیم — VOCATIONAL & TECHICAL EDUCATION اردو میڈیم سے دی جائے گی۔

(۴) فاصلاتی تعلیم کا یہ مرکز ہوگا

(۵) خواتین کی تعلیم پر خاص توجہ دی جائے گی۔ یہ جو عام خیال ہے کہ اس یونیورسٹی کے تحت میڈیکل کالج، انجینیرنگ کالج اور زرعی کالجس وغیرہ بھی کھولے جائیں گے ان باتوں کا تذکرہ منظورہ بل میں کہیں نہیں ہے۔ ممکن ہے آئندہ چند برسوں بعد اردو یونیورسٹی مضبوط بنیادوں پر قائم ہو جائے تو ان کالجوں کے شروع کرنے کا امکان ہے۔ فی الحال اعلیٰ پیشہ ورانہ کالجس کھولنے کا خیال مختلف وجوہات کی بناء پر بعید از قیاس ہے۔ پروفیسر جعفر نظام کا ایک مضمون "سیاست" میں جامعہ عثمانیہ کی یادوں سے متعلق شائع ہوا تھا پھر اس کا سلسلہ چل پڑا۔ بڑے اچھے مضامین سے اس زمانہ کی علمی ماحول کی یاد تازہ ہوگئی۔ لیکن یہ سب اب تاریخ کا حصہ ہیں۔ بہت کم حضرات نے موجودہ حالات میں اردو کی کسمپرسی کے ماحول میں اس اردو یونیورسٹی کو کس طرح مضبوط بنیادوں پہ قائم کرنا ضروری ہے کسی نے اس جانب توجہ نہیں دی ہے حالانکہ یہ معرکہ سر کرنے کا کام بالکل سامنے ہے بلکہ اردو والوں کے لئے ایک بڑے چیلنج کا سامنا ہے جامعہ عثمانیہ کے کام کا عملی نمونہ ہمارے سامنے ہے اور پھر تلگو یونیورسٹی کے تجربات سے بھی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

حال ہی میں (۶ مارچ ۱۹۹۷ء) آندھرا پردیش بھون نئی دہلی میں جشنِ اُردو منایا گیا۔ اس میں مرکزی
وزیر جناب سی ایم ابراہیم کا یہ اعلان کہ وہ چار مہینوں میں اُردو یونیورسٹی میں نئے تعلیمی سال ۹۸-۱۹۹۷
میں پڑھائی کا آغاز ہو جائے گا باعثِ حیرت ہے۔ ایسی جلد بازی میں اُردو یونیورسٹی کا کام بہت
سی مشکلات میں پھنس جائے گا اور تنقیدوں کا شکار ہو جائے گا بغیر ابتدائی مراحل کی یکسوئی کے
اس کی مثال اندھیرے میں چھلانگ لگانے کی ہو جائے گی۔ ان ہی ابتدائی مراحل کے متعلق کچھ کہنا

ابتدائی مراحل کے چند اہم کام :- (۱) با ضابطہ تعلیم کا انتظام دو چار مہینوں
میں آئندہ تعلیمی سال ۹۹-۱۹۹۸ء سے شروع کیا جائے اور اس ایک سال کے دوران ضروری
اقدامات کر لیئے جائیں۔ یونیورسٹی کے وائس چانسلر، رجسٹرار اور دوسرے عہدیداروں کا تقرر بھی
ہونا ضروری ہے۔ اُردو کی عام مایوس کن فضاء کو خوشگوار ماحول میں تبدیل کرنے کا کام وائس چانسلر
اُردو یونیورسٹی کے اساتذہ کے علاوہ عوامی تائید، جوش اور دلچسپی پر مبنی ہے جس کے لئے وائس چانسلر
نہ صرف قابل صحت مند ہو بلکہ اس کی شخصیت متحرک ہو اور وہ جرأت آمیز اقدامات کی صلاحیت
رکھتا ہو۔

(۲) پروفیسر آل احمد سرور کی تجویز کے مطابق ایک آل انڈیا سمینار پندرہ بیس کا منعقد کیا
جس میں سارے ملک کے قابل پروفیسر، دانشور اور ماہرینِ تعلیم حصہ لیں اور کام کی نوعیت اور اہمیت
کے لحاظ سے ایک با ضابطہ ایجنڈا تیار کیا جائے تاکہ بعد میں کوئی پریشان کن حالات پیدا نہ ہوں۔

(۳) اصل پریشانی تین باتوں کی ہے۔ اُردو کا طالبِ علم یونیورسٹی سطح کا کہاں ملے گا اور ان کی
تعداد اس یونیورسٹی میں داخلہ لے گی۔ اُردو کی کتاب کہاں ہے۔ پرائمری سکنڈری سطح کی نصابی کتابوں
کا تو قحط ہے۔ ڈگری سطح کی کتابیں مختلف مضامین کی کہاں سے ملیں گی۔ ریاضی۔ فزکس، باٹنی، بیا
اکنامکس، کامرس اور اس قسم کے مضامین کی ایک دو کتابیں نہیں بلکہ ایک ایک درجن کتابوں کی
ہوگی ان کی تیاری کیسے کی جائے گی۔ تیسرا اہم عنصر خود اُردو میڈیم سے پڑھانے والے اساتذہ کی ضرورت
اُردو زبان کے ایم اے کامیاب اساتذہ کا املا تک ٹھیک نہیں ہے۔ جس میں انہوں نے اس اعلیٰ ڈگری
مشہور یونیورسٹی سے حاصل کیا وہ کسی ایک شعر کا مطلب نہیں بتا سکتے۔ یہ برا حال سارے ہندوستان
اُردو میڈیم اسکولوں کا ہے اور اس میں کچھ مبالغہ نہیں ہے۔

کے اردو میڈیم اسکولوں کا ہے اور اس میں کچھ مبالغہ نہیں ہے۔

(۴) دارالترجمہ کا قیام فی الفور ضروری ہے۔ جس میں جامعہ کی سطح کے کورسس کے لئے ضروری کتب اور مواد کا ذخیرہ تیار ہوسکے۔ یونیورسٹی کی سطح کے مضامین کے ہر مضمون میں چھ سات کتابیں اردو زبان میں تیار ہوجائیں تو آئندہ تعلیمی سال سے پڑھائی شروع کی جاسکتی ہے۔ اگر سارے ہندوستان کے ماہرین فنون یکجا جمع نہ بھی ہوسکتے ہیں تو اس دارالترجمہ کے REGIONAL CENTRES قائم ہوسکیں۔ اور پہلے سال کے دوران میں اس طرح کتابوں کا ترجمہ، تالیف، تصنیف اور طباعت کا انتظام کرلیا جائے تو یونیورسٹی کا کام اعتماد سے شروع کیا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے اس کام کے لئے ایک بڑی ٹیم کی ضرورت ہوگی۔

(۵) فاصلاتی تعلیم DISTANCE EDUCATION تالیف و ترجمہ کا کام ایک برس اور بعد بھی چلتا رہے گا لیکن اس تعلیمی سال سے ۹۸-۱۹۹۷ء میں ایک محدود پیمانہ پر فاصلاتی تعلیم کا کام شروع کیا جاسکتا ہے۔ اس سے متعلقہ مضامین کا اردو زبان میں نصابی لٹریچر تیار ہوگا۔ یہ تجربہ بھی بہت کچھ کام آئے گا۔ دہلی اور حیدرآباد میں جو OPEN UNIVERSITIES کام کر رہے ہیں ان کے تجربات اور طریقہ کار سے بہت فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

(۶) اردو کا طالب علم۔ فاصلاتی تعلیم کے نظم سے سارے ہندوستان کے طلبار سے تعلق قائم ہوجائے گا۔ اس سے یہ اندازہ بھی ہوجائے گا اردو یونیورسٹی سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد اور دلچسپی کا کیا حال ہے۔ سارے ملک میں ایسے طلبار جو ثانوی اور انٹرمیڈیٹ تک اردو میڈیم سے تعلیم پائے ہوئے ہیں اور جو اردو یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہوں ان کی تعداد بہت کم ہوگی۔ دوسرے یہ کہ یہ دوسری ریاستوں اور اضلاع سے آکر ہاسٹل کے اور ٹیوشن فیس کے اخراجات برداشت کرتے ہوئے اردو میڈیم سے گریجویشن کرنا چاہتے ہوں ان کی تعداد اور بھی کم ہوگی۔ اس لئے ابتدائی چند برسوں میں ہاسٹل ٹیوشن فیس میں خصوصی رعایتوں کی ضرورت ہوگی اور وظائف بھی بہت دینے ہوں گے۔ جب یونیورسٹی کا کام اطمینان سے چلنے لگے گا تو طلبار کی تعداد میں اضافہ کی توقع ہے۔

(۷) اردو میڈیم ہائی اسکولوں اور انٹرمیڈیٹ کالجوں کی سرپرستی اور الحاق۔ اردو میڈیم طلبار کی سپلائی کے لئے یہ ضروری ہے کہ خود اردو یونیورسٹی ہندوستان کی ساری ریاستوں میں دو چار اردو میڈیم ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کالجوں کو ADOPT کرے۔ وہاں کے تعلیمی معیار کو بلند کرنے کے لئے مالی امداد

کے علاوہ ضروری انتظامات کرے۔ اس طرح اُردو یونیورسٹی کا ایک زندہ رشتہ ساری ریاستوں اور اضلاع سے قائم ہوجائے گا جو یونیورسٹی کے لئے حیات بخش ہوگا۔ ابتداً چند برسوں میں یونیورسٹی جانب سے اُردو کے پودوں اور جڑوں کی آبیاری ضروری ہے۔

(۸) اُردو میڈیم ٹریننگ کالج برائے اساتذہ — یونیورسٹی باضابطہ آئندہ سال سے تعلیم شروع کرنے سے پہلے اُردو میڈیم ٹریننگ کالج قائم کرلے تاکہ یونیورسٹی کے منتخب اساتذہ کے علاوہ مختلف ریاستوں کے اُردو میڈیم کے ثانوی اور انٹرمیڈیٹ لیکچررس بھی یہاں پیشہ ٹریننگ حاصل کرسکیں۔ ماحول سے اُردو میڈیم سے تدریس۔ بحث و مباحثہ کے ذریعہ اُردو میں اصطلاحات اور اظہار کو بہت تقویت ملے گی۔

(۹) انگریزی زبان میں مہارت حاصل کرنے کے لئے اسپیشل کوچنگ۔ جن طلباء کا ذریعہ مقامی زبان یا مادری زبان رہا ہو ان کا انگریزی زبان کا معیار بہت کم رہ جاتا ہے۔ یہ ایک لا بات ہے لیکن سارے ملک میں انگریزی زبان کی اہمیت بلکہ ساری دنیا میں اس وجہ سے ہے پیشہ وارانہ کورسس کی ساری تعلیم انگریزی زبان ہی میں ممکن ہے انگریزی سے ترجمہ ان اعلیٰ کورسس کو مقامی زبانوں میں کرنا ناممکنات سے ہے یہ ایک کتاب کا ترجمہ کرنے تک درجنوں کتابیں انگریزی زبان میں آجاتی ہیں اس کے لئے اُردو زبان ہی نہیں ہر مقامی وقار کا سوال نہ بنا اور ترجموں کے لئے روپیہ نہ صرف کرڈالے۔ انگریزی زبان میں مہارت حاصل کرنے کے سوائے ہمارے طلباء اور اساتذہ کے لئے کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ عام طور پر ہمارے طلباء اور ٹیچرس کا انگریزی زبان میں معیار افسوسناک حد تک پست ہے اُردو یونیورسٹی میں جو لائبریری ہوگی ان میں ایک ہزار انگریزی کتابوں کے ساتھ ایک آدھ کتاب اُردو کی ہوگی۔ اصل علم کا خزانہ تو آج بھی انگریزی زبان میں ہے اس لئے ہمارے طلباء ٹیچرس لکچررس کے لئے انگریزی زبان میں بات چیت اور صحیح انگریزی لکھنے اور بولنے کی مشق کے لئے ایسے ایک ادارہ کی ضرورت روز اول ہی سے رہے گی تاکہ طلباء لائبریری کتب سے اور انگریزی میگزین کے لٹریچر سے خاطر خواہ فائدہ اٹھاسکیں۔ یہ چند عملی تجاویز قارئین غور و فکر کے لئے پیش ہیں۔ اہل دانش و بینش سے توقع ہے کہ وہ اس خاکہ میں رنگ بھریں کیونکہ یہ وقت کی عین پکار ہے۔ ■

ماہنامہ

شاداب

حیدرآباد

جلد ۱۳
شمارہ ۷
جولائی ۱۹۹۷ء
قیمت دس روپے

ایڈیٹر : محمد قمر الدین صابری

جائنٹ ایڈیٹر : رشید الدین

مینجنگ ایڈیٹر : قدیرہ الفہاری

مجلس مشاورت

...ہ عائشہ بیگم — ڈاکٹر منشار الرحمٰن خاں منشار — محترمہ سیدہ مہر — پروفیسر تراب علی

...ڑ یوسف الدین — محمد منظور احمد منظور — منیر احمد صدیقی

زرِ تعاون

	سالانہ	دو سال کیلئے	تاحیات
ہندوستان	۱۰۰ روپے	۱۸۰ روپے	۱۵۰۰ روپے
خلیجی ممالک	۳۰۰ 〃	۵۵۰ 〃	۴۰۰۰ 〃
امریکہ	۵۰ ڈالر	۹۰ ڈالر	۹۰۰ ڈالر
انگلستان	۳۰ پونڈ	۵۰ پونڈ	۵۰۰ پونڈ
پاکستان	۲۰۰ روپے	۳۵۰ روپے	۴۰۰۰ روپے

ترسیل زر کا پتہ ماہنامہ شاداب ۱۴۷-۵-۱۱ ریڈہلز حیدرآباد

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمر الدین صابری نے نفیس فائن پرنٹنگ پریس میں چھپوا کر دفتر شاداب ۱۴۷-۵-۱۱ ریڈہلز حیدرآباد سے شائع کیا۔

فہرست

محمد اسحاق

فکرِ اسلامی اور اجتہاد

۲۰ دسمبر ۱۹۹۶ء کو مدینہ ایجوکیشن سنٹر کے سرسید ہال میں اہلِ علم کی مجلس میں ڈاکٹر حمید اللہ ندوی (پروفیسر برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال) نے عنوانِ بالا پر ایک عالمانہ لکچر دیا۔ فکرِ اسلامی اور اجتہاد کے سلسلے میں اس کی ضرورت اور اہمیت کے بیان کے ساتھ ساتھ علمائے دین کے نفسیاتی ردِ عمل کا بھی تذکرہ کیا جو بعض رکاوٹوں کا ذمہ دار ہے۔ آپ نے بتلایا کہ اس صورتحال سے نکلنے کا ایک ہی عملی حل یہ ہے کہ اجتہاد کی اہمیت اور ضرورت پر علمی سمینار منعقد کیئے جائیں جن میں علمائے دین اور عصری تعلیم کے فارغ دانشور شریک ہوں۔ جدید تعلیم یافتہ حضرات مسائل کی نوعیت کے لحاظ سے طبی اور سائنٹفک تجزیات کے ساتھ علمائے دین کے سامنے مسائل پیش کریں۔ تاکہ وہ صحیح نتیجے پر پہنچ سکیں۔ آپ نے یہ امید ظاہر کی کہ انشاء اللہ ایسی کوششوں سے ذہن تبدیل ہوں گے۔ موصوف کے خیال میں یہی ایک عملی حل ہے۔

مولانا ندوی جس کو عملی حل سمجھتے ہیں وہ دراصل کوئی حل ہی نہیں ہے۔ کیونکہ سمینار کے منعقد کر لینے سے چند مضامین اور خیالات سے شرکیِ جلسہ واقف ہو جاتے ہیں لیکن اس قسم کی کوششوں سے علمائے دین اپنی نفسیاتی کمزوریوں سے باہر آسکتے ہیں اور جدید تعلیم یافتہ دانشور مسائل کے سائنٹفک تجزیات پیش کریں بھی تو علمائے کرام شاید ہی صحیح نتائج اخذ کر سکیں گے۔ فقہی مسائل میں علمائے دین نے محتاط طرز یہ اختیار کی ہے کہ فلاں بزرگ کے پاس یہ درست ہے اور فلاں کے پاس یہ قابلِ اعتراض ہے۔ اب پڑھنے والا اپنی عقل اور مزاج کے مطابق عمل کرے۔ بہرحال کوئی بھی دو ٹوک فتویٰ نہ دینے کی وجہ امتِ مسلمہ ذہنی طور پر انتشار کا شکار رہے۔ مثالوں کی کمی نہیں۔

اصل مسئلہ کا حل جو بنیادی اور دور رس ہے وہ دینی درس گاہوں میں عصری تعلیم کا امتزاج

ہے۔ آج دینی مدارس کی تعداد سارے ملک میں کئی ہزاروں میں ہے یہاں پر ریاضی، انگریزی سائنس، ماحولیات کا کوئی گزر نہیں۔ گو ان مضامین کی معقولیت سے سب آگاہ ہیں لیکن علمائے دین کے ذہن اس سلسلے میں بند ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بند دروازہ کے سامنے گفتگو کر رہا ہے۔

جشنِ جامعہ نظامیہ کے سلسلے میں ۱۲ اکتوبر کو ایک علمی سیمینار منعقد ہوا تھا جس میں مولانا خواجہ حسن ثانی نظامی نے بیان فرمایا کہ دینی مدارس خالص مذہبی تعلیم کے مرکز ہیں۔ اگر جدید تعلیم کی ایک کھڑکی بھی کھول دی جائے تو پھر اس دین کے قلعہ کی بنیادیں ہل جائیں گی، دین کی بنیادیں متزلزل ہو جائیں گی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ دین کے قلعے کی بنیادیں اتنی بودی اور کمزور ہیں کہ ایک کھڑکی کے کھلنے سے سارا قلعہ دھم سے زمین پر آجائے گا۔ حالانکہ اس کھڑکی کے کھلنے سے باہر کی روشنی اور تازہ ہوا ان بند قلعوں میں داخل ہوگی۔ اس طرح مولانا ملتانی (پاکستان) نے فرمایا کہ کسی انجینیر سے ڈاکٹری معلومات کیوں نہیں دریافت کرتے اور کسی ڈاکٹر سے انجینیرنگ معلومات کیوں نہیں پوچھے جاتے۔ عالم دین سے دنیوی مسائل اور جدید معلومات کیوں پوچھے جاتے ہیں۔ مولانا کا یہ بیان خام خیالی اور سادہ لوحی پر مبنی ہے۔ انجینیر، ڈاکٹر ہی نہیں ہر طالب علم کو میٹرک تک ان سارے جدید علوم پڑھائے جاتے ہیں۔ انٹر اور اس کے بعد کسی ایک فن یا مضمون پر مہارت حاصل کرنی پڑتی ہے۔ چنانچہ ہر طالب علم ریاضی، سائنس، انگریزی، سماجی علوم، ہندی تلگو سے بہت اچھی طرح واقف ہو جاتا ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ موجودہ دور میں فکرِ اسلامی اور اجتہاد کے لیے یہ ضروری ہے کہ دینی مدارس میں مولوی کے درجے تک جو جدید نصاب کے میٹرک کے مماثل سمجھا جاتا ہے، انھیں تیسری جماعت سے ساتویں جماعت کی سطح تک جدید نصاب کے مضامین، ریاضی، سائنس، سماجی علوم اور انگریزی اور مقامی سرکاری زبان کی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ یہاں سے فارغ طلبا، دنیاوی مسائل کو بہتر طور پر سمجھنے کے لائق ہو سکیں گے۔ انھیں عصری علوم پڑھے ہوئے لوگوں کی باتوں اور اس پس منظر کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوگی۔ موجودہ علمائے دین خالص دینی درس گاہوں کے فارغ ہیں، انھیں جدید

کا صحیح ادراک نہیں ہے۔ اس لیے وہ بینکنگ، شیرز، یونٹ ٹرسٹ وغیرہ جیسے اہم ترین
مسائل کا ان کے پاس کوئی واضح حل موجود نہیں ہے اور نہ وہ کسی رہنمائی کے موقف میں ہیں۔ اس
وضاحت کے لیے صرف ایک مثال کافی ہے ۱۹۴۰ء کے دہے میں مساجد میں لاوڈ اسپیکر کا
استعمال شروع ہوا۔ اس کے استعمال کے خلاف کئی علمائے دین نے فتوے صادر کر دیئے لیکن آج
لاؤڈ اسپیکر کے بغیر نہ کسی عالم دین کا وعظ سنا جاتا ہے، نہ اذان ہوتی ہے اور نہ خطبہ۔ آخر
ان فتوؤں کا جواز کیا تھا۔ پروفیسر غلام دستگیر رشید اپنی تقاریر میں کہتے تھے کہ لاوڈ اسپیکر کی
بحث میں علمائے کرام نے امت مسلمہ کے دس برس ضائع کر دیئے اور اتنی ہی مدت میں روس نے
پنج سالہ منصوبے مکمل کر لیے۔ آج کوئی عالم دین ان فتوؤں کا تذکرہ بھی نہیں کرتا۔ اس صورت
کی توضیح کیا ہو سکتی ہے سوائے اس کے کہ علمائے دین، زمانے کے تقاضوں سے ناواقف ہیں
قدامت پرستی ان کا امتیاز ہے۔

مولانا حمید اللہ ندوی نے جن باتوں کو اجتہاد کا حل بتلایا ہے وہ دراصل بحث و مباحثے
ذریعے تسکین کا ذریعہ ہیں۔ ان کوششوں سے کوئی نتیجہ حاصل ہونے کی امید رکھنا عبث ہے اصل
دینی درسگاہوں میں طلبار کو عصری علوم کی باضابطہ پانچ چھ برس کی تعلیم ہے۔ اب تک کافی دیر
ہو چکی ہے۔ اگر یہی حال رہا تو دین اور دنیا کے فاصلے بڑھتے جائیں گے۔ کہیں پر یہ دو دریا نہ ملنے
پائیں گے۔ مرج البحرین یلتقیان۔ یہ دونوں آج ایک دوسرے کے لئے اجنبی
ہیں۔ جو طلبار کسی حد تک عصری علوم سے واقف ہوں گے تو ان کے سوچنے سمجھنے کا ڈھنگ بدل
جائے گا تب ہی وہ موجودہ دور کے تقاضوں کو سمجھ سکیں گے۔

آج سے آئندہ دس برس میں جو طلبار اس ذہن کے ساتھ آئیں گے وہ امت مسلمہ
کی بہتر رہنمائی کر سکیں گے۔

شاداب حیدرآباد
سہیل یوسف
ایڈیٹر "ریڈیئنس"

جامعہ ملیہ اسلامیہ
اصل حیثیت بحال کی جائے

یکم مئی ۱۹۹۷ء کے دہلی ہائی کورٹ کے ایک فیصلے سے، جس میں جامعہ ملیہ اسلامیہ، میں جاری داخلہ پرحرف گیری کی گئی ہے جامعہ ملیہ اسلامیہ ایکٹ ۱۹۸۸ء (ACT, 58 of 1988) کا کچا چٹھا کھل ۹۷-۱۹۹۶ء کے لئے B.Sc انجینیرنگ کورس میں داخلے کے خواہاں آفتاب احمد ثقلینی، متھیال، نیرج کار شرما اور راجیش گپتا کی رٹ درخواستوں 96/3478، 96/3447 و 96/ پر اپنا فیصلہ سناتے ہوئے دہلی ہائی کورٹ کے جج جسٹس مسٹر سی ایم نائر نے : جامعہ اسٹاف کے پانچ فیصد ریزرویشن کو "غیر دستوری" قرار دیا ہے۔ اردو ذریعہ تعلیم کے لئے پانچ فیصد ریزرویشن اپنے مقصد سے غیر متعلق بتایا، ۲۵ فیصد جامعہ طلبار کے لئے ریزرویشن کو "زیادہ" کہا ہے، ساتھ نے داخلہ امتحانات میں انٹرویو کے لئے جو ساڑھے سترہ فیصد متعین ہے اسے بھی زیادہ قرار دیتے ہوئے ضروری حد تک کم کرنے کی ہدایت کی ہے۔

تقریباً ۱۵ فیصد ریزرویشن درج فہرست ذاتوں کے لئے اور ۵ء۷ فیصد درج فہرست کے لئے جو جامعہ میں جاری ہے، اس ضمن میں کسی قسم کی ہدایت نہیں دی گئی ہے ... چیلنج نہیں کیا گیا تھا ویسے معزز جج نے کہا ہے کہ انجینیرنگ کورس میں داخلے کے لئے کم از کم کافی صد مقرر کر دینا زیادہ مناسب ہوگا تاکہ تعلیم کا معیار نہ گرنے پائے۔

حالانکہ پانچ فیصد اسٹاف ریزرویشن کو ختم کر دیا گیا ہے لیکن پانچ فیصد اردو ذریعہ تعلیم ریزرویشن اور ۲۵ فیصد جامعہ کے طلبار کے لئے ریزرویشن کے متعلق کوئی واضح ہدایت نہیں دی گئی کیونکہ عدالت کو بتایا گیا تھا کہ مجلس تعلیمی نے پہلے ہی اس معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے اور ...

کے مسئلہ پر غور کر رہی ہے نیز کم از کم صلاحیت کے متعلق آئندہ تعلیمی سیشن (۹۸ - ۱۹۹۷ء) سے قبل ہی کوئی فارمولہ طے کیا جانا ہے۔ ابھی دیکھنا یہ ہوگا کہ مجلس تعلیمی اس مسئلہ کو دہلی ہائیکورٹ کے واحد جج کے فیصلہ کی روشنی میں کس طرح حل کرتی ہے۔

وائس چانسلر کے لئے دوہری مشکل :۔ کارگزار وائس چانسلر جناب مشیر الحسن کو بڑی مشکل کا سامنا ہے۔ جامعہ میں شعبہ تاریخ کے سربراہ کی حیثیت سے پروفیسر مشیر الحسن نے ۱۹۸۸ کے جامعہ ایکٹ کو خوش آئند کہا تھا اور اسے اس کے بانیوں کے خواب سے تعبیر کیا تھا موصوف نے کہا تھا کہ اس سے حقیقی معنوں میں ادارے کی خدمت ہو سکے گی اور یہ کہ اس ایکٹ میں جامعہ کی تاریخی حیثیت کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔

وقت آگیا ہے کہ جامعہ کے کارگزار وائس چانسلر صاحب اب اپنے نقطۂ نظر کو ثابت کریں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں کہ جامعہ کا اپنا حقیقی کردار دوبارہ بحال ہو جائے جبکہ بعض مفادات حاصلہ ان کی برطرفی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

اسوسی ایشنوں کے مشورے :۔ اساتذہ، ملازمین اور طلباء کی متعدد انجمنوں نے ۱۳ اگ ۱۹۸۸ء کو اپنی مشترکہ میٹنگ میں اس وقت راجیہ سبھا میں زیر غور جامعہ بل ۱۹۸۸ء میں کئی بنیادی ترمیمات کا مشورہ دیا تھا، لوک سبھا سے پہلے ہی ۲۹ اگست ۱۹۸۸ء کو منظور کر چکی تھی چند اہم مشورے یہ تھے۔

بل میں جامعہ کے قابل احترام بانیوں کے ناموں کی شمولیت، جامعہ کے بنیادی مقاصد میں ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کو مذہبی و دنیاوی تعلیم مہیا کرنے اور فروغ دینے سے متعلق شق کا اضافہ، سماج کے کمزور طبقات کے لئے تحفظات (ریزرویشن) مجلس تعلیمی اور مجلس انتظامی جیسے اداروں میں نامزدگی کے بجائے انتخاب کا طریقہ اختیار کرنا۔ وزیٹر کے فیصلوں کو نافذ کرنے کے بجائے جامعہ کے خود مختار کردار کو برقرار رکھنا اور تنازعات کے حل کے لئے ثالثی ٹریبونل کی بجائے عدالتوں سے رجوع کرنا وغیرہ لیکن یہ مشورے قبول نہیں کئے گئے۔

پارلیمنٹ میں مشورے :۔ دونوں ایوانوں میں بل پر بحث کے دوران مختلف مم

نے بعض اہم مشورے بھی دیئے۔ مثلاً بھارتیہ جنتا پارٹی کے رہنما اٹل بہاری واجپائی نے اس بات پر زور دیا تھا کہ جامعہ کا انفرادی کردار برقرار رکھا جائے۔ تلگو دیشم پارٹی نے مسلمانوں کے لئے سیٹوں کے ریزرویشن کا مطالبہ کیا تھا۔ کانگریس ممبران پارلیمان ہاشم قدوائی اور امین انصاری نے جامعہ کے اقلیتی کردار کو باقی رکھنے کا مطالبہ کیا تھا جبکہ مسٹر ہدایت اللہ انصاری نے اردو ذریعہ تعلیم کو باقی رکھنے پر زور دیا تھا۔ انڈین یونین مسلم لیگ کے رہنما جی ایم بنات والا لفظ "مسلم" کی شمولیت چاہتے تھے اور ابراہیم سلیمان سیٹھ کا اصرار تھا کہ جامعہ کے بنیادی مقاصد اور اسلامی تعلیم و ثقافت کو تحفظ فراہم کیا جائے۔ سید شہاب الدین نے اسے ایک فراڈ کہا تھا

تاریخی پس منظر :- ۱۹۱۹ء میں خلافت تحریک اور تحریک عدم تعاون کے دوران گاندھی جی نے جو تحریک آزادی کی قیادت کر رہے تھے، سرکاری تعاون سے چلنے والے تعلیمی اداروں کے بائیکاٹ کی اپیل کی۔

جواباً جدوجہد آزادی کے مشہور رہنما مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے علی گڑھ میں "نیشنل مسلم یونیورسٹی" قائم کی جو "جامعہ ملیہ اسلامیہ" کے نام سے مشہور ہوئی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جو انگریزی ذریعہ تعلیم اور مغرب زدگی کے لئے شہرت پا چکی تھی۔ اسی سے علیحدہ ہونے والا ایک حصہ یہ جامعہ تھی۔

۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء (مطابق ۱۶ صفر ۱۳۳۹ھ) جمعہ کو جامعہ کا افتتاح کرتے ہوئے شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن نے جامعہ کے مقاصد کو ان الفاظ میں واضح کیا تھا۔

"مسلمانوں کی تعلیم کو مسلمانوں کے ہاتھوں میں رکھنا۔ بیرونی مداخلت سے بالکل آزاد تاکہ ہمارے عقائد اور نظریات، ہمارے اخلاق و عادات، ہمارا رویہ اور کردار۔ یہ سب بیرونی اثرات سے محفوظ رہ سکیں۔"

انھوں نے مزید کہا تھا۔ "ہماری عظیم قوم اپنے کالجوں سے زیادہ دنوں تک سستے غلام نہیں فراہم کر سکتی۔" اس کا صاف اشارہ علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کی طرف تھا جس کے بانی سرسید پر الزام تھا کہ انہوں نے انگریزوں سے اشتراک کر رکھا ہے۔

۲۴-۱۹۲۳ء کا دستورالعمل :- جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ۲۴-۱۹۲۳ء کے دستورالعمل واضح طور پر جامعہ کے مقاصد کے تحت درج ہے کہ قوم کے نوجوانوں کو اسلامیات اور مشرقی علوم بہم دی جائے تاکہ انہیں صحیح معنوں میں اسلامی تہذیب، اور ہندوستانی قومیت کا علمبردار بنایا جا سکے اس کے نتیجے میں مسلم نوجوان اسلام کے سچے پیرو بن سکیں۔ اسلام کا صحیح علم نہ صرف مسلم نوجوانوں بلکہ دنیا کی دوسری قوموں کو بہم پہنچایا جائے۔ ہندوستانی مسلمانوں کو ہندوستان کے دیگر مذاہب ان کے بنیادی نظریات وعقائد سے آگاہ کیا جائے اور نصاب تعلیم کو انسانی زندگی کے لئے مفید جائے۔ بالخصوص اسلامی تہذیب کے بہترین ثمرات کو قوم کے سامنے پیش کیا جائے اور اس سے متمتع ہونے کے مواقع فراہم کیئے جائیں۔

صحیح معنوں میں مسلمان :- بمبئی کرانیکل (۲ مارچ ۱۹۲۳ء) میں شائع ایک اپیل میں ہے کہ ایک وفد ڈاکٹر (مختار احمد) انصاری، حکیم اجمل خاں، پرنسپل اے ایم خواجہ اور نائب پرنسپل سن پر مشتمل، مولانا محمد علی کے قائم کردہ، نیشنل مسلم یونیورسٹی، کے لیئے چندے کی فراہمی کرنے بمبئی ہے۔ ہمیں ہر اس مسلمان سے توقع ہے جسے اللہ تعالیٰ نے دولت سے نوازا ہے کہ وہ یونیورسٹی کی مالیات مضبوط کرنے کے لئے بھرپور تعاون دے گا۔ اس جامعہ کی کامیابی ہر مسلمان اور ہر ہندوستانی کو آنے والے دنوں میں فائدہ پہنچائے گی۔ اپیل کی سرخی اس طرح ہے: "صحیح معنوں میں مسلم، صحیح معنوں میں قومی

- (TRULY MUSLIM ,TRULY NATION

جامعہ ملیہ کے مونوگرام پر :- علم الانسان مالم یعلم کی قرآنی آیت درج ہے جس کا مفہوم : (خدا نے) انسان کو سکھایا جو کچھ وہ جانتا نہ تھا۔

۸ جنوری ۱۹۲۸ء کے "ہمدرد" میں بانی جامعہ مولانا محمد علی جوہر نے جامعہ کا تعارف ان الفاظ میں یا ہے — " از کلید دین در دنیا کشاد " یعنی دنیا کے دروازے دین اسلام کی کنجی سے کھلتے ہیں

جامعہ ملیہ اسلامیہ ۱۹۲۵ء میں علی گڑھ سے دہلی، قرول باغ میں منتقل ہو گئی اور کئی سال کے بعد ملا کے علاقے میں جو اب "جامعہ نگر" کے نام سے جانا جاتا ہے منتقل ہوئی۔ پھر جون ۱۹۳۹ء کو جامعہ سوسائٹیز ایکٹ ۱۸۶۰ کے تحت رجسٹرڈ ہوئی۔ اس وقت تک یہ "انجمن تعلیم ملی" کے تحت چل رہی تھی

جامعہ سوسائٹی کا پہلا اور بنیادی مقصد اسکی الیشن کے میمورنڈم میں یوں درج ہے۔ "۳ (الف) ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں مذہبی اور بنیادی تعلیم کو فروغ دینا ہے۔ سوسائٹی کو چلانے کے لئے جو بنیادی اصول سیکشن ۳ کے تحت وضع کئے گئے تھے، وہ اس طرح

(الف) یہ جامعہ ایک خود مختار تعلیمی سوسائٹی ہوگی۔

(ب) یہ ایسا کوئی تعاون نہیں لے گی جو اس کے کسی بھی مقصد یا اصول سے متصادم ہو۔

(ج) سوسائٹی کے تحت چلنے والے تمام اداروں میں ذریعہ تعلیم ہر سطح پر اردو ہوگا۔ البتہ مخصوص حالات میں دوسری زبانوں کو بھی ذریعہ تعلیم کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔

(د) جامعہ کے دروازے ہر شخص کے لئے خواہ وہ کسی بھی جنس، نسل، طبقے یا عقیدے سے تعلق رکھتا ہو، کھلے رہیں گے (یہ فقرہ ۳ (الف) میں مذکور "بالخصوص مسلم" سے کسی طرح متضاد نہیں ہے۔ اس سے مراد صرف یہ ہے کہ بلا کسی امتیاز کے، تمام ہندوستانیوں کو یہاں تعلیم دی جائے)

(ہ) یہ (جامعہ) ہندوستان کے مختلف فرقوں اور قوموں کے درمیان مفاہمت اور باہمی میل جول کو فروغ دے گی۔

بالخصوص مسلمان :- گرچہ جامعہ کا ابتدائی مقصد مسلمانوں کی دینی اور دنیاوی تعلیم تاہم اس کے دروازے دوسروں کے لئے بھی ہمیشہ کھلے رہے۔ مسلمانوں کو اگر اسلامیات پڑھائی جاتی تو غیر مسلموں کے لئے ہندو اخلاقیات یا ہندوستانی مذہبی نظریات پڑھنے کی آزادی تھی۔ آج بھی درجے تک ذریعہ تعلیم اردو ہے، نویں سے گریجویشن کی سطح پر (بلا لحاظ لسان) تمام طلبا کو اردو پڑھنی ضروری ہے

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے رام گڑھ کانگریس اجلاس کے صدارتی خطبے میں زور دے کر کہی تھی کہ ہندوستانی مسلمانوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ خود کو مسلمان کہیں یا ساتھ ہی ہندوستانی۔ ان دونوں شناختوں کے درمیان کوئی تضاد نہیں پایا جاتا۔

★ معین الدین حارث نے ۱۹۷۰ء میں جامعہ کے جشن زرین کے موقع پر اپنے صدارتی خطبے میں مولانا آزاد مرحوم کے اس جملہ پر زور دیتے ہوئے کہا تھا — "مسلمانوں کو واضح کر دینا چاہیئے کہ جامعہ

"ملیہ" رہے تو یہ "اسلامیہ" بھی رہے اور اسلامیہ ہی "باقی" رہے گی۔ اس کا ملی کردار کے ساتھ "اسلامی" کردار بھی ہے۔ جو تاریخی ہے اور اسے ہرگز نہ تو بھلایا جاسکتا ہے۔ نہ ہی اسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔

متصورہ یونیورسٹی :- جامعہ ملیہ اسلامیہ ــ جو اب تک ایک خود مختار ادارے کی حیثیت سے ایک رجسٹرڈ سوسائٹی کے تحت چل رہی تھی ۱۹ جنوری ۱۹۶۲ء کو اسے ایک متصورہ یونیورسٹی DEEMED UNIVERSITY کا درجہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن ایکٹ ۱۹۵۶ء کی دفعہ ۳ کے تحت دیا گیا۔

بعد کو پتہ نہیں کیا ہوا کہ اس وقت کے فروغ انسانی وسائل کے مرکزی وزیر جناب پی شیوشنکر نے جامعہ ملیہ اسلامیہ بل لوک سبھا میں پیش کر دیا۔ اس کا مقصد دہلی میں ایک تدریسی یونیورسٹی قائم کرنا بتلایا گیا۔ اس بل کے ذریعہ جامعہ ملیہ اسلامیہ (رجسٹرڈ) "سوسائٹی" کی تمام املاک اور حقوق کو اس "نئی جامعہ" کے حوالے کرتے ہوئے سوسائٹی کو "کالعدم" قرار دے دیا گیا۔ اس "اقدام" کے پس پردہ پتہ نہیں کون سی "اغراض" کارفرما تھیں کہ شیوشنکر کے پیش کردہ "بل" کو بہت ہی جلد بازی میں لوک سبھا اور راجیہ سبھا' دونوں نے ایک ہفتے کے اندر "منظور" کر لیا۔ اسے کسی مشترکہ سلیکٹ کمیٹی کے حوالہ بھی نہیں کیا گیا اور جو مشورے مختلف لوگوں اور تنظیموں کی جانب سے دیئے گئے تھے (کہ جامعہ کے تاریخی کردار کو برقرار رکھا جائے) ان سب کو ردی کے حوالے کر دیا گیا۔

★ تلنگانہ کانگریس کے لیڈروں جیسے بیرگلا راما راؤ' کے وی رنگا ریڈی' ایم نرسنگ راؤ' پی وی نرسمہا راؤ وغیرہ جنھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کو راتوں رات اردو ذریعہ تعلیم سے انگریزی ذریعہ تعلیم کی یونیورسٹی بنا دیا تھا۔ ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے مسٹر پی شیوشنکر نے "جامعہ سوسائٹی" کے بنیادی اصول کو الٹ کر رکھ دیا۔

یہ بنیادی اصول جیسا کہ اوپر درج ہے' یہ تھا کہ جامعہ میں ذریعہ تعلیم ہر سطح پر اردو ہوگا اور مخصوص صورتوں میں ذریعہ تعلیم ہر سطح پر اردو ہوگا اور دیگر زبانیں بھی ذریعہ تعلیم کے طور پر اختیار کی جاسکتی ہیں وزیر موصوف نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ دفعہ ۳ (الف) کے تحت جہاں "بالخصوص مسلم" کے الفاظ درج تھے۔ اسے

بھی حذف کر دیا اور جامعہ کو ایک نام نہاد سیکو... بنا دیا۔ ... کے وزرا ر فروغ انسانی وسائل پی وی نرسمہا راؤ اور ان کے جانشین پی شیو شنکر کا تصور "سیکولرازم" شاید یہی رہا ہو کہ ایک مخصوص طبقے کو اپنے ایک تعلیمی ادارے کو قائم رکھنے سے "محروم" کر دیا جائے۔"

* کون ہے جو ان سے دستور کی دفعہ ۲۹ اور ۳۰ (الف) کا "مفہوم" دریافت کرے؟

بنیادی حقوق ۔ جو دستور کی ان دفعات میں دیئے گئے ہیں وہ کسی بھی لسانی، تہذیبی، مذہبی اقلیت کو اپنے مذہب، کلچر اور زبان کے تحفظ کے لئے اپنی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور چلانے کا حق دیتے ہیں۔

سوسائٹی کی غیر قانونی تحلیل :- "جامعہ سوسائٹی" اپنے دستوری حق کو استعمال کرتے ہوئے ایک خود مختار تعلیمی ادارہ کو جسے یونیورسٹی کے مماثل درجہ حاصل تھا اور جو بالخصوص مسلمانوں کے لئے قائم کیا گیا تھا اور جس کا ذریعہ تعلیم اُردو تھا، چلا رہی تھی اس کی کارکردگی پر کسی طرح کا کوئی اعتراض یا الزام نہیں تھا۔ لیکن چند افراد کو خوش کرنے کے لیے مرکزی حکومت نے راجیو گاندھی کے دور میں اچانک اس رجسٹرڈ سوسائٹی کو "تحلیل" کر دیا اور اس طرح مسلمانوں کے اپنی پسند کے تعلیمی ادارے کے قائم کرنے اور انہیں چلانے کے "بنیادی حق" کو ان سے "چھین" لیا۔

کیا مرکزی حکومت کسی ایسی سوسائٹی کو، جو سوسائٹیز رجسٹریشن ایکٹ ۱۸۶۰ کے تحت رجسٹرڈ ہو کسی سبب کے بغیر تحلیل کر سکتی ہے۔ اس طرح کی تمام رجسٹرڈ سوسائٹیاں، ایکٹ ۲۱ (۱۸۶۰) کی شرائط کے ساتھ کام کرتی ہیں اس طرح کی سوسائٹیوں کو تحلیل کرنے کے لئے لازمی ہے کہ سوسائٹی کے ممبران کی ۵/۲ اکثریت اس سے اتفاق کرے اور دوبارہ اسی اکثریت کے ساتھ ایسے تحلیل کرنے کی قرارداد منظور کرے۔

قانون کی سرعام خلاف ورزی :- کتنے تعجب کی بات ہے کہ اس شرط کے علی الرغم مرکزی حکومت ایک رجسٹرڈ سوسائٹی کو فی الفور "تحلیل" کر دیتی ہے اور اس کی تمام جائیداد اور اثاثہ جات و حقوق کو ایک نئے قائم شدہ "ڈھانچے کے سپرد" کر دیتی ہے جبکہ تحلیل کے لئے سوسائٹی کی جنرل باڈی (انجمن) کی درخواست ضروری تھی۔

محض جامعہ کے چند نام نہاد "ذمہ داران" کی خواہش یا درخواست پر اس طرح کا اقدام کیوں کر

"صحیح" قرار دیا جاسکتا ہے۔ ۱۹۸۸ء کے ایکٹ ۵۸ کو اس قانونی پہلو سے بھی دیکھنے کی ضرورت ہے
DEEMEDUNIVERSITY کے درجے سے بڑھا کر اسے ایک مرکزی یونیورسٹی کا درجہ دینے
کے "بہانے" جامعہ ملیہ اسلامیہ کاغذ پر صرف نام کی "ملیہ اور اسلامیہ" رہ گئی۔

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی ؛ جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی (اقبال)

یہ حال ہے دنیا کی سب سے بڑی سیکولر جمہوریت کہے جانے والے ملک میں ناانصافی کا!

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہندوستانی پارلیمنٹ، مسلمانوں کے ساتھ کی گئی اس ناانصافی کا فوری ازالہ کرتے ہوئے جامعہ کے اقلیتی کردار کو بحال کرے۔

کم از کم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی وہ حیثیت، جو اسے ۱۹۸۱ء کے ترمیمی ایکٹ کے ذریعہ دی گئی تھی۔ ضرور دے۔ کیونکہ جامعہ کے ایسا تعلیمی ادارہ ہے جس کی بنیاد مسلمانوں نے "بالخصوص مسلمانوں" کے لئے رکھی تھی چودہ پارٹیوں پر مشتمل موجودہ مرکزی حکومت کو چاہیئے کہ وہ احتجاجی طلبہ کے جو جامعہ کے اقلیتی کردار کی بحالی کا مطالبہ کر رہے ہیں، ایک قیمتی تعلیمی سال کو ضائع نہ ہونے دے اور جلد سے جلد جامعہ ایکٹ ۱۹۸۸ء میں مناسب ترمیم کرے۔

جامعہ کو اقلیتی کردار دیئے جانے سے قومی مفاد کو کسی طرح کا کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہیں ہے۔ یہ اقدام تعلیمی لحاظ سے پسماندہ مسلمانوں کی خدمت بھی ہوگا اور ان کے قیمتی ورثے "اردو زبان اور اسلامی ثقافت" کے تحفظ کی ضمانت بھی Radiance views weekly. NewDelhi.oooo

سید علی
(کلکتہ)

جامعہ ملیہ اسلامیہ کا شدھی کرن
اقلیتی کردار لٹ گیا

جامعہ ملیہ اسلامیہ جو کبھی مسلمانوں کی آرزوؤں کا مظہر اور تمناؤں کا مرکز تھا۔ آج وہ ان کے خوابوں کا مدفن و مزار بن گیا۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کا "شدھی کرن" ہو گیا، اس کا اقلیتی کردار لٹ گیا۔ جامعہ کا سوسائٹی ایکٹ اندھیرے میں بدل دیا گیا۔ داخلہ کے کوٹہ سسٹم میں بنیادی تبدیلی کر دی گئی۔ ہائر سکنڈری اسکول میں اردو جو لازمی مضمون تھا، ختم کر دیا گیا۔ مسلمانوں کے قائم کردہ ادارہ میں ان کی نسلوں کو داخلہ و ملازمت سے محروم کیا جا رہا ہے۔ جس جامعہ کو بانیانِ جامعہ نے انگریزوں کے استبدادی دور میں اپنے روپیوں اور خون پسینے سے نئی نسلوں کے اسلامی کیریکٹر کی تعمیر کے لئے قائم کیا تھا، ہماری آزاد جمہوری حکومت نے بے دردی سے جامعہ انتظامیہ کے ساز باز سے اس کا چہرہ اور کردار بدل دیا جبکہ دستور میں یہ الفاظ موجود ہیں۔ "تمام اقلیتوں کو خواہ وہ مذہب کی بنا پر ہوں یا زبان کی' اپنی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور ان کا انتظام کرنے کا حق ہوگا۔" ملاحظہ ہو: دستور ہند آرٹیکل ۳۰ (۱)۔ مزید یہ کہ "مملکت' تعلیمی اداروں کو امداد عطا کرنے میں کسی تعلیمی ادارے کے خلاف اس بنا پر امتیاز نہ برتے گی کہ وہ کسی اقلیت کے زیر انتظام ہے خواہ وہ اقلیت مذہب کی بنا پر ہو یا زبان کی۔" ملاحظہ ہو دستور ہند آرٹیکل ۳۰ (۲)

دہلی ہائیکورٹ کے حالیہ فیصلہ (۳۰ اپریل ۱۹۹۷ء) کے بعد اس بات کا انکشاف ہوا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی کا اقلیتی کردار "سیکولر" ڈھانچہ میں ڈھال دیا گیا ہے۔ اس غیر متوقع فیصلہ سے جامعہ سے وابستہ تمام لوگوں کے ہوش اڑ گئے اور خوابیدہ مسلمانوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اتنا بڑا دھوکہ' اتنا عظیم المیہ' اتنی گھناؤنی سازش!!

طلبار برادری میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی ہے۔ امتحانات کا بائیکاٹ ہو چکا ہے، اقلیتی کردار کی
ی تحریک شروع ہو گئی ہے۔ جامعہ کے سابقہ لیڈران اور قدیم طلبار، جامعہ ٹیچرز اسوسی ایشن
ن اسوسی ایشن اور درجۂ چہارم کے ملازمین بھی اپنی حمایت کا اعلان کر کے تحریک سے وابستہ ہو گئے
۔ جلسے، جلوس اور مظاہرے کے بعد اب طلبار نے رابطہ کمیٹی تشکیل دیدی ہے جو سینیئر طلباء یونیورسٹی
ملازمان اساتذہ، اسٹاف، ملت کے رہنماؤں، قانونی ماہرین اور سیاسی لیڈران سے رابطہ قائم کر کے
عملی تیار کر رہی ہے۔

۷ رمئی کو طلبار، اساتذہ، انتظامیہ کے اسٹاف اور درجۂ چہارم کے ملازمین نے جامعہ میں لوکن
ٹک کی اور "یوم سیاہ" منایا۔ اسی دن سے طلبار نے ایڈمنسٹریٹیو بلاک کے سامنے دھرنا دے رکھا
الحال جامعہ میں تمام تعلیمی سرگرمیاں بند ہیں۔ مراکز امتحانات، لائبریری اور دیگر بہت سے دفاتر
بے پڑے ہوئے ہیں۔

اس سانحہ پر دہلی میں ہلچل مچی ہوئی ہے لیکن سارا ملک بے خبری کی نیند سو رہا ہے۔

ایس آئی ایم آف انڈیا، ایس آئی او آف انڈیا، آل انڈیا ملی کونسل، انجمن طلبار و قدیم
ترالفلاح دہلی اور دوسرے اداروں اور تنظیموں نے طلبار کی "بحالی اقلیتی کردار" تحریک کی
کرتے ہوئے اپنی "نیک نیتی" کا ثبوت فراہم کر کے طلبار جامعہ نے ایک میمورنڈم قائم مقام
چانسلر پروفیسر مشیر الحسن کو دیا ہے جس میں جامعہ سوسائٹی ایکٹ کی بحالی اور اس ایکٹ کو از سرنو
کر کے یونیورسٹی وزیٹر صدر جمہوریہ ڈاکٹر شنکر دیال شرما کے پاس منظوری کے لئے بھیجنے، کوٹہ
کو برقرار رکھنے، ہائیر سکنڈری اسکول میں اردو بحیثیت لازمی مضمون قرار دینے اور تحریری امتحانات
امیدواروں کو کامیاب کرنے کے لیئے ۲۰ فیصد نمبرات اردو سے متعلق سوالات کے لئے مخصوص
دینے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ ۱۹۲۰ء میں قائم ہوا۔ اس کے قیام کا پس منظر یہ تھا کہ تحریک خلافت کے
میں برطانوی تعلیمی اداروں کے بائیکاٹ کی جو تحریک شروع ہوئی تو مسلمانوں نے جگہ جگہ برطانوی تعلیمی
ںکا بائیکاٹ شروع کر دیا۔ مولانا محمد علی جوہر نے ان طلبار کے تعلیمی مستقبل کا خیال کرتے ہوئے

مولانا محمود الحسن اور حکیم اجمل خاں کی تائید و تعاون سے ایک ایسے کالج کی ضرورت محسوس کی جہاں
مسلمان تعلیم حاصل کرکے سچے مسلمان بنیں اور ان میں اسلام کی ایسی روح پیدا ہو کہ وہ اپنی گمشدہ عظمت
کا اعادہ اور اپنی مادر وطن کی خاطر خواہ خدمت کرسکیں۔

کالج کے قیام کے ساتھ انہوں نے واضح اعلان کردیا تھا کہ اُن کو تعلیم سے زیادہ مذہب عزیز ہے
تعلیم کو وہ چھوڑ سکتے ہیں لیکن مذہب کو پس پشت نہیں ڈال سکتے۔ مولانا محمد علی جوہر اپنے اخبار
ہمدرد میں لکھتے ہیں۔

"جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کا پہلا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو
حق دوست اور خدا پرست مسلمان بنایا جائے۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ ان
کو وطن دوست و حریت پرور ہندوستانی بنایا جاوے۔"

۱۹۳۹ء میں جامعہ کو چلانے کے لئے ایک سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا اور یہیں سے جامعہ
رنگ روپ بدلنے لگا۔ جامعہ کے بانی مولانا محمد علی جوہر تھے۔ لیکن ان کے ساتھ کے بانیوں میں کئی نام
اور شامل کردیئے گئے، اسی کے ساتھ جامعہ کے "اسلامی کردار" میں انحطاط کا آغاز ہوگیا۔ ۱۹۵۲ء میں
جامعہ کے لئے سرکار کی طرف سے ایک لاکھ روپیہ کی گرانٹ منظور ہوئی پھر ۱۹۶۲ء میں اسے ڈیمڈ یونیورسٹی
کا درجہ دیدیا گیا۔ البتہ ان سب کے باوجود جامعہ کا اقلیتی کردار برقرار تھا، لیکن ۱۹۸۸ء میں حکومت نے
اسے ایک "مرکزی" یونیورسٹی کا درجہ دیدیا گیا۔ تو اسی وقت سے اس کا کردار بدل گیا۔

۲۹ اگست ۱۹۸۸ کو راجیہ سبھا اور ۲ ستمبر ۱۹۸۸ء کو لوک سبھا سے بل منظور ہوتے ہی مسلمانوں کی
طرف سے اس کی شدید مخالفت کی گئی لیکن کانگریس حکومت نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔ مسلم ارکان
پارلیمنٹ نے بل پر بحث کے دوران جامعہ کے "اقلیتی کردار" کو برقرار رکھنے کا مطالبہ کیا، حتیٰ
مسٹر اٹل بہاری واجپائی نے بھی جامعہ کے انفرادی کردار کو باقی رکھنے کی وکالت کی۔ مرکزی یونیورسٹی کا درجہ
دیئے جانے پر اگر خوشی تھی تو صرف جامعہ کے ارباب اقتدار کو۔

دہلی ہائیکورٹ نے جب ایک مقدمہ میں ایکٹ مجریہ ۱۹۸۸ طلب کیا تو اس میں سرفہرست
یہ بات مذکور تھی کہ جامعہ ایک "سیکولر" یونیورسٹی ہے جبکہ سوسائٹی ایکٹ ۱۹۳۹ء میں اس بات کی

[illegible] حت" تھی کہ جامعہ "مسلمانوں" کی یونیورسٹی ہے اور اس کا اپنا "اقلیتی" کردار ہے۔ اس میں اگر
[illegible] ریزرویشن" دیا جا سکتا ہے تو صرف مسلمانوں کو۔ جس کا بنیادی مقصد معاشی طور پر پسماندہ طبقات خصوصاً
مسلمانوں کو تعلیم سے آراستہ کرنا ہے۔

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۹۸۸ء میں جامعہ کو "مرکزی" یونیورسٹی تسلیم کرنے کے لئے راجیو
[illegible]ندھی اور جامعہ انتظامیہ میں خفیہ "سودا بازی" ہوئی۔ انتظامیہ سرکاری مراعات کے عوض سوسائٹی
[illegible]یلٹ میں بنیادی تبدیلی کے لئے "رضامندی" دے دی۔ اس طرح جامعہ اور پوری ملت کے ساتھ غداری کی گئی
[illegible] پر نجانے ابھی اور کتنے دنوں تک پردہ پڑا رہتا۔ اگر ایک مقدمہ میں ہائیکورٹ دہلی کا فیصلہ سامنے
نہیں آیا ہوتا۔

واقعہ یہ ہے کہ موجودہ تعلیمی سال ۹۷-۱۹۹۶ء کے لئے جب داخلے ہوئے تو انتظامیہ نے انجینئرنگ
کے ایک امیدوار رجنیش گپتا کو داخلہ کی اجازت اس لیئے نہیں دی کیونکہ وہ تحریری امتحان میں کامیاب نہیں
ہوا تھا جو جامعہ کے کسی بھی کورس میں داخلہ کی پہلی شرط ہے۔ رجنیش گپتا کے والدین نے تو پہلے انتظامیہ
پر دباؤ ڈالا کہ وہ انکے بیٹے کو داخلہ دیدے لیکن جب ایسا نہیں ہوا تو انہوں نے داخلہ کے نظام کو دہلی کورٹ
میں چیلنج کر دیا۔ دہلی ہائیکورٹ کی سنگل بنچ نے ۱۰ اپریل ۱۹۹۷ء کو اپنا فیصلہ سناتے ہوئے "میرٹ لسٹ" میں
نہ آنے کے باوجود انتظامیہ کو ہدایت دی کہ وہ رجنیش گپتا کو داخلہ دے۔ کورٹ میں بحث کے دوران جامعہ
[illegible] تاریخ، دستور اور نظام زیرِ بحث آیا اس وقت اس دھوکہ سے" پردہ اٹھا" جس سے پوری ملت
"ناواقف" تھی۔

کورٹ نے یونیورسٹی اکیڈمک کونسل کے پیرا [illegible] اصول و ضوابط کالعدم قرار دے کر فیصلہ کی روشنی
میں نئے اصول و ضوابط مرتب کرنے کی ہدایت دی ہے۔

جامعہ میں داخلے کے مخصوص کوٹے کو ختم کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جامعہ میں مسلم طلباء کی شرح کم
ہو جائے گی۔

یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ مسلمان معاشی اور تعلیمی اعتبار سے برادرانِ وطن کے
مقابلے میں بہت پیچھے ہیں سرکاری اور غیر سرکاری سروے سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ مسلمان

تعلیمی میدان میں بہت پیچھے ہیں' اس لیے انہیں ملکی و قومی مفاد میں بھی آگے بڑھانے کی ضرورت ہے لیکن حکومت کا عملی رویہ یہ ہے کہ جو کچھ بھی مسلمانوں کو تعلیم و ترقی کے مواقع حاصل ہیں۔ انہیں گہری سازش اور منظم منصوبے کے تحت ختم کر رہی ہے۔ اسکولوں' کالجوں اور ٹکنیکل وطبی اداروں میں مسلم طلباء کا داخلہ تقریباً ناممکن بنادیا گیا ہے مسلمان اپنے طور پر جو اسکول و کالج قائم کر رہے ہیں' ان کے اقلیتی کردار کو تسلیم نہیں کیا جارہا ہے۔ مسلمانوں کی جو چند قدیم قائم کردہ یونیورسٹیاں ہیں۔ ان کو بھی کسی نہ کسی طریقے سے ختم کیا جارہا ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد اپنی شناخت سے محروم کردی گئی۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے کردار پر وقفہ وقفہ سے حملہ ہوتا رہتا ہے اور اب ایک شمع جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی جو بچ گئی تھی۔ اس کو بھی اندھیرے میں شب خون مار کر لوٹ لیا گیا۔

کبھی مسلم رہنماؤں نے اپنے پیسے اور ذرائع و وسائل سے "بدیسی" حکومت کے دور استبداد میں اپنی نسلوں کی ترقی و تعلیم کے لیے ادارے قائم کیے تھے۔ آج "اپنی" حکومت میں ان پر ڈاکے ڈالے جارہے ہیں اور ان کے لائق و فائق وارثین' ان کی حفاظت سے بھی محروم ہیں۔

تاریخ کا کیسا عبرتناک سانحہ ہے یہ! کیا مسلمانوں کا احساس زیاں واقعی چھن چکا ہے؟ کیا یہ وقت نہیں ہے کہ وہ جامعہ کے اقلیتی کردار کی بحالی کے لئے پوری شدت سے تحریک چلائیں اور اس مادر علمی اور محمد علی جوہر کی امانت کو لٹنے سے بچائیں۔ ٥

محمد سراج الدین صدیقی (وظیفہ)
اسسٹنٹ ڈائرکٹر سروے اینڈ لینڈ ریکارڈ

پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر قادری

میں نے اپنے دوران قیام شارجہ جنوری ۹۲ء ادارۂ منہاج القرآن سے واقفیت حاصل کی جس کے بانی و سرپرست جناب پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر قادری صاحب ہیں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کی کچھ تصانیف پڑھنے، متعدد تقاریر کے آڈیو اور ویڈیو کیسٹس سننے اور دیکھنے کے بعد میں بے حد متاثر ہوا۔ خوش قسمتی سے انہی دنوں ڈاکٹر صاحب کے دورۂ متحدہ عرب امارات کے پروگرام کی اطلاع ملی۔ ملاقات کا اشتیاق بڑھا۔ آخرکار بمقام عجمان ادارہ منہاج القرآن کی شاخ کے افتتاح کے موقع پر مجھے اس عظیم شخصیت سے ملنے کا موقع ملا اور تعارف ہوا۔ میری خوشی کی انتہا نہ رہی جب میں نے اخبار میں پڑھا کہ جناب صلاح الدین اویسی صدر مجلس اتحاد المسلمین کی کاوش سے ان کی دعوت پر پروفیسر صاحب موصوف ۹ مئی کو حیدرآباد تشریف لا رہے ہیں۔ یہ اہل حیدرآباد کی خوش قسمتی ہے کہ عصر حاضر کے ایک کم عمر ۴۶ سالہ عظیم مفکر، مجتہد، عصری تعلیم سے آراستہ عالم دین پروفیسر اور ماہر دینی علوم و فنون متداولہ کو سننے اور استفادہ کرنے کا موقع ملے گا۔

حضرت ڈاکٹر محمد طاہر قادری کے والد گرامی علامہ فرید الدین قادری ۱۹۱۸ء میں بمقام جھنگ (لاہور) میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک عدیم المثال خطیب، بلند پایہ عالم دین اور جلیل القدر طبیب تھے۔ دین ادب اور طب کی ساری تعلیم لکھنؤ میں حاصل کی۔ طب یونانی میں تخصص لکھنؤ، حیدرآباد دکن

اور دہلی سے حاصل کیا۔ ۱۹۴۸ء میں سرزمین بغداد و نجف کی زیارت کے بعد حرم کعبہ اور روضہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حاضری کا پہلا موقع نصیب ہوا تھا۔ رات کے پچھلے پہر طواف کے بعد اور مقام ملتزم پر غلافِ کعبہ کو تھامے ہوئے آنسوؤں کی برسات میں ان کی زبان سے یہ دعا نکل رہی تھی۔ "باری تعالیٰ ایسا بچہ عطا کر جو تیری اور تیرے دین کی معرفت کا حامل ہو جو دنیا و آخرت میں تیری لے بنیاہ عطا و رضا کا حقدار ٹھہرے اور فیضانِ رسالت مآب صلعم سے بہرہ ور ہو کر دنیائے اسلام میں ایسے علمی فکری اور روحانی انقلاب کا داعی ہو جس سے ایک عالم متمتع ہو سکے۔"

علامہ فریدالدین قادری کے دل کی گہرائیوں سے نکلنے والی اس دعا کے نتیجہ میں خود فخر موجودات علیہ الصلوٰۃ والسلام نے طاہر کے تولد کی بشارت دی اور نام بھی خود تجویز فرمایا۔ چنانچہ ۱۹ فروری ۱۹۵۱ء کو آپ کے ہاں لڑکا پیدا ہوا۔ والد نے حضور صلعم کی نسبت کا اضافہ کر کے محمد طاہر نام رکھا۔ من بعد محمد طاہر حضرت سیدنا الشیخ طاہر علاء الدین الگیلانی القادری بغدادی مظلہ سے روحانی نسبت اور بعیت کے باعث محمد طاہر القادری ہو گئے۔ محمد طاہر القادری تیرہ سال کی عمر میں والدین کے ساتھ حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ منورہ سے مشرف ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود بلا کر اپنے لطف و کرم اور خصوصی فیضان سے نوازا اور بلاوے کا مقصد پورا ہونے کی بشارت بھی خود ہی مرحمت فرما دی۔ محمد طاہر کو دودھ کا بھرا ہوا ایک مٹکا عطا کیا اور اسے ہر ایک میں تقسیم کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ یہ حاضری کی قبولیت اور خصوصی عنایات کی خوشخبری تھی۔ محمد طاہر نے اپنی تعلیمی زندگی کا آغاز "اسیکرڈ ہارٹ اسکول جھنگ صدر سے کیا۔ اسکول۔ کالج یونیورسٹی میں تمام امتحانات میں فرسٹ ڈویژن میں پاس کئے۔ ایم اے (اسلامیات) میں پنجاب یونیورسٹی میں اول آئے۔ اس کے بعد ایل ایل بی کیا۔ گورنمنٹ کالج جھنگ میں چھ ماہ تک علوم اسلامیہ کے عارضی استاد رہے۔ ۱۹۷۴ء کے اواخر میں گورنمنٹ کالج عیسیٰ خیل (ضلع میانوالی) میں اسلامیات کے لیکچرر مقرر ہوئے۔ جب تمام دینی و دنیوی علوم کی تکمیل ہو گئی تو ۲ نومبر ۱۹۷۴ء کو والد گرامی کا وصال ہو گیا۔ اس کے بعد وطن میں گھریلو ذمہ داریوں کے سبب ملازمت سے دستبردار ہو گئے اور وطن

(جھنگ) میں دو سال تک ایڈووکیٹ کی حیثیت سے پریکٹس کرتے رہے۔ تمام گھریلو معاملات
اور ہمشیرگان کی شادیوں سے فراغت کے بعد اپریل ۱۹۷۸ء میں آپ اسلامک اسٹڈیز کے لیکچرر
کی حیثیت سے یونیورسٹی لاء کالج لاہور (پنجاب) سے منسلک ہو گئے اور طلباء کو اپنی خداداد صلاحیتوں
سے مستفید کرنے لگے۔ اپریل ۱۹۸۶ء میں آپ نے اسلامک لاء میں تحقیقی کام PUNISHMENT —
ISLAM THEIR CLASSIFICATION AND PHILOSOPHY کے زیر عنوان
پنجاب یونیورسٹی کو پیش کیا اور ڈاکٹریٹ (پی ایچ ڈی) کی ڈگری حاصل کی

دینی تعلیم :— مدینہ طیبہ میں زمانۂ قیام میں جناب محمد طاہر القادری کو عالم اسلام
کی معروف روحانی شخصیت جناب ضیاء الدین قادری مہاجر مدنی علیہ الرحمہ کی خدمت میں تبرکاً
زانوائے تلمذ تہہ کرنے کا موقع ملا اور وہاں سے دینی تعلیم کا آغاز ہوا۔ آپ نے صرف و نحو۔ فقہ
اصولِ فقہ، منطق، فلسفہ، معانی اور عربی ادب کی ابتدائی کتب اپنے والدِ محترم سے پڑھیں۔ اس کے
بعد جامعہ قطبیہ رضویہ جھنگ میں ۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۰ء تک مختلف اوقات میں استاذ العلماء حضرت
علامہ عبد الرشید رضوی مدظلہ سے اکتسابِ علم کیا۔ دورہ حدیث اپنے والدِ معظم سے مکمل کیا بعد ازاں
لاہور کے زمانۂ قیام میں حضرت علامہ ابوالبرکات سید احمد قادری صاحب کے درسِ حدیث میں
شریک ہوتے رہے۔ پاکستان کے نامور عالمِ دین، غزالئ دوراں حضرت سید احمد سعید کاظمیؒ
نے پروفیسر صاحب کی دینی قابلیت اور علمی استعداد کے پیشِ نظر طریقِ محدثین پر آپ کو سند
حدیث عطا کی۔ آپ نے اسلامی فلسفہ، مفکرِ اسلام حضرت ڈاکٹر برہان احمد فاروقی مدظلہ سے پڑھا

قومی و ملی خدمات :— پنجاب یونیورسٹی سے منسلک ہونے کے بعد بہت جلد ہی
یونیورسٹی سنڈیکیٹ، سینیٹ اور اکیڈمک کونسل کے ممبر منتخب ہو گئے اور بے پناہ مقبولیت حاصل
کی۔ اسی اثناء میں مرکزی وزارتِ تعلیم حکومتِ پاکستان نے آپ کو قومی کمیٹی برائے نصاباتِ اسلامی
میں بطور ایکسپرٹ نامزد کیا۔ حکومتِ پاکستان نے آپ کو وفاقی شرعی عدالت کا مشیر بھی مقرر کیا

مرکزی ادارہ منہاج القرآن کا قیام :— پروفیسر محمد طاہر القادری نے ۱۹۷۶ء میں محاذ
حریت کے نام سے جھنگ ڈسٹرکٹ میں ایک تنظیم قائم کی تھی اس کے تحت دو سال تک ہر روز

درس قرآن اور نوجوانوں کی فکری تربیت کا سلسلہ جاری رکھا۔ ۱۹۷۸ء میں لاہور منتقل ہوجانے کے بعد کوئٹہ سے پشاور اور کراچی تک تبلیغی دورے کیے۔ اس ابتدائی کام کے بعد امت مسلمہ کے احیاء اتحاد کی عالمگیر جدوجہد کی خاطر آپ نے بعض دوستوں کے تعاون سے ۱۷ اکتوبر ۱۹۸۰ء کو مرکزی ادارہ منہاج القرآن کی بنیاد رکھی۔ اسلام کی تبلیغ اور اتحاد کے علاوہ عظمت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا تحفظ، اطاعت رسول صلعم کی ترویج و اشاعت ادارے کے قیام کا مقصد ہے جنوری ۱۹۸۳ء میں آپ نے "اتفاق اسلامک اکیڈیمی" کے نام سے ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا جس میں میٹرک پاس طلباء کے لئے چھ سالہ کورس کے ذریعہ گریجویشن اور قدیم و جدید تقاضوں کے مطابق درس نظامی کی تکمیل کا کام کیا جاتا رہا۔ اب تعلیم و تربیت کا یہ عظیم مرکز ماہ اگست ۱۹۸۶ء سے جامعہ اسلامیہ منہاج القرآن کے نام سے موسوم کر دیا گیا ہے اور ایک مکمل یونیورسٹی کے منصوبہ پر عملدرآمد کا آغاز ہوچکا ہے۔ پروفیسر صاحب نے ایران کے شہر تہران، قم اور مشہد مقدس، انگلستان کے شہر لندن، مانچسٹر، برمنگھم اور بوسٹن، امریکہ میں واشنگٹن نیویارک، شکاگو اور دیگر مقامات نیز ناروے، ڈنمارک کے کوپن ہیگن میں ادارہ منہاج القرآن کا قیام عمل میں لایا گیا۔ علاوہ ازیں متحدہ عرب امارات کے ابوظہبی، دوبئی، شارجہ اور عجمان میں نہ صرف مسلسل دورے جاری ہیں بلکہ ادارہ کی شاخوں کا قیام عمل میں آچکا ہے۔

۱۹۸۸ء میں لندن میں ادارہ منہاج القرآن کے زیراہتمام ایک بین الاقوامی اسلامی کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا جس میں اقطاعات عالم سے ہزاروں مندوبین نے شرکت کی۔ پروفیسر صاحب کے انقلابی فکر کی آبیاری بطور خاص امام غزالی، مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ کے انقلابی افکار سے ہوئی۔ دور جدید کے رہنماؤں میں سے جمال الدین افغانی، مفتی محمد عبداللہ حسن، علامہ رشید رضا اور مولانا عبید اللہ سندھی وغیرہ کے انقلابی رجحانات کا مطالعہ کیا۔ غیر مسلم مفکرین اور داعیان انقلاب میں سے کارل مارکس، فریڈرک اینجلز، لینن، سٹالن اور ماوزے تنگ وغیرہ کی تصانیف کا بھی مطالعہ کیا۔ فکری ارتقاء اور ذہنی نشوونما کے اس سفر میں مولانا احمد رضا خان اور علامہ اقبال کے افکار و خیالات نے آپ کو امت مسلمہ کے دینی و ملی تشخص اور

سید حامد قسط دوم

اردو یونیورسٹی

افسوس اس کا ہے کہ اس احساس کے باوصف کہ ماضی کو کریدنا ایک بے مصرف مشغلہ ہے راقم سطور کے پانو بھی اس طرف پھسل گئے ایک نتیجہ تو اس روداد سے نکالنا ہی پڑے گا طاقت کے بنا بات نہیں بنتی۔ اور طاقت ہاتھ سیاست سے آتی ہے۔ اُسی سیاست سے جس کی گل کاریوں نے ہمارے وطن عزیز کو لہو لہان کر رکھا ہے لیکن وہ تو سیاست کی بدترین شکل ہے۔

جو اقتباسات اوپر دیئے گئے ہیں ان سے قارئین کرام کو یہ اندازہ ہو گیا ہوگا کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی ایکٹ تعبیر و تفسیر کی بڑی گنجائش رکھتا ہے۔ جس وقت یہ بل زیر تشکیل تھا اس وقت ایک کوشش یہ کی گئی کہ تسوید کے توسط سے یونیورسٹی کمیٹی کی بعض اہم سفارشات کو جن پر محتسب کی قینچی معاندانہ چل چکی تھی، بازیاب کیا جائے، چنانچہ اس سرمائے میں سے بہت کچھ جو کمیشن اور وزارت میں لوٹ لیا گیا تھا۔ بل میں نقاب پہنے ہوئے واپس آ گیا۔ اب سوال روئے زیبا سے نقاب اٹھانے، ایکٹ کے امکانات اور مضمرات کو سمجھنے اور ارباب وزارت کو سمجھانے کا ہے۔ آپ بھی جانتے ہیں اور کم سواد بھی کہ یونیورسٹی پر اس کے وائس چانسلر کی شخصیت کس طرح سے اثر انداز ہوتی ہے اور کسی یونیورسٹی کا پہلا وائس چانسلر اس کے کارتقار کے لئے غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے اردو یونیورسٹی پر یہ کلیہ اور زیادہ پورا اترتا ہے کہ یہاں نظائر و سوابق راہ دکھانے

کے لئے موجود نہیں ہیں، ایک نئی عمارت کھڑی کی جاتی ہے۔ ایکٹ میں اجمال ہے، ابہام ہے۔ اخفا ہے۔ یہاں بے شمار مواقع ہیں۔ تعبیر، تفسیر، تشریح اور انکشاف کے یہاں بال و دکار ہیں اور خونِ جگر بھی۔ اگر پہلا وائس چانسلر لائق، دور اندیش، عالی حوصلہ، خوددار، پیش قدم، روابط آفریں اور صاحبِ بصیرت ہے تو سمجھ لیجئے کہ یونیورسٹی بہترین منہج اور معیار پر قائم ہوگی اور اپنے امکانات کو اپنی گرفت میں لے لگی اور اگر بدقسمتی سے پہلا وائس چانسلر بے تخیل، تھڑ دل، کم حوصلہ، کمزور، مسکین اور ہچکچاہٹ پیشہ، سازش خو، سفارشی اور تنگ نظر ہوا تو یونیورسٹی اپنی خطوط پر اُٹھے گی اور اپنی اوصاف کی آئینہ دار ہوگی۔ بنیاد اگر کج پڑگئی تو عمارت کو ثریا تک پہنچا لے جائیے تو بھی کج رہے گی۔ اسی بناء پر ابتداء سے داستان سے راقم سطور یہ فریاد کرتا رہا ہے کہ پہلے وائس چانسلر کی تلاش میں ملک کا چپہ چپہ چھان ڈالو اور اس کے انتخاب میں کسی سفارش، کسی دباؤ، کسی وقتی مصلحت، کسی ذاتی منفعت کو دخیل نہ ہونے دو۔ بدقسمتی سے ہمارے یہاں سفارش اور سیاست کا کاروبار زوروں پر ہے تعلیمی اداروں کو اس نے گھایل کر رکھا ہے۔ ان کو اور زیادہ جن سے اُردو والوں کا تعلق ہے کہ یہیں وہ جلبِ منفعت کے امکانات دیکھتے ہیں۔ خدائے بزرگ و برتر کی وسیع کائنات میں مقابلہ کی بہت سی راہیں انھوں نے اپنے اوپر بند کر رکھی ہیں۔ یاد رکھیئے کہ پہلے سربراہ کا انتخاب اگر خدانخواستہ صحیح نہ ہوا تو اُردو والوں کا وہ خواب جو ایک مدت کے بعد تعبیر کے قریب پہنچا ہے، ٹوٹ کر بکھر جائے گا۔ اردو یونیورسٹی جس کے ایکٹ میں اجمال، ابہام امکان شانہ بہ شانہ دکھائی دیتے ہیں، ایک حوصلہ مند، بالغ نظر، وسیع الخیال، فراخ شانہ، دکھائی دیتے ہیں، ایک حوصلہ مند، بالغ نظر، وسیع الخیال، فراخ شانہ، منظم، بصیرت خو، اقدامیت پیشہ اور بزرگ امیدوائس چانسلر کی طالب ہے اگر سازشی یا سیاست کے زیرِ سایہ کسی سر جھکاتے ہوئے اور تنگ حوصلہ اور پیادہ رو یا قناعت پیشہ یا سازشی اور بر خود غلط یا بے خبر اور کم سواد یا وظیفہ خوار اور سپر انداز انسان کو تعبیر، تنظیم، تحمیل اور ارتباط کا یہ عظیم الشان کام سپرد کر دیا گیا تو یونیورسٹی سکڑ کر رہ جائے گی جیسے بالی میں گیہوں کا تخم خوردہ دانہ۔

نا وقت ہواؤں سے سمٹ جاتا ہے، سکڑ جاتا ہے۔ یونیورسٹی ایکٹ نے تعمیر کا سامان فراہم کر دیا ہے یہ بات معمار (یعنی پہلے وائس چانسلر) کے ظرف پر منحصر ہے کہ وہ اس سے قصر تعمیر کرتا ہے یا گڑیا گھروندا۔ گھروندا ایک بار بن جائے تو پھر ہمیشہ گھروندا ہی رہتا ہے۔ ہمیں درکار ہے کشادہ ذہن، فلک شگاف تخیل اور آہنی عزم۔ چاپلوسوں اور سالوسوں سے خدارا ان کا یہاں گزر بھی نہ ہونے پائے۔ سب سے زیادہ یونیورسٹیوں میں اردو ادب کی تعلیم اور اس پر تحقیق ہوتی ہے بیشتر توجہ تنقید کو دی جاتی ہے۔ اردو کی تخلیقات کا غالب حصہ غزل اور افسانہ پر مشتمل ہوتا ہے۔ اردو کا رشتہ علوم کے ساتھ سید والا گہر اور ان کے رفقاء نے جوڑا تھا۔ وہ اب ٹوٹ چلا ہے۔ آگے چل کر عثمانیہ یونیورسٹی نے ثابت کر دکھایا تھا کہ اردو کے ظرف میں علوم کی سمائی ہے۔ لیکن اردو محفلوں میں علوم کی بات اب کون کرتا ہے ہماری بے حد باصلاحیت زبان علوم کے جاں بخش عمل سے محروم ہوتی جا رہی ہے اردو یونیورسٹی کی بنیاد متزلزل، اس کی وجہ وجود، اس کا سبب تاسیس صرف یہ ہے کہ اردو کا دامن پھر علوم سے بھر دیا جائے۔ اس لئے اس کی عمارت علوم یا سائنس اور ٹکنالوجی کے ستونوں پر کھڑی ہونی چاہئے۔ یہ روایت بنا لیجئے کہ اس یونیورسٹی کا وائس چانسلر زبان اور ادب کے بجائے سائنس یا علوم کا پروردہ ہوگا اور پہلے وائس چانسلر کے لئے جو یونیورسٹی کی نیو ڈالے گا، اس کی روپ ریکھا بنائے گا، اس کی تشکیل اور تعمیر کے لئے ذمہ دار ہوگا، علوم کی شرط اور زیادہ ضروری ہے۔

ساتھ ہی ساتھ ایک گروپ بنائیے جو اپنے طور پر یونیورسٹی ایکٹ کی دفعات کی تشریح کرے اور متعلقہ وزارت کو اپنی تعبیر و تشریح سے باخبر کر دے۔ ایکٹ کے تلوں میں جتنا تیل ہے سب نکالنا ہوگا۔ کسی مبصر نے کہا کہ زندہ رہنے کا ڈھنگ یہ ہے کہ "مسائل" کو مواقع میں بدل دیجئے نہ کہ اس کے برعکس۔ دیکھنا یہ ہے کہ اردو یونیورسٹی کی نیو رکھتے وقت ہم اس زرّین موقع کو مسئلہ نہ بنا بیٹھیں۔ محل یہ یونیورسٹی کی تخفیف و تحقیر اور اس پر استہزا کا ہے، نہ یہ تلاش کرنے کا کہ اس کی بنا کس نے ڈالی ہے۔ نہ ساری توانائی شادیانے

بجانے میں صرف کرنے کا۔ اس وقت، کام کرنے کا یہی ہے تمہیں کرنا ہے یہی کہ وائس چانسلری کے لئے ناموزوں ناموں کی نشان دہی کی جائے اور بالآخر جس کا انتخاب ہو اسے یونیورسٹی کو صحیح خطوط پر قائم کرنے کے لئے صحیح مشورہ دیا جائے اور رائے عامہ کی تائید سے استطاقت بخشی جائے۔ حکومت کو یہ احساس دلا دیجئے کہ اردو یونیورسٹی کی جو وسیع حوصلہ افزا روپ رکھا اس کے پہلے وائس چانسلر نے بنائی ہے اسے اردو والوں کی اجتماعی دلی اور ذہنی تائید حاصل ہے اور یہ بھی کہ اگر حکومت نے اس کے پر کترنے کی کوشش کی تو اردو یونیورسٹی کے بنائے جانے کا اردو عوام پر الٹا اثر ہوگا۔ اگر آپ نے ایسا نہیں کیا تو حکومت شیخ جامو کی بات نہیں سنے گی اور نہ اس کی شخصیت اور تجاویز کو وہ احترام دے گی جس کی وہ ہر آئینہ مستحق ہیں۔ پھر تو وزارت اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن دونوں اس پیمانہ پیکر، اس زبردست اٹھان والے دارالعلوم کی وسعتوں اور اس کے امکانوں کو تنگنائے میں بدل دیں گے اور اس کے سربراہ کی سفارشات کو اپنی بے نیازی کے ساتھ رد کر دیں گے جو وہ عام پیمانہ رد، پرانی وضع کی یونیورسٹیوں کے لئے روا رکھتے ہیں، یا پھر ایسی حوصلہ شکن تاخیر کا ہدف بنا کر چھوڑ دیں گے "ماضی میں کیا ہوا اور کیا ہوتا رہا ہے اور سرکار کی نیت کیا تھی اور کیا ہے اور یونیورسٹی کے لئے مختلف مراحل میں ہم کس کے مرہونِ منت ہیں اور ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا اہتمام نہیں تو اردو یونیورسٹی کھولنے سے کیا حاصل۔ یہ تو گاڑی کو گھوڑے کے آگے رکھنا ہوا۔" یہ ساری باتیں لایعنی ہیں، بے کار ہیں۔ ان میں پڑ کر وقتِ عزیز ضائع نہ کیجئے۔ جو کچھ آپ کو دیا جا رہا ہے۔ اسے بڑھ کر لپک لیجئے۔ اس میں جان ڈالیے، اس سے فائدہ اٹھائیے۔ تاریکی کا پیٹ چیر کر اس میں سے روشنی کی کرنیں برآمد کیجئے کہ زندگی عبادت ہی انھی سے ہے اور تابندگی کا سرچشمہ بھی یہی ہے۔

اردو لکھیئے، پڑھیئے، بولیئے اور
اپنی تہذیب و ثقافت کی حفاظت کیجئے

شاہنواز فاروقی

شہزادہ چارلس کی اسلام میں دلچسپی

اسے شہزادہ چارلس کی خوش بختی ہی کہا جائے گا کہ اب ذرائع ابلاغ میں ان کا ذکر لیڈی ڈائنا یا ان کی گرل فرینڈ کے بجائے اس حوالے سے ہو رہا ہے کہ ان کی شخصیت میں سنجیدگی کا عنصر بڑھ رہا ہے اور وہ اسلامی تعلیمات میں گہری دلچسپی لے رہے ہیں برطانیہ کے ایک اخبار کے مطابق شہزادے کے کچھ دوستوں نے یہ انکشاف کیا ہے کہ پرنس چارلس بکنگھم پیلس میں عربوں کا مخصوص لباس زیب تن کئے رہتے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ انہیں اس لباس میں (روحانی) سکون ملتا ہے۔ شہزادے کے بعض قریبی دوستوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ ان کے کتب خانے میں اسلام سے متعلق کتب کا ایک عمدہ ذخیرہ ہے اور وہ ان کتب کے مطالعے کے بعد اسلام کی عظمت کے قائل ہو گئے ہیں اور دوستوں سے ہونے والی گفتگو میں اسلام کی تعلیمات پر کھل کر بات کرتے ہیں۔ پرنس چارلس کے حوالے سے اس نوع کی خبریں عرصے سے شائع ہو رہی ہیں البتہ اس طرح کی خبروں میں اب رفتہ رفتہ ایک تواتر سا پیدا ہو چلا ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ پرنس چارلس کی صورت میں مغربی دنیا اور اسلامی دنیا کے درمیان حائل دیوار میں ایک کھڑکی کھل رہی ہے اور یہ کھڑکی دونوں دنیاؤں کے لئے سود مند ثابت ہو سکتی ہے اگرچہ اسلامی دنیا اور مغربی دنیا اب اپنی اپنی جگہوں پر موجود رہ کر خود کلامی میں مصروف نہیں۔ ان کے درمیان بہت سے پل وجود میں آ چکے ہیں لیکن بہرحال اگر شہزادہ چارلس کی صورت میں فریقین کے درمیان موجودہ دیوار میں کوئی کھڑکی کھل رہی ہے تو یہ اچھی بات ہے بلکہ ہماری خواہش تو یہ ہے کہ یہ کھڑکی رفتہ رفتہ دروازہ بن جائے۔ ایسا دروازہ جس سے آنا اور جانا دونوں ممکن ہوں۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس سے پہلے کہ یہ کھڑکی کھلے ہمیں کھڑکی سے جھانک کر اس پار کا ایک

جائزہ ضرور لینا چاہیئے۔
کسی واقعہ یا مظہر کے جائزے کا ایک اصول یہ ہے کہ وہ واقعہ یا مظہر کسی فطری ا
کے تحت یا از خود رونما ہوا ہے یا اسے رونما کرایا گیا ہے۔ اگر کوئی واقعہ از خود رونما ہوتا ہے تو
کی معنویت کچھ اور ہوتی ہے اور اگر وہ کسی کی کدوکاوش کا نتیجہ ہوتا ہے تو اس کی معنویت ک
ہوتی ہے۔ چنانچہ شہزادہ چارلس کے سلسلے میں دیکھنے کی پہلی بات یہ ہے کہ وہ اسلام سے جس د
شغف کا اظہار کر رہے ہیں وہ ان کی ذاتی تلاش کا نتیجہ ہے یا اس کی پشت پر کچھ اور محرکات
کر رہے ہیں۔ اگر اس کی پشت پر کچھ اور محرکات کام کر رہے ہیں تو ہمیں اس پر کوئی اعترا
نہیں البتہ ہمیں یہ بات ٹھیک ٹھیک معلوم ہونی چاہیئے۔ کسی بھی چیز کے سلسلہ میں خوش
یا بدگمانی میں مبتلا رہنا نقصان دہ بات ہوتی ہے۔ لاعلمی میں قائم ہونے والے رابطوں اور آگ
ساتھ قائم ہونے والے رابطوں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ یہ باتیں ہم نے اس لیے عرض کی ہیں کہ ا
باوجود کہ مغربی دنیا اسلامی ملکوں کو اپنے شکنجے میں جکڑے ہوئے ہے لیکن اس کے باوجود ا
اندیشہ ہے کہ یہ شکنجہ کسی بھی وقت کمزور پڑ سکتا ہے اور مسلم دنیا اس گرفت سے آزاد ہو
چنانچہ اس کی خواہش یہ ہے کہ مسلم دنیا کی ہر قابلِ ذکر قوت سے رابطہ رکھا جائے۔ اس مسئلہ
پس منظر ہے انقلابِ ایران نے مغربی دنیا اور خاص طور پر امریکہ کو ششدر کر رکھا ہے لیکن
بھی زیادہ اہم بات یہ ہوئی تھی کہ ایران کی قیادت اور مغربی دنیا کے مابین اور خاص طور پر امر
ساتھ ایران کے تمام رابطے منقطع ہو گئے تھے جس کا سارا نقصان امریکہ اور اس کے اتحادیوں
چنانچہ وہ چاہتے ہیں کہ تمام تر اختلافات اور دوطرفہ مسائل کے باوجود اسلامی دنیا کے ہر ملک اور ہر
تمام قابل ذکر جماعتوں اور گروہوں کی قیادت سے رسم و راہ رہے۔ جہاں تک برطانیہ کا تعلق ہے
اپنے ماضی کے تعلق سے اس سلسلہ میں زیادہ دلچسپی رکھتا ہے انگریز اپنے طویل نوآبادیاتی پس منظر
سے مسلم دنیا کو امریکیوں سے زیادہ بہتر طریقے سے جانتے ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ مسلم دنیا بالآخر
کے بنیادی اصولوں کی طرف مراجعت کرے گی جو ڈھکوسلہ مسلم دنیا میں عرصے سے چل رہا ہے وہ
زیادہ دن تک نہیں چلے گا۔ مسلم دنیا جیسے جیسے اسلام سے مطابقت پیدا کرے گی ویسے ویسے

اسلوبِ سیاست بدلے گا اور پھر اس کے ساتھ ان اصطلاحوں میں گفتگو نہیں کی جاسکے گی جن اصطلاحوں میں اب گفتگو کی جارہی ہے۔ ایسی صورت میں وہ لوگ مسلم دنیا سے بامعنی رابطہ قائم کرنے میں مددگار ثابت ہوں گے جن کا امیج ایک مذہبی انسان کا امیج ہوگا اور جن کی شہرت اسلام دوست کی ہوگی۔ چنانچہ ممکن ہے کہ شہزادہ چارلس کو ایسی ہی کسی صورت حال کے لیے تیار کیا جارہا ہو۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ محض ایک قیاس ہے اور قیاس غلط بھی ہوسکتا ہے لہذا شہزادے کی اسلام سے بڑھتی ہوئی دلچسپی کو صرف اس تناظر میں دیکھنا قرینِ انصاف نہ ہوگا۔ ممکن ہے چارلس کی اسلام سے دلچسپی مطالعے کا نتیجہ ہو لیکن عام طور پر اس نوع کی تبدیلیاں عام کتابیں پڑھنے کے بجائے کتابِ زندگی کے کئی ابواب ایسے ہیں جو انہیں اسلام کی جانب مائل کرنے کا سبب بنے ہیں۔

پہلا باب تو ان کی خانگی زندگی ہی ہے جو مایوسیوں اور ناکامیوں سے عبارت ہے۔ انسان اپنی زندگی میں بعض ایسے تجربات سے دوچار ہوتا ہے جو اسے ان سوالات تک پہنچا دیتا ہے جن کا جواب حاصل کیے بغیر انسان ایک پل بھی چین سے نہیں جی پاتا۔ انسان اپنے علم، اپنے ماحول اور اپنے مذہبی و خاندانی پس منظر سے جواب اخذ کرتا ہے۔ جواب تسلی بخش نہ ہوں تو انسان کی جستجو ان سرچشموں تک لے جاتی ہے جن پر عام حالات میں کبھی جانا پسند نہ کرتا۔ چنانچہ ممکن ہے کہ چارلس بھی ایسے ہی تجربات کے ذریعہ اور ایسے ہی سوالات کے جواب کی تلاش میں اسلام تک پہنچے ہوں۔

جہاں تک مغرب کے عام خواص و عوام کا تعلق ہے تو ان کے لئے اسلام کی پانچ چیزیں انتہائی کشش کا باعث ہیں۔

۱۔ توحید ۲۔ اسلام کے مطلق اخلاقی تصورات۔
۳۔ خاندان کی مرکزیت کا تصور ۴۔ دین و دنیا کی یکجائی
۵۔ اور اسلام کا تصورِ عدل اور تصورِ مساوات

انسان کا ایک مسئلہ یہ ہے کہ جو چیزیں اس کے پاس نہیں ہوتیں انہی میں رغبت محسوس کرتا ہے۔ مغرب کے لوگوں کے مسئلہ بھی یہی ہے وہ اسلام کے ان تصورات میں زیادہ دلچسپی لے رہے

ہیں جو ان کی زندگی میں یا تو کبھی تھے ہی نہیں اور اگر تھے تو اب ان کی زندگی سے خارج ہو چکے عقیدۂ توحید میں انہیں اس لیے کشش محسوس ہو رہی ہے کہ تثلیث کا نظریہ انہیں اپیل نہیں کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی زندگی ہر اعتبار سے انتشار اور اس حوالے سے ایک نوع شرک کا منظر پیش کر رہی ہے۔ کلیسا نے بہت سے اخلاقی تصورات کو زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کے شوق میں "اضافی" بنا دیا ہے اور اخلاقی تصورات کا معاملہ یہ ہے کہ اگر مطلق اور ناقابلِ تغیر نہیں تو پھر انہیں اخلاقی تصورات ہی نہیں کہا جا سکتا۔ اسلام کے مذکورہ باقی تین تصورات بھی مغربی دنیا کے لوگوں کے لیے اس حوالے سے باعث کشش ہیں کردہ ان تصورات سے اپنی زندگی سے عاری پاتے ہیں۔

معاملہ کے یہ تمام رخ مغربی دنیا کا مجموعی تجربہ ہیں۔ اس میں کسی عام شخص اور شہزادے کی کوئی تخصیص نہیں۔ چنانچہ ممکن ہے کہ چارلس کی اسلام سے بڑھتی ہوئی دلچسپی کا سبب یہی ہو۔

بہر حال وجہ جو بھی ہو چارلس کی اسلام دوستی کئی اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے۔ اس کی پشت پر اگر کوئی منصوبہ موجود نہ ہو تو پھر یہ اہمیت مزید بڑھ جائے گی۔

(دعوت ۱۰)

تخلیقات کی شاداب میں اشاعت کے لئے

اُنکا غیر مطبوعہ ہونا لازمی ہے

تبصرے کے لئے دو جلدوں کا آنا ضروری ہے

(ادارہ)

اردو کسی فرقے کی زبان نہیں، گجرال کمیٹی رپورٹ پر عمل درآمد ضرور، وزیر اعظم کی یقین دہانی

نئی دہلی۔ وزیر اعظم جناب اندر کمار گجرال نے کہا ہے کہ اردو کے معاملے پر گجرال کمیٹی کی رپورٹ پر عمل درآمد کا وہ تہیہ کیئے ہوئے ہیں اور یہ کہ اردو کسی طبقے یا فرقے کی زبان نہیں ہے۔

گجرال کمیٹی کی رپورٹ ۱۹۷۴ء میں منظر عام پر آئی تھی جس میں ملک میں اردو کے فروغ کے لیئے متعدد اقدامات کی سفارش کی گئی تھی۔

وزیر اعظم نے کہا کہ ملک کی کوئی مذہبی کتاب اردو یا ہندی میں نہیں ہے اور اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے۔ وزیر اعظم نے کہا کہ گجرال کمیٹی نے جو سفارشات کیئے تھے ان پر عمل درآمد کیا جائے گا انہوں نے تجویز پیش کی کہ اردو کی تعلیم کے لئے علاحدہ اسکول نہیں ہونی چاہیئے بلکہ اساتذہ کو دونوں رسم الخط آنا چاہیئے۔ انہوں نے کہا کہ کتابوں کے مضامین ایک جیسے ہونے چاہئیں گو کہ ان کا رسم الخط علاحدہ ہی کیوں نہ ہو۔ (انقلاب۔ ممبئی)

ہومیوپیتھک لیگ کی عالمی کانگریس، ڈاکٹر شمس بابر کی شرکت اور واپسی

ہومیوپیتھی علاج کے ماہرین اور محققین نے اپنے بین الاقوامی اجتماع میں اس طریقہ علاج کو دنیا بھر میں اور زیادہ مقبول، موثر اور ارزاں بنانے کے لئے کئی اہم فیصلے کیئے ہیں یہ عالمی اجتماع پچھلے ماہ سیئل (واشنگٹن) میں منعقد ہوا جس میں شرکت کے بعد ممتاز فزیشین و ہومیوپیتھ کنسلٹنٹ ڈاکٹر شمس بابر نے جدہ کو واپسی پر بتایا کہ انٹرنیشنل ہومیوپیتھک لیگ کی ۵۲ ویں کانفرنس کے اجلاس میں دنیا کے زائد از اکیس ملکوں کے سرکردہ ہومیوپیتھ کنسلٹنٹ ماہرین پریکٹیشنرز اور ریسرچرز نے شرکت کی اپنے تجربات پر مبنی پیپرز پڑھے اور باہمی تبادلہ خیالات کیا۔ امریکی انسٹیٹیوٹ آف ہومیوپیتھی کے زیر اہتمام یہ کانفرنس اٹھائیس تا یکم جون ۹۷ء منعقد ہوئی جس میں ماہرین نے عصر حاضر کے مختلف امراض کے موثر علاج کے لئے اپنے اپنے تجربات سے اجلاس کو آگاہ کیا۔ ڈاکٹر شمس بابر نے متذکرہ کانگریس میں مڈل ایسٹ کی نمائندگی کی۔ موصوف دو دہوں سے جدہ اور حال میں دبئی میں اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں

نواب پرنس محسن علیخان کو قابل فخر اعزاز

برطانوی یونیورسٹی کی اعزازی ڈگری

لندن ۔ انٹرنیشنل یونیورسٹی لندن کی جانب سے یونیورسٹی کے کیمپس واقع واٹرلو روڈ پر جلسہ تقسیم
کی ایک تقریب منعقد ہوئی جس میں دنیا کے ۲۰ ممالک کے جملہ ۸۰ گریجویٹس کو ڈگریاں عطا کی گئیں
میں چین، کولمبیا، برمودا، لندن، فرانس، جرمنی، ہونڈراس، ہندوستان، جیمکا، لبنان، الیہ
نائجیریا، پاکستان، فلپائن، روس، تھائی لینڈ، ترکی، سویڈن اور امریکہ شامل تھے اس میں ج
۴۰۰ افراد نے شرکت کی جس میں منگولیا اور سوئٹزرلینڈ کے سفیر شہزادہ و شہزادی رومانیہ، ہند
کی دیسی ریاست کی شہزادی اوشا دیوی، شہزادی ثریا ن حیدرآباد مسٹر اینڈ مسز مصطفےٰ احمد حی
مسٹر فرحان، مسٹر کریم خان، مسٹر کرشنا دت صحیفہ نگار وغیرہ شامل تھے اس تقریب کی ایک خصوص
حیدرآباد کے ایک نواب پرنس میر محسن علی خان کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری عطا کرنا ہے
کا تعلق حیدرآباد کے ایک شاہی خاندان سے ہے۔ پرنس علی خان بہت سے خیراتی اور فلاحی تنظ
سے وابستہ ہیں جن میں یونیسف خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جو ادارہ اقوام متحدہ کا ایک ذیلی ادا
ہے۔ ان کے ساتھ مسٹر اسٹینلی ایس ٹول مین کو بھی یہ ڈگری یعنی ڈاکٹریٹ آف ہیومن لیٹر
گئی ہے جو دی ٹراویل کارپوریشن کے صدر نشین ہیں۔ انہیں بھی یہ ڈگری اعزازی دی گئی ہے پرنس عا
ذیلی براعظم ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش میں امن کے لئے اپنی مساعی کے لئے سفارتی حلقوں
بہت مشہور رہیں۔ وہ بہت سے خیراتی تنظیموں اور فلاحی اداروں کے سرپرست ہیں اور اپنی ا
اقدار اور بنی نوع انسان کے تئیں ہمدردی کے لئے شہرت رکھتے ہیں وہ امن عالم کے بہت بڑے

ہیں انسان کا خیال ہے کہ جنگ سے کوئی مسائل حل نہیں ہوسکتے اور نہ یہ کسی طرح امن کا مقابلہ کرسکتی ہے۔ ان کے ان ہی خیالات کی وجہ سے شلر انٹرنیشنل یونیورسٹی نے انہیں اس اعزاز کے لئے منتخب کیا ہے۔ اس موقع پر منعقدہ ایک تقریب میں ویسٹ منسٹر ہال میں اپنی تقریر میں پرنس نواب میر محسن علی خاں نے کہا کہ انسان کو اس کے دل کی وجہ سے عزت ملتی ہے نہ کہ اس کے خیالات کی وجہ سے۔ انسان چاہے کتنی بھی ترقی کرے اور کتنے ہی قابل احترام حالات میں رہے اس کی بنیاد ایک پرامن اور مستحکم معاشرہ ہی ہے۔ پرنس خاں نے اپنی پراثر تقریر میں کہا کہ یہ یقیناً میرے لئے ایک اعزاز ہے مگر انسانیت کی خدمت انسان کے لئے سب سے بڑی خدمت ہے اور سب سے بڑا اعزاز ہے تاریخی ویسٹ منسٹر ہال جیسے اہم مقام پر جہاں دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا کے اہم قائدین نے قیام امن کے تعلق سے بات چیت کی تھی۔ انہوں نے کہا کہ وہ امن کے ایک بہت بڑے حامی ہیں۔ کیونکہ امن کے لئے خدمات انجام دینا بھی ایک جہاد ہے۔ یہی بات انہوں نے شلر یونیورسٹی میں تقسیم اسناد کے موقع پر اسی یونیورسٹی کے گریجویشن سے کہی تھی۔ طلباء اور اساتذہ کے درمیان ایک گہرے رشتہ کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ استاد کا احترام بہت اہم بات ہے اور ماں کا گہوارہ اس کا پہلا استاد ہوتا ہے انہوں نے اس موقع پر ایک حدیث بھی دہرائی کہ "ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہوتی ہے۔" اس کی تشریح کرتے ہوئے انہوں نے مزید کہا کہ خدا نے بھی ماں کو فضیلت بخشی ہے اور اسے انسان کا پہلا رہنما اور رہبر تسلیم کیا ہے۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے نواب محسن علی خاں جن کا تعلق حیدرآباد کے ایک شاہی خاندان سے ہے وہ ایک انجمن ONE NATION OF FAITH سے بھی وابستہ ہیں جس کا مقصد یہ ہے کہ مختلف اقوام جو مختلف عقائد رکھتی ہے انہیں ایک زنجیر میں جکڑ دینا چاہئیے وہ زنجیر ہے انسانیت اس تنظیم کا یہ خیال ہے کہ انسان خواہ کسی مذہب یا کسی عقیدہ کا ہو اس کا اصل محور انسانیت ہے ہمارے بنی نوع انسان ایک قوم ہے اور یہ عقیدہ جتنا عام ہوگا دنیا میں نفرتیں اور تعصب، تنگ نظری اور کوتاہ بینی اتنی ہی کم ہوگی اور امن اور سکون کا بول بالا ہوگا۔ نواب پرنس محسن علی خاں کے ان خیالات

اور شلر یونیورسٹی سے انہیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری ملنے پر ہم کو ان کے حیدرآبادی ہونے
فخر ہے اور ہم ان کی خدمت میں اہلِ حیدرآباد کی جانب سے مبارکباد پیش کرتے ہیں۔
بہت سے لوگوں اور خصوصاً اہلِ حیدرآباد کو یہ معلوم نہیں تھا کہ حیدرآباد کے شاہی
کے افراد برطانیہ جیسے ملک میں کیا کیا خدمات انجام دے رہے ہیں اور کس طرح اہلِ مغر
سے اپنی شخصیت منوا رہے ہیں　(سیاست ۲۲/۶/۱۹۹۷ء سے شکریہ کے ساتھ)

مولانا محمد علی جوہر کو بھارت رتن اعزاز عطا کرنے کی
وزیراعظم کو مولانا محمد علی جوہر اکیڈیمی نئی دہلی کا مکتوب

نئی دہلی ۲۸ مئی۔ مولانا محمد علی جوہر اکیڈمی نئی دہلی نے وزیراعظم مسٹر آئی کے گجرال کو موسوم
ایک مکتوب میں اپیل کی کہ مجاہد آزادی و بے باک اردو صحافی مولانا محمد علی جوہر کو بعد از مر
بھارت رتن کے اعزاز سے نوازا جائے۔ اکیڈیمی کے صدر ہارون رشید علی بیگ، نائب صدر راجہ
نائب صدر کرنت پوری، سکریٹری نشر و اشاعت فاروق اقبال اور جنرل سکریٹری ایم سلیم
مکتوب میں کہا کہ مجاہد آزادی اردو کے شاعر و بے باک صحافی مولانا محمد علی جوہر مرحوم جو ہندوستان
وقت کے ان ممتاز اور اچھوتے لوگوں میں سے تھے جنھوں نے اپنی زندگی ملک اور قوم کی تعمیر
کرنے کے لئے وقف کر دی تھی اور آخری سانس تک ہندوستان کو غیر ملکی طاقتوں سے رہائی دلا
جدوجہد کرتے ہوئے اور اپنی منزل پانے کے لئے جان دے دی تھی لیکن یہ عجیب ستم ظریفی اور
کی بدقسمتی ہے کہ ہم نے ملک پر احسان کرنے والے دیگر لوگوں کی طرح مولانا محمد علی جوہر کو بھی بھ
۱۹۳۰ء میں مولانا گول میز کانفرنس لندن میں ہندوستان کا مقدمہ لے کر گئے تھے جہاں انہوں نے کہا
مجھے ہندوستان کی آزادی کا پروانہ دو یا دو گز زمین قبر کے لئے دو کیونکہ میں غلام ہندوستان واپس جا
جا ہتا۔ مولانا کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ کی رب نے لاج رکھی اور ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو مولانا کا
میں انتقال ہوگیا۔ ۵ جنوری کو انہیں بیت المقدس (یروشلم) میں دفنایا گیا۔ آزادی کے بعد
بعد تک بھی عوام مولانا کا نام لیتے ہوئے خوف محسوس کرتے تھے۔ اسی بات کو خیال میں رکھتے ہوئے ایک

کے طور پر ۴ ۱۹۷ء میں مولانا کے شہر رامپور (یوپی) میں مولانا محمد علی جوہر اکیڈیمی کے نام سے
ایک ادارہ قائم ہوا۔ اس کے بعد ۱۹۸۲ء سے دلی میں یہ اکیڈیمی مولانا کی یاد کو قائم رکھے ہوئے ہے
۱۹۸۹ء میں اکیڈیمی نے صحافت، اُردو شاعری، ادب، سماجی خدمات، قومی سیاست اور پبلیکیشن
سے متعلق ملک کے منتخب لوگوں کو مولانا کے نام سے موسوم ایوارڈ سے سرفراز کرنے کا سلسلہ شروع
کیا۔ ۱۹۸۹ء سے ۱۹۹۳ء تک یہ ایوارڈ آنجہانی گیانی ذیل سنگھ سابق صدر جمہوریہ ہند کے دست
مبارک سے دئے گئے۔ اور ایوارڈ کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ مولانا محمد علی جوہر اکیڈیمی کو یہ فخر
بھی حاصل ہے کہ موجودہ وزیر اعظم جناب اندر کمار گجرال بھی ۱۹۹۳ء میں آنجہانی گیانی ذیل سنگھ جی
کے دست مبارک سے قومی سیاست کا ایوارڈ حاصل کر چکے ہیں۔ یہ اکیڈیمی جناب اندر کمار گجرال
کو ملک کا وزیر اعظم بننے پر دلی مبارکباد پیش کرتی ہے اور یہ اُمید کرتی ہے کہ گجرال صاحب کے دور اقتدار
میں مجاہد آزادی مولانا محمد علی جوہر کو ان کی ملک کے لئے قربانیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے بھارت رتن
کے خطاب سے سرفراز کیا جائے۔ مولانا جس کے صحیح حقدار بھی ہیں۔ سرکار کے ذریعہ دیا جانے والا یہ
ایوارڈ مولانا کے نام سے قائم اس اکیڈیمی کو دیا جائے۔ اس کے علاوہ اکیڈیمی حکومت سے یہ مطالبہ بھی
کرتی ہے کہ مولانا کی ایک بڑی تصویر پارلیمنٹ کے سنٹرل ہال میں لگائی جائے اور مولانا کے یوم پیدائش
۱۰ ڈسمبر یوم وفات ۴ جنوری کو سرکاری طور پر منایا جائے۔ حکومت کی طرف سے مولانا مرحوم کو
بھارت رتن کے اعزاز سے نوازنا ایک مجاہد آزادی کو صحیح معنوں میں خراج عقیدت ہوگا۔●

اردو میں حلف دلانے سے انکار پر اسپیکر یوپی کیخلاف مظاہرہ

لکھنو۔ محبانِ اُردو کی مختلف تنظیموں نے سماج وادی پارٹی کے ۲ ارکان اسمبلی کو اُردو میں حلف
دلانے سے اسپیکر یوپی قانون ساز اسمبلی کے انکار پر بطور احتجاج ریاستی اسمبلی (ودھان سبھا) کے سامنے اُردو
رابطہ کمیٹی کے بیانر پر احتجاجی مظاہرہ کیا دھرنا کی قیادت ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد نے کی۔ جس میں اُردو کی
تقریباً پچاس تنظیموں نے حصہ لیا۔ کمیٹی نے انتباہ دیا کہ اگر ان ارکان مسٹر عالم ہادی اور مسٹر وسیم احمد کو اُردو
میں حلف نہ دیا گیا تو اس مسئلہ کو نمایاں کرنے کے لئے دہلی میں دھرنا منظم کیا جائے گا۔

مسز سیدہ فرح صبا زیب (حال مقیم کمپالا)

سید امیر حیدر عابدی

افریقہ میں تدریسی خدمات

آج دنیا کے سیاسی، معاشی، سماجی اور سائنسی میدانوں میں جس تیز رفتاری سے آگے بڑ
اس کا انسان کو آج سے پچاس سال پہلے قطعی علم نہیں تھا مگر اب دنیا مختصر ہو کر ایک گا
سی شکل اختیار کر گئی ہے جہاں ہر شخص ہر دوسرے شخص سے واقف ہوتا ہے رسل و رسائل
ٹکنالوجی نے دنیا کے تمام تر انسانوں کو جیسے ایک چھوٹے سے گاؤں میں لاکر رکھ دیا ہے۔ ان تما
معاملات کا نتیجہ ہے بین الاقوامی سطح پر مقابلہ۔ اب اکیسویں صدی میں مقابلہ سائنس، ٹکنا
اور علم کے میدان میں ہوگا۔ ہر شخص کو اس حقیقت کا احساس ہونا چاہیئے۔ عابدی فیملی اس نئے
کو تسلیم کرتی ہے اور اپنی تمام تر وسائل کو اپنی ایک تعلیمی حصول پر خرچ کرنے سے مطمئن ہے
صاحب کے تین بچے کینز، محمد اور علی یوگینڈا کے سرکاری اسکولوں میں تعلیم پانے کے بعد اب یو
میں پہونچ چکے ہیں۔ دختر کینز عابدی، میکسریرا یونیورسٹی کے میڈیکل اسکول میں فارمیسی کی ڈ
کر رہی ہیں اور اب تیسرے سال میں ہیں۔ میکسریرا یونیورسٹی ۷۵ سال پہلے ۱۹۲۲ء میں قائم
تھی اور اس پورے علاقہ مشرقی، جنوبی اور مرکزی آفریقہ کی سب سے مشہور یونیورسٹی ہے
محمد حیدر عابدی مئی کے مہینے میں لوسیانہ اسٹیٹ یونیورسٹی امریکہ سے کمپیوٹر انجینیرنگ اور کمپ
سائنس کے ڈبل میجر کے ساتھ ڈگری حاصل کر رہے ہیں اور چھوٹے بیٹے علی حیدر عابدی کیمیکل
انجینیرنگ کے تیسرے سال میں امریکہ ہی میں زیر تعلیم ہیں اور پیٹرولیم انجینیرنگ میں اسپیلائزیشن
کا ارادہ رکھتے ہیں۔ عابدی صاحب یونیورسٹی میں پروفیسر ہونے کے ناطے صرف تعلیم پانے اور
کرنے کے مشاغل کے علاوہ ایڈمنسٹریشن کی بھاری ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہیں۔ وہ اسیٹ

اسکول آف لائبریری اینڈ انفارمیشن سائنس کے ڈائرکٹر ہیں ۔ میکسر ایپر یونیورسٹی پریس کے چیرمین بھی ہیں۔ یہ پریس یونیورسٹی کی علمی کتب شائع کرنے کے لئے ذمہ دار ہے یونیورسٹی سینٹ اور وائس چانسلرس ایڈوائزری کمیٹی کے ممبر بھی ہیں۔ ڈین اور ڈائرکٹرس کی مرکزی کمیٹی کے ممبر ہیں ۔ یونیورسٹی کی اور بہت سی اہم کمیٹیاں ہیں کہ جہاں وہ مختلف حیثیتوں سے خدمت انجام دے رہے ہیں یونیورسٹی کے بورڈ آف کمرشیل یونٹ کے ممبر بھی ہیں۔ اس کمیٹی کا کام یونیورسٹی کے گیسٹ ہاؤس بک شاپ، یونیورسٹی پیرنٹری، یونیورسٹی بیکری، یونیورسٹی ٹکنالوجی کنسلٹنسی کمیٹی وغیرہ کے انتظامات کی دیکھ بھال، مختلف بین الاقوامی اداروں اور قومی اداروں میں مشیر کے طور پر طلب کیئے جانے کے علاوہ چھ کتابوں اور سو سے زیادہ مقالوں کے مصنف بھی ہیں یہ ان کی Hobby ہے۔ اردو شاعری سے لطف اندوز ہونا اور پیراکی ہے اور بد قسمتی سے ان دونوں خواہشات کی تکمیل اس ملک کے ماحول میں اور کچھ مصروفیات کے سبب اور کچھ اردو داں طبقہ کی غیر حاضری کے سبب ممکن نہیں ہو پاتی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ہندوستان کے ماحول میں کم سے کم ان کا اردو ذوق ضرور سکون پا سکے گا اگر ہندوستانیوں نے اردو کو زندہ رکھا۔ مسٹر عابدی کی ان تمام کامیابیوں کا سہرا ان کی شریک حیات مسز عابدی کو جاتا ہے

(سیاست ۱۴/۵/۱۹۷۶ء) ملخص

دوحہ قطر میں حفظ قرآن کا مقابلہ، دس لاکھ روپیے کا انعام اول

یکم اپریل کی شام دوحہ کی مشہور و معروف ہوٹل شیراٹون میں حفظ قرآن کے چوتھے سالانہ مقابلے میں کامیاب حفاظ کرام کے لئے تقسیم انعامات کی پر وقار تقریب منعقد کی گئی جس میں شہر کے معزز و معروف شخصیتوں نے شرکت کی۔ حفظ قرآن کا یہ عظیم الشان مقابلہ گذشتہ چار سال سے پابندی کے ساتھ منعقد کیا جا رہا ہے۔ مستحق حضرات کو جامعہ ازھر سے خاص طور پر بلایا جاتا ہے۔ اس سال جملہ ۸۹۱ مرد و خواتین نے اس میں حصہ لیا جس میں پورے تیس پاروں کے حفاظ کرام کی تعداد ۳۲۵ رہی جن میں مرد حضرات کی تعداد ۲۹۹ اور خواتین کی تعداد ۳۳ رہی۔ جہاں دس سال سے کم عمر کے ۱۳ حفاظ کرام شریک مقابلہ رہے ہیں ۔ ۶ سال کی عمر والے ۱۲ اور ۷ سال کی عمر والے ۱۲ حفاظ کرام نے بھی اس

میں حصہ لیا۔ اس مقابلہ میں حصہ لینے والوں کا تعلق میزبان ملک قطر کے علاوہ اردن، سوڈان، الجیریا، ایران، ہندوستان، کیمرون، امریکہ، یمن، فلسطین، لیبیا، موریطانیا، پاکستان، نیپال، ایتھوپیا، چڈ، شام، مصر، مراکش، صومالیہ، بنگلہ دیش، سینگال اور گامبیا سے تھا جس میں سب سے بڑی تعداد بنگلہ دیش کے حفاظ کرام کی ۲۰۹ رہی، دوسرے نمبر پر مصری حفاظ کی تعداد ۱۱۷ اور پاکستان کے ۸۹ حفاظ تھے۔ ہندوستانی حفاظ ۲۳ شریک مقابلہ رہے۔

حفظ قرآن کا یہ مقابلہ تین مرحلوں میں مشتمل تھا۔ تیسرے مرحلے کے لئے ۳۰ حفاظ کرام کا انتخاب کیا جاتا ہے ان تینوں مرحلوں میں مجموعی کارکردگی کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان حفاظ کرام کی ۱۳۰ درجہ بندی کی جاتی ہے اور پہلے تین درجات کے خوش نصیبوں کو بالترتیب ۵۰ ہزار ریال نقد اور ایک موٹر کار، ۴۰ ہزار ریال نقد ایک کار اور ۳۰ ہزار ریال نقد اور کار انعام میں دیئے جاتے ہیں جو بالترتیب مصر، پاکستان اور صومالی حفاظ نے حاصل کیا۔ چوتھا، پانچواں اور چھٹا درجہ پانے والے حفاظ کرام کو بالترتیب ۲۰ ہزار ریال، ۱۵ ہزار ریال اور ۱۰ ہزار ریال نقد دیئے جاتے ہیں اس کے علاوہ ۳۰ ویں رینک کے حفاظ کو مختلف نقد انعامات سے نوازا جاتا ہے۔ جس میں آخری انعام تقریباً ۸ ہزار ریال کا ہوتا ہے۔ جو اب کے سال ہندوستانی حافظ جناب خورشید انور قطب الدین نے حاصل کیا۔ اس سال کامیاب ہونے والے ۳۰ حفاظ کرام کا تعلق مصر، پاکستان، صومالیہ، یمن، بنگلہ دیش، قطر، ایران اور ہندوستان سے تھا۔ ہندوستانی حفاظ کرام کے کمزور مظاہرہ کے بارے میں ایک استفسار پر ایک ذمہ دار نے بتایا کہ ہندوستانی حفاظ اچھے ہوتے ہیں مگر تجوید کے معاملے میں مصری حفاظ کرام سے مقابلہ نہیں کر پاتے اور ایسے بین الاقوامی مقابلہ کے مراحل ان کے لئے دشوار کن ثابت ہوتے ہیں۔

محمود شکیل (سیاست ۴/۵/۹۷ء)

نمونے کی کاپی کیلئے دس روپئے کے ڈاک یا جواب طلب امور کیلئے جوابی لفافہ ساتھ
ٹکٹ آنا ضروری ہے میں روانہ فرمائیے۔

جناب سعود احمد خاں شیروانی کا انتقال پُرملال

خاندان شیروانی کے چشم و چراغ جناب پروفیسر ہارون خان شیروانی مرحوم کے فرزند اصغر سابق حبیب بنک اور موجودہ اسٹیٹ بنک آف حیدرآباد کی مختلف شاخوں سے وابستہ اہم خدمات پر فائز جناب سعود احمد خان شیروانی کا انتقال پُرملال حیدرآباد ۲۵ رمئی ۱۹۹۷ء کو بوقت ظہر مرحوم کی حالیہ خریدی رہائش گاہ "شمس ولا" بہادر یار جنگ کالونی قادر باغ مہدی پٹنم میں بعمر ۷۲ سال ہو گیا۔ مرحوم کی شخصیت ہر اس ماحول پر چھائی رہتی تھی جس میں سعود احمد خان شیروانی کارکرد اور نمایاں رہتے تھے۔ مرحوم کے دور ملازمت میں اُن کی بہتر خدمات کا اسٹیٹ بنک آف حیدرآباد کے اعلیٰ عہدیداروں نے اعتراف کیا ہے۔ مرحوم کے بنک کی مستقر کی برانچس جنگاؤں، پدا پلی وغیرہ وغیرہ پر خدمات انجام دیں۔

سعود احمد خان شیروانی مرحوم کی پیدائش آبائی قصبہ دانا ولی ضلع علیگڈھ میں ۱۵ رستمبر ۱۹۲۴ء کو ہوئی۔ جہاں جناب پروفیسر ہارون خان شیروانی مرحوم اور اُن کی اہلیہ محترمہ قیام پذیر تھیں۔ کچھ عرصہ بعد محترم پروفیسر ہارون خان شیروانی مرحوم معہ افراد خاندان اور نوزائیدہ سعود احمد خان شیروانی کے ہمراہ حیدرآباد وارد ہوئے اور یہاں جنرل احمد اشرف مرحوم کے مکان موقوعہ دامنِ نوبت پہاڑ میں مقیم رہے اور پروفیسر شیروانی مرحوم کی ملازمت بحیثیت صدر شعبۂ تاریخ و سیاسیات جامعہ عثمانیہ کے دوران جناب سعود احمد خان شیروانی اپنے برادر بزرگ جناب مصطفیٰ کمال شیروانی اور ہمشیرہ محترمہ کے ہمراہ ابتدائی تعلیم میں مشغول رہے۔ ۱۹۴۴ء کے حبیب وھلک پلیگ جو حیدرآباد میں جاری تھا اُس سے سعود شیروانی مرحوم بھی متاثر ہوئے اور تقریباً جانکنی کی حالت میں ڈاکٹروں نے نقل سکونت کا مشورہ دیا اور نواب عسکر یار جنگ مرحوم، مشیر قانونی حکومت نظام حیدرآباد نے اپنا میر محمود صاحب کی پہاڑی پر واقع مکان پروفیسر شیروانی صاحب کے حوالے کیا جہاں قیام سے سعود احمد خان شیروانی

مرحوم کو تبدریج افاقہ ہوا اور بعد ازاں وہ سابق رہائش گاہ منتقل ہو گئے۔ ۱۹۳۸ء میں جب
پروفیسر شیروانی مرحوم آٹھویں کل ہند تاریخی کانگریس کے اجلاس منعقدہ زیورچ (سوئٹزرلینڈ)
تشریف لے گئے اُس وقت صاحبزادوں اور صاحبزادیوں کو علیگڈھ مسلم یونیورسٹی اسکول،
زنانہ کالج میں شریک کرادیا گیا۔ سعود شیروانی مرحوم علیگڈھ سے الف اے میں کامیابی
کے بعد ۱۹۴۴ء میں حیدرآباد واپس آگئے اور یہاں جامعۂ عثمانیہ سے بی اے کامیاب کر
کے بعد اُس دور کی حبیب بنک ہیڈ کوٹی برانچ میں مامور ہو گئے۔ پولیس ایکشن کے بعد
جب حبیب بنک کے عہدہ دار اور اسٹاف اسٹیٹ بنک آف حیدرآباد میں ضم کر لیئے گئے
سعود شیروانی بھی اسٹیٹ بنک آف حیدرآباد کی اہم خدمات پر مامور رہے اور بنک
کے مختلف مستقر برانچس پر خدمات بحسن خوبی انجام دینے کے بعد ۱۹۷۹ء میں وظیفہ
حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔

مرحوم کی شخصیت ایک مخیر دیندار، خدا ترس حیثیت کی حامل تھی اور مخ
رفاہی اداروں سے مرحوم لمحۂ آخر تک وابستہ رہے جن میں تعمیر ملت، اقبال اکیڈ
قابلِ ذکر ہے

سعود احمد شیروانی مرحوم علیگڈھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز اسوسی ایشن حیدرآبا
کے تین میقاد تک خازن رہے۔

آخر عمر میں دمہ جیسے مرض کا شکار ہوئے جس میں ٹی بی کی وجہ سے مزید پیچید
پیدا ہو گئی تھی۔ اور بالآخر ۲۵ مئی ۱۹۹۷ء کو یہ ملت کی خاموش خدمت گذار شخصیت
اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہو گئی۔

پسماندگان میں بیوہ اور سوگوار خاندان کے افراد شامل ہیں۔

کل من علیھا فان و یبقیٰ وجہ ربک ذوالجلیل
والاکرام ▲ [سعود احمد شیروانی کا قلمی تعاون ماہنامہ شاداب کو حاصل رہا۔
مرحوم کے کئی مضامین شاداب میں شائع ہو چکے ہیں] (ادارہ)

ممتاز عثمانین ڈاکٹر محمد یوسف الدین کا انتقال

حیدرآباد۔ علوم اسلامیہ کے بلند پایہ عالم ممتاز ادیب و محقق ڈاکٹر محمد یوسف الدین سابق صدر شعبہ مذہب و ثقافت جامعہ عثمانیہ کا طویل علالت کے بعد ۱۳ رمئی کی رات حالت نیند میں ان کے مکان واقع ترپ بازار میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر ۸۲ برس کی تھی۔ نمازہ جنازہ مسجد مالاکنڈ معظم جاہی مارکٹ میں ادا کی گئی اور تدفین احاطہ درگاہ حضرات یوسفین رح نامپلی میں عمل میں آئی۔ ڈاکٹر محمد یوسف الدین کا شمار ممتاز عثمانین میں ہوتا تھا۔ انہوں نے علامہ مناظر احسن گیلانی، پروفیسر انور اقبال قریشی اور ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی نگرانی میں اسلام کے معاشی نظام پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے اولین ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے والوں میں ان کا شمار تھا۔ وہ کئی بلند پایہ کتابوں کے مصنف و مرتب اور اردو، انگریزی، عربی، فارسی اور ترکی کے عالم تھے وہ انسٹی ٹیوٹ آف انڈو مڈل ایسٹ کلچرل اسٹڈیز اکاڈیمی آف اسلامک اسٹڈیز اور ڈاکٹر سید عبداللطیف قرآنک سوسائٹی کے معتمد تھے ڈاکٹر لطیف کے انگریزی ترجمہ قرآن اور ان کی دوسری کتابوں کی اشاعت میں وہ ڈاکٹر لطیف کے دست راست رہے۔ ۱۹۷۵ء میں وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہونے کے بعد بھی وہ اپنی وفات تک علمی ادبی کاموں میں مصروف رہے انہوں نے ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی تین کتابیں شائع کی تھیں۔ سیرت عثمان غنی رضہ پر ان کی ایک کتاب ابھی حال ہی میں شائع ہو کر بڑی مقبول ہوئی۔ آخری ایام تک وہ حضرت زید بن علی بن امام حسین رض کی تفسیر قرآن کی اشاعت میں مصروف تھے ڈاکٹر محمد یوسف الدین نے حج و زیارت کے علاوہ بغداد، دمشق، مصر بیت المقدس اور ترکی کا بھی علمی سفر کیا۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ چار لڑکیاں ہیں۔ ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال ریڈر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی مرحوم کے بھتیجے اور داماد ہیں۔

جناب افضل خان ناغڑ کو خراج عقیدت

حیدرآباد ــــ اراکین انتظامی کمیٹی جامع مسجد ابن صاحب ترپ بازار کی جانب سے منعقدہ ایک تعزیتی اجلاس میں جناب محمد افضل خان ناغڑ کے انتقال پر دکھ کا اظہار کرتے ہوئے ان کی خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔

ڈاکٹر مجید بیدار

حسینی جاوید

دیدہ زیب وجامہ زیب صوفی منش صحافی

سادات کی شانِ بے نیازی کے باوجود ہر کام دلچسپی سے انجام دینے اور اپنے کام سے ایک نئی روایت کا آغاز کرنے والے سید شاہ علی اکبر محمد محمد الحسینی الحسنی چشتی البرقی المعروف حسینی جاوید (مرحوم) کا مسلک انسانیت دوستی تھا۔

اگرچہ وہ حضرت سید محمد محمد حسینی بندہ نواز گیسو درازؒ کے خانوادے سے تعلق رکھتے تھے اور اس خاندان کے طرۂ امتیاز یعنی قلم سے دوستی کا حق بھی ادا کرتے رہے۔ لیکن استغنا کا یہ عالم تھا کہ کبھی خود کو ادیب یا قلمکار کی حیثیت سے متعارف نہیں کروایا۔ تاہم جس موضوع پر بھی لکھا اس کا حق ادا کر دیا۔ ادب سے رغبت رہی لیکن صحافت کی خدمت کی۔

ابتدا میں اورنگ آباد کے روزنامہ "آج" سے وابستہ رہے پھر حیدرآباد کے مشہور روزنامہ رہنمائے دکن سے وابستہ ہو گئے تھے۔ ادب اور صحافت سے دلچسپی کے ساتھ ساتھ مذہب سے رغبت کا ذوق انہیں اپنے والدِ محترم سے ملا تھا۔ ان کے والد بزرگوار حضرت ابوالفیض سید شاہ معین الدین من اللہ محمد محمد الحسینی چشتی البرقی فیض مرحوم نے ابوالحسن تانا شاہ قطب شاہی آخری تاجدار کے پیر و مرشد حضرت شاہ راجو قتال حسینی کی فارسی کتاب "آداب المریدین" کا اردو ترجمہ کیا تھا۔ خود حسینی جاوید نے کافی محنت اور تحقیق کے ساتھ بندہ نوازی سلسلہ کے بزرگانِ دین کے حالات اور شجرے جمع کیے تھے جن سے ان کی علم دوستی اور تحقیقی مزاج کا پتہ چلتا ہے مزاح نگاری میں ان کا قلم خوب چلتا تھا۔ خوبرو تو تھے ہی، خوش پوشی کے ساتھ خوش مزاجی کا ایسا ثبوت دیتے کہ اپنے مخاطب کو لاجواب کر دیتے۔ کسی کا دل نہ دکھانا ان کی فطرت تھی۔ چنانچہ جب مرہٹواڑہ وقف بورڈ کی

"وقف بلیٹن" جاری کیا تو مشاورتی بورڈ میں شامل افراد کے نام کی ترتیب کو حروف تہجی کے اعتبار سے طبع کیا تاکہ تقدیم و تاخیر کی بنا پر کسی کی دل شکنی نہ ہو۔

حسینی جاوید بڑے رکھ رکھاؤ کے انسان تھے شہر میں مہمان آجائے تو اس کی ضیافت اور اس کے اعزاز میں نشست کا اہتمام جیسے ان کے فرائض میں داخل تھا۔ چنانچہ بوگس حیدرآبادی کی آمد پر اپنے مکان پر مشاعرہ کا نظم کیا۔ خواجہ شوقی کی اورنگ آباد پہلی بار آمد پر ڈاکٹر جلیل مرحوم کے مکان پر شعری نشست کا اہتمام کیا۔ اسی طرح ڈاکٹر گوڈر شاہی اور دوسرے ادیبوں اور شاعروں کی شہر میں آمد پر مخصوص نشستوں کا اہتمام کرکے انہوں نے اپنی ادب دوستی کا ثبوت دیا جبکہ شہر کے بااثر لوگ بھی اس فریضہ کی انجام دہی سے قاصر رہے۔

خدا نے حسینی جاوید کو منتظمانہ صلاحیتوں سے نوازا تھا، جسے وہ ہر موقع پر ضرور بروئے کار لاتے تھے۔ ہر وقت مسکراتا ہوا چہرہ اور جامہ زیبی کے ساتھ جب محفلوں میں آتے تو اپنی وجاہت اور گل افشانی کی وجہ سے پہچان لیئے جاتے تھے چھوٹے سے لے کر بڑے تک، عہدیدار سے لے کر چپراسی تک ہر ایک کو خوش کرنے اور خوش رکھنے کا گر انہیں خوب آتا تھا، اسی لیئے ان کے دوستوں کی تعداد زیادہ تھی۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ ان کا کوئی دشمن نہیں تھا۔ صحافت سے وابستگی کے نتیجہ میں پیشہ وارانہ چشمک ضرور پیدا ہو گئی تھی اور وہ اپنے مخالفین کو نہ صرف جانتے بلکہ ان کی ہر حرکت کو پہچانتے تھے۔ اپنے دشمنوں کی ہر حرکت سے باخبر رہنے میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا علم جفر اور علم ہندسہ میں انہیں ید طولیٰ حاصل تھا ہمیشہ احباب کا ایک بڑا حلقہ ان کے ساتھ ہوتا۔ ریلوے اسٹیشن پر واقع اپنے مکان سے تنہا نکلتے اور شہر پہنچتے پہنچتے کثیر احباب ان کے ہمراہ ہو جاتے۔

شہر میں وہ کبھی متنازعہ شخصیت نہیں رہے بلکہ حسینی جاوید کی یہ خوبی تھی کہ متنازعہ مسائل سے کو بڑے سلیقے سے باہر نکال لیا کرتے تھے۔ مولانا مودودی کے ایک مضمون میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے واحد متکلم کے صیغہ کے استعمال پر بحث کا آغاز ہوا تو انہوں نے حوالے تو ضرور فراہم کیئے لیکن اپنی ذات کو اس تنازعہ سے الگ رکھا۔ حق گوئی میں وہ بڑے بے باک تھے لیکن صوفیانہ مزاج کے نتیجہ میں لوگوں کی بد اخلاقی پر چراغ پا ہونے کی بجائے معاف کر دیا کرتے تھے۔

دل کی سادگی لبوں پر آکر گالوں پر چمکتی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے چہرہ نہ ہو بلکہ مدھم روشنی کا ایک ہالا ہو جو دیکھنے والوں کو متاثر کرتا ہے گھنگھریالے بال، ایک دوسرے میں پیوست سیاہ بھنویں، سرخ متوالی آنکھیں، ستواں ناک، ہمیشہ تابناکی دکھاتے ہوئے گال سرخ ہونٹ اور ٹھوڑی چاہ زنخداں لیئے ہوئے گھنی مونچھیں اور ڈاڑھی سے بے نیاز صاف ستھرا چہرہ۔ دل کے انتہائی سادہ اور فقیر منش، سائل کو کبھی خالی ہاتھ جانے نہیں دیتے تھے۔ قد اور صحت کو دیکھ کر کبھی اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا تھا کہ اس قدر پیاری شخصیت اور صحت مند جسامت والا انسان کبھی بیمار بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن جب بیماری نے گھیراؤ کیا تو انہیں کھوکھلا کر کے چھوڑ دیا اس قدر وجیہہ اور پُر نور شخصیت کو کینسر کے مہلک مرض نے کہیں کا نہیں رکھا۔

اعتدال پسند مزاج کے مالک ہونے کے علاوہ صبر و استقامت ان کی شخصیت میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ بغیر کسی ملازمت کے وہ برسہا برس تک اورنگ آباد میں رہے لیکن کبھی کسی سے اپنی معاشی بدحالی کا ذکر تک نہیں کیا۔ دوسروں کی مدد کرنے میں وہ بڑے فراخ دل واقع ہوئے تھے۔ سیدزادے جو تھے، نرم دلی فطرت کا حصہ تھی۔ چنانچہ کسی کی بے چینی دیکھ کر خود بے چین ہو جاتے تھے۔ مدد اور تعاون کا جذبہ ان کی فطرت میں رچ بس گیا تھا۔ خلوص کا پیکر تھے۔ محبت بانٹتے اور پیار وصول کیا کرتے تھے خدا نے جس قدر فیاضی بخشی تھی اسے لٹاتے پھرتے تھے۔ علمی و ادبی حلقوں کے علاوہ مذہبی، سیاسی اور صحافتی حلقوں سے ان کی وابستگی بڑی منصفانہ تھی۔ ہر معاملہ میں انصاف کو اپنا معلم بنایا کرتے تھے یہی وجہ رہی ہے کہ ناانصافی کے خلاف ہمیشہ لڑتے رہے۔ اپنی پُر وقار شخصیت سے لوگوں کے دلوں میں جگہ بناتے رہے۔ اورنگ آباد کے ادبی ماحول میں ان کی وجہ سے رونق تھی۔ اس شہر کو خیرباد کہہ کر جب، دوبارہ اپنے وطن میں سکونت اختیار کی تو اس سے اس قدر لپٹے رہے کہ اسی کے پیوندِ خاک بننا پسند کیا اور نگ آباد کی پتھریلی زمین کے باسیوں سے انہیں کئی قسم کی شکایتیں تھیں لیکن کبھی انہیں نوکِ زبان پر نہیں لایا۔ گلہ شکوہ ان کی فطرت کا خاصہ نہیں تھا۔ اورنگ آباد کی ادبی فضا میں کئی سال تک خاموشی کے بعد کامیاب مشاعرہ منعقد کروایا تو کہا کہ مشاعرہ کامیاب کروانے کا گر کوئی حیدرآبادیوں سے سیکھے۔

کینسر کے حملے نے انہیں رفتہ رفتہ نحیف کر دیا تھا۔ گھومتی ہوئی آنکھیں ہی شخصیت کا محور بن کر رہ گئی تھیں۔ ٹکٹکی باندھے ہر آنے جانے والے کو دیکھتے رہتے، کسی سے کچھ نہیں کہتے۔ سمندر جیسا سکوت اور ویرانے جیسی خاموشی ان کی طبیعت میں سرایت کر گئی تھی اور اسی (دیکھی نہ بولتی ہوئی خاموشی) نے انہیں یکشنبہ ۱۳ر اپریل ۱۹۹۷ء کو ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا۔

اب بھی ایسا لگتا ہے کہ وہ آنکھیں اورنگ آباد کے ادبی اور صحافتی سفر کی نگرانی کر رہی ہیں کھلی ہوئی باخبر آنکھیں، جنھوں نے اورنگ آباد سے اپنے ادبی اور صحافتی سفر کا آغاز کیا۔ اب بھی منتظر نظر آتی ہیں کہ کوئی آگے بڑھ کر ان کی ڈگر کو اختیار کرے اور ان کے راستوں پر چلتے ہوئے منزلِ مقصود پر پہنچے۔

حسینی جاوید کی ان منتظر آنکھوں کا جواب یہاں کا ادبی اور صحافتی حلقہ دے سکتا ہے۔ وہ تو گذر گئے لیکن ہم ان کی خدمات کو خراج پیش کرتے ہوئے بے بسی کے عالم میں کہہ اٹھتے ہیں

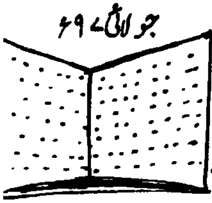
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

***

—: (بقیہ سلسلہ پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری) :—

اور اس کی بقاء کے لئے نسبت مصطفوی صلعم کی پختگی کا درس دیا۔ پروفیسر محمد طاہر القادری راسخ العقیدہ، حنفی المذہب ہونے کے باوجود جدید قانونی، اقتصادی، سیاسی اور بین الاقوامی مسائل میں قرآن و سنت کی روشنی میں اجتہاد کے قائل ہیں۔ آپ امت مسلمہ کے اتحاد کی سخت ضرورت محسوس کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ گروہی، مسلکی یا فرقہ وارانہ نزعات سے بلند ہوئے بغیر اسلام کے نشاۃ احیاء کا کام ممکن نہیں۔ پروفیسر صاحب کی تمام دینی خدمات آپ کی جملہ تصانیف تقاریر و خطبات کے کیسٹ وغیرہ سب کچھ وقف فی سبیل اللہ ہیں۔ آپ ان میں سے کسی شئے کا کوئی بھی معاوضہ، مشاہرہ یا کمیشن وغیرہ نہیں لیتے۔ ادارہ منہاج القرآن کی سرپرستی بھی اسی طرح آپ کی فی سبیل اللہ خدمت ہی کا ایک حصہ ہے





ماہنامہ
نصب العین
ادبی جالنہ

مدیر : وسیم اشفاق

پتہ : ڈان پرنٹرس مہلا اسٹریٹ قدیم جالنہ مہاراشٹرا

تبصرہ نگار : پروفیسر لطیف احمد سبحانی

تبصرے کے لئے کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری

شہر جالنہ چند نمائندے شعرا کی وجہ سے مہاراشٹرا میں جانا جاتا ہے اس سنگلاخ زمین سے ایک ادبی ماہنامہ "نصب العین" کا پہلا شمارہ جاری ہوا جو واقعی تعجب خیز بلکہ جوئے شیر لانے سے بھی زیادہ دشوار کام ہے۔ جالنہ جیسا شہر جہاں وسائل کی کمی۔ پریس کی دشواریاں، کاغذ کی گرانی، طباعت کی کمی، مالی اعانت کی مشکلات، نامساعد حالات کے باوجود اس قدر معیاری اور دلچسپ رسالہ کو جاری کرنا پُرخار جھاڑیوں سے گزرنا ہے۔ "نصب العین" ایڈیٹر کے کوہ شکن عزائم کی نشاندہی کرتا ہے۔

اس رسالہ سے مدیر وسیم اشفاق اور مدیر اعزازی عبدالرحیم ارمان کی اردو نوازی اردو پرستی، اردو دوستی اور اردو سے انسیت کا اظہار ہوتا ہے یوں تو اردو کے ادبی رسالوں کی کساد بازاری عام ہے۔ کسی بھی رسالے کا پابندی سے چلنا بے انتہا دشوار مرحلہ ہے۔ اس سے پہلے مرہٹواڑہ سے حضرت تاج کا ماہنامہ "نقش نو" اورنگ آباد مولانا آزاد کالج کا سہ ماہی غبار خاطر روزنامہ ڈان اورنگ آباد، بلند عزائم، بڑی شان و شوکت، بڑے آب و تاب سے جلوہ نما ہوئے تھے۔ لیکن بہت جلد ہی بند ہو گئے۔

بہترین طباعت و کتابت سے مزین "نصب العین" کا پہلا شمارہ اس کے ایڈیٹر کی جانفشانی اور محنت کا ثمر ہے۔ اس میں مضامین، منظومات، غزلیں، افسانے رسالوں اور کتابوں پر تبصرے اہل نظر کے قیمتی مشورے اور اہم رائیں شامل ہیں۔ بعض اہل قلم حضرات کی خوبصورت تصاویر بھی شائع کی گئی ہیں عقابی نگاہ اور عقابی پرواز کی طرح ایڈیٹر کے عزم اور ارادے کا اندازہ رسالہ سے ہوتا ہے۔

اگر ان کے عزائم بلند جد و جہد مسلسل اور عمل پیہم ہو تو پھر
"یہ بہر و بحر کیا ہیں۔ یہ مہر و قمر کیا ہیں"

رسالہ کی ابتداء مقامی شاعر شاکر جالنوی کی حمد باری تعالیٰ اور نعت رسول صلعم سے ہوتی ہے اس کے مشمولات میں عارف خورشید، رؤف خیرؔ، ابراہیم اختر، ڈاکٹر شبیر حسین جوش، ڈاکٹر جلیس سہسوانی کے مضامین شامل ہیں۔ کالی داس گپتا رضا۔ نذیر فتح پوری۔ علامہ شارق جمال ناگپوری، م ع باسط کے منظومات، محبوب راہی، ارتقی نشاط، پیروین کار اشک، مصطفیٰ اجمیل، عرفان پیر بھنوی، مَنین اچلپوری، عطا عابدی، بشیر آصف، اور صادق کی غزلیں ہیں۔ اس کے علاوہ یوسف ناظم، عظیم راہی، معین الدین عثمانی کے افسانے تبصرے، علمی وادبی خبریں۔ زبانِ خلق کے تحت مشورے اور رائیں شامل ہیں۔ مضامین، افسانے، نظموں اور غزلوں کے انتخاب سے لے کر شائع ہونے تک سلیقہ مندی اور ادبی ذوق کا دلچسپ مظاہرہ کیا گیا ہے۔

رسالہ کا اجراء خوش آئند اور مستحسن اقدام ہے۔ کسی بھی کام کو حسن و خوبی سے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے مسلسل تگ و دو قربانی اور بے لوث خدمات کی ضرورت ہوتی ہے۔

اگر "نصب العین" کے روح رواں میں یہی جذبہ برقرار رہا تو یقیناً یہ بیج ایک دن تناور درخت کی شکل اختیار کرے گا۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعاگو ہوں۔

انٹرنیٹ پر اُردو نیوز سروس

انٹرنیٹ INTERNET کے سبسکرائبرس کو پہلی بار اب "اُردو" زبان میں بھی خبریں سننے کو مل سکیں گی انٹرنیٹ پر "اُردو نیوز" سروس میڈیا اسٹار نیوز فیچر ایجنسی آف انڈیا نئی دہلی کے مسٹر محمد احمد کاظمی شروع کرنے والے ہیں انہوں نے ۱۴ مئی کے دن دیئے گئے ایک انٹرویو میں یہ بھی بتایا کہ دنیا بھر میں بالخصوص مغربی ملکوں اور خلیجی عرب ملکوں میں سکونت پذیر لاکھوں اُردو داں افراد کیلئے یہ اُردو نیوز سروس ان کی آگہی کے لئے ایک بڑا مسئلہ بن جائیگی وہ ہندوستان میں ہونے والے واقعات کی تفصیلات سے بھی بروقت آگاہ ہوسکیں گے۔

کرشن موہن

رسمِ خط

نمودِ زندگی، اُردو کا رسمِ خط ہے آئینہ نمط روشن
عیاں اہلِ زمانہ پر ہے اِس کی وسعتِ دامن
کبھی ہم اِس کا رسمِ خط نہ بدلیں گے
کہ رسمِ خط زباں کا جسم ہوتا ہے
یہ پیراہن نہیں ہوتا
زباں تو رسمِ خط کے ساتھ ہی نشو ونما پاتی ہے اور پروان چڑھتی ہے
فنا ہو جسم تو نابود ہو جاتی ہے پھر جاں بھی
جو رسمِ خط بدل جائے زباں زندہ نہیں رہتی
اگر زندہ بھی رہ جائے، درخشندہ نہیں رہتی

ماہنامہ

شاداب

حیدرآباد

جلد ۱۳

شمارہ ۸

قیمت ‎۱۵/- روپے

زرِ تعاون

ہندوستان	سالانہ	۱۰۰ روپے	دو سال کے لئے	۱۸۰ روپے	تاحیات	۱۵۰۰	روپے
بیرونی ملک	"	۳۰۰ "	"	۵۵۰ "	"	۴۰۰۰	"
امریکہ	"	۵۰ ڈالر	"	۹۰ ڈالر	"	۹۰۰	ڈالر
انگلستان	"	۳۰ پونڈ	"	۵۰ پونڈ	"	۵۰۰	پونڈ
پاکستان	"	۲۰۰ روپے	"	۳۵۰ روپے	"	۴۰۰۰	روپے

ترسیلِ زر کا پتہ : ماہنامہ شاداب ۱۴۷-۵-۱۱ ریڈہلز حیدرآباد

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلیشر محمد قمر الدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپوا کر
دفتر شاداب ۱۴۷-۵-۱۱ ریڈہلز حیدرآباد سے شائع کیا۔

فہرست



ڈاکٹر محمد خالد عبدالسمیع
ایم ڈی - ایم - ایس
(ریاض)
چیئرمین آف ڈپارٹمنٹ آف افتھلمالوجی
کنگ فیصل اسپیشلسٹ ہاسپٹل - ریاض

عصری تعلیم میں مذہبی اقدار کی شمولیت وقت کا اہم تقاضہ

یہ اُن دنوں کی بات ہے جبکہ ہم نے اخبارات میں یہ خبر پڑھی کہ امریکہ کے ایک ہر میں بم کا ایک زبردست دھماکہ ہوا جس سے وفاقی حکومت کی بلڈنگ پوری طرح تباہ و برباد ہوگئی اور اس میں کئی اشخاص ہلاک اور زخمی ہوگئے۔ ان میں کئی چھوٹے چھوٹے بچے تھے، عورتیں اور جوان افراد شامل تھے۔ اس کے بعد یہ سننے میں آیا کہ کسی مجنوں نے برطانیہ کے کسی مقام پر اسکول میں بندوق لیکر داخل ہوا اور چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں پر اندھا دھند گولیاں چلا کر کئی بے قصور بچوں کو ہلاک اور زخمی کر دیا۔ آسٹریلیا میں ایک آدمی پکڑا گیا جس نے اپنے حلفیہ بیان میں اعتراف کیا کہ اُس نے کئی بے گناہ مسافروں کو جس میں اکثریت عورتوں کی تھی سخت ایذیت دے کر ہلاک کر دیا تھا جب اُس سے پوچھا گیا اُس نے ایسا کیوں کیا تو اُس سفاک نے جواب دیا کہ مجھے لوگوں کو مجبور اور تڑپتا دیکھ لطف آتا ہے۔ اسی طرح کے کئی ایک واقعات ہر مقام پر ہر ایک کی نظر سے گذرے ہیں۔ آپ اور ہم نے اِن جیتے جاگتے ڈراموں کا آخری سین نہیں دیکھا ہے۔ انسانی اقدار اور اخلاق جس تیزی کے ساتھ گرتے جا رہے ہیں اُس نے ظاہر کیا کہ اگر وقت کے دھارے نے ان جرائم کے وجود میں آنے کے اسباب معلوم نہ کیئے اور سختی کے ساتھ اس کا تدارک نہ کیا تو انسانیت کا مستقبل بہت ہی اندھیرا اور بھیانک نظر آتا ہے اور وہ وقت دور نظر نہیں آتا جبکہ کوئی شخص اپنے شہر میں اپنے محلے میں بلکہ اپنے گھر میں اپنے آپ کو محفوظ خیال کر سکے۔

بنی نوع آدم کی تاریخ اٹھاکر آپ دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ حضرت انسان نے گذشتہ ایک سو سال میں بہت زیادہ تیزی کے ساتھ ترقی کرلی ہے۔ آج سے ۸۰، ۹۰ سال قبل کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ انسان اڑ کر ایک مقام سے ہزاروں میل دور دوسرے مقام کو چند ہی گھنٹوں میں چلا جائے گا۔ گذشتہ ۶۰ ایک سال میں PENCILLEN اور INSULIN کی دریافت نے انسان کی بقاء کے دروازے کھول دیئے ہیں جہاں انسان نے اپنی بقاء آرام و آسائش کے بہترین طریقے معلوم کرلئے ہیں تو دوسری طرف اتنی ہی مدت میں جوہری توانائی کی دریافت اور اس سے بننے والے مہلک بموں نے پوری انسانیت کو تباہی کے دوراہے پر لاکر کھڑا کردیا ہے۔ طاقتور ممالک کے ہاتھوں میں دنیا کے پورے انسان یرغمال کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سبک رفتار طیارے و کمپیوٹرس اور لاسلکی مواصلات نے دنیا کے دامن کو اتنا کم اور تنگ کردیا ہے کہ دنیا میں دور سے دور کا علاقہ بھی اتنا دور رہ گیا ہے جتنا کہ آپ کے دیوان خانے میں رکھے ہوئے فون یا کمپیوٹر کا TARMINAL کا فاصلہ آپ کی جائے نشست سے ہے۔ یہ کتنی افسوس کی بات ہے کہ جہاں ایک طرف چاند پر کمند ڈال کر اس پر اترا کر چلنے والے انسان نے تو اتنی مادی ترقی کرلی ہے کہ اب وہ ستاروں کے آگے جہاں بنانے کے خواب دیکھ رہا ہے تو دوسری طرف اس میں اخلاقی انحطاط اور کردار کے فقدان کے باعث دورِ حاضرہ کا آدمی حلقہ انسانیت سے باہر نکلتا ہوا نظر آتا ہے۔

کبھی آپ نے غور کیا ہے کہ وہ کیا وجوہات ہیں کہ انسان کی اتنی عظیم مادی ترقیات کے باوجود انسانیت اپنی بقاء کے لئے کیوں سسکیاں لے رہی ہے۔ دنیا کے ہر علاقہ میں افراتفری پھیلی ہوئی ہے ہر کوئی اپنے نقطہ نظر کو دوسرے پر مسلط کرنے کی خواہش رکھتا ہے ایک گروہ دوسرے گروہ پر غلبہ و برتری چاہتا ہے طاقتور ممالک کمزور اقوام کا استحصال کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ اقوام متحدہ کا منشور تو اپنی جگہ ہے لیکن اس ادارہ کا عملی نظام

طی قتور ممالک کا دستِ نگر ہو کر رہ گیا ہے۔ ایامِ جاہلیت میں "جس کی لاٹھی اُس کی بھینس" کے اصول کا عمل دخل ہوا کرتا تھا آج وہ ایامِ رفتہ ایک مخصوص کے لحاظ میں پھر سے عود کر آ رہے ہیں۔ انفرادی طور پر دیکھا جائے تو حصولِ دنیا کی خواہش میں خاندانی اور خونی رشتوں میں دراڑ آ گئی ہے۔ بھائی کو بھائی سے تعلق ہے تو صرف اس لیے کہ اس تعلق سے "مجھے کیا فائدہ" ہو سکتا ہے۔ پڑوسی کے حقوق کی حفاظت، مسافر کی مدد و اعانت، بیمار کی تیمارداری اور بیاری بھوکوں کو کھانا کھلانے کے لئے اب کسی کے پاس وقت نہیں رہ گیا ہے۔ ان اجتماعی اور انفرادی سماجی برائیوں کے اسباب کو جاننے کے لئے میں آپ کی توجہ موجودہ نظامِ تعلیم کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جس سے آپ پر عیاں ہو جائے گا کہ کس طرح سے عصری نظامِ تعلیم کو مغربی ممالک نے موجودہ صورت میں مروج کر کے بنی نوع انسان اور انسانیت پر کتنا بڑا ظلم کیا ہے۔

موجودہ نظامِ تعلیم نے طالب علموں کی تمام توانائیاں بہتر سے بہتر مشاہیرہ کے حصول اور کسبِ معاش کے اعلیٰ سے اعلیٰ تدابیر کو سکھانے میں صرف کر دیے ہیں۔ ۱۹۵۷ء میں تمام امریکی جامعات کے صدور نے ہارورڈ یونیورسٹی ہاسٹل میں بیٹھ کر کالجس میں پڑھائے جانے والے مضامین کو ۳ حصوں میں تقسیم کر دیا۔

۱۔ فلسفہ و ادبیات — HUMANITIES

۲۔ طبعی سائنس — NATURAL SCIENCES

۳۔ انسانی معاشراتی سائنس — SOCIAL SCIENCES

اس کانفرنس کے "کامیاب اختتام" پر یہ دعویٰ کیا گیا کہ علم کو ان تینوں حصوں میں بانٹ کر پڑھانے سے طالب علم کے اندر وہ تمام صلاحیتیں پیدا ہو جائیں گی جس کے ذریعہ ایک نیا اور بہتر معاشرہ بنانے میں مدد ملے گی اور مزید کہا گیا کہ اس سے نہ صرف انسانی صحت کی حفاظت ہو سکے گی بلکہ ایک بہتر اور اعلیٰ عالمی معاشی نظامِ عمل میں آ سکے گا۔ تعلیم کی اس

ترتیب نو کے باعث ایک انسان کو دوسرے انسان کے برابر مواقع اور حقوق حاصل ہو سکیں گے۔

اس بات کو ماننے سے کسی کو انکار نہیں کہ موجودہ طریقہ تعلیم کے حصول سے معاشی منفعت اور معاشی استحکام کے بہتر سے بہتر مواقع پیدا کیئے جا سکتے ہیں اور کیئے جارہے ہیں لیکن عصری تعلیم کے ان ماہرین اور اجارہ داروں نے اس بات کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا کہ موجودہ طرز تعلیم اور تعلیمی نظام سے پورا پورا فائدہ اٹھانا اور اس سے بہتر سے بہتر انفرادی و اجتماعی اور معاشرتی نتائج نکلنا اسی وقت ممکن ہو سکے گا جبکہ اس تعلیمی نظام کی بنیادوں میں انسانی ہمدردی، حسن سلوک اور روحانی اقدار کی اہمیت کو شامل کیا جائے۔ انسان کے اندر اپنے خالق کی ذات سے تعلق پیدا کرنے کی جو اٹوٹ خواہش ہے اس کو نظر انداز کیا یا دبایا نہیں جا سکتا اور نہ اس بات سے بھی انکار کیا جا سکتا ہے کہ انسانی کردار بنانے میں روحانی اور مذہبی تعلیمات بے انتہا ضروری ہیں۔ اگر مذہبی اور اخلاقی تعلیمات کو انسانی نشو و نما کرنے میں ضروری جز کی طرح شامل نہ کیا جائے تو انسان کی رہبری کے لئے کوئی خود ساختہ پیمانہ و معیار انسانیت کی حفاظت کا اہل نہیں ہو سکتا اور مذہبی تعلیم کی عدم موجودگی سے انسانیت کا مستقبل تاریک سے تاریک ہوتا چلا جائے گا۔ یورپ اور دوسرے مغربی ممالک میں انسانی اخلاق اتنے گر چکے ہیں کہ بغیر شادی شدہ عورتوں اور مردوں میں ناجائز جنسی تعلقات اب کوئی معیوب بات نہیں خیال کی جاتی۔ اور مغربی معاشرہ نے اس بات کو قبول کر لیا ہے کہ عورت مرد کے لئے ایک کھلونا اور تفریح گاہ ہے جس کو جیسا چاہے استعمال کیا جا سکتا ہے شادی کی اہمیت، عورت و مرد کے درمیان الفت و محبت، عہد و پیماں کوئی معنی نہیں رکھتے۔ اگر شادی کی بھی جاتی ہے تو ۶۰ تا ۸۰ فیصد شادیاں پانچ سال کے اندر ختم ہو جاتی ہیں عصری تعلیم میں مذہبی اقدار کی عدم شمولیت کے نتائج کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔

عصری تعلیم سے مذہبی اقدار کو جدا کر کے حصول علم کو صرف کسب معاشی کی حد تک محدود کرنے

کرنے والے ماہرین کی دانست میں یہ بات نہیں آئی کہ ایک مستحکم معاشی نظام کی تخلیق اور کارکردگی کے لئے یہ بہت ضروری ہے کہ اس نظام کو چلانے کے لئے معاشی اداروں کے افراد کے اندر خوش اخلاقی، دیانت داری، خوش اسلوبی، کام سے رغبت، وقت کی پابندی، محنت گذاری، ایفائے عہد، کفایت شعاری، وفاداری، افسر بالا کا احترام، ماتحتین کے ساتھ حسن سلوک اور باہمی امداد و تعاون کے جذبہ کا موجود ہونا تجارت اور معاشی استحکام کے لئے بے حد ضروری ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ دنیاداری کے کاروبار کو بہتر سے بہتر چلانے کے لئے جن باتوں اور اقدار کی ضرورت ہے وہ تو صرف مذہبی تعلیم روحانی التفات کے سوا اور کسی ذریعہ سے حاصل نہیں کئے جا سکتے۔ انسانوں کے درمیان مساوی حقوق، خودغرضیوں اور ذاتی نفع بندی سے محفوظ رہنے کے قواعد صرف ایک مذہبی نصب العین ہی عطا کر سکتا ہے۔ اس لئے کہ مذہبی قوانین ہی وہ ضابطۂ حیات ہیں کہ جس کی اطباع میں بنی نوع آدم کی بھلائی مضمر ہے۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ایک مستحکم معاشی نظام کے ذریعہ ہی معاشرہ کی اقتصادی و سیاسی صورت حال بہتر ہو سکتی ہے اور جس معاشرہ میں اعلیٰ اخلاقی معیار موجود اور اس کے افراد میں اخوت و محبت اور بھائی چارگی اور انسانی مساوات جیسے اہم عناصر شامل ہوں تو ایسا معاشرہ نہ صرف اقتصادی اور سیاسی حیثیت سے مضبوط ثابت ہو سکتا ہے بلکہ انسانی اعتبار سے ایک مثالی معاشرہ قرار دیئے جانے کا اہل بن جاتا ہے۔

سویڈن کے عالمی شہرت یافتہ ماہر معاشیات ڈاکٹر گونر مرڈل GUNNAR MYRDAL نے ایشیاء کے ممالک کے معاشی حالات کا بہت عرصے تک مطالعہ کیا ہے اور ایک مدت کی تحقیق کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ ان ممالک کی گرتی ہوئی معاشی حالت کی بڑی ذمہ داری ان کے گرتے ہوئے قومی کردار کے باعث ہے جس میں خدائی عطا کردہ انسانی حقوق کو رات دن بہ بانگ دہل پامال کیا جا رہا ہے۔ انصاف کا فقدان اور اقربا نوازی کی بیماری اور لت نے ان ممالک کے معاشی نظام کے اندر ایک گھن لگا دیا ہے جس میں امیر اور امیر ہوتا جا رہا ہے اور

غریب کے لیے عزت کا ایک سمندر نا پیدا کنار پیدا کیا گیا ہے اگر وہ اپنی محنت و کوشش و
کاوش سے اپنی معاشی حالت کو بہتر کرنے کی لاکھ سبیل بھی کرے تو وہ اشرور سوخ کی عدم
موجودگی اور خاندانی نام سے محرومی کے باعث اپنے جینے کے بنیادی حق کو اس دھرتی کے
ہم مکینوں سے حاصل نہیں کر سکتا اور نہ کوئی اس کے مانگنے پر اس کو دینے کے لئے تیار ہوتا
ہے پروفیسر مرڈل کا مشاہدہ ہے کہ ان ممالک میں تعلیمی اداروں نے نوجوان طالب علموں کے لئے
یونیورسٹی اور جامعات سے فلسفہ اور ادبیات (HUMANITIES) جیسے مضامین
میں تعلیم کی سہولیتیں فراہم کر کے انھیں بی اے اور ایم اے کی ڈگریاں عطا کر کے تلاش
معاش کی ان لمبی قطاروں میں لگا دیا ہے جس کا مقصد حصولِ روزگار کی حد تک محدود ہو کر
رہ جاتا ہے۔ ان تمام انسانی سعی و کاوش کے تانے بانے میں انسانی کردار کی تعمیر کے اجزا
کا عمل دخل کہیں بھی شامل تعلیم نہیں کیا گیا ہے۔ انسانی تاریخ پر سرسری نظر ڈالنے سے واضح ہو
کہ حضرتِ انسان کو انسانیت کے اصول مذہبی تعلیمات کے قدیم و ضخیم خزائن ہی سے ملے ہیں
اگر مذہب کو انسانی تعلیم و تربیت کے دائرہ عمل سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ تو حضرتِ انسان
کا ایک ایسا کردار ابھر کر آتا ہے جس میں سچ بولنا، وعدہ پورا کرنا، حق گوئی اختیار کرنا
عدل و انصاف سے کام لینا نہ صرف غیر ضروری نظر آتا ہے بلکہ اپنی ذاتی منفعت کے لیے ال
اصولوں کی لاشوں پر قدم رکھ کر گذرنے پر فائدہ نظر آئے تو بلا جھجک و قباحت گذر
جانا بہت آسان ہو جاتا ہے۔ دورِ حاضرہ کے عالمی معاشرہ میں ایسے افراد کا بڑی
تیزی کے ساتھ اضافہ ہوتا جا رہا ہے جس کی وجہ سے جرائم میں اضافہ۔ حق تلفیوں میں کثرت
ہوتی ہوئی نظر آرہی ہے میں دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مغربی ممالک میں کسی بھی
خبریں سننے کے لئے ٹی وی کھولا جائے تو سب سے پہلے آپ کو یہ سننے کو ملے گا کہ آج اس
شہر میں کتنے قتل ہوئے۔ کتنی عورتوں کی عزت ریزی کی گئی۔ گھروں میں چوریاں کتنی ہو
بچوں کو اغوا کر لیا گیا وغیرہ وغیرہ۔ ان سخت قسم کے جرائم کے ارتکاب کی وجوہات پر

کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان مجرموں میں سے سو فیصد افراد کے حصے میں کوئی مذہبی تعلیم یا کردار کی تعمیر و نشو و نما کے مواقع نہیں آئے۔ ان میں کئی ایک تعلیم یافتہ بھی ہوں گے لیکن ایسی تعلیم جو آدمی کو انسان نہ بنائے اور انسانیت نہ سکھائے تو بھلا اس دماغ میں یہ بات کیسے آسکتی ہے کہ دوسروں کے حقوق پامال کرنا انسانیت کی توہین اور تذلیل ہے اور اخلاق کا نچلا اور بد ترین درجہ ہے۔ ان دلائل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عصری تعلیم میں مذہبی تعلیم کا اختلاط و شمولیت انسانیت کی بقاء کے لئے نہایت ضروری ہے ورنہ ڈر ہے کہ انسانی کردار کے انحطاط کی رفتار اور روش پر قائم رہے تو وہ دن دور نہیں ہیں جبکہ اس دنیا میں آدمی تو باقی رہے گا لیکن انسانیت بہت ہی تھوڑے عرصے کے بعد اس کرۂ ارض میں عنقا ہو جائے گی۔

مذہبی تعلیم کو عصری تعلیم میں شامل کرنے کے لئے دورِ حاضر کے ماہرانِ تعلیم نے دو بنیادی اعتراضات کو بار بار دہرایا ہے۔ پہلا اعتراض تو یہ ہے کہ مذہبی تعلیم کے باعث انسانوں کے درمیان گروہ بندی ہو جاتی ہے اور اس تفریق کے باعث مختلف گروہ کے درمیان نفرت کے جذبات پیدا ہو سکتے ہیں۔ دوسرا نقطۂ اعتراض یہ ہے کہ مذہبی تعلیم سائنس کی ارتقاء اور ترویج میں باعثِ رکاوٹ ہے جہاں تک پہلے اعتراض کا تعلق ہے اس کی حقیقت کو دیکھیں تو صاف ظاہر ہو جائے گا کہ معاملہ اس کے برعکس ہے کہ انسانوں میں تفریق اور نفرت کے جذبات مذہبی تعلیم کے باعث نہیں بلکہ اس کی عدم موجودگی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ دنیا میں کوئی مذہب ایسا نہیں جس میں بھائی چارگی اخوت و محبت جیسے بنیادی انسانی اقدار کی تعلیم نہ دی گئی ہو۔ جب مذہب کو عصری حلقۂ تعلیم سے نکال دیا جائے تو انسانوں کے خود ساختہ اقدار میں اتنی گنجائش و وسعت نہیں کہ اپنی ذاتی منفعت اور خود پیدری کے جذبات کو لگام دے کر اپنے پڑوسی اور کسی اجنبی کے حقوق کا احترام کر کے اس کے ساتھ وقت آنے پر انصاف کرے۔ تجارت میں دھوکا دہی ناپ تول میں کمی زیادتی

جھوٹے بیانات کم سن افرادِ خاندان کی حق تلفیاں اور اسی قسم کے کئی اور برائیاں اتنی عام ہو گئیں ہیں کہ ایک عام آدمی کو ان حرکات میں کوئی برائی نظر نہیں آتی ہے کہ اس دیدہ دلیری کو ذہی فہمی، ہوشیاری، حاضر باشی اور موقعہ سے فائدہ اٹھانا قرار دیا جانے لگا ہے۔ مذہبی تعلیم کے فقدان اور خالق کے وجود پر عدم اعتمادی کے باعث کئی افراد نے مذہب کو آڑ بنا کر خود پروری کے ایسے اسباب بنا لئے ہیں کہ ایک فہم و عقل آدمی کا مذہب سے متنفر ہونا ایک فطری بات ہے اس میں مذہب کے اصولوں کا کوئی قصور یا مذہب کے اصولوں میں کوئی خرابی ہو ایسی بات نہیں ہے۔ درحقیقت خرابی ہے تو معاشرہ کے اس تعلیمی نظام میں جس میں مذہب کو اچھی طرح سے سمجھایا نہیں گیا ہے۔ اگر مذہب کو اچھی طرح سے سمجھایا جائے اور یہ بات طالب علم کے دل کے اندر جاں گزین کر دی جائے کہ اللہ حاضر و ناظر ہیں۔ حق و باطل کو دیکھ رہے ہیں اور ہمیں روزِ قیامت اپنے اپنے اعمال کا محاسبہ کرنا ہے تو کسی کی مجال نہیں ہو سکتی کہ کسی کے حقوق کو پامال کرنے کی جرارت کر سکے۔ اگر مذہب پر یقین ہو اور اس کے ماننے والے ایقان و یقین کے ساتھ مذہب کے اصولوں پر عمل کریں تو ایک ایسا معاشرہ ابھر سکتا ہے جس میں بیمار کی تیمارداری اور ضرورت مند کی حاجت روائی میں لوگ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کریں گے۔ مسافر کی آمد باعثِ برکت خیال کریں گے بڑوں کا ادب، چھوٹوں پر شفقت، بھوکے کو کھانا کھلانا، مظلوم کی حمایت کرنا، عزیز و اقارب کے حقوق ادا کرنا اس قسم کے اعلیٰ کردار معاشرہ کا روزمرہ کا دستور ہو جائیں گے۔ آدمی اپنی ذاتی خواہشات اور نفسِ امارہ کو اس لئے مارتا ہے کہ اس کو مذہبی تعلیم نے اس حقیقت سے روشناس کروایا ہے کہ ہمارا مقصدِ حیات دراصل اس بات میں مضمر ہے کہ ہم انسانیت کی بقا اور اس کی عظمت کو قائم رکھنے کے لئے پیہم کوشش کرتے رہیں جس سے انسانوں کے درمیان انصاف کی فضا اور امن و چین اور بھائی چارگی کا ماحول پیدا ہو سکتا ہے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ مذہب نہیں چاہتا کہ

انسانوں کے درمیان طبقے اور تفریقات ہوں۔ مذہب کا یہ ادعا ہے کہ تمام انسان برابر پیدا کیئے گئے ہیں اور انسانوں کو ترغیب دی گئی ہے کہ انسانی حقوق کی بلندی اور اس کے حصول کے لئے ستری اور درمیان کا راستہ اختیار کریں اسی میں ہمارے خالقِ مطلق کی خوشنودی مضمر ہے اور جس نے اپنے پیدا کرنے والے کو خوش کر لیا اُس نے دونوں جہانوں کی خوشیاں اپنے حصہ میں کر لیں۔

دوسرا اعتراض جو خود ساختہ تعلیمی ماہرین کی طرف سے اکثر مذہب کے خلاف استعمال کیا جاتا ہے کہ مذہب سائنس کی ترقی کے لئے درمیان حائل ہے اور مذہب کے ماننے والے سائنس کے خلاف ہیں (A N T I S C I E N C E) ہیں یہ ممکن ہے کہ بعض مذہبی رہنماؤں نے کسی زمانے میں اپنی ذاتی تنگ نظری اور عدم روشن خیالی کے باعث سائنس کی کسی موقعہ پر مخالفت کی ہو بالکل اسی طرح جس طرح بعض کوتاہ نظر سائنس دانوں نے سائنس کے نام پر خدا کے وجود کو ماننے سے انکار کر دیا۔ لیکن حقیقت دیکھی جائے تو مذہبی اعتقادات میں ایسی کوئی بات نہیں جو سائنس کی تحقیقات اور اس کے نتائج کے مغائر ہو۔ وسیع النظری اس بات کی طالب ہے اور اس امر کی غمازی کرتی ہے کہ سائنس اور مذہب میں اختلاف یا جھگڑا نہیں۔ اگر مذہبی تعصب کی عینک اُتار کر دیکھیں تو یہ معلوم ہوگا کہ جہاں سائنس کے حدود ختم ہو جاتے ہیں وہیں سے مذہب کا عمل دخل شروع ہو جاتا ہے مذہب اور سائنس میں جو اٹوٹ مشترک حقیقت ہے وہ یہ ہے کہ سائنس اور مذہب انسان کو سچائی کی طرف بلاتا ہے سائنس داں صحیح حقیق اور قابلِ قبول اصولوں کی تلاش میں رہتا ہے اور مذہب کے ماننے والے اور اس پر عمل کرنے والے حق و سچائی کی دریافت اور اتباع میں زندگیاں گذار دیتے ہیں۔ اگر سائنس اور مذہب دونوں ہی سچائی اور حق کے متلاشی ہیں تو دونوں کا مطمعِ نظر اور مقصد ایک ہے مختلف نہیں ہے۔ اس منطق سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ مذہب اور سائنس میں کوئی

جھگڑا یا اختلاف نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ سائنس اور مذہب ایک ہی ڈگر پر ساتھ
ساتھ چلتے رہتے ہیں اور اس سفر میں ایک منزل ایسی آجاتی ہے کہ سائنس کے حدود ختم ہو
جاتے ہیں اور وہیں سے دائرہ مذہب شروع ہو جاتا ہے۔ سائنسداں نے تو یہ ثابت کر دیا کہ
دل کی حرکت کی ابتداء دل کے اندر ایک مخصوص گوشے (SINUS NODE) سے شروع
ہوتی ہے دل کے گوشت کے اس حصے کی فطرت میں یہ بات ہے کہ وہ آدمی کی ایماء علم اور
مرضی کے بغیر ایک برقی قوت کو پیدا کرے جو تیز رفتاری سے پھیل کر دل کے دوسرے حصو
کو حرکت میں لے آتی ہے۔ دل کے ایک مخصوص حصے کی شناخت کر کے سائنسداں نے ثابت
تو کر دیا یہاں پر خود بہ خود سے برقی توانائی پیدا ہوتی ہے لیکن کیسے پیدا ہوتی ہے اس کا
جواب اس کے پاس نہیں ہے اس نے ایک حقیقت تو دریافت کی لیکن اس کے پیچھے
کس کی مرضی شامل ہے اس کا جواب دینے سے وہ قاصر ہے۔ کن فیکون کا مطلب یہ
ہے کہ اللہ نے کہہ دیا ہو جا اور ہو گیا۔ اللہ نے یہ کیسا کیا ہماری عقل میں یہ بات نہیں آسکتی
اللہ کے احکام پورے ہوتے ہیں ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے لیکن کیسے پورے ہوتے ہیں؟
چیز ہماری عقل اور سائنس کے تجربوں سے باہر ہے۔ بیج کو زمین میں بو کر پانی اور سورج
روشنی دینے سے پودا نکل آتا ہے۔ زمین کے اندھیارے میں خشک بیج کے اندر زندگی کی
گدگداہٹ کیسے ہوتی ہے سائنس داں اس کی تفصیل نہیں بتلا سکتا۔ انسانی خلیوں (CELLS)
کی تحلیل کر کے سائنسدانوں کے لئے ممکن ہو گیا ہے کہ وہ مختلف بیماریوں کے نشانات کو انسانی
جین (GENE) کے D.N.A میں اثباتی طور پر نشاندہی کر سکتے ہیں لیکن سائنسدانوں
کے لئے یہ ممکن نہیں کہ ان D.N.A کے اندر جو پروٹین کی ترتیب ہے اس کی کیا وجہ ہے
بیان کر سکیں اور جب D.N.A خرابی کی طرف مائل ہوتا ہے تو کیسے قدرت نے اس کی اصلاح
کے لئے خود اس کے اندر اصلاحی نظام (DNA REPAIR MECHANISM) بنا رکھا
ہے کہ جب کوئی D.N.A خراب ہو جاتا ہے تو یہ اندرونی اصلاحی نظام خراب DNA کو نکال

ت مند DNA کو لگا دیتا ہے۔ سائنسداں قدرت کے کرشموں کو دیکھ تو سکتا ہے لیکن
د سے ان کرشموں کو روبہ عمل نہیں لا سکتا۔ قدرت نے جو اصول بنائے ہیں اس سے سائنسداں
ائدہ اٹھا سکتا ہے لیکن وہ خود سے قدرتی اصولوں کی طرح نہ کوئی اصول بنا سکتا ہے اور نہ
سی قدرتی اصول کو توڑ سکتا ہے ایک منزل پر آکر سائنسداں رک جاتا ہے اور جب
درتی قوانین کو اپنی منطق سے ثابت نہیں کر سکتا تو یہ کہہ کر فرار اختیار کرتا ہے کہ نیچر
(NATURE) نے اس چیز کے اندر ایسی ترتیب بنا رکھی ہے دورِ حاضر کا سائنس داں
ب قدرتی قوانین اور اٹل اصولوں کو سمجھانے سے قاصر ہو جاتا ہے تو فطرت (NATURE)
نام پر ان اصولوں کی برتری ماننے تیار رہے ہے لیکن اس میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں کہ وہ یہ
ہہ سکے کہ اس دنیا کا ایک خالق ہے جو ایک بہترین سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اس کائنات
ے نظام کو چلا رہا ہے۔ سجدہ ریز ہو جانا چاہئیے ہر اس سائنس داں کو جس پر یہ عقدہ کھل گیا
، اللہ ہی کی وہ ذات ہے جس نے کائنات کے اس نظام کو اتنی باریکی اور منظم طریقہ پر
نایا ہے اور استمراری طریقہ پر چلا رہا ہے لیکن افسوس کہ قدرت کے ان اٹوٹ اور محکم قوانین
و دیکھنے کے باوجود سائنسدانوں کے دائرۂ فکر میں یہ بات نہیں آسکی کہ ان نیچر کے اصولوں
کے پیچھے اصل حقیقت اور مقصد کیا ہے اور یہ بات جاننے سے قاصر ہے کہ ان نیچر کے
صولوں کو بنانے والے نے کوئی اصول بغیر اپنی مرضی اور مقصد کے نہیں بنایا۔

نیپولین (NAPOLEAN) کے سامنے اس زمانے کے مشہور سائنس داں لاپلاس
(LAPLACE) نے فلکیات پر اپنی کتاب نیپولین کے دربار میں پیش کی کہ شاید اسے بڑا
انعام مل جائے گا تو نپولین کی اوراق گردانی کرنے کے بعد پوچھا کہ اس کتاب میں خدا کا کہیں نام
نہیں ہے تو لاپلاس نے جواب دیا کہ " حضور والا فلکیات کے اصولوں کو سمجھانے کے لئے مجھے
خدا کی ضرورت نہیں پڑی "۔ سائنس کی موجودہ روشنی میں دیکھیں تو لاپلاس کا جواب غلط
نہ تھا اس نے تو صرف علم حساب، فزکس و ریاضیات کے ذریعہ چاند و سورج کے محور اور

اِن اجسام کے حرکات کا مشاہدہ کیا تھا مختلف ستاروں اور اُن کے مقامات کا تعین کیا تھا اور تفصیل سے بیان کیا کہ اِن اجسام کے حرکات کیسے ہوتے ہیں اور کن اصولوں کے تحت ہوتے ہیں ۔ لاپلاس نے اِس بات کو اپنی کتاب میں زیر بحث ہی نہیں لایا کہ ان اجسام کو کس نے بنایا ہے، کیسے بنایا ہے اور کیوں بنایا ہے ۔

سورج وقت پر آتا ہے سب کا مشاہدہ ہے اور سائنسداں اپنے علم فلکیات سے حساب لگاکر یہ بتلا سکتا ہے کس دن کس وقت پر سورج نکلے گا۔ سورج گہن کب ہوگا کس مقام سے چاند گہن بہتر صورت پر نظر آئے گا لیکن یہ نہیں بتلا سکتا کہ وہ کیا قوت ہے کہ سورج اپنے محور پر اٹل حقیقت کی طرح قائم ہے۔ سورج کیوں کسی وقت چاند سے یا زمین سے آکر ٹکرا نہیں جاتا۔ قدرت نے اتنے مضبوط قوانینِ فطرت بنائے ہیں کہ سائنسدانوں کو یقین ہے کہ سورج ایک لمحے کے لئے بھی اپنے محور سے ہٹنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ زمین کے کسی علاقے میں بھی چلے جائیے ہوا میں آکسیجن کی ۲۱ فیصد ہی آمیزش ملے گی نہ اس سے کم اور نہ اس سے زیادہ۔ آکسیجن کے اس قدرتی توازن سے کرۂ ارض پر نباتات، حیوانات اور بنی نوع آدم زندہ رہ سکتے ہیں۔ اگر آکسیجن کا یہ توازن کسی سمت میں (اوپر تا نیچے کی طرف پلٹ جائے تو زمین پر زندگی برقرار نہیں رہ سکتی۔ سائنسدانوں نے خود ہمیں یہ بات بتلائی ہے آکسیجن کے اس نازک توازن کو برقرار رکھنے کے لئے نباتات کے لئے ضروری ہے کہ وہ انسان اور حیوانات سے خارج ہونے والی کاربن ڈائی آکسائیڈ (CO_2) کو جذب کرکے تازہ آکسیجن کو ہوا میں شامل کرتے رہیں تاکہ اس ۲۱ کا توازن باقی رہے۔ سائنسداں کی نظر بینا؟ باریک اور نہین توازن کو دیکھنے کے باوجود کہ قدرت نے زمین پر حیات اور زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے کتنا مستحکم اور استمراری نظام قائم کیا ہے پھر بھی خدا کی برتری بلکہ اُسکے وجود کو بھی ماننے سے انکار کیئے جاتا ہے۔ محققین کی نظر میں اس انکار کی وجہ تاریخ کی گہرائیوں اور اُس کے کالے صفحات میں ملتی ہیں۔ سولہویں صدی عیسوی کے اوائل میں جب اُس زمانے سائنسدانوں

نے علمِ فلکیات کے اصولوں کو بیان کرنے کی کوشش کی کہ سورج، زمین، چاند اور ستارے ایک مکمل و منظم نظام کے تحت دورانِ گردش ہیں تو اُس وقت کی برطانوی حکومت نے چرچ آف انگلینڈ کی ایماء پر سائینسدانوں کو سخت سزائیں دینے کا اعلان کیا اور اِس بات کا قانون بنادیا گیا کہ سائنس کے تاویلات اور انسانی جسم کی تشریحات کو سمجھنا، بیان کرنا اور اُس کی تعلیم دینا چرچ کی تعلیم کے خلاف ہے چنانچہ قابلِ سزا قرار دیا گیا۔ یہ انسانیت کی بدقسمتی اور بدبختی ہے کہ کئی سو سال گذر جانے کے باوجود سائینس کو اب بھی مذہب کے خلاف تصور کیا جاتا ہے۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے کہ عقل و دانش کا یہ تقاضہ ہے کہ ایک سائینسداں اور ایک مفکر جب قدرت کے مکمل اور اٹوٹ نظام کو دیکھتے ہیں تو ان کو اِس بات کی شہادت دینی چاہیئے کہ اتنا جامع اور کوتاہیوں سے مبرّا نظام خود بہ خود سے وجود میں نہیں آسکتا۔ اگر بہ فرضِ محال اس بات کو ایک لمحہ کے لئے مان بھی لیا جائے کہ حسنِ اتفاقات نے اس نظام کو جنم دیا ہے تو یہ بات قیاس میں نہیں آسکتی کہ اتنا جامع اور وسیع نظام اپنے محور پر صدیوں سے قائم ہے۔ اُنیسویں صدی عیسوی کے مشہور روسی ادیب و مفکر ٹالسٹائے (TOLSTOY) کے پاس عیسائی مبلغین نے جاکر اُس کو عیسائیت قبول کرنے کی ترغیب دینے کے سلسلے میں حضرت عیسٰی علیہ السلام کا معجزہ بیان کیا کہ وہ کنواری عورت کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ کسی بچے کا کنواری عورت کے بطن سے پیدا ہونا ان عیسائی مبلغین نے زور دیا کہ یہ سوائے ایک معجزہ کے کوئی دوسری چیز نہیں ہوسکتی۔ اس لئے ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ آپ حضرت عیسٰی علیہ السلام کو خدا کا بیٹا مان لیں اور عیسائی مذہب قبول کرلیں۔ ٹالسٹائے نے بڑی دیر تک ان عیسائی مبلغین کی باتوں کو خاموشی سے سننے کے بعد جب جواب دینے پر اصرار کیا گیا تو اُس نے بڑی دیر کی خاموشی کے بعد سکوت کو توڑا تو اُس نے ان مبلغین سے کہا کہ مہربانوں تم لوگ کنواری عورت کے جسم سے بچے کی پیدائش ایک غیر معمولی واقعہ بلکہ ایک معجزہ قرار دیتے ہو میری دانست میں خدا کا وجود کا بہترین ثبوت و معجزہ ایک عام بچے

کی پیدائش ایک غیر معمولی واقعہ ہے جو روزمرہ کے مشاہدہ میں آتا ہے۔ عورت و مرد کے اختلاط کے بعد ایک عام عورت کے جسم سے صحت مند بچے کا پیدا ہونا خود ایک معجزہ ہے اور خدا کے وجود کا بہترین ثبوت ہے۔ ٹالسٹائے کے اس مشاہدہ اور بصیرت کو حضرت سعدی علیہ الرحمہ نے اپنے الفاظ میں یوں بیان کیا ہے۔

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار　　ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

قصہ مختصر یہ کہ اگر انسان خواہ وہ ادیب ہو، مفکر ہو یا سائینسداں ہو اس میں اگر حقیقت کو ماننے اور سچائی کو قبول کرنے کا مادہ ہو تو وہ خدا کے وجود کا انکار کسی صورت میں نہیں کرسکتا۔

اس تمام بحث اور استدلات سے یہ بات صاف ظاہر ہوجاتی ہے کہ مذہبی تعلیم نہ تو معاشرہ کے مختلف گروہوں میں تفریق پیدا کرتی ہے اور نہ مذہب سائنس کی ترقی و ترویج دار تقار میں کسی قسم کی رکاوٹ ہے۔ چنانچہ وقت کا اہم تقاضہ ہے کہ بنی نوع آدم کو راہ راست اور انسانیت کی ڈگر پر چلاتے اور اس کو یہ درس دینے کے لئے کہ اس دنیا میں سب انسان برابر ہیں کسی ایک انسان یا گروہ کو دوسرے انسان یا گروہ پر فوقیت نہیں ہے اور دنیا کے شہری ہونے اور ایک خدا کے بندے ہونے کے ناطے ایک دوسرے کی ضرورتیں اور ایک دوسرے کی تکالیف سے انسانی ہمدردی و تعلق ہونے کے لئے مذہبی تعلیم بہت ضروری ہے خدائی احکامات ہی انسانیت کے لئے بہترین مشعل راہ ہیں اور اس کی اتباع ہی میں انسانیت کی بقاء مضمر ہے۔

محمد عارف خان

اردو اسکولوں کے مسائل

رپورٹ

اُتر پردیش اُردو ٹیچرز ایسوسی ایشن اور انجمن ترقی اُردو (ہند) کے زیر اہتمام ۳۰ر جون ۱۹۹۷ء کو اُردو گھر میں دہلی اور اُتر پردیش کے اُردو اسکولوں، اساتذہ اور طلبہ کے مسائل پر خلیق انجم صاحب کی صدارت میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس کی بہت سے مسائل پر دہلی اور اُتر پردیش کے اساتذہ نے کھل کر گفتگو کی۔ اُردو اساتذہ کا تقرر، اُردو مترجمین سہ لسانی فارمولا، اُردو انسپکٹر، اُردو کی نصابی کتابیں، اُردو ڈائرکٹریٹ اور اُردو اساتذہ تربیتی مراکز وغیرہ اہم موضوعات زیر بحث رہے۔ جلسے میں بلند شہر، غازی آباد ہری دوار اور دہلی سے آئے ہوئے نمائندوں نے شرکت کی۔

جلسے کا افتتاح پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے فرمایا۔ انھوں نے اساتذہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ آپ لوگ باہم گفتگو کر کے کوئی مضبوط اور جامع لائحہ عمل تیار کرلیں اور پھر اس کے مطابق عملی جامہ پہنانے کے لیے کوشش کریں۔ پروفیسر آزاد نے کہا کہ اُردو کے ساتھ تعصب اور ناانصافی آزادی کے بعد سے مسلسل ہوتی چلی آرہی ہے اس کو ختم کرانے اور اُردو کو اس کا جائز حق دلانے کے لیے ہمیں غیر معمولی محنت، ہمت اور جرأت سے کام لینے کی ضرورت ہے ہم ہندی یا کسی اور زبان کے خلاف نہیں ہیں، ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں

ہیں کہ جو بھی اُردو پڑھنا چاہے اس کو اُردو کی تعلیم کا موقع فراہم ہونا چاہیئے ۔ آج پورے ملک میں ایسے اُردو اداروں کی ضرورت ہے جو ہمارے بچوں کو اُردو کی تعلیم اسی معیار کی دے سکیں جو دوسرے کالجوں اور اداروں میں دی جاتی ہے ۔

جناب علی حیدر رضوی نے اتر پردیش اُردو ٹیچرز ایسوسی ایشن کی کارکردگی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہ تنظیم ۱۹۷۳ء میں قائم ہوئی تھی اور اس وقت سے لے کر اب تک پورے اتر پردیش میں اُردو تعلیم اور اساتذہ کے مسائل کے حل کے لئے کوشش کر رہی ہے انھوں نے اتر پردیش کے پرائمری اور مڈل اسکولوں میں اُردو اساتذہ کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ ۱۹۷۳ء سے اب تک سترہ ہزار اُردو اساتذہ کا تقرر ہو چکا ہے ان اساتذہ کا تقرر اُردو بحیثیت ایک مضمون کے لئے ہوا ہے حیدر علی رضوی صاحب نے بتایا کہ ملائم سنگھ یادو کے زمانے میں پندرہ ہزار اُردو ٹیچرز کے تقرر کا اعلان کیا گیا تھا ' لیکن ابھی تک صرف ۹۸۵۶ اساتذہ کا تقرر ہوا ہے ۔ ۵۱۴۴ اساتذہ کا تقرر ہونا ابھی باقی ہے اس سلسلے میں ہمارا مطالبہ ہے کہ اتر پردیش کے ایک لاکھ ۴۲ ہزار اسکولوں میں اُردو اساتذہ کا تقرر کیا جائے تبھی اُردو کی تعلیم کو عام کیا جا سکتا ہے ۔ انھوں نے کہا کہ بہت دکھ کی بات ہے کہ بعض دفتروں میں جہاں اُردو مترجمین ہیں وہاں اُردو مترجمین سے دوسرے کام لیئے جاتے ہیں ۔ علی حیدر رضوی صاحب نے پرائمری اسکول میں اُردو کے ساتھ ناانصافی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ رپورٹ کارڈ میں اُردو کے نمبر درج نہیں کیئے جاتے ۔ ٹائم ٹیبل میں اُردو کو شامل نہیں کیا جاتا ۔ اسی طرح جو اُردو انسپکٹر مقرر کیئے گئے ہیں وہ اُردو نہیں جانتے ریاستی سطح کے ڈپٹی ڈائرکٹر اُردو سپروائزر صاحب بھی اُردو نہیں جانتے ۔

راشد علی ظفر صاحب نے کہا کہ اتر پردیش میں مڈل اسکول تک تو اُردو تعلیم کا انتظام ہے لیکن سرکاری ہائر سکنڈری اسکولوں میں اُردو تعلیم کا انتظام نہیں ہے صرف کچھ اقلیتی اداروں میں انتظام ہے ۔

جناب سید محمد الیاس نے کہا کہ اتر پردیش میں اُردو کی صورت حال بہت ناگفتہ بہ ہے اتر پردیش میں جو ۲۲ ہم اُردو میڈیم اسکول ہیں، وہ اُردو میڈیم برائے نام ہیں ان اسکولوں کے ٹیچر اور ہیڈ ماسٹر جنرل ٹیچر ہیں۔ صرف ایک اُردو ٹیچر کام کرتا ہے انھوں نے کہا کہ حکومت ۲۲ ہم اسکول بتاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ تعداد بہت کم ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ حکومت اتر پردیش اُردو تعلیم کے معاملے میں قطعی سنجیدہ نہیں ہے اسکول بہت کم ہیں اُردو اساتذہ کا تقرر نہیں کیا جاتا۔ نصابی کتابیں وقت پر فراہم نہیں کی جاتیں۔ اکثر اُردو اسکولوں کے ہیڈ ماسٹر اور انسپکٹر اُردو سے ناواقف ہوتے ہیں۔

رمضان محمد زخمی صاحب نے بتایا کہ یہ آرڈر تو ہے کہ ہر اسکول میں ایڈمیشن رجسٹر رکھے جائیں لیکن وہ رجسٹر ہمیں نہیں ملتا۔ رجسٹر ہیڈ ماسٹر کے پاس ہوتے ہیں اور وہ اپنی مرضی سے کام کرتے ہیں۔

مولانا ریاض الدین صاحب، ذکی طارق صاحب، اطہر علی عباسی صاحب اور غازی الدین صاحب وغیرہ نے بھی اتر پردیش میں اُردو کی تعلیم سے متعلق بہت سے مسائل کا ذکر کیا اور کچھ اہم تجاویز بھی پیش کیں۔

اس کے بعد دہلی کے اساتذہ نے دہلی میں اُردو تعلیم کی صورت حال پر روشنی ڈالی اور تجاویز پیش کیں۔ سب سے پہلے محترمہ شمیمہ بیگم نے نیو فرینڈس کالونی میں واقع ہائر سینئر سکنڈری اسکول کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہاں آٹھویں جماعت تک تو اُردو تعلیم کا انتظام ہے اس کے بعد اُردو تعلیم کی سہولت نہیں ہے۔ جب کہ اس اسکول میں اُردو بچوں کی خاصی تعداد ہے انھوں نے کہا کہ دہلی کے پرائمری اور مڈل اسکولوں میں اُردو داں ہیڈ ماسٹر تو ملتے ہیں لیکن ہائر سینئر سکنڈری اسکولوں کے پرنسپل اُردو داں نہیں ہوتے۔ شمیمہ صاحبہ نے مزید کہا کہ ہم صرف شکایتیں ہی نہ کریں بلکہ اپنی ذمہ داریوں کے سلسلے میں بھی غور و فکر کریں۔

محترمہ خالدہ زاہدی نے اس نکتے کی طرف اشارہ کیا کہ ایسے اساتذہ کی تعداد خاصی

ہے جنھوں نے اُردو بحیثیت ایک مضمون پڑھی ہے۔ ایسے لوگ کس طرح دوسرے مضامین اُردو کے ذریعے پڑھا سکتے ہیں اس لیے جب اساتذہ ہی اُردو تعلیم میں کمزور رہیں گے تو اُردو تعلیم اور نتائج کیسے اچھے آئیں گے۔

جناب مہرالدین نے مصطفیٰ آباد کے ایک اسکول کے بارے میں بتایا کہ یہاں اُردو بچوں کی تعداد صدفی صد ہے لیکن سترہ اساتذہ میں سے صرف دو اُردو داں ہیں انھوں نے بتایا کہ اس اسکول میں طلبار کی تعداد آٹھ سو ہے مہرالدین صاحب نے بتایا کہ اُردو کی تدریس میں بہت سی مشکلات ہیں مثلاً ہندی کے مقابلے میں اُردو میں ٹیچنگ ایڈ برائے نام ہے اُردو میں ہندی کے ابھیاس پُستکا کی طرح مشق کی کوئی کتاب نہیں ہے انھوں نے اس بات کی ضرورت پر بھی زور دیا کہ ایم سی ڈی میں اُردو ایجوکیشن آفیسر کا تقرر ہونا چاہیے

مہرالدین صاحب نے ایک حیرت انگیز انکشاف کیا کہ این سی ای آر ٹی کی تیسری کلاس کی ہندی کتاب میں "دلّی کے تہوار" عنوان کے تحت عید کے سلسلے میں بتایا گیا ہے کہ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جنم دن کے اپلکچھ میں منائی جاتی ہے۔" اس سے بھی زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ کتاب پندرہ سال سے نصاب میں شامل ہے۔

جناب انیس احمد نے اس مسئلے کی طرف توجہ مبذول کرائی کہ دہلی کے اکثر اُردو اسکول ہیڈ ماسٹر کے بغیر چل رہے ہیں۔

جناب محمد عزیز نے محکمۂ تعلیم کی اُردو کی طرف عدم دلچسپی کی شکایت کی اور کہا کہ اُردو کی نصابی کتابیں وقت پر دستیاب نہیں ہوتیں۔

جلسے کے دو اہم مقررین جناب شریف الحسن نقوی اور جناب منظور عثمانی نے اُردو تعلیم کے مسائل کے حل کے لئے بہت سی تجاویز پیش کیں اور کچھ مفید مشورے بھی دیئے۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں ایسے طریقے کار اپنانے چاہئیں جن میں ہمیں دوسروں کا بھی تعاون اور

اشتراک مل سکے۔

آخر میں جلسے کے صدر خلیق انجم صاحب نے کہا کہ یونیورسٹیوں میں جو تعلیم دی جاتی ہے وہ بہت اہم ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پرائمری اور ثانوی سطح کی تعلیم ہماری اصل بنیاد ہے اگر نئے پڑھنے والے پیدا نہیں ہوں گے تو یونیورسٹیوں میں کون داخلہ لے گا۔ انجم صاحب نے کہا کہ میں کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ کرام سے مودبانہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ بھی اس مہم میں حصہ لیں۔ انجم صاحب نے مزید کہا کہ ہمیں سب کام چھوڑ کر پرائمری تعلیم کو ایک تحریک کی شکل دینا چاہیئے۔ کیوں کہ بعض صوبائی حکومتیں اور خاص طور سے حکومت اتر پردیش نے اردو کو ختم کرنے کا جو پروگرام بنایا ہے اس کا طریقۂ کار یہ بنایا ہے کہ اردو کو پرائمری اسکولوں سے ختم کر دیا جائے۔ اس کا ایک بڑا ثبوت یہ ہے کہ اتر پردیش میں آزادی سے قبل اردو اور ہندی دونوں زبانیں پڑھائی جاتی تھیں۔ آزادی کے ایک سال بعد پرائمری اور ثانوی سطح کے اسکولوں میں اردو ذریعۂ تعلیم کو ختم کر دیا گیا ہے اور جو اردو میڈیم اسکول تھے انھیں آہستہ آہستہ ہندی میڈیم کر دیا گیا ہے اب صورت حال یہ ہے کہ لسانی اقلیتوں کے کمشنر ۸۹-۱۹۸۸ء میں اپنی رپورٹ میں بتایا تھا کہ اتر پردیش میں ۱۳۴۵ اردو میڈیم پرائمری اسکول ہیں۔ اب حکومت کی ایک رپورٹ سے معلوم ہوا کہ کل ۲۲۴ اسکول ہیں۔ خلیق انجم صاحب نے کہا کہ اب ہم ان اسکولوں کا بھی سروے کریں گے

---★★★---

سہیل انجم نئی دہلی

قومی صحافت اور اردو اخبارات

بابری مسجد کے انہدام کے بعد جب ملک کے مختلف حصوں میں فسادات برپا ہوئے تو دہلی کے مسلم اکثریتی علاقے سیلم پور میں بھی فساد بھڑک اٹھا تھا جس کی بھرپور کوریج شاید کسی اخبار نے کی ہو۔ البتہ وہ تصویر ضرور تقریباً سبھی اخباروں نے شائع کی تھی جس میں پولیس والے پستول کی نوک پر ایک مسلم لڑکے کو وحشیانہ انداز میں گھسیٹ رہے تھے اور چھتوں سے مسلم خواتین فریاد کناں تھیں۔ میں نے بھی سیلم پور فساد کی رپورٹنگ کی تھی اور دو۲ دن تک مسلسل متاثرہ افراد سے ان کی روداد سنتا اور قلم بند کرتا رہا۔ میں نے ایک ایک متاثرہ گھر اور ایک ایک شخص سے ملاقات کی۔ بلند ہوتے ہوئے شعلوں اور آہ و بکا کرتے لوگوں کی تصاویر لیں۔ ان لوگوں کی زبانی جو واقعات معلوم ہوئے ان کا نچوڑ تھا کہ پولیس نے ہندو بلوائیوں کا نہ صرف بھرپور ساتھ دیا بلکہ اس وقت کے اس علاقے کے ایس پی جناب دیپک مشرا کی جانب داری نے فساد کو بھڑکنے کا موقع فراہم کیا۔ اگر انھوں نے غیر جانبداری سے کام لیا ہوتا تو شاید فساد کی ہولناکی کافی کم ہوتی۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں ان کا تبادلہ کر دیا گیا لیکن یہ بھی دیکھا گیا کہ بعض اخبارات نے ان کے خلاف کچھ لکھنے کے بجائے ان کی قصیدہ خوانی کی تھی۔ ان اخبارات کی نظروں میں فساد کے دوران انھوں نے انتہائی جرأت مندانہ رول ادا کیا۔ چند ایک ہی اخبار تھے جنھوں نے ان کی جانبداری پر روشنی ڈالی تھی اور وہ بھی بہت ہلکے پھلکے انداز میں۔

اسی طرح بنگلہ دیشی مسلمانوں کا معاملہ ہے۔ اخبارات میں یہ خبر تو بڑے نمایاں انداز میں شائع ہوئی ہے کہ ہندوستان میں اتنے لاکھ بنگلہ دیشی ہیں۔ مگر اس خبر کے دوسرے پہلو یعنی ان کی بستیوں پر مظالم کی داستانیں خاموشی سے پی لی جاتی ہیں۔ جس وقت بھارتیہ جنتا پارٹی کے لیڈر اور دہلی کے سابق وزیر اعلا مدن لال کھرانہ نے بنگلہ دیشی مسلمانوں کے خلاف مہم چھیڑی تھی تو میں نے اس مسئلے کا جائزہ لینے کے لیے بنگلہ دیشیوں کی جھگی بستیوں کا دورہ کیا تھا۔ نظام الدین اور جمنا پار کے سیما پوری کے لوگوں نے جن میں بنگلہ دیشی بھی ہیں اور مغربی بنگال کے بھی (ان کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جاتا ہے جو بنگلہ دیشیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے) جو واقعات بتائے ان کا لب لباب یہ ہے کہ دن تو کسی قدر گزر جاتا ہے مگر رات میں وہاں پولیس کی حکمرانی ہوتی ہے پولیس کے نزدیک ان انسانوں کی عزت و آبرو کی کوئی قیمت نہیں جس خاتون کو چاہیں تھانے میں بلالیں اور جب تک جی چاہے روک کر رکھیں، کوئی پوچھنے والا نہیں۔ بعض اوقات تو وہاں کی بے بس خواتین پولیس کی ہوس کا شکار بھی بن جاتی ہیں وہاں جرائم پیشہ عناصر کو پولیس کی بالواسطہ پشت پناہی حاصل ہے۔ پولیس ایک بنگلہ دیشی سے اس کی جھگی جبراً خالی کراتی ہے اور دوسرے بنگلہ دیشی کے ہاتھ فروخت کردیتی ہے۔ میں نے جب وہاں کا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ اس مسئلے کی بہت حد تک پولیس ذمہ دار بھی ہے۔ لیکن قومی اخبارات میں پولیس کا یہ چہرہ دیکھنے کو نہیں ملتا۔

جہاں تک سنسنی خیزی کا تعلق ہے تو انگریزی اخبارات کو اس میدان میں جو مہارت تام حاصل ہے اردو اخبار نویسوں کے پاس اس کا عشر عشیر بھی نہیں ہے تقریباً تین سال قبل مشہور فلم اداکارہ شبانہ اعظمی اور جنوبی افریقہ کے صدر نیلسن منڈیلا کے مابین ایک بوسے کو لے کر جو غیر ضروری تنازعہ کھڑا ہوا تھا وہ ابھی تک لوگوں کو یاد ہوگا۔ اس تنازعہ کے پس پردہ ایک انگریزی روزنامہ اخبار کی کارستانی تھی۔ حالانکہ اس غیر اہم واقعہ کے کئی دنوں بعد تک خاموشی چھائی رہی اور مسلمانوں یا کسی کی جانب سے بھی اس پر کسی قسم کا ردعمل ظاہر نہیں کیا گیا تھا

لیکن اس معروف انگریزی روزنامے نے علی گڑھ کے ایک مراسلہ باز قسم کے قاری کا خط چھاپ کر اس معاملے کو گرمانا شروع کیا۔ اس خط کے جواب میں مختلف خطوط کی اشاعت ہوئی اس کے بعد اخبار کے ایڈیٹوریل بورڈ کی جانب سے پہلے ایک طویل مضمون شائع کیا گیا جس میں اس واقعہ کی آڑ میں مسلمانوں اور اسلام کی نام نہاد تنگ نظری پر روشنی ڈالی گئی۔ اس کے بعد اداریہ لکھا گیا اور پھر اشتعال انگیز ردعمل کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ اس مسئلے میں ہندو مسلم دانشور اور ماہرین قانون بھی کود پڑے۔ اسلام میں کیڑے نکالے جانے لگے، مسلم معاشرے کے حامیوں اور مخالفین کا ایک محاذ کھڑا ہو گیا اور پھر پورے ملک میں آگ لگ گئی۔ لیکن کسی نے بھی دانستہ صحافتی اشتعال انگیزی کے خلاف صدائے احتجاج بلند نہیں کیا۔ یہاں تک کہ پریس کونسل نے بھی اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا اگر کسی اردو اخبار نے ایسی مہم چلائی ہوتی تو یقینی طور پر پورے ملک میں اس کے خلاف ملک میں ایک محاذ کھڑا کر دیا گیا ہوتا اور اس کے خلاف مقدمات کی بھرمار ہوتی۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ اردو صحافت کمزوریوں اور خامیوں سے پاک ہے اردو صحافیوں کے سیاسی اور صحافتی شعور اور سیاست پر اردو قارئین کی گہری نظر ہونے سے اردو اخبارات کی بے بضاعتی کم نہیں ہو جاتی۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو اخبارات تنگ دامانی کے شکار ہیں اور جو اردو صحافت کی معراج سمجھے جاتے ہیں وہ بھی آٹھ دس صفحات سے آگے نہیں بڑھ پاتے۔ ظاہر ہے کہ آپ اتنے کم صفحات میں وہ سب کچھ پیش نہیں کر سکتے جو مل کر ایک مکمل اخبار بناتے ہیں۔

اردو اخبارات و رسائل میں صرف سیاسی اور ملی خبروں پر اس لئے زور دیا جاتا ہے کہ باقی دیگر موضوعات کے لئے جگہ نہیں ہوتی جب کہ ایک مکمل اخبار اور عالمی و بین الاقوامی حالات پر نظر رکھنے والے قاری کے لیے سیاسی خبروں کے ساتھ ساتھ اقتصادی اور معاشی خبریں بھی ضروری ہوتی ہیں اور ماحولیات و جنگلات کی بھی۔ کثافت و آلودگی کی

بھی کوریج ضروری ہے اور بچوں و خواتین کے گوشے کی بھی ــ میڈیکل اور کمپیوٹر کی معلومات بھی۔ سائنس کا مواد بھی ضروری ہوتا ہے ۔شیر بازار کی بھی کوریج ہونی چاہیئے اور کھیل کود کی بھی۔ لیکن یہ تمام موضوعات اُردو اخبارات میں تقریبًا ناپید ہوتے ہیں چوں کہ اُردو اخباروں کے مالکوں اور مدیروں کے پاس وسائل کی کمی ہوتی ہے یا وہ ایسا ظاہر کرتے ہیں اس لیئے ان کی دلچسپی مذکورہ موضوعات سے نہیں ہوتی اسی لیئے وہ ان کالموں کے لیئے الگ سے کوئی سب ایڈیٹر یا کالم نگار نہیں رکھتے۔ اور چوں کہ ان میدانوں کے ماہرین کی ضرورت نہیں ہوتی اس لیئے اُردو صحافی بھی ان موضوعات سے خود کو الگ تھلگ رکھتا ہے ۔حالاں کہ وہ انگریزی اور ہندی اخبارات میں ان موضوعات کا دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کرتا ہے ایسی صورت حال میں آٹھ صفحات کا اخبار ۲۰ یا ۲۴ صفحات کے اخبار کا مقابلہ کیسے کر سکتا ہے۔

اُردو اخبارات کی کم مائیگی کا شدت سے احساس گزشتہ دنوں اس وقت ہوا جب مائکرو سافٹ کمپیوٹر کمپنی کے چیرمین مسٹر بل گیٹس دہلی آئے ۔ دہلی میں ان کی آمد سے قبل اور اس وقت سے جب سے ان کی آمد کے پروگرام کے بارے میں معلومات حاصل ہوئی انگریزی اور ہندی کے اخبارات میں مائکروسافٹ' ہندوستان میں اس کی ایجنسی' بل گیٹس کی شخصیت' کمپیوٹر کے بارے میں ان کی دنیا نگی اور کمپیوٹر کے ذریعہ کمائی گئی اور کمائی جانے والی ان کی بے شمار دولت کے بارے میں تفصیل سے چیزیں شائع ہو رہی تھیں۔ جس وقت وہ دہلی میں آئے تو ان کے پروگراموں اور ان کی مصروفیات سے قومی اخبارات بھرے پڑے تھے مگر اُردو اخبارات نے ان جانے کیوں ان کو ریج کو ضروری نہیں سمجھا۔ جب کہ اب تو اُردو اخبارات کا تعلق بھی کمپیوٹر سے بڑھتا جا رہا ہے اس کے باوجود بل گیٹس جیسی شخصیت کے بارے میں جس نے کمپیوٹر پر اپنا کنٹرول قائم کر رکھا ہے اُردو اخبارات کی سرد مہری انتہائی تکلیف دہ اور افسوس ناک رہی۔

آج کے دور میں صحافت بھی ایک صنعت بن گئی ہے کئی صنعتی اور تجارتی گھرانے اور

فائنانشیل ادارے انگریزی اور ہندی کے اخبارات نکال رہے ہیں مگر نہ تو کسی ایک بھی صنعت کار نے اُردو اخبار نکالنے کی طرف توجہ دی ہے اور نہ ہی اُردو والے کسی صنعتی یا تجارتی گھرانے کو اس کے لئے تیار ہی کر سکے ہیں اُردو اخبارات سے وابستہ کچھ لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ اگر ہم بھی انگریزی اخبار کی مانند کثیر صفحاتی اخبار نکالیں تو ہمیں وہ سرکاری سہولتیں دستیاب نہیں ہوں گی جو دیگر زبانوں کے اخبار کو حاصل ہیں جب کہ راقم الحروف کے خیال میں ایسا نہیں ہے اگر سرکاری و غیر سرکاری اداروں کو یہ معلوم ہو کہ اُردو اخبارات بھی بڑی مقدار میں پڑھے جاتے ہیں تو ان کی توجہ ان اخبارات کی جانب بھی ہوگی۔

اُردو صحافت کا ایک بہت بڑا المیہ یہ ہے کہ اس کا استحصال کرنے والوں کی تو کمی بہت زیادہ ہے ایسے بے شمار لوگ مل جائیں گے جو پاکٹ اخبار نکال کر سرکاری سہولتوں سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں اور انتخابات کے دوران یہی لوگ سیاسی جماعتوں کے سامنے دستِ سوال دراز کرتے ہیں اور اصول و نظریات کی قربانی دے کر اُن کی حمایت کی قیمت وصول کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان نام نہاد صحافیوں اور مدیروں نے اُردو صحافت کو کشکول بدست بنا دیا ہے۔ یہ لوگ بغیر وسائل اور بغیر محنت کے انگریزی اخبارات کے مالکوں اور مدیروں سے کہیں زیادہ کمانے کی تگ و دو میں رہتے ہیں۔ خواہ اس کے لیے صحافت جیسے مقدس پیشے کو منہدم ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ ان نام نہاد اخبارات کے نام نہاد مالکوں اور مدیروں نے اُردو صحافت کو بازار میں لاکر کھڑا کر دیا ہے اور آج اُردو صحافی فروخت ہونے والی جنس بن کر رہ گیا ہے۔

آج زیادہ تر اُردو اخبارات کا حال یہ ہے کہ ایک ایڈیٹر اور چند سب ایڈیٹرس سے کام چلایا جاتا ہے حالاں کہ ایک مکمل اخبار کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس وہ تمام شعبے ہوں جو انگریزی اور ہندی کے بڑے اخباروں میں ہوتے ہیں اور جو ایک مکمل اخبار کے لئے ضروری ہوتے ہیں چیف ایڈیٹر، ایسوسی ایٹ ایڈیٹر، اسسٹنٹ ایڈیٹر، جوائنٹ ایڈیٹر

نیوز ایڈیٹر، میگزین ایڈیٹر، چیف سب ایڈیٹر، چیف رپورٹر، کرائم رپورٹر، اسپورٹس رپورٹر اور اسپیشل کرسپانڈنٹ کے ساتھ ساتھ مختلف شہروں میں نامہ نگار اور رپورٹر ہوں اور انھیں وہی سہولتیں اور تنخواہیں دی جائیں جو ایک ملکی اخبار کے نامہ نگاروں اور نمائندوں کو دی جاتی ہیں تو اُردو اخبارات بھی قومی کہے جانے والے انگریزی اور ہندی اخبارات کے شانہ بہ شانہ نظر آئیں گے لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ قومی اخبارات کے بیرونِ شہر نمائندوں اور نامہ نگاروں کو جو سہولتیں اور تنخواہیں دی جاتی ہیں وہ تنخواہیں اور سہولتیں اُردو اخبار کے دفتر میں کام کرنے والوں کو نہیں مل پاتیں۔ اس کے علاوہ پرنٹنگ کی کوالٹی پر بھی کوئی توجہ نہیں دی جاتی جب کہ بہترین کاغذ، بہترین طباعت اور ملٹی کلر اخباروں کا زمانہ ہے اس دور میں جب کہ الیکٹرانک میڈیا پرنٹ میڈیا کو خاص نقصان پہنچا رہا ہے تو انگریزی اور ہندی کے اخبارات اپنی چمک دمک اور کوالٹی میں اضافہ کر کے اپنا وجود برقرار رکھنے میں کامیاب ہیں جب کہ اُردو اخبارات آج بھی پرانے دور میں جی رہے ہیں اور زمانے کے ساتھ چلنے کا شعور ابھی تک ان کے اندر پیدا نہیں ہوا ہے۔

اگر مذکورہ بالا باتوں پر توجہ دے کر اُردو صحافت کی خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کی جائے تو ان اُردو صحافیوں کو جو معقول تنخواہ اور سہولتوں کی خاطر انگریزی اخبارات کی طرف رُخ کرتے ہیں، نہ صرف روکا جا سکتا ہے بلکہ اُردو صحافت کو خیرباد کہہ چکے صحافیوں کو بھی دوبارہ واپس لایا جا سکتا ہے اور تجربہ کار و باصلاحیت صحافیوں کی نئی کھیپ بھی تیار کی جا سکتی ہے ●●

مولانا ہادی نقشبندی

قائد اعظم محمد علی جناح کی اصول پرستی

علیگڑھ کے زمانۂ طالب علمی میں قائد اعظم محمد علی جناح سے قریب رہنے، اجتماعات کلکتہ
پٹنہ، دہلی وناگپور میں ساتھ کام کرنے اور رسالہ "بیداری" و AWAKENING کے دورِ ادارت
میں ان سے استفادہ کے کافی مواقع ملے چند واقعات پیش ہیں۔

قائد اعظم کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ عزم بے باک کے مالک تھے جو بھی
قدم اٹھاتے، سوچ سمجھ کر اپنا راستہ متعین کرتے اور اس پر بلا دھڑک گام زن ہو جاتے
نیز اس پر اس درجہ مطمئن رہتے کہ نہ اپنی قیادت، شہرت، عظمت اور ہر دلعزیزی
کی پرواہ کرتے اور نہ انہیں کسی ستائش اور صلہ کی خواہش ہوتی، وہ اپنے اصول پر انتہائی سختی
سے عمل کرتے جہاں سے انہیں دنیا کی کوئی قوت اس جادۂ استقامت سے منحرف نہ کر سکتی

۱۹۳۸ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا چھبیسواں اجلاس پٹنہ میں قائد اعظم کی صدارت میں
ہو رہا ہے جلسۂ عام میں تمام صوبائی صدور اور اکابرین نے مکمل اتحاد سے پُر جوش انداز میں ستیہ گرہ
کی تجویز پر تقاریر کیں جنھیں قائد اعظم نے انتہائی سکون و اطمینان سے سنا۔

اسی شام ۲۶ دسمبر ۱۹۳۸ء کو "بیت العزیز" دولت کدہ سید عبد العزیز صدر استقبالیہ
پر نواب بہادر یار جنگ کے عصرانہ کے اہتمام میں مصروف تھا، بعد عصرانہ اسی مقام پر
آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا اجلاس قائد اعظم کی صدارت میں شروع ہوا جس میں ستیہ گرہ
کی تائید میں گرما گرم بحث جاری ہے قبل اس کے کہ تجویز پاس ہو، قائد اعظم اٹھے اور فرمایا
آپ سب لوگ ستیہ گرہ چاہتے ہیں مجھے اس سے اختلاف ہے اور میری یہ سوچی سمجھی رائے

ت اسلامیہ ابھی اس کے لئے تیار نہیں اور نہ یہ اس کے لئے مفید ہے لہذا میں
پ کے جذبات کا احترام میں آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت سے مستعفی ہوتا ہوں ۔"
سنتے ہی پورے جلسہ پر خاموشی طاری ہو گئی تمام جوش و خروش سرد پڑ گیا اور سب نے
قہ طور پر بیک زبان عرض کیا کہ جب آپ کو سیتہ گرہ سے اتفاق نہیں ہے تو ہم
تجویز واپس لیتے ہیں آپ صدارت سے مستعفی نہ ہوں۔ اس وقت عام طور پر
اری ہر پا تھی لیکن بعد کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ قائد اعظم کی رائے کس
، صائب تھی ۔

محمد علی جناح کی سابقہ زندگی جو کچھ بھی رہی ہو لیکن قائد اعظم ہونے کے بعد وہ اسلامی
ات واقدار پر حتی الوسع عملی طور پر پابند رہے چنانچہ ان کی اولاد میں انہیں ایک
ا جزادی تھیں جو انہیں دل و جان سے زیادہ عزیز و پیاری تھی جس کی اسلامی تعلیم و
یت کے لئے قائد اعظم نے مولانا شوکت علی کے مشورہ سے رئیس احمد جعفری (صاحب
ت محمد علی و حیات جناح) کو اتالیق مقرر کیا جو صاحبزادی صاحبہ کو اسلامی تعلیمات
معلومات فراہم کرتے لیکن یہ صاحبزادی اپنی پارسی نانی کے زیر پرورش رہی تھی
وجہ سختی سے ہر اس عمل سے جو جعفری صاحب کرواتے مخالفت کرتی جس کی وجہ
عظم نے کئی مرتبہ تنبیہ کی اور سزائیں دیں اکثر مواقع پر مس جناح بیچ بچاؤ کرتی رہیں
صاحبزادی اپنی عادتوں پر متعصبانہ طور پر قائم رہی جس کی وجہ انتہائی مجبور ہو کر
عظم نے اپنی اس عزیز ترین صاحبزادی سے قطع تعلق کر لیا۔ یہاں تک کہ وہ اس کے
ئد اعظم کی حیات میں اُن سے نہ مل سکیں البتہ قائد اعظم نے اس کے باوجود
س کے اسلامی ورثہ سے محروم نہ کیا اپنے پینتیس ۳۵ لاکھ کے اندوختہ میں سے
لاکھ پورے ہندوستان کے مسلم اداروں کو بانٹ دیئے باقی چار ۴ لاکھ میں سے دو ۲
بزادی اور دو ۲ لاکھ مسز جناح کے نام وصیت کی ۔ یہ قائد اعظم کی اصول پرستی کی

انتہائی سخت ترین مثال ہے جو دل صاحب اولاد ہے انصاف طلب ہے۔

حسب عمل در آمد ۱۰ مارچ ۱۹۴۱ء کو قائداعظم مسلم یونیورسٹی علیگڈھ تشریف لائے ہوئے ہیں۔ " قیام حبیب منزل " میرس روڈ پر ہے قائداعظم کے جلسوں میں شرکت کے لئے باوجود تیاری امتحان طلباء جوق در جوق قائداعظم کی تقریر سننے مسلم یونیورسٹی " حامد یونین ہال " پہنچ رہے ہیں۔ اس دوران طلباء کا ایک وفد قائداعظم کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ قائداعظم ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد صاحب سے کہہ کر امتحانات یونیورسٹی کو پندرہ دن تاخیر سے کروادیں۔ یہ سنتے ہی قائداعظم نے ڈانٹا کہ میں نے تم سے یہ نہیں کہا تھا کہ تم جس مقصد کے لئے آئے ہوئے ہو میری خاطر اُسے پس پشت ڈال کر میری تقریر سنو، تمھیں ہر حالت میں اپنا فرض پہلے ادا کرنا ہے بعد میں دوسرے کام ہوں۔ بہر حال قائداعظم نے اپنی اصول پرستی کے پیشِ نظر طلباء کی اس درخواست کو مسترد کر دیا۔

ناگپور میں ۲۶ دسمبر ۱۹۴۱ء کو آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا پانچواں اجلاس ہے دوسرے روز ۲۷ دسمبر ۱۹۴۱ء کی صبح دس بجے قائداعظم کھلے عام اجلاس کی صدارت فرما رہے ہیں بے خیالی میں سگریٹ کیس نکال کر جلانا چاہتے تھے کہ عقب سے میں نے نکل کر قائداعظم سے عرض کیا کہ یہ ماہ صیام مبارک ہے اور آج ۲۱ رمضان المبارک حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا یوم شہادت ہے یہ سنتے ہی قائداعظم نے سگریٹ مسل کر پھینک دی اور سگریٹ کیس مجھے دے دیا۔

۱۹۴۲ء میں قائداعظم محمد علی جناح حسب روایت ۲ نومبر کو مسلم یونیورسٹی آئے ہوئے ہیں قیام نواب صدر یار جنگ محمد حبیب الرحمن خان شیروانی کے دولت کدہ " حبیب منزل " میرس روڈ میں ہے جہاں شام ۵ بجے طلباء مسلم یونیورسٹی کا جم غفیر ہے مختلف انجمنوں اور ہال کی جانب سے فوٹو گروپ کھنچوائے جارہے ہیں مسلم یوتھ مجلس دکن ٹائمس کی شاخ

علیگڈھ کا سکریٹری قائداعظم کو فوٹو کھینچوانے لایا پہلے قائداعظم نے فرمایا میں مسلم لیگ کے علاوہ کسی اور جماعت کا فوٹو نہ کھینچواؤں گا۔ قائداعظم واپس ہو رہے تھے کہ میں اتنے میں پہنچا اور بحیثیت صدر مجلس میں نے عرض کیا کہ یہ بچہ مسلم لیگ ہے اس پر فوراً قائداعظم تیار ہو گئے۔

قائداعظم محمد علی جناح کے سالانہ روایتی دورہ مسلم یونیورسٹی کے موقع پر ۹ مارچ ۱۹۴۴ء کو ہادی نقشبندی چیف ایڈیٹر اوکنگ، نائب صدر یوپی مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن نے قائداعظم کی خدمت میں مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کے رام پور ہال میں اردو میں سپاسنامہ پیش کیا۔ اس موقع پر قائداعظم کے ساتھ نوابزادہ لیاقت علی خاں، راجہ میر احمد خاں محمود آباد، ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد وائس چانسلر پروفیسر ابو بکر احمد حلیم پرو وائس چانسلر موجود تھے۔ اس موقع کی تصویر خدا بخش لائبریری جرنل شمارہ نمبر ۹۴ میں شائع ہو چکی ہے اس وقت بھی قائداعظم نے فوٹو لیتے وقت اپنے اصول کے پیش نظر دریافت فرمایا "کہ کیا فوٹو گرافر مسلم ہے۔"

(بقیہ سلسلہ صـ ۴۵ سے آگے)

تمام قانونی قیود سے آزاد ہو جائے گی۔

تیسرے یہ کہ اس پہلو کو بھی ملحوظ رکھا جائے کہ پنجاب میں جنگجوئیت ۱۹۸۰ء کے اوائل میں سکھ انتہا پسندی اور بنیاد پرستی کے نتیجہ میں پیدا ہوئی تھی ان کی دہشت گردی پر تنقید کرنے والے غیر سکھ آرگنائزیشن انتہا پسند اور بنیاد پرست سکھوں کا نشانہ بنے تھے اس لئے یہ بات بالکل فطری تھی کہ انتہا پسند اور بنیاد پرست سکھوں کی کارروائی کا نشانہ بننے والوں نے سخت کارروائی کا مطالبہ کیا تھا لیکن پولیس نے سخت کارروائی کی انتہا کر دی تھی جو جمہوری تنظیمیں اب زیادتی اور مظالم کرنے والی پولیس کے خلاف کارروائی کا مطالبہ کر رہی تو وہ عوام کی نمائندگی اور ترجمانی کر رہی ہیں اب پولیس کے مظالم اور جبر و قہر پر پردہ ڈالنے کی کوئی بھی کوشش خطرناک نتائج و عواقب پیدا کرے گی۔ ■

پروفیسر سُدھیر راؤ دت (مراٹھی تحریر)
(ترجمہ) قاضی رؤف انجم

ڈاکٹر محبوب راہی کا سفر پستیوں سے بلندیوں تک

بلڈانہ ضلع کے ماٹر گاؤں جیسے چھوٹے سے دیہات میں محمود خاں پٹیل کے عزیز خاندان میں ۲۰ جون ۱۹۳۹ء کو پیدا ہونے والے اور آزادی کے بعد کے ماحول میں تربیت پانے والے محبوب راہی نے دنیا بھر کے اردو داں طبقے میں اپنے نام اور فن کے اعتبار سے ایک نمایاں مقام حاصل کر لیا ہے۔

مہاراشٹرا میں پٹیل گھرانے ایک زمانے میں گاؤں بھر میں حاکمیت اور نظم و نسق کی ذمہ داری سنبھالنے والے ہوا کرتے تھے لیکن اس عہدے سے سبکدوشی کے بعد محبوب راہی کے خاندان پر مزدوری تک کی نوبت آن پڑی تھی۔ کھیل کود کی عمر ہی میں جنگل سے گوبر کے اُپلے چن کر لانے اور جنگل ہی سے ندی کے پانی میں بہہ کر آ جانے والی سوکھی لکڑیاں پکڑ کر گھر کا چولھا جلائے رکھنے کے لئے معصوم راہی کو بھی اپنا حصہ ادا کرنا پڑا۔

لکڑیاں پکڑنے اور اُپلے چننے والے ہاتھوں نے قلم پکڑنے کی ہمت کی۔ بیبل گاؤں راجا کی پرائمری اسکول سے ہفتم جماعت ۱۹۵۳ء میں پاس کیا لیکن خاندان کی کفالت کرنے والے باپ کی ذمہ داری کم کرنے کے خیال سے یہ ہاتھ بھی بے کار نہیں رہے ؎

دُکھ کی دھوپیوں میں کبھی غم کے گھنے سایوں میں ؛ زندگی کشتی ہے ہر طور پہ کٹ جائے گی

دکھ جھیلتے جھیلتے زندگی گزارنے کا پختہ عزم ان کے اندر پیدا ہوا۔ بنیادی طور پر علم کی چاٹ رکھنے والا دل خاموش نہیں رہا۔ ۱۹۵۸ء میں بالاپور ڈسی ایڈ کالج سے معلمی کا ڈپلوما لے کر ملڈانہ ضلع بیراشیدھ کے گوندھنا پور اردو پرائمری اسکول میں معلم کے عہدے پر تقرر ہوا۔ روزی روٹی کا مسئلہ کسی حد تک حل ہو گیا۔ کدال پکڑنے والے ہاتھوں میں کھریا آتے ہی حصولِ علم کی ادھوری خواہش ابھر آئی۔ زندگی میں کچھ کر دکھانے کا عزم پیپل گاؤں، لاکھن واڑہ جیسے دیہاتوں میں ایک طرف گھر سنسار، دوسری طرف کامنیا ملازمت کی لگن! اپنی ٹٹ پونجیا تنخواہ میں ہی یہ ذمہ داریاں سنبھالتے ہوئے اَن تھک محنت کر کے پہلے میٹرک اور پھر بی اے کی ڈگری پرائیوٹ طالبِ علم کی حیثیت سے حاصل کی۔ اسی پر اطمینان نہ کر کے علم کی شمع جلائے ہی رکھی، اپنے چلنے کے لئے راستہ خود ہی بنایا۔ اسی لیئے اتنے ناگفتہ حالات میں بھی شاعر ایسے شعر کہہ سکا ؎

راہی میں خود اپنا ہمراہی بھی رہبر بھی ÷ اپنا رستہ آپ بنانا مجھ کو اچھا آتا ہے

ایسے ہی حالات میں ان کی شاعری پھلتی پھولتی رہی۔ اُن کی پہلی غزل ۱۹۶۲ء میں اردو ٹائمز بمبئی میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد چھوٹے بڑے اردو روزناموں، ہفتہ وارں، ماہناموں، ڈائجسٹوں میں اُن کا فن جھلکنے لگا۔ مذہبی، سماجی، علمی، سماجی، قومی ہم آہنگی وغیرہ موضوعات پر مضامین طنز و مزاح، تبصرے، تنقیدیں اسی طرح بچوں کے لئے نظمیں بھی ادب تخلیق کر کے ان کا قلم پورے ہندوستان سے اپنی اہمیت کا لوہا منوانے لگا ؎

یوں ہی بہنے دو خیالات کا دھارا راہی ÷ دیر تک پانی جو رکتا ہے تو سڑ جاتا ہے

اسی اصولوں کو اپناتے ہوئے محبوب راہی کے حساس دل کو فنِ غزل محبوب ہو گیا ؎

لہو دل کا نچوڑے فنِ غزل کا ÷ نکھرتا ہے تبھی جوبن غزل کا
زمانے، راج، تخت و تاج سب سے ÷ مگر ڈولانہ سنہاسن غزل کا

اسی پختہ یقین نے ان کے دل پر فنِ غزل کا نقش جما دیا۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں اپنے

والے عام آدمی کی زندگی، اس کی اپنے وجود کو قائم رکھنے کی جدو جہد، اس کے دکھ درد، اس کی تمنائیں اور اس کی تہذیب کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ نیچے سے اوپر تک بوسیدہ ہو جانے والے سماج بندھنوں سے لڑتے لڑتے حالات سے مجبور اور مایوس انسان، ان کی غزلوں کا عنوان ہے ع

نراشاؤں کا اک تپتا ہوا صحرا ہے ہر جیون ؛ دکھوں کو آج کے یُگ کی کہانی کا ورثہ

عام آدمی کی یہی مجبوریاں اُن کی راہ میں بھی آن کھڑی ہوتی ہیں۔ دکھوں سے کنارہ نہ کر کے شاعر انہیں گلے لگا لیتا ہے اپنی غرض اور مجبوری کا اُسے بیک وقت احساس ہوتا ہے اس کر حالات میں شاعر کا قلم کچھ یوں لکھ جاتا ہے ع

دونوں کی ضرورت ہے دونوں کی ہے مجبوری ؛ میں غم کو نہ چھوڑوں گا غم مجھ کو نہ چھوڑے

"غم" انسانی زندگی کی اس آخری سچائی کو شاعر کا دل قبول کر لیتا ہے۔ اس کی بس ایک تمنا ہے۔ شاعر کا دکھ بہچاننے والا۔ دل رکھنے والا، اس کے زخموں پر مرہم رکھنے والا کوئی ہو؟ لیکن موجودہ نفسا نفسی کے زمانے میں بد قسمتی سے اُسے ایسا کوئی نہیں ملا ع

دیکھنے والا کوئی ہو تو دکھاؤں اس کو ؛ روح میں ہوتی ہے زخموں کی سجاوٹ کیسے

ایسا شعر وہ کہہ تو دیتا ہے لیکن پھر بھی اپنی ناہموار کھی راہِ عمر میں غزلوں کے پھول کھلا جاتا ہے اس بات کا اُسے فخر ہے تو بجا ہے ع

لکھا ہے میں نے راہی ایسی پتھریلی زمینوں پر ؛ کہ جن پر لکھتے لکھتے اچھے اچھوں کے قلم ٹ

زندگی گزارتے ہوئے انسان کو بہت سے مسائل سے سمجھوتا کرنا پڑتا ہے اس بات سے شاعر بھی اپنے آپ کو علیحدہ نہیں رکھ سکتا۔ اُسے بھی کچھ مسائل سے دو چار ہونا ہی پڑتا ہے کیونکہ وہ اپنے سماجی ماحول کا ہی ایک انگ ہوتا ہے اپنی خود سپردگی اُسے نظر آنے لگتی ہے اور وہ بے میں کہہ جاتا ہے ع

گلا میں نے خود اپنے ہاتھوں اس کا گھونٹ ڈالا ہے
وہی اک شخص کچھ خوددار سا جو میرے اندر تھا

۱۹۷۵ء میں اپنی ذاتی اغراض سے بلڈانہ ضلع پریشد سے تبادلہ کروا کے اکولہ ضلع پریشد میں بلدسی ٹاکلی کے اردو پرائمری اسکول میں اسی عہدے پر رجوع ہوتے ہیں، مائسی ٹاکلی کے خوشگوار ماحول میں قاضی رؤف انجم جیسے مخلص باشعور فنکار کی قربت انہیں نصیب ہوتی ہے، اکولہ جیسے قریبی شہر کے ادبی فائدے انہیں حاصل ہوتے ہیں، اکولہ کے بزرگ اور معروف مشہور شاعروں سے یاری ہوتی ہے آپس میں گفت و شنید، تبادلہ خیال، گھریلو نشستوں کا اہتمام ہوتا ہے۔ قلم کو ایک امتیازی دھار ملتی ہے ہر اردو ہفتہ وار، روزناموں اور ماہناموں میں محبوب راہی کا نام جھلکنے لگتا ہے۔ مشاعروں میں اسی نام کی گونج ہونے لگتی ہے۔ اخبارات و رسائل نیز آکاشوانی کے ذریعہ یہ نام ادب نوازوں کے دلوں پر نقش ہوتا جاتا ہے اسی دوران ان کی غزلوں کا پہلا مجموعہ "ثبات" شائع ہوتا ہے جسے ۱۹۸۱ء میں بہار اور مہاراشٹرا کی اردو اکاڈمیوں کا دوسرا انعام بیک وقت حاصل ہوتا ہے۔ پہلے ہی مجموعے سے "محبوب راہی" اس نام کی ادبی اہمیت کو قاری کے ساتھ ساتھ ریاستی حکومت بھی تسلیم کی سند عطا کر دیتی ہے انعامات کی بوچھار شاعر کی شاعری میں اُبال پیدا کر دیتی ہے اور وہ مسلسل غزلیں کہتا جاتا ہے دوسرے مجموعے "تردید" کو مہاراشٹرا اردو اکاڈمی کا پہلا انعام ملتا ہے تو رنگا رنگ۔ اس بچوں کی نظموں کے مجموعے کو بہار اور مہاراشٹرا اردو اکاڈمیوں کا دوسرا انعام حاصل ہوتا ہے اس طرح ان کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہوتے ہیں۔ مہاراشٹرا کے محکمۂ تعلیم کی سفارش کے نتیجہ میں ہر سرکاری اسکول اور کتب خانوں میں وہ خریدے جاتے ہیں "بازیافت" اور "گل بوٹے" ان دونوں مجموعوں کو مہاراشٹرا ریاست کی اردو اکاڈمی کا دوسرا انعام حاصل ہوتا ہے انعامات کی یہ بوچھار ان کے نام کے اطراف شہرت کا حصار باندھ دیتی ہے لیکن چونکہ محبوب راہی جو لوگوں کے رجحانات سے پوری طرح واقف ہے اپنے آپ سے یوں بھی کہہ لیتے ہیں ؎

راہی تم بھی کتنے سادہ لوح ہو ☆ یہ زمانہ ہے یہ کب کس کا ہوا

اسی دوران اردو لٹریچر سے وہ ایم اے کی ڈگری حاصل کر لیتے ہیں اُن کے اندر کا نقّاد،

متبحر اور محقق بیدار ہو اٹھتا ہے۔ ڈاکٹر منشاء الرحمن خان منشاء کی رہنمائی میں تحقیق
کا کام شروع ہوتا ہے ۱۹۸۴ء میں ڈاکٹر مظفر حنفی ' شخصیت اور فن ' اس موضوع
تحقیق کے لئے ناگپور یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی امتیازی ڈگری بحال کی جاتی ہے ۱۹۸۶ء
انہیں مثالی معلم کا امتیازی انعام اور تمغہ بھارت کے راشٹرپتی آر وینکٹ رمن کے ہاتھوں د
جاتا ہے اور ایک پرائمری مدرس کی ایماندارانہ ملازمت کی سند پر مہر تصدیق ثبت ہو جاتی
اس بے پناہ مسرت کی ایک جھلک شاعر کے قلم سے یوں پھسل پڑتی ہے ع

اب مری مٹھی میں سورج بند ہے ÷ دیکھتا ہوں اب کدھر جاتی ہے دھو

جگہ جگہ اعزازات سے نوازے جاتے ہیں لیکن فوراً انہیں محسوس ہو جاتا ہے ع

غرض کے سکوں میں یہ لوگ ڈھالتے ہیں مجھے ÷ ہتھیلیوں پہ پھر اپنی اچھالتے ہیں مجھے

اسی زمانے میں جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی سے پروفیسر کی ملازمت کی پیشکش کی جاتی
لیکن بڑے شہروں کے ماحول سے وہ پوری طرح واقف ہوتے ہیں ع

وحشت کا پہرہ ہے ہر دروازے پر ÷ لوگ گھروں سے ڈر کر بھاگ رہے ہیں

بھیڑ بھاڑ میں انسانوں کی ÷ انسان خود کو ڈھونڈ رہا ہے

ایسے شہری ماحول میں محبوب راہی صاحب برار کو بھلا کیسے لگے؟ ع

آؤ پھر سے لوٹ چلیں گاؤں کی طرف ÷ شہروں کی ہاؤ ہو سے تو اب جی اچٹ گیا

لیکن گاؤں میں بھی انھیں یہی تجربہ ہوتا ہے اور وہ بے اختیار کہہ اٹھتے ہیں ۔ ہ

گھنا سا ایک پیپل جو ہمارے گاؤں میں تھا ÷ وہاں اب کوئلے کی اک بڑی سی بھٹی ہے

پرائمری ٹیچر کی ملازمت کرتے کرتے راہی سماج کے کڑوے تیکھے تیوروں کو محسوس کر
چکے ہیں اور یہی احساس ان کی غزلوں میں ثبت ہوتا رہتا ہے ع

زہر ہے حالات کے پر گز بدل مر سکتا نہیں ÷ پیا ہوں شنکر اک سمندر زہر کا مجھ میں بھی

ادب کی بلندی سے آبشار کی طرح گرنے والی شاعرانہ زندگی میں کچھ تبدیلیاں بھی گوا

پڑتی ہیں اور اُن کا احساس ہوتے ہی وہ کہہ اٹھتے ہیں ؎

راہی میں ٹکڑے ٹکڑے سے ہو ہو کر ⁂ حرام خوروں میں بٹ رہا ہوں

انہی تبدیلیوں کے دوران کچھ دنوں تک اپنی زندگی میں یاسیت کی دراندازی سے بھی دوچار ہوتے ہیں اور کچھ دنوں تنہائی کا بھی شکار رہتے ہیں لیکن بڑے حوصلے کے ساتھ اپنے آپ کو سنبھال لیتے ہیں اس کیفیت کو ایک شاعر کا "پونر جنم" زندگی بعداز مرگ کہنا میں زیادہ مناسب سمجھتا ہوں ؎

ساری دنیا سے کٹ رہا ہوں ⁂ اپنے اندر سمٹ رہا ہوں

یاسیت کے خول سے باہر آنے کے اسی زمانے میں ایک واقعہ ایسا پیش آتا ہے جو محبوب راہی کو پھر شاد و مسرور کر کے اپنی شاعرانہ ڈھب پر لے آتا ہے ۱۹۸۹ء میں بارسی ٹاکلی جیسے ترقی پذیر گاؤں میں غلام نبی آزاد کالج (آرٹس و کامرس) کی بنیاد پڑتی ہے جس میں انہیں اردو کے لکچرر کے ساتھ ساتھ پرنسپل کا عہدہ بھی گھر بیٹھے حاصل ہوتا ہے۔ اپنی پوری زندگی میں ذخیرہ کیا ہوا اردو ادب کا علمی سرمایہ وہ اپنے طلباء کی جھولیوں میں ڈالنا شروع کر دیتے ہیں اور ایک بے پناہ روحانی مسرت وہ اپنے قلب کے اندر محسوس کرتے ہیں ؎

وقت کا کوئی ٹھکانہ ہے نہ کوئی رنگ و روپ ⁂ جب بھی آئے گا نیا چولا بدل کر آئے گا

زندگی میں کچھ غیر معمولی نیکی کرنے کا اطمینانِ قلب انہیں اس ملازمت سے حاصل ہوتا ہے۔ ۱۹۹۱ء میں اسی کالج میں راقم السطور بھی پروفیسر کی حیثیت سے داخل ہوتا ہے یوں تو راہی سے میں پہلے ہی سے واقف ہوں لیکن شاعری کے واسطے سے اور قریب جا کر راہی کے دل کے اندر کسی حد تک جھانک سکتا ہوں۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ راہی کا دل ایک بچے کی طرح معصوم ہے۔ اس موقع پر انہیں کا ایک شعر یاد آتا ہے ؎

دوست دشمن کی نہیں محبوب راہی کو تمیز ⁂ دل کی باتیں دشمنوں میں بھی اگل کر آئے گا

اور یہی سادگی انھیں ان دکھوں سے بھی دوچار کرتی ہے ؎

دوڑ میں زندگی کی اسے راہی ∴ مجھ سے آگے نکل گئے پتھر

کہا جاتا ہے کہ شاعر حساس ہوتا ہے ڈاکٹر محبوب راہی کے بارے میں بھی یہ سچ ہے۔
برسوں پہلے ان کے مجموعۂ "ثبات" کے یہ اشعار ان کے اسی احساس کے عکاس ہیں ع

مندروں میں اب بکیں گے وید و گیتا کے شلوک
مسجدوں میں بیٹھ کر قرآن بیچے جائیں گے
ہے سجھئی کی منڈیوں کا رنگ کچھ ایسا کہ اب
مورکھوں کے ہاتھ بدھی مان بیچے جائیں گے

آج انسان کی اخلاقی گراوٹ کا یہ عالم ہے کہ ایک زمانے میں یگانگت اور اتحاد کے
علم بردار ہندوستان کی یہ ٹوٹی ہوئی تصویر شاعر کے حساس دل کے بھی ٹکڑے کر دیتی ہے اور
وہ دکھ بھرے لہجے میں کہتا ہے ع

مذہب، سماج، ملک، زبان، قوم، خاندان
اک آدمی تھا سینکڑوں خانوں میں بٹ گیا

اور ان سینکڑوں خانوں میں بٹے ہوئے اس آدمی کو دیکھ کر وہ خود یوں محسوس کرتے ہیں ع

آدمی پر جو نظر آج کے پڑتی ہے مری
آدمی ہونے پہ خود اپنے حیا لگتی ہے

شاداب میں مضامین اور تخلیقات کی اشاعت کے لئے غیر مطبوعہ
ہونا لازم ہے ● تخلیقات کا صاف خوش خط ہونا ضروری ہے
شاداب، ریڈ ہلز۔ حیدرآباد ۔ اے پی

معصوم مرادآبادی

[illegible] مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن

مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی دور کرنے کے لئے قائم کئے گئے مولانا آزاد ایجوکیشن
ونڈیشن کا پیسہ غیر مسلم اداروں پر صرف کیا جارہا ہے۔ مرکزی وزیر بہبود مسٹر بلونت سنگھ
مووالیہ اوران کی وزارت میں موجود بیوروکریسی ایسے حالات پیدا کرنے پر آمادہ نظر
تی ہے جس سے اس فاونڈیشن کی راہیں مسدود ہو جائیں اور آزادی کے پچاس برسوں
پہلی بار مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے کے لئے حکومت کی طرف سے قائم کیا گیا یہ
ارہ مفلوج ہوکر رہ جائے۔ حالات اس درجہ ابتر ہوگئے ہیں کہ ایک مرحلہ میں فاونڈیشن
نائب صدر سید حامد نے استعفیٰ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مسٹر بلونت سنگھ راموالیہ کی بیجا
اخلت کے نتیجے میں دیگر ممبران بھی دلبرداشتہ نظر آتے ہیں

حال ہی میں فاونڈیشن کی ایک خطیر رقم سکھوں کے ایک تعلیمی ادارے کو دینے کا فیصلہ
ٹر راموالیہ نے ضابطوں کو بالائے طاق رکھ کر از خود لے لیا۔ جس سے فاونڈیشن کے ممبران
بے چینی پیدا ہونا ایک لازمی بات تھی بلونت سنگھ راموالیہ مرکزی وزیر بہبود کے طور پر
ونڈیشن کے صدر ہیں اور اس کے ممبران کی کل تعداد ۱۵ ہے چونکہ فاونڈیشن کے پاس آج
تاریخ میں امداد پانے کے مستحق تعلیمی اداروں کی طرف سے ۵ کروڑ روپے سے زیادہ کی درخواستیں
قار میں پڑی ہوئی ہیں اور فاونڈیشن اپنے محدود وسائل کے تحت ان درخواستوں کو
را کرنے میں ناکام ہے۔ ان حالات میں مستحق تعلیمی اداروں کی درخواستوں کو نظر انداز کر کے

غیر مستحق اداروں کو امداد دینا اپنے آپ میں تشویش ناک بات ہے۔

۱۹۸۹ء میں جب حکومت ہند نے مولانا آزاد ایجوکیشن فاونڈیشن بنانے ۳۰ کروڑ روپے کا اعلان کیا تو اس کے دائرہ کار کا بھی تعین کر دیا گیا تھا اس میں کہا گیا ہے کہ فاونڈیشن کے قیام کا مقصد تعلیمی طور پر پسماندہ اقلیتوں کو اوپر اٹھانے سے عبارت ہے۔ سوال یہ ہے کہ تعلیمی طور پر پسماندہ اقلیتیں کون سی ہیں اس کی وضاحت خود حکومت ہند نے کی ہے۔ گوپال سنگھ کمیشن کی رپورٹ کی روشنی میں محض دو اقلیتوں یعنی مسلمانوں اور نیو بدھسٹ کو تعلیمی طور پر پسماندہ تسلیم کیا گیا ہے سکھ اقلیت کا اس زمرے میں کوئی نام و نشان نہیں ہے خود حکومت ہند کی افرادی وسائل سے متعلق وزارت (ایچ آر ڈی) نے اپنے پروگرام آف ایکشن میں مسلمانوں اور نیو بدھسٹ کو تعلیمی طور پر ڈکلیر کیا ہے۔

پس منظر میں دیکھیں تو صاف نظر آتا ہے کہ فاونڈیشن کے قیام کے پس پردہ محض مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے کا مقصد پوشیدہ تھا جس کی وضاحت اس وقت کی مرکزی وزیر بہبود مسز راجندر کماری باجپائی نے شروع دن ہی کر دی تھی۔ مولانا آزاد فاونڈیشن کے قیام کے سلسلے میں سب سے پہلے اعلان ۲۹ نومبر ۱۹۸۸ء کو کیا گیا۔ آنجہانی وزیر اعظم راجیو گاندھی کے دور اقتدار میں مرکز کی وزیر بہبود نے ایک فلاحی تنظیم کے دو کیشنل کورس کے جلسہ تقسیم اسناد میں تقریر کرتے ہوئے یہ کہا کہ مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی دور کرنے کیلئے حکومت ہند ایک ایجوکیشن فاونڈیشن کے قیام پر غور کر رہی ہے۔ مسز راجندر کماری باجپائی کے اس اعلان کی خبر حکومت ہند کے محکمہ اطلاعات نے باقاعدہ ایک پریس ریلیز جاری کر کے اخبارات کو دی جس میں لفظ "مسلمان" پر خاص زور دیا گیا اور یہ خبر ملک کے تمام اہم اخبارات میں نمایاں طور پر شائع ہوئی۔

انہی دنوں مولانا ابوالکلام آزاد کے یوم پیدائش کی صد سالہ تقریبات منائی جارہی تھیں۔ لہٰذا اسی مناسبت سے فاونڈیشن کا نام مولانا آزاد ایجوکیشن فاونڈیشن رکھ کر اس کے باضابطہ قیام کا اعلان ۱۹۸۹ء میں کر دیا گیا۔ سوسائٹیز رجسٹریشن ایکٹ مجریہ ۱۸۶۰ کے تحت ۶ جولائی ۱۹۸۹ء

کو قاعدہ فاؤنڈیشن کو رجسٹر کرایا گیا۔ لیکن بعض تکنیکی دشواریوں کے سبب ۱۹۸۴ء کے وسط میں ہی فاؤنڈیشن نے باضابطہ کام کرنا شروع کیا۔ ۱۹۹۳ء سے ۱۲۵ [illegible] (ان) دو قسطوں کی فاؤنڈیشن کو ۳۰ کروڑ ایک لاکھ روپئے کا سرمایہ دیا گیا۔ ابتداء مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن سینٹرل وقف کونسل کے ایک حصہ کے طور پر کام کرتا رہا لیکن بعدازاں فاؤنڈیشن کو ایک علیحدہ حیثیت حاصل ہوگئی۔ فی الوقت فاؤنڈیشن کو اپنے مجموعی سرمایہ یعنی ۳۰ کروڑ ایک لاکھ روپئے پر سالانہ ۴ کروڑ ۱۲ لاکھ روپئے کا سود مل رہا ہے جو فاؤنڈیشن کے بنیادی مقصد کی تکمیل نہیں کرتا اور فاؤنڈیشن کو سرمایے کی قلت کا شدت سے احساس ہے۔

فاؤنڈیشن کی دو بنیادی اسکیمیں ہیں جن میں سے پہلی لڑکیوں کے رہائشی اسکولوں کے قیام سے متعلق ہے اور دوسری پیشہ وارانہ تربیتی کورسیز سے متعلق۔ اس میں پہلی اسکیم کو فوقیت حاصل ہے چونکہ فاؤنڈیشن کی خاص توجہ تعلیم نسواں پر ہے چونکہ فاؤنڈیشن کی خاص توجہ تعلیم نسواں پر ہے اس کے تحت لڑکیوں کے اچھے اسکولوں میں رہائشی ہاسٹل بنانا، اسکولوں کی عمارتوں کی توسیع لائبریری، لیب وغیرہ پر عمارتیں بنانا شامل ہے دوسری اسکیم میں چھوٹے چھوٹے ووکیشنل ٹریننگ سنٹر، الکٹرانکس، ریفریجریشن، آرٹ کرافٹ، ٹی وی، ریڈیو میکنک کی تربیت کے علاوہ فاؤنڈیشن نے اسی اسکیم کے تحت پولی ٹیکنک، انجینئرنگ کالج، ڈینٹل کالج وغیرہ کی مدد کرنا بھی شروع کردی ہے فاؤنڈیشن اپنے قیام سے ۳۱ مارچ ۱۹۹۷ء تک ملک کے ۷۰ اداروں کو تقریباً ۸ کروڑ ۶۸ لاکھ روپے کی امداد دے چکا ہے لیکن ۴ کروڑ روپیے ۱۲ لاکھ روپیے سالانہ آمدنی سے مستحق اداروں کی مدد کرنے میں فاؤنڈیشن کے پاس۔ ۵ کروڑ روپے کی امداد پانے والے اداروں کی درخواستیں التواء میں پڑی ہوئی ہیں۔ فاؤنڈیشن کو چار پراجیکٹ یومیہ موصول ہوتے ہیں ذرائع کا کہنا ہے کہ فاؤنڈیشن کا مجموعی اثاثہ اگر ۲۰۰ کروڑ کردیا جائے تو اسے آسانی کے ساتھ اپنا مقصد حاصل ہوسکتا ہے۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ موجودہ حکومت فاؤنڈیشن کا اثاثہ بڑھانے کے بجائے اس کے موجودہ وسائل کو بھی تتر بتر کرنے پر آمادہ نظر آتی ہے مرکزی وزیر بہبود بلونت سنگھ راموالیہ نے صدر

کی حیثیت سے حال ہی میں سہارن پور (یو پی) کے ایک سکھ تعلیمی ادارے گرو نانک جونیئر کنیا ودیالیہ کو فاونڈیشن کے محدود سرمائے سے ۱۵ لاکھ روپیئے منظور کیئے جو فاونڈیشن کے بنیادی مقصد سے کھلواڑ ہے۔

بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی۔ قابل غور نکتہ یہ بھی ہے کہ حکومت نے فاونڈیشن تو قائم کر دیا لیکن اسے اپنا دفتر قائم کرنے کے لئے کئی سال بعد بھی کوئی جگہ الاٹ نہیں کی گئی جب کہ ماضی میں حکومت نے اس قسم کے فاونڈیشن کو باقاعدہ سرکاری عمارتیں الاٹ کی گئی ہیں اسی طرز پر امبیڈکر فاونڈیشن قائم ہوا اور اسے دفتر کے لیئے ایک بڑا بنگلہ الاٹ کر دیا گیا جبکہ مولانا آزاد فاونڈیشن آج بھی ہمدرد ایجوکیشن آج بھی ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی نئی دہلی کی عمارت میں کرائے پر اپنی گزر بسر کرنے پر مجبور ہے فاونڈیشن نے اپنے باقاعدہ دفتر کے لیئے بے پناہ کوششیں کیں اور ہر سطح پر اس مسئلہ کو اٹھایا لیکن اب تک کسی کے کان پر جوں نہیں رینگی۔ کیا مولانا آزاد کی شخصیت ایسی گئی گزری تھی کہ حکومت نے آزادی کے پچاس سال کی تاریخ میں پہلی بار مسلمانوں کے لئے مولانا آزاد کے نام پر کوئی تعلیمی ادارہ قائم کیا اور اسے اپنا سائن بورڈ لگانے کے لیئے کوئی عمارت تک نہیں دی گئی۔ یہ المیہ نہیں تو اور کیا ہے۔

(رہنمائے دکن ۱۲٫۶٫۷۶ء سے ماخوذ)

نکھیل ہے چکرورتی



پولیس کا جبر و تشدّد

ایک ملک گیر مسئلہ

پنجاب کے ایک پولیس آفیسر اجیت سنگھ سندھو کی خودکشی نے ایک ایسا تنازعہ کھڑا کر دیا ہے کہ جو ملک گیر بن گیا۔ کیونکہ اس پولیس آفیسر کی خودکشی کے واقعہ نے کئی مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔

پنجاب سرحدی ڈسٹرکٹ ترن تارن میں مسلح جنگجوئیت کے انتہائی عروج کے زمانے میں اجیت سنگھ سندھو نے کارہائے نمایاں انجام دے کر ناموری اور شہرت حاصل کر لی تھی ان میں چند مسلح جنگجو علیٰحدگی پسند تھے اور انڈین یونین سے پنجاب کی علیٰحدگی کے پرچارک تھے اجیت سنگھ سندھو نے بڑی بے جگری کے ساتھ ان مسلح جنگجوؤں کا ان کے خفیہ اڈوں پر ہی حملہ کر کے خاتمہ کیا تھا ظاہر ہے کہ ایسی نوعیت کی کارروائیوں میں انسانی حقوق کی پامالی بھی ہو جاتی ہے۔ جنگجوؤں کے خلاف کارروائی میں اجیت سنگھ سندھو سے بھی انسانی حقوق کی پامالی ہوئی۔ پنجاب میں حالات معمول پر آنے کے بعد ایک منتخبہ مخلوط حکومت اب برسراقتدار ہے مخلوط حکومت میں اکالی دل نے بڑا حصہ پایا۔ اس لیئے پنجاب میں ہوئے زبردست جبر و تشدد کے نتائج و عواقب اب اس کو ہی بھگتنے پڑ رہے ہیں لیکن پوری انتخابی مہم کے دوران تو خاص طور پر اس نے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ عوام کو جبر و تشدّد کا نشانہ بنانے والوں کو بخشے گی نہیں۔ اس لیئے اس بات پر کوئی حیرت نہیں ہوئی کہ اجیت سنگھ سندھو جیسے سینئر آفیسروں کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ مقدمہ دائر کیا گیا یہ مقدمہ زیر دوران ہی تھا کہ اجیت سنگھ سندھو نے خودکشی کر لی۔ خودکشی کے اس واقعہ نے کئی عناصر کو سنہرا موقع فراہم کیا کہ وہ موجودہ حکومت کو نشانہ بنائیں اور اس پر یہ الزام لگائیں کہ وہ پنجاب پولیس سے انتقام

لینے لگی ہے۔ اب ایسا دعویٰ بھی کیا جانے لگا ہے کہ وہ پنجاب پولیس ہی تھی جس نے پانچ سال میں دہشت گردی پر قابو پا کر دہشت گردوں کا صفایا اور خاتمہ کر دیا تھا اس خصوص میں پنجاب پولیس کے سابق سربراہ کے پی ایس گل بہت مشہور ہو گئے تھے حسنِ اتفاق کہیئے کہ ان ہی پر یہ الزام لگا ہے کہ انہوں نے ریاستی حکومت کی ایک لیڈی آفیسر کے کولھے پر چٹکی لی تھی۔ اب وہی پی ایس گل پنجاب پولیس کے کارناموں کو اچھالنے اور اس کو اعلیٰ ترین پولیس فورس بتلانے میں اور پنجاب میں انسانی حقوق کی پاسدار تنظیموں کے خلاف بیان بازی کی مہم میں سب سے آگے ہیں اب تو یہ بھی کہا جانے لگا ہے کہ انسانی حقوق کی پاسدار تنظیمیں ہی جنگجوؤں کے لئے ایک ڈھال اور ان کی ترجمان بنی ہوئی تھیں۔ حکمران اکالی دل کے خلاف یہ بات کہی جا رہی ہے کہ اس کے خلاف مواخذے کی کارروائی کا فیصلہ کیا ہے جنہوں نے کہ دہشت گردوں سے لڑائی لڑی تھی لیکن مواخذے کی کارروائی کے لئے یہ جواز گھڑا گیا ہے کہ دہشت گردوں سے لڑائی کی آڑ میں ان پولیس ملازمین نے عوام کو جبر و تشدد کا نشانہ بنایا تھا اجیت سنگھ سندھو ایک پولیس آفیسر تھے ان کے خلاف بھی اسی بنیاد پر مواخذے کی کارروائی شروع ہوئی تھی ان پر جب عوام پر جبر و تشدد کے الزامات لگائے گئے تو انہوں نے خودکشی کا ارتکاب کیا۔ اب ایک نئی مہم چلائی جا رہی ہے کہ پنجاب کو صرف پولیس نے بچا لیا ہے۔ پولیس نے ہی پنجاب کو دہشت گردوں سے نجات دلائی ہے اسی بنیاد پر پولیس کے ہر ظلم و ستم کی مدافعت کی جا رہی ہے کے پی ایس گل کی طرح دوسرے بھی پولیس کے عمل کی مدافعت کرنے لگے ہیں۔

پنجاب میں اب جو نئی صف آرائی ہونے لگی ہے وہ خطرناک نتائج و عواقب پیدا کرے گی۔ یہ ادعا کرنا بالکل غلط ہوگا کہ پنجاب میں دہشت گردی کو پنجاب کی بہادر پولیس نے ہی ختم کیا ہے کیونکہ پنجاب میں دہشت گردی کو ختم کرنے میں اہم عنصر سیاسی رہا ہے نہ صرف یہ کہ پنجاب کے تعلق سے مرکزی حکومت کی پالیسی تبدیل ہوئی بلکہ اکالی دل نے

نے بھی سیاسی طور پر خود کو بدل ڈالا۔ پنجاب میں جنگجوئیت سے پارلیمانی سیاسیات کی سمت
سفر کے لئے تمام تر سہرے اگر پنجاب پولیس کے سر باندھ دیئے جاتے ہیں تب بھی پنجاب پولیس
کی زیادتیوں، بداعمالیوں، بدعنوانیوں، لوٹ کھسوٹ اور جبر و تشدد سے یکسر قطع نظر نہیں
کیا جاسکتا۔ پولیس فورس میں اس خصوص میں خود کے پی ایس گل کے کردار اُجلے اُجلے بے داغ نہیں
ہیں۔ صرف ایک ممتاز پولیس عہدیدار مہیر یو کی تنقید کو ایک اہمیت اور وقعت دی جاسکتی ہے
ریبیرو کو پنجاب سے ہٹا کر سفارت کار بنا دیا گیا تھا۔ پنجاب میں کئی خاندانوں کے لئے
کے پی ایس گل ایک نہایت سنگدل اور کٹھور ویلن جیسی شخصیت ہیں۔ اب وہ پنجاب میں کئی
خاندانوں کے لئے کے پی ایس گل ایک نہایت سنگدل اور کٹھور ویلن شخصیت ہیں اب وہ پنجاب
میں معمول کے مطابق حالات کا استحصال کرنے لگے ہیں۔ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ
پنجاب میں جنگجوؤں سے نمٹنے میں پولیس نے بھی سرگرم کردار ادا کیا۔ لیکن جو تبدیلی آئی وہ سیاسی
عمل کے سبب آئی۔ صرف پولیس کارروائیوں کے سبب ہی حالات نہیں بدلے۔ دوسری خطرناک
بات یہ ہے کہ علحدگی پسندی کے خلاف کسی مہم میں پولیس کے لئے مکمل چھوٹ کا مطالبہ کیا جائے پولیس
کو کھلی چھوٹ دینے کا مطلب پولیس کو ہر قسم کے تشدد اور ظلم وستم کا لائسنس دے دینا ہوگا۔
دہشت گردوں سے لڑائی کی آڑ میں یا دہشت گردوں سے لڑائی کے نام پر پولیس کو عوام کو جبر و
تشدد اور ظلم وستم کا نشانہ بنانے کی کوئی اجازت، کوئی چھوٹ، نہیں دی جاسکتی۔ کشمیر شمال
مشرقی علاقوں جیسے حساس علاقوں جیسے بھی حساس علاقوں میں پولیس کی غیر قانونی کارروائیوں کے
کئی واقعات ہیں جو کہ منظر عام پر آچکے ہیں۔ صرف پنجاب میں ہی نہیں، ہر حساس علاقے میں پولیس نے
انسانی حقوق کی پامالی کی ہے نیشنل ہیومن رائٹس کمیشن کے ریکارڈس اس بات کے گواہ ہیں ہمارے
ملک میں یہ روایت بن گئی ہے کہ ظلم و تشدد میں پولیس ایک آلہ کار بن جاتی ہے پر آشوب علاقوں
میں تو پولیس ایک آلہ کار بن جاتی ہے۔ پر آشوب علاقوں میں تو پولیس کے جبر و تشدد اور ظلم و

چھ سالہ سدھارتھ ریاضی کا ماہر

دہلی۔ چھ سالہ سدھارتھ ریاضی کا ماہر ہے سدھارتھ بھٹاچاریہ اس سال جولائی میں دوسرے درجہ میں گیا ۔لیکن اس عمر میں اس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی ہے کیونکہ وہ 2007ء تک کے کسی بھی سال کے کسی بھی مہینہ کا دن اور تاریخ فوراً بتا سکتا ہے سدھارتھ کے گھر والے ایک مرتبہ خاندان کے ایک فرد کی سالگرہ کی تاریخ پر تبادلۂ خیال کر رہے تھے جب اتفاقیہ طور پر اس کی غیر معمولی صلاحیت کا ان پر انکشاف ہوا ۔ سدھارتھ نے فوراً تاریخ بتائی جسے سن کر وہ متحیر رہ گئے۔ انہوں نے آزمانے کے لئے مزید تاریخیں پوچھیں اور اس نے تمام سوالات کے جوابات ٹھیک ٹھیک دیئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ لڑکا خاندان اور پڑوسیوں کے آنکھوں کا تارا بن گیا ۔سدھارتھ کے والدین نے ایک نیوز سروس کے دفتر میں آکر دعویٰ کیا کہ ان کا بیٹا کسی بھی سال کا دن یا مہینے صحیح صحیح بتا سکتا ہے لڑکے سے جنوری 2001ء کا کلینڈر تیار کرنے کو کہا گیا اور حیرت انگیز طور پر اس نے محض دو منٹ کے اندر نہ صرف جنوری بلکہ فروری کا بھی کلینڈر تیار کر کے رکھ دیا ۔ یہ کلینڈر جدید ترین ڈجیٹل ڈائریوں سے بالکل مطابقت رکھتے تھے لڑکا یہ بتانے سے قاصر ہے کہ آخر وہ کس بنیاد پر یہ کلینڈر تیار کرتا ہے بس وہ یہ کام کر کے بڑوں کو حیرت میں ڈال دیا کرتا ہے اس کے علاوہ سدھارتھ نے مختلف ملکوں کے جھنڈے بنانے کی بھی صلاحیت حاصل کر رکھی ہے وہ پلک جھپکے بغیر بے جوڑ نمبروں کا مضروب صحیح صحیح بتا دیتا ہے اس کے والدین کا کہنا ہے کہ چھ مہینے قبل اسے ہوم ورک کرنے کے لئے 1995ء کی ایک ڈائری دی گئی تھی سدھارتھ نے 97-1996ء کا کلینڈر دیکھا۔ کچھ حساب کتاب کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے 1998ء کا کلینڈر تیار کر لیا

(بشکریہ "منصف")

سوال ہے لیڈرشپ کا

سیتارام کیسری کا کہنا ہے کہ میں سب سے سینیئر اور تجربہ کار لیڈر ہوں اس لیئے کانگریس کا صدر مجھے ہی رہنے دیا جائے۔ لیکن شرد پوار کہتے ہیں کہ ہمیں میں زیادہ قابل آدمی ہوں اس لئے صدر مجھے بنایا جائے۔ ادھر راجیش پائلٹ کا خیال ہے کہ اس وقت کانگریس کی صدارت کے لئے میں ہی موزوں ترین لیڈر ہوں، جونیئر ہوں تو کیا ہوا، لیڈرشپ کی پوری صلاحیت رکھتا ہوں اور اگر عبدالرحمٰن انتولے کی سنی جائے تو معلوم ہوگا کہ پارٹی کی قیادت کے لئے ان سے بہتر آدمی اس وقت کوئی نہیں ہے تاہم کیسری، پوار اور انتولے اپنے سے بہتر اگر کسی کو مانتے ہیں تو وہ سونیا گاندھی ہیں جن کے بارے میں ارجن سنگھ بھی کہتے ہیں کہ کانگریس کو صرف ان کی قائدانہ صلاحیت ہی بچا سکتی ہے۔ جنتا دل کا حال بھی کچھ یہی ہے لالو پرساد کسی قیمت پر صدارت چھوڑنے کو تیار نہیں۔ جبکہ شرد یادو اور شرد یادو کا خیال ہے کہ وہ زیادہ لائق و فائق ہیں۔ پارٹی کے سوپر لیڈر وی پی سنگھ بیمار ہیں، کچھ کہہ نہیں سکتے۔ گجرال صاحب کو وزارتِ عظمیٰ سے فرصت نہیں مدھو ڈنڈوتے شاید دل ہی دل میں اپنی سینیرٹی اور اس کی بے مائیگی پر کڑھ رہے ہیں

(دعوت ۴؍۶؍۹۷ء سے ماخوذ)

مضامین صاف اور خوشخط روانہ فرمائیے
جواب طلب امور کے لئے جوابی لفافہ آنا ضروری ہے

ہاشم پورہ کی یاد میں

اطمینان کی بات ہے کہ ڈاکٹر سبرامنیم سوامی کو ہاشم پورہ ابھی تک یاد ہے اور وہ ایک بار پھر سرکار اور عوام کی توجہ اس کی جانب مبذول کرانا چاہتے ہیں ورنہ عام لوگ تو کیا خود مسلم لیڈرشپ بھی یہ بات بھولتی جارہی تھی کہ ۲۱ر مئی ۱۹۸۷ء کی رات میرٹھ کے ہاشم پورہ محلہ میں پی اے سی نے انتہائی درندگی کا مظاہرہ کیا تھا محلہ کو گھیر کر مکانوں سے زبردستی مسلم نوجوانوں کو نکالا۔ ایک جگہ جمع کیا پھر ٹرک بھر بھر کر ندی کے کنارے ان سب کو کھڑا کرکے گولیاں مار دیں اور ندی میں پھینک دیا۔ اس بے مثال ظلم کا شکار ہونے والوں کی تعداد ۲۶ بتائی جاتی ہے۔ موت سے بچ جانے والے چار نوجوانوں نے بعد میں سارا قصہ سنایا تھا یوں تو اس درندگی پر بہت شور مچا۔ مسلم قائدین بھی اِدھر اُدھر دوڑے لیکن سب سے سخت نوٹس اس کا ڈاکٹر سوامی نے لیا۔ اعداد و شمار اور شواہد جمع کیئے۔ ریاستی اور مرکزی سرکاروں کو متوجہ کیا۔ جس کے نتیجہ میں ایک کمیٹی بٹھائی گئی۔ کمیٹی نے ظلم کی تصدیق کردی۔ مگر اس کی رپورٹ پر عمل درآمد ہنوز ندارد ہے۔ اب ڈاکٹر سبرامنیم سوامی نے خبردار کیا ہے کہ اگر ایک ماہ کے اندر اندر اترپردیش سرکار نے رپورٹ پر عمل درآمد نہیں کیا تو وہ الہ آباد ہائی کورٹ میں قصور وار افراد کے خلاف فرد جرم عائد کرائیں گے۔

ڈاکٹر سبرامنیم سوامی زیادہ سنجیدہ سیاستداں نہیں ہیں۔ ان کی سیاسی سوچ بھی پراسرار ہے لیکن ان کے اندر بہرحال کچھ خوبیاں ہیں۔ جن میں سے ایک ہے صاف گوئی اور دوسری ہے کسی کام کو ہاتھ میں لے کر پایہ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کرنا۔ امید ہے وہ ہاشم پورہ کے معاملے کو اس کے منطقی انجام تک پہنچانے کی کوشش جاری رکھیں گے اور بالآخر مظلوموں کو انصاف دلانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ مسلم اداروں اور افراد کو اس سلسلہ میں ان کے ساتھ تعاون کرنا چاہیئے۔

ماہنامہ
شاداب
حیدرآباد

جلد ۱۴
شمارہ ۹
قیمت ۱۵/= روپے

نومبر ۱۹۹۷ء

زرِ تعاون

ہندوستان	سالانہ	۱۰۰ روپے	دو سال کے لئے	۱۸۰ روپے	تاحیات	۱۵۰۰ روپے
بیرونی ممالک	″	۳۰۰ ″	″	۵۵۰ ″	″	۴۰۰۰ ″
امریکہ	″	۵۰ ڈالر	″	۹۰ ڈالر	″	۹۰۰ ڈالر
انگلستان	″	۳۰ پونڈ	″	۵۰ پونڈ	″	۵۰۰ پونڈ
پاکستان	″	۲۰۰ روپے	″	۳۵۰ روپے	″	۴۰۰۰ روپے

ترسیلِ زر کا پتہ :- ماہنامہ شاداب ، ۱۴۷-۵-۱۱ ریڈ ہلز حیدرآباد
ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپوا کر
دفتر شاداب ۱۴۷-۵-۱۱ ریڈ ہلز حیدرآباد سے شائع کیا۔

فہرست

قاری عبدالمجید خطیب

اسلام امن وسلامتی کا دین

اسلام، سلامتی کی طرف اور ایمان، امن کی طرف بلاتا ہے کیونکہ اسلام کا سلامتی کے ساتھ اور ایمان کا امن کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ ایمان کے دائرے میں سب سے پہلے اللہ کی ذات پاک آتی ہے اور اللہ نے اپنا تعارف کراتے ہوئے فرمایا۔ الملک القدوس السلام وہ بادشاہ ہے محتاج نہیں ہے، پاک ہے کوئی اس کا رشتہ دار، شریک وساجھی نہیں، وہ سلام ہے سلامتی دینے والا ہے اس کے بعد اس کے پیغمبر برحق ہادی سبل صلی اللہ علیہ والہ وسلم پر ایمان لانا ضروری ہے اور آپؐ کی شان یہ ہے کہ آپؐ جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ آپؐ ہی نے فرمایا انما انا رحمۃ مھداۃ میں رحمت کا ایک تحفہ بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ یعنی ان کی ذات گرامی کی بدولت لاکھوں معلوم اور غیر معلوم برکتیں انسانوں کو نصیب ہوں گی۔ ان کے کردار کو نمونۂ عمل اور تعلیمات کو مشعل راہ بنانے والے سکھی، مطمئن، بے خوف اور پُرامن رہیں گے کتاب ہدایت، قرآن مجید جسے دستور زندگی اور ضابطہ حیات مانا جاتا ہے اس کی پہچان یہ ہے کہ وہ زندگی کے ہر شعبے کے لئے سلامتی کے راستے دکھاتی ہے یھدی بہ اللہ من اتبع رضوانہ سبل السلام (۱۶۔ المائدہ)۔ اس قرآن مجید کے ذریعہ اللہ پاک ان لوگوں کو جو اس کی رضا کے طالب ہیں سلامتی کے طریقے بتاتا ہے۔ اسلام کے معنی ہی اطاعت، فرمانبرداری اور سلامت روی ہے۔ ادخلوا فی السلم کافۃ پورے

کے پورے دائرہ اسلام کے اندر آجاؤ، شیطان کے وسوسوں پر عمل نہ کرو وہ تمہا کھلا دشمن ہے۔

نماز اسلامی عبادات میں اہم ترین عبادت ہے بلکہ دین کا ستون ہے اس آخری حصے میں نبی مکرم ؐ پر رحمت، برکت اور سلام بھیجا جاتا ہے السلام علیک ایہا النبی ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، اس کے ساتھ ہی اپنی سلامتی اور صالحین کی سلامتی کے لئے التجا کرتا ہے: السلام علینا وعلی عباد اللہ الصلحین نماز کی تکمیل اس وقت ہوتی ہے جب نمازی اپنے ماحول کے دائیں بائیں افراد کی سلامتی کے لئے ان الفاظ میں دعا مانگتا السلام علیکم ورحمۃ اللہ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ تم پر اللہ کی سلامتی اور سلامتی کی برکھا برستی رہے۔ نماز کا سلام پھیرتے ہی یہ سوال کیا جاتا ہے: اللھم انت السلام ومنک السلام والیک یرجع السلام حینا ربنا بالسلام وادخلنا دار السلام تبارکت ربنا وتعالیت یا ذی الجلال والاکرام ہمارے پروردگار تو سلامتی دینے والا ہے، تیرے ہی دربار سے سلامتی مل سکتی ہے، سلامتی تیرے ہی اختیار میں ہے جو لوٹ کر تیری طرف چلی جاتی ہے۔ ہمارے رب! ہمیں سلامتی کے ساتھ زندہ رکھ اور موت کے بعد ہمیں اس گھر میں ٹھکانہ عطا فرما جو سراسر سلامتی کا گھر ہے۔ اللہ کی دعوت بھی اسی امن وسلامتی کے لئے ہے واللہ یدعوا الی دار السلام اللہ تمہیں سلامتی والے گھر کی طرف بلاتا ہے۔ اہل ایمان کے لئے امن وسلامتی مقدر ہے لھم دار السلم عند ربھم وھو ولیھم (۱۲۷- الانعام) ان کے لئے سلامتی کا گھر مقرر ہے اور وہ ان کا کارساز ہے۔

محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے روم کے بادشاہ قیصر کو فرمان بھیجا، اسلام کی دعوت دی اور ایک جملہ یہ بھی لکھا أَسْلِمْ تَسْلَمْ اسلام قبول کر لیجئے آپ کو سلامتی نصیب

محمد عبدالرحیم قریشی

قسط اول

سیکولرزم

تعبیر اور ہندوستان کیلئے معنویت

(امبیڈکر سرکل کل ہند مجلس تعمیر ملت کے زیر اہتمام اس عنوان پر منعقدہ سمپوزیم کا کلیدی خطبہ)

ہندوستان ایک قدیم ملک ہے زمانہ قدیم ہی سے اس ملک میں مختلف نسلوں کے لوگ آباد رہے ہیں جن کی تہذیبیں جدا اور جن کے تمدن مختلف تھے اور جو مختلف زبانیں بولتے تھے ملک کے شمال میں زیادہ تر مغرب سے اور کسی قدر مشرق سے بری اور کوہستانی راستوں سے لوگ آتے رہے۔ اس طرح یہ ملک مختلف نسلوں تہذیب و تمدن رواج و رسوم کا گہوارہ بنا۔ زبانوں کی رنگا رنگی بھی اس کی خصوصیت رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شکل و صورت اور خدوخال کے اعتبار سے شمال کے لوگ جنوب سے اور مشرق کے لوگ مغرب سے مختلف نظر آتے ہیں مغرب کی زبانیں مشرق میں اور جنوب کی زبانیں شمال میں بولی نہیں جاتیں۔ لوگوں کے ساتھ ان کے عقیدے اور مذاہب بھی اس ملک میں داخل ہوتے رہے۔ اس ملک کے اندر بھی کئی بانیان مذاہب پیدا ہوئے اور کئی مذہبی تحریکیں ابھریں۔ اس طرح یہ ملک مختلف عقیدوں اور مختلف مذاہب کا گہوارہ بن گیا۔

اس کثیر نسلی، کثیر لسانی اور کثیر مذہبی ملک کی ایک طویل تاریخ ہے جو ہزارہا سال پر پھیلی ہوئی ہے تاریخ کے اس طویل عرصہ میں حکومتیں، بادشاہتیں اور سلطنتیں قائم ہوتیں اور ختم ہوتی رہیں۔ باہر سے آئے ہوئے فاتحین نے بھی اس کو اپنی ملک بنالیا، یہیں بس گئے یہیں کے ہو رہے اس ملک کا سرمایہ اس ملک میں رکھا اور یہیں خرچ کیا یہ سلسلہ معلوم تاریخ میں آریاؤں سے لےکر مغلوں

تک چلتا رہا لیکن یورپی اقوام کی اس ملک میں آمد کی نوعیت بالکل مختلف ہے ان کا مقصد اس ملک کے حصول پر اپنے ملک کے مفادات اور استعماری (سامراجی) مقاصد کی خاطر حکومت کرنا یہاں کے وسائل کا اپنے ملک کے لئے استعمال کرنا اور یہاں کی دولت کو اپنے ملک میں لے جانا تھا ہندوستان سے لوٹی ہوئی دولت ہی صنعتی انقلاب کی پیشرفت کا ذریعہ بنی - یوروپی اقوام کے درمیان ہندوستان میں اپنے عمل دخل کی کشمکش میں انگریز فرانسیسیوں اور دوسروں پر بازی لے گئے اور بالآخر انہوں نے سارے ملک پر اپنی حکومت قائم کرلی اور ہندوستان اور برطانوی استعمار کا جزو اور غلام بن گیا

نیا تجربہ برطانوی استعمار کے خلاف جدوجہد کا نتیجہ بالآخر ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو آزادی کی صورت میں برآمد ہوا - اس تاریخ سے عالمی برادری میں ایک نئے انقلاب ملک اور نئی سیاسی وحدت کا اضافہ ہوا اور اس کے ساتھ ہی اس ملک میں ایک نئے تجربہ کا آغاز ہوا - ہندوستان کے لئے یہ ایک بالکل نیا تجربہ ہے جس کا آغاز ۱۹۴۷ء سے ہوا اور ابھی یہ کہنا مشکل ہے کہ ہم اس تجربے میں کامیاب ہیں یا کامیابی کی طرف بڑھ رہے ہیں؟ ہم ہندوستانی چاہے وہ ہندو ہو کہ مسلمان ہم میں سے اکثر عام شہری سے کہیں زیادہ تعلیم یافتہ اصحاب اور اہلِ علم نئے دور کی ہر چلی ہوئی بات مقبول نظریات اور افکار اور دوسروں کے کامیاب تجربات کے بارے میں یہ کہنے کے عادی ہیں کہ یہ تو قدیم سے ہمارے پاس ہیں' جمہوریت کی بات کہئیے تو ہندو برادرانِ وطن کہیں گے کہ قدیم ہندوستان میں ہیں ہر دیہات میں پنچایت تھی اور پنچایت کا نظام جمہوریت کی ابتدائی شکل تھی اور اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ جمہوریت کی بنیاد انسانی مساوات کے اصول پر ہے اور یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ قدیم ہندوستان میں انسانی مساوات کا کوئی تصور نہیں تھا لوگ ادنیٰ و اعلیٰ ذاتوں میں بٹے ہوئے تھے تمام حقوق اور مراعات اعلیٰ ذاتوں کو حاصل تھے ادنیٰ ذات کا کام خدمت اور غلامی تھا اور چنڈ کو تو دیہات میں رہنے کا تک حق نہیں تھا دیہات میں آکر گندگی اور غلاظت اٹھانا اور گاؤں کے باہر گھاس پھوس کی جھونپڑیوں میں بسر کرنا ان کا مقصد تھا - غلامانہ خدمت ان کا فرض

تھا اور کسی حق کا مطالبہ نہیں کر سکتے تھے۔ جہاں مساوات نہ ہو وہاں جمہوریت بے معنی ہے اس طرح مسلمان بھی اکثر یہی کہتے ہیں کہ جمہوریت تو ہمارے پاس رہی ہے اس میں شک نہیں کہ اسلام انسانی اور سماجی مساوات کے ذریعہ ایسی قدریں عطا کرتا ہے جو جمہوریت کے لئے پائیدار اور دیرپا بنیادیں بن سکتی ہیں لیکن یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ مساوات انسانی کی سیاسی تعبیر کا کوئی تجربہ تاریخ میں نہیں ہوا اور اس بنیاد پر کوئی سیاسی نظام سابق میں وجود میں نہیں آیا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم ممالک اب تک جمہوریت کا تجربہ کامیاب نہیں ہو سکا۔ اس طرح کی باتیں ہندو اور مسلمان دونوں کے کچھ اہل علم عام اصحاب سیکولرازم کے بارے میں کہتے ہیں اور اپنے دعوؤں کی دلیل میں جس بات کو پیش کرتے ہیں وہ مذہبی رواداری ہے۔ مذہبی رواداری سیکولرزم کی ایک خصوصیت ضرور ہے لیکن سیکولرزم صرف مذہبی رواداری کا نام نہیں۔

یہاں میں جس بات کو واضح کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ برطانیہ کی سیاسی غلامی سے آزادی نے بالکل نئے حالات میں ایک نئے تجربہ کا چیلنج ملک اور ملک کی قیادت کے سامنے رکھا قائدین کو اس بات کا پورا اندازہ تھا کہ اس کو ہندو ریاست قرار نہیں دیا جا سکتا۔ عوام کے تمام طبقات میں اپنے حقوق کا شعور پیدا ہو چکا تھا۔ کمتر ذاتیں اور اچھوت برہمنوں اور اعلیٰ ذات کے لوگوں کو تمام حقوق و اختیارات سونپ کر غلامی کی سطح کی زندگی پر اب تیار نہیں ہو سکتے تھے۔ ڈاکٹر بی آر امبیڈکر نے اچھوتوں کو منظم کر کے جداگانہ انتخاب کا مطالبہ تک کر دیا تھا جس سے وہ بڑے پس و پیش کے بعد دستبردار ہوئے وہ اور دوسرے طبقات مساویانہ سیاسی حقوق سے کمتر کوئی بات قبول نہیں کر سکتے تھے۔ اسی لئے آزادی کی جدوجہد کے دوران یہ واضح کر دیا گیا کہ ملک کا نظام جمہوری ہوگا یہ بات بھی واضح تھی کہ ہندوستان کی سیاسی وحدت ہندو ریاست نہیں ہوگی کیونکہ ہندو ریاست جمہوری نہیں ہو سکتی۔ ہندو ریاست کا مطلب برہمنوں کی آقائی اور بالادستی اور ان کے ہاتھوں میں اختیارات کا ارتکاز ہے جس کو خود ہندو سماج کے دوسرے طبقات قبول کرنے آمادہ

ہیں ہو سکتے تھے ۔ اس لیے آزادی کی جد و جہد کے دوران اس تصور کو پیش کیا گیا کہ مستقبل کے ہندوستان میں تمام مذاہب کو آزادی ہوگی۔ یہ ریاست کسی مذہب سے وابستہ نہ ہوگی، اس کا نظام ایسا ہوگا جس میں تمام شہریوں کو مساویانہ حقوق حاصل رہیں گے ۔

سیکولرزم کی تعبیرات اس نو آزاد ملک کے بہترین مفادات کو نظر میں رکھتے ہوئے آئین ساز وں نے بجا طور پر یہ طئے کیا کہ یہ ملک ایک سیکولر جمہوریت ہوگا۔ سیکولرازم کے بارے میں یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ اس کی تعبیرات مختلف اور گوناگوں ہیں اور مختلف ممالک نے اپنے مخصوص حالات کے مطابق اس کی تعبیر کو اختیار کیا۔ یہاں سیکولرازم کے تعلق سے دو پہلوؤں کا تذکرہ بھی ضروری ہے ایک ہے سیکولر طرزِ زندگی اس سیکولرازم سے مراد یہ ہوتا ہے کہ زندگی کے تمام شعبوں میں عمل اور رویے کی بنیاد اور اس کا محرک صرف اور صرف دنیوی بہتری اور اس کے تقاضے ہوں اور کوئی مذہبی احساس و جذبہ، عمل و رویے کی بنیاد نہ بنے۔ اور ایسا کوئی احساس و جذبہ دنیوی بہتری یا اس کے تقاضوں کی خاطر کی جانے والی کوششوں میں رکاوٹ نہ بنے۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ نیکی و بدی، اچھائی و برائی، خیر و شر کے تصوّرات ختم ہو جائیں اور مذہب کا کوئی تعلق زندگی کے کسی شعبہ سے باقی نہ رہے، مذہب کو زندگی سے نکال باہر کیا جائے سیکولرازم کی یہ تعبیر ملک کے تمام باشندوں کی اکثریت کے لئے ناقابلِ قبول رہی ہے۔ سیکولرازم کی اس تعبیر کو کمیونسٹوں اور مارکسسٹوں نے قبول کیا تھا لیکن اب وہ بھی یہ برملا کہتے ہیں کہ اس مفہوم میں سیکولرازم ہندوستان میں ناقابلِ عمل ہے کیوں کہ بنیادی طور پر ہندوستانی سماج کے تمام طبقات مذہبی احساسات رکھتے ہیں سیکولرازم کی دوسری تعبیر ریاست سے متعلق ہے کہ ریاست کسی مذہب سے وابستہ نہ ہو ریاست کا کوئی مذہب نہ ہو اس کی کئی شکلیں ہیں ایک یہ کہ ریاست اور کلیسا (چرچ) دونوں ایسے دائروں میں کام کریں جو ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں مذہب صرف عبادت تک محدود رہے اور زندگی کا یہ شعبہ کلیسا کے تحت رہے اور اس میں کوئی مداخلت ریاست کی نہ ہو اور زندگی کے باقی تمام

شعبے ریاست کے دائرہ اختیار کے اندر رہیں اور اس میں کلیسا یعنی چرچ کی کوئی مداخلت نہ
سیکولرازم کے اس تصور میں مذہب کو صرف رسوم عبادات تک محدود کر دیا گیا ہے سیکولر ریاست
یہ تعبیر ہم کو یو۔ ایس۔ اے اور بعض یوروپی ممالک میں ملتی ہے۔ سیکولر ریاست کی دوسری شکل
ہے جس میں یوں تو عبادت کی آزادی ہوتی ہے لیکن ساری کوشش یہ ہوتی ہے مذہب کو
مٹا دیا جائے کیونکہ مذہب کو ترقی کا مخالف سمجھا جاتا ہے اور اس کو عوام کے لئے افیون قرار دیا
جاتا ہے سیکولر ریاست کی یہ شکل مذہب کی [illegible] ہوتی ہے۔ کمیونزم نے روس، چین اور
مشرقی یوروپ میں سیکولرازم کی اس شکل کو اختیار کیا لیکن اب سوویت یونین کے بکھرنے اور کمیونزم
کے ناکام ہونے کے بعد اس سیکولرازم اور ایسی سیکولر سیاست کا سحر ٹوٹ رہا ہے۔

سیکولرزم کی ہندوستانی تعبیر سیکولر ریاست کی تیسری تعبیر کی بہترین
مثال ہندوستان کے آئین میں ملتی ہے کہ ریاست مذہب کے اثر سے آزاد ہے ریاست کسی مذہب
سے وابستہ نہ ہو، مگر زندگی کے اور شعبوں میں ہر شہری کو مذہبی عقیدہ و عمل اور ضمیر کی آزادی حاصل ہو
سیکولرازم کی بات کرتے ہیں تو اس سے مراد نہ سیکولر طرز زندگی ہے جو مذہبی اور اخلاقی قدروں
سے آزاد ہو اور نہ ایسی ریاست ہے کہ مذہب کی مخالف ہے اور نہ ہی ایسی ریاست ہے جس میں
مذہب کو صرف عبادات اور رسوم تک محدود کر دیا گیا ہے ایسی صورت میں ان افراد اور گروہوں
کو جو سیکولرازم کو لادینیت یا مذہب دشمنی کے ہم معنی سمجھ کر مخالفت کرتے ہیں اپنے نقطہ نظر
پر نظر ثانی کرنا چاہئے۔

ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ دستور ساز اسمبلی کے مدونہ دستور میں کہیں لفظ سیکولر کا استعمال
نہیں کیا گیا یہ لفظ بعد میں آئین کے ابتدائیہ میں داخل کیا گیا۔ یہ بات صحیح ہے کہ دستور ساز
اسمبلی کے منظورہ دستور میں لفظ سیکولر نہیں ملتا لیکن دستور سازوں کے ذہن میں سیکولر ریاست
کا تصور موجود تھا۔ وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے اپریل ۱۹۴۹ء میں اپنی تقریر میں کہا تھا۔

"میں اس بات کا قائل ہوں کہ ہندوستان کی ترقی کے درجہ سے مراد ہماری جانب سے اس کو مکمل طور پر روبہ عمل لانے کا درجہ ہے جس کو سیکولر ریاست کہا جاتا ہے اس کا قطعاً یہ مطلب نہیں ہے کہ عوام اخلاق و مذہب سے عاری ہوں اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کہ مذہب مکمل طور پر آزاد ہو۔ ریاست اپنے وسیع دائرہ میں مختلف مذاہب اور تمدنوں کو شامل رکھتے ہوئے سب کو تحفظ اور مواقع فراہم کرے گی۔ اس طرح رواداری اور باہمی تعاون کی فضا پیدا کرے گی"

(ہندوستان ٹائمز ۱۸ اپریل ۱۹۴۹ء)

ایک آئین ساز ڈاکٹر بی۔ آر۔ امبیڈکر نے ۱۹۵۱ء میں ایک بحث کے دوران کہا تھا

"یہ کہنا بہت اچھی بات ہے کہ ہم نے اپنے دستور میں ایک سیکولر ریاست کے قیام کی تجویز کی ہے۔ مجھے معلوم نہیں ہے کہ جب کوئی رکن لفظ سیکولر ریاست استعمال کرتا ہے تو وہ یہ جانتا ہے کہ اس کا حقیقی مطلب کیا ہے اور آئین میں کیا مفہوم اختیار کیا گیا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم غور و بحث میں مذہبی احساسات کا لحاظ نہیں کریں گے سیکولر ریاست کا مطلب یہی ہے کہ یہ پارلیمنٹ کسی خاص مذہب کو باقی عوام پر مسلط کرنے کی اہل نہیں ہے۔ یہی واحد پابندی ہے جس کو دستور تسلیم کرتا ہے۔ ہم یہاں عوام کے احساسات کی تحقیر کے لئے نہیں بیٹھے ہیں۔"

(پارلیمانی مباحث ۱۱ جلد ۱۱۱ ۱۹۵۱ء صفحہ ۲۴۶۶)

ہندوستانی سیکولرزم کے خدوخال حقیقت یہ ہے کہ دستور میں سیکولر کا لفظ استعمال نہ کئے جانے کے باوجود دستور ساز ایک سیکولر ریاست کی تشکیل چاہتے تھے جس میں ریاست کا کوئی مذہب نہ ہو اور تمام مذاہب کو مساویانہ آزادی حاصل ہو۔ ہمارے دستور اور ہمارے سیاسی نظام کے ا[illegible] سیکولر کردار کی وضاحت خود دستور کے کئی دفعات میں موجود ہے۔ حصہ ۲ میں شامل دفعات ۵ تا ۱۱

شہریت سے متعلق ہیں۔ ان دفعات میں شہریت کے لئے مذہب کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا ہے بنیادی حقوق حصہ ۳ کے دفعہ ۱۴ میں سب کے لئے قانون کے سامنے برابری اور مساوات کو لازم قرار دیا گیا ہے دفعہ ۱۵ میں مذہب، نسل، ذات، جنس اور مقام پیدائش کی بنیاد پر امتیاز کی ممانعت ہے۔ البتہ خواتین، بچوں، سماجی و تعلیمی طور پر پسماندہ طبقات اور درج فہرست ذاتوں اور قبائل کی ترقی کے لئے خصوصی قوانین کی تدوین کو روکا نہیں گیا ہے۔ دفعہ ۱۶ میں سرکاری ملازمتوں میں مواقع کی مساوات کی طمانیت فراہم کی گئی ہے اور واضح کیا گیا ہے کہ مذہب، نسل، ذات، جنس، گھرانہ مقام پیدائش یا مقام رہائش کی بنیاد پر کسی کے خلاف امتیاز برتا نہیں جائے گا۔ ان اہم دفعات سے یہ واضح ہے کہ شہریوں میں کوئی درجہ بندی نہیں ہے اور شہریت کو کسی مذہبی وابستگی سے مشروط نہیں کیا گیا ہے سب شہریوں کو برابر کے حقوق حاصل ہیں۔ مذہب کی بنیاد پر حقوق میں کوئی کمی بیشی نہیں ہے۔ اس حصہ کے دفعہ ۲۵ کے ذریعہ تمام کو ضمیر، مذہب، عقیدہ، عمل اور اشاعت (پرچار کی آزادی، نظم عامہ، اخلاق، صحت اور دیگر بنیادی حقوق کے تابع رکھتے ہوئے عطا کی گئی ہے۔ دفعہ ۲۶ کے ذریعہ ہر مذہبی فرقہ یا طبقہ کو اپنے مذہبی امور کے انتظام یعنی مذہبی و خیراتی مقاصد کے لئے اداروں کے قیام مذہبی معاملت میں اپنے امور کے انتظام، منقولہ جائیداد کو حاصل کرنے اور قانون کے مطابق ایسی املاک کا انتظام کرنے کی آزادی دی گئی ہے دفعات ۲۵، ۲۶ کی آزادیاں تمام مذہبی گروہوں کو حاصل ہیں اور کسی مذہب یا کسی مذہبی گروہ کو کوئی مراعات نہیں دیئے گئے ہیں۔ ان دفعات سے یہ واضح ہے کہ ریاست کا اپنا کوئی مذہب نہیں ہوگا، وہ خود کو کسی مذہب سے وابستہ نہیں کرے گی اور کسی مذہب میں نہیں ہوگا، وہ خود کو کسی مذہب سے وابستہ نہیں کرے گی اور کسی مذہب میں مداخلت نہیں کرے گی۔ ہندوستانی ریاست نہ مذہب دشمن ہے نہ منکر مذہب ہے۔ ہمارے دستور سازوں نے سیکولرازم اور سیکولر ریاست کی مارکسی یا کمیونسٹ تعبیر کو قبول نہیں کیا اور نہ ہی مذہب کے دائرہ کو تنگ کر دینے کی تعبیر کو اس ملک کے لئے قبول کیا۔ سیکولرازم کا جو کردار دستور میں اختیار کیا گیا ہے

ڈاکٹر سلطان عمر
کل ہند تعمیر ملت



جدوجہدِ آزادی میں مسلمان کسی سے پیچھے نہیں

آج جبکہ وطنِ عزیز کی آزادی کی (۵۰) ویں سالگرہ بڑے ہی دھوم دھام سے منائی جارہی ہے کل ہند مجلس تعمیر ملت اس حقیقت کو منظرِ عام پر لانا چاہتی ہے کہ کس طرح سے اس یادگار مرحلہ پر مسلمانوں کی قربانیوں اور ان کی سرفروشیوں کو نظرانداز کردیا گیا اور تاریخ کے اس تابناک دور کو ملک اور عوام کی نظروں سے اوجھل رکھا گیا ہے۔ حالانکہ ؎

چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

تعمیر ملت کا یہ نقطۂ نظر ہے کہ ملک کی آزادی کی گولڈن جوبلی کا یہ جشن اس وقت تک مکمل جشن نہیں ہوسکتا جب تک کہ جدوجہد آزادی کی تاریخ کو صحیح طور پر پیش نہ کیا جائے اور یہ نہ بتایا جائے کہ ملک کی آزادی کی مانگ سب سے پہلے کس نے کی تھی ۔۔۔ آزاد ہند فوج کے استحکام کے لیے سب سے زیادہ مالی تعاون کس نے کیا تھا کس نے افغانستان جاکر کابل میں پہلی آزاد ہند حکومت قائم کی تھی ۔۔۔ مختصر یہ کہ برطانوی سامراج کو جڑ پیڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی جدوجہد کا تاریخ ساز آغاز کس نے کیا تھا! مگر خود مسلمان بھی اس سے کہاں واقف ہیں کہ انگریزوں کی محکومی سے آزادی کے

لیے ان کی جد و جہد دو سو سال پر محیط ہے جس میں انہوں نے سب سے زیادہ قربانیاں دیں مصائب جھیلے اور دار و رسن کی آزمائشوں میں بھی استقامت، صبر اور فولادی عزم کا مظاہرہ کیا۔

آج ضرورت ہے کہ سرفروشی کے ان واقعات کو مسلمانوں اور دیگر ابنائے وطن کے سامنے لایا جائے۔ اسٹیٹ سرکل کل ہند مجلس تعمیر ملت نے ان ہی اسلاف کے کارناموں اور ان کی بے لوث جد و جہد کو پیش کرنے کے لئے اردو ہال حمایت نگر میں بتاریخ ۵ تا ۷ ستمبر ۹۷ء اس سمینار کا اہتمام کیا ہے معتمد سمینار کمیٹی ڈاکٹر سلطان عمر نے درج ذیل سطور میں اسی پس منظر کو بیان کیا ہے

ہمارے ملک ہندوستان کی تاریخ طویل اور ہزار ہا سال پر مشتمل ہے اس میں کئی ایسے واقعات اور ابواب ہیں جو آج بھی ملک کے لئے روشنی کے میناروں کا کام انجام دے سکتے ہیں۔ ایسا ہی شاندار باب انگریزوں کے تسلط اور غاصبانہ قبضے کے خلاف آزادی کے لئے جد و جہد کا ہے۔ اور یہ تاریخ تقریباً (۲۰۰) سال تک محیط ہے یوں تو عام طور پر ۱۸۵۷ء کی جد و جہد آزادی کو پہلی جنگ آزادی کا نام دیا جاتا ہے لیکن درحقیقت اس جد و جہد کا آغاز ۱۷۵۶-۵۷ء میں ہوا جبکہ بنگال کے جواں سال حکمراں سراج الدولہ نے انگریزوں کو نکال باہر کرنے کی کوشش کی اس کوشش میں ناکامی ضرور ہوئی لیکن اس سے اس کی اہمیت ختم نہیں ہوتی۔ ۱۷۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک جہاں ملک کے مختلف طبقات نے حکمرانوں اور عوام نے ہندوؤں اور مسلمانوں نے سب آزادی کی اس کشمکش میں حصہ لیا، مصیبتیں جھیلیں، پھانسی کو گلے لگالیا اور قربانیاں دیں وہیں ایک تابناک حقیقت یہ ہے کہ جد و جہد کا آغاز مسلمانوں نے کیا اور ایثار و قربانی کے مظاہرے میں وہ سب سے بازی لے گئے۔ بقول قائد مرحوم سید خلیل اللہ حسینی علیہ الرحمہ

وہ ہندوستان کی آزادی کے لئے مسلمانوں نے اتنی قربانیاں دی ہیں
کہ ارضِ وطن کی جگہ کی مٹی اٹھا کر سونگھیئے تو اس میں ہمارے آبا و اجداد کے خون
کی خوشبو ملے گی۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مسلمانوں اور مسلم حکمرانوں نے
ہی فرنگیوں کے خلاف جد و جہد کا آغاز کیا، تلوار اٹھائی، میدانِ کارزار
سجایا اور خون بہایا۔ آزادی کی جو شمع مسلمانوں نے جلائی اس کو آہستہ آہستہ
ہندو برادرانِ وطن اپنی شرکت سے شعلے جوالا بنا دیا۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء کی
جنگِ آزادی میں ہندو اور مسلمان شانہ بشانہ انگریزوں کے خلاف لڑتے اور
جان لڑاتے نظر آتے ہیں۔ "

آج ہمارے ملک میں آزادی کی گولڈن جوبلی تقاریب منائی جا رہی ہیں ریڈیو اور ٹی وی سے
جد و جہد آزادی کے بارے میں پروگرام پیش کئے جا رہے ہیں اخبارات میں مضامین شائع ہو
رہے ہیں لیکن آزادی کے لئے اس جد و جہد میں تاریخ کا وہ روشن اور تابناک باب یکسر نظر انداز
کیا جا رہا ہے جو مسلمانوں کے خون کی سرخی، ان کے ایثار و قربانی سے عبارت ہے اس ملک پر برطانوی
سامراج کی مزاحمت کرتے ہوئے سراج الدولہ نے اپنی جان دے دی۔

ٹیپو سلطان شہید کے پیشِ نظر صرف اپنی سلطنت خداداد کی حفاظت نہیں تھی اس کی
دور بین نظروں نے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کا اندازہ کر لیا تھا جو سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں
لے رہا تھا نہ صرف اس نے داخلی محاذ پر تیاری کی بلکہ اس سیلاب کو روکنے کے لئے نپولین بلکہ
ترکی وغیرہ کے حکمرانوں سے بھی رابطہ پیدا کیا۔ البتہ یہ کوششیں اپنوں ہی کی سازش کا شکار ہو گئیں
آزادی کے لئے مولانا احمد اللہ نے سرفروشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے شہادت پائی ۱۸۵۸
کی جد و جہد میں علماء نے جس مجاہدانہ جانبازی کا مظاہرہ کیا اس کو یاد نہیں کیا جاتا۔ تحریک ہجرت
ہو یا ریشمی رومال تحریک ہو یا مولانا محمود الحسن اور مولانا محمد جعفر تھانیسری یا مولانا عبید اللہ سندھی

مولانا برکت اللہ بھوپالی کے جلاوطن حکومت کے قیام کی کوششیں ' ان جیسے جیالوں کی
ستانِ حریت یہ سب زینتِ طاق نسیاں ہیں۔ ہزاروں ایسے تھے جنھوں نے قید و بند میں
رکا ایک طویل عرصہ کاٹ دیا یا زنداں ہی میں قیدِ جان سے چھوٹے۔ اشفاق اللہ خان
بھی تو جذبۂ آزادی سے سرشار پھانسی کے پھندے کو گلے لگا لیا۔

آزادی کے نقیب اقبال نے غلامی کے خلاف اپنی شاعری کے ذریعے آواز اُٹھائی ان کی
سویر درد ' رلاتا ہے نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو " نے اہلِ وطن کو تڑپا دیا۔ ان کا ترانہ
ہدانِ آزادی کا رجز بن گیا۔ یہ ۱۹۰۴ء کی باتیں ہیں جبکہ آزادی کی تحریک ابھی رینگ رہی تھی یہ
ناہوم رول اور مطالبات کا دور تھا۔ گاندھی جی ابھی اُفقِ سیاست پر اُبھرے نہیں تھے۔
ت نہرو کا سن تو ابھی ۵ ابرس کا تھا۔

یہ مولانا حسرت موہانی ہی تو تھے جنھوں نے سب سے پہلے مکمل آزادی کا نعرہ لگایا جبکہ
ریس اس کے لئے ذہنی طور پر تیار نہیں تھے۔

اُردو صحافت نے کامریڈ ' ہمدرد ' اردوئے معلیٰ ' البلاغ اور الہلال نے آزادی کی جدوجہد
ہمیز لگائی پریس ضبط ہوئے کثیر مالی نقصان ہوا۔ یہ سب آزادی کے لئے قبول کیا اُردو
عری نے انقلابی کیفیت سے سرشار کیا اور انقلاب زندہ باد کا نعرہ دیا۔ آزاد ہند فوج میں کتنے
ن افسر اس کے دست و بازو بنے ہوئے تھے یہی نہیں بلکہ انھوں نے اس کی امداد کے لئے وہ مالی
ار بھی کیا جس کا آج تصور نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی بتائے کہ کانگریس کہاں ہوتی اگر حکیم اجمل خان
ر ڈاکٹر انصاری کی مسیحائی کانگریس کے تنِ نازک میں قوت نہ بھر دیتی۔ مولانا آزاد کی تقریر
تحریر کی گھن گرج نہ ہوتی۔ رفیع احمد قدوائی ' سیف الدین کچلو جیسے رہنماؤں کا ایثار اور
بانی نہ ہوتی۔

یہ مولانا محمد علی ہی تو تھے جنھوں نے سخت بیماری کی حالت میں گول میز کانفرنس کے سفر کی

زحمت برداشت کی اور یہ نعرۂ حق بلند کیا کہ میں اپنے غلام وطن واپس نہیں جاؤں گا جب تک کہ میرے ہاتھ میں آزادی کا پروانہ نہ ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو آپ کو میری قبر کے لئے جگہ دینی پڑے گی اور قدرت نے ان کی بات کی لاج رکھ لی۔

آزادی کے لئے مسلمانوں کی تاریخ کا یہ باب عمداً نظر انداز کیا جا تا رہا ہے۔ عہدِ وسطیٰ کی تاریخ آج ہمارے مدارس اور جامعات میں اس لیئے پیش نہیں کی جاتی ہے کہ وہ فرقہ پرستوں کے حلق سے نہیں اترتی۔ اقبال نے کہا تھا کہ کسی قوم کی تاریخ اس کا اجتماعی حافظہ ہوتی ہے اگر کسی قوم کو اس کی تاریخ سے محروم کر دیا جائے تو وہ اپنی جڑ سے کٹ جاتی ہے آزادی کے بعد ہندوستان کے برسرِ اقتدار حکمراں یہ نہیں چاہتے تھے کہ اہلِ وطن کو ان باتوں سے واقف کروایا جائے۔ اب صورتحال یہ ہے کہ یہ ساری داستان ملک میں کوئی نہیں جانتا۔ جو جانتے ہیں وہ بلا اشتثنیٰ مسلمانوں کی نئی نسل کو صرف مولانا آزاد ہی کا نام یاد ہے جبکہ جدوجہدِ آزادی کا بیج بویا اور اپنے خون سے اس کو سینچا۔ اُن کے ایثار اور قربانی نے اس کو پروان چڑھایا۔ اس تلخ حقیقت کے پیشِ نظر کل ہند مجلس تعمیرِ ملت نے یہ طئے کیا کہ ایک روزہ سیمینار کے ذریعہ اہلِ ملک اور خصوصاً مسلمانوں کے سامنے اس داستانِ حریت کے مختلف پہلوؤں کو پیش کیا جائے۔ واضح رہے کہ اس سیمینار کا مقصد ایک نقطۂ آغاز ہے کہ تاریخِ آزادی میں مسلمانوں کی جدوجہد کو نہ صرف یاد کیا جائے بلکہ انھیں باقی رکھا جائے۔ اجتماعات اور مطبوعات کے ذریعے انھیں پیش کیا جائے تاکہ ابنائے وطن کو معلوم ہو کہ اس ملک کو آزاد کرانے میں اپنا خون بہانے، اپنا مال و متاع ایثار کرنے میں مسلمان کسی سے پیچھے نہیں بلکہ آگے ہیں اور مسلمانوں کی نئی نسل اس احساسِ کمتری سے آزاد ہو کہ ہمارے اسلاف نے اس ملک کے لئے کچھ نہیں کیا۔ اس سے ان کے اندر خود اعتمادی کا جذبہ پیدا ہوگا اور اپنے اجداد کے ان سرفروشانہ کارناموں کو سن کر پڑھ کر ان کا سر فخر سے اونچا ہوگا۔

سمینار کے علاوہ ایک ایسی نمائش کا اہتمام بھی کیا گیا ہے جس میں کتابوں، تصاویر
لس اور چارٹ کے ذریعے اس داستانِ آزادی کے ان پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے اور ارادہ
ہے کہ ایسا کرتے ہوئے ایک ایسے مرکز کا عمل قیام میں لایا جائے جو ایسی کوششوں کو جاری
باقی رکھے۔ جدوجہدِ آزادی میں مسلمانوں کے حصے اور اس ایثار بھری داستان کو محفوظ رکھنا
یار بار دہرانا اس لیئے بھی ضروری ہے کہ اس کے ساتھ یہ بات بھی اہلِ وطن کے سامنے آئے گی
لخصوص ۱۸۵۷ء سے پہلے کے دور میں آزادی کا پرچم مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا اور وہی اس
جہد کی قیادت کر رہے تھے لیکن ان کے ساتھ جو اس پر خطر مہم میں شریک تھے ان میں ہندو
رانِ وطن بھی شامل تھے ۱۸۵۷ء اور اس کے بعد تو ہندو اور مسلمان شانہ بشانہ انگریزوں
خلاف صف آرا ہوتے رہے۔ اگر ان واقعات کو عام کیا جائے اور بار بار دہرایا جائے
ئع ابلاغ سے نمایاں کیا جائے تو ملک کے دو بڑے طبقات ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان
ماد اور مفاہمت کی وہ کیفیت پیدا ہو سکتی ہے جس سے ملک آزادی کے بعد سے اب تک محروم
۔ یہ باہمی اعتماد و مفاہمت ایسی خوشگوار فضا پیدا کر سکتی ہے جس میں ملک ترقی کی راہ پہ
مزن ہوتے ہوئے جنت نشان بن سکتا ہے۔ لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ دل کشادہ
ں اور نظر وسیع اور عمیق ہو اور اخلاقی حالت اس بلندی پر پہنچے کہ کسی کی خدمات کا اعتراف
ینے نہ دل جھجکے اور نہ زبان رکے۔

جدوجہدِ آزادی میں مسلمانوں کے حصے اور ان کی ایثار و قربانی کے واقعات کو منظرِ علم پر
نے اور نمایاں کرنے کا ایک مقصد جہاں یہ ہے کہ مسلمانوں کے ایثار اور قربانی سے واقف ہوں
یلے دل کے اعتراف کے ذریعے ملک کی ترقی کے لیئے راستہ ہموار کریں۔

سید سمیع الدین اویسی

حضرت العلامہ طاہر رضوی مدظلہ

حیدرآباد کے مطلع علم و عرفان پر جگمگاتی کہکشاں اپنے حسن و کشش کے لحاظ سے ہر نگاہ کو اپنی طرف متوجہ کرلیتی ہے علم دین کے سلسلہ میں اس کی ضیا باری، اذہان و افکار کی روشنی اور عقائد و اعمال کے لئے رہبری کا فریضہ انجام دے رہی ہے کم و بیش آٹھ دہوں سے اہلیان حیدرآباد کے علمی و دینی رہنمائی کے منصب جلیلہ کی ذمہ داری سنبھالنے والے گھرانوں میں حضرت علامہ سید شاہ طاہر رضوی قادری نجفی مدظلہ کا خاندان نمایاں حیثیت رکھتا ہے حضرت گرامی منزلت کے والد بزرگوار استاذ العلماء افتخار حضرت علامہ سید شاہ ابراہیم ادیب رضوی القادری قبلہ رحمتہ اللہ علیہ تھے جن کی عظیم الشان علمی دینی اور ادبی خدمات ظاہر دینیدار اور باشعور احساس رکھتا ہے حضرت علامہ طاہر رضوی صاحب قبلہ ۱۷ مارچ ۱۹۱۳ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ نسبی تعلق حضرت امام علی موسیٰ رضا علیہ السلام سے ہوتا ہوا۔ حضرت امیر المومنین سیدنا علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ تک پہنچتا ہے۔ اسی نسبت کے رضوی کہلاتے ہیں۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد محترم کی نگرانی میں پائی بعد ازاں مدرسہ نظامیہ میں داخل ہوئے مولوی کامل (عربی) کی سند حاصل فرمائی۔ علاوہ ازیں عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم اے (عربی) کی ڈگری حاصل کی۔ حضرت العلامہ طاہر صاحب قبلہ کے اساتذہ گرامی میں خود حضرت علامہ ابراہیم ادیب قبلہ کے علاوہ حضرت شیخ الحدیث علامہ حکیم محمد حسین صاحب قبلہ، حضرت علامہ مفتی عبدالحمید صاحب قبلہ، حضرت علامہ سید شاہ محمد شطاری صاحب قبلہ، حضرت علامہ سید مفتی مخدوم حسینی صاحب، حضرت علامہ مفتی مخدوم بیگ صاحب قبلہ اور

حضرت علامہ ابو الوفا افغانی صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہم) جیسے جید علماء کرام کے اسمائے گرامی ملتے ہیں

حضرت علامہ طاہر رضوی صاحب قبلہ ان چنیدہ اور ذہین لوگوں میں شامل ہیں، جن کی خداداد صلاحیتیں ہر ایک کو اپنی طرف متوجہ کرلیتی ہیں چنانچہ جوہر شناس نگاہوں نے انھیں اچھی طرح پرکھ کر ان کی خدمات زمانۂ طالب علمی میں جامعہ نظامیہ نے حاصل کرلیں۔ اور آپ بحیثیت استاد مقرر کیے گئے۔ اپنی غیر معمولی قابلیت اور اعلیٰ تدریسی صلاحیتوں کے باعث بہت جلد شیخ کے عہدہ تک ترقی کرلی۔ بعدازاں آپ کا بحیثیت شیخ الجامعہ تقرر کیا گیا۔ مسلسل دس سال تک اس عہدہ عظمیٰ پر فائز رہے۔ آپ کے دور میں جامعہ نظامیہ نے اپنی معنوی خدمات کے کئی نقش بنائے۔ گزشتہ کئی سال سے علمی شعبہ میں صدر الشیوخ کے منصب پر فائز ہیں۔ حضرت علامہ کی علمی خدمات سے لطیفیہ عربی کالج نے بھی برسہا برس استفادہ کیا۔ آپ امارت شرعیت سے بھی وابستہ رہے۔ علاوہ ازیں حیدرآباد کی دینی، علمی، ادبی اور اصلاحی تنظیمیں حضرت محترم سے کسی نہ کسی طور پر استفادہ کرتی رہتی ہیں۔ تعلیمی اور تدریسی خدمات کے ساتھ ساتھ آپ کا قیمتی وقت تبلیغ و اشاعت، اصلاح معاشرہ دعوت و ارشاد، وعظ و نصیحت، تصنیف و تالیف کے ساتھ ساتھ مریدین و متوسلین کی باطنی تربیت کے لئے وقف رہتا ہے حضرت شیخ الحدیث علامہ حکیم محمد حسین صاحب قبلہ کی صاحبزادی سے آپ کی شادی ہوئی۔ حضرت علامہ طاہر رضوی صاحب کو پانچ صاحبزادے اور ایک صاحبزادی ہیں۔

حضرت علامہ طاہر رضوی صاحب کو بیعت و خلافت اپنے والد گرامی سے حاصل ہے۔ آپ چاروں سلاسل طریقت، قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ اور سہروردیہ کے اجازت یافتہ ہیں۔ آپ نے علوم باطنی کے حصول کے بعد عملی مجاہدات کے ذریعہ تزکیہ و احسان کے مراحل طے کئے۔ حیدرآباد اور بیرون آپ کے ہزاروں مریدین و متوسلین ہیں جو آپ کی ہدایات و ارشادات کے موافق جادہ شریعت و طریقت اور اطاعت خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور خدمت خلق کے راستے پر گامزن ہیں۔ حضرت علامہ طاہر رضوی مدظلہ درگاہ حضرت سید شاہ نشین بھی ہیں۔ آپ نے اپنے ہزاروں مریدین میں سے پانچ اصحاب

کو خرقہ خلافت سے بھی سرفراز کیا ہے۔

حضرت سید شاہ طاہر رضوی کی دینی و علمی خدمات کی مظہر آپ کی وہ تصانیف ہیں، جن میں چند شائع ہو چکی ہیں اور سابق طباعت کے لئے محفوظ ہیں جن کے منجملہ قصیدہ ہمزیہ ہے جو جامعہ نظامیہ اور مختلف اور فیل کا مجلس میں داخل نصاب ہے۔ علاوہ ازیں قال اور حال، اسرار استغفار اور حقائق و دقائق آپ کی معروف کتابیں ہیں۔ حضرت علامہ موصوف کی معنوی خدمات میں درس و تدریس کے ساتھ ساتھ رشد و ہدایات کا نصف صدی پر مشتمل سلسلہ ہے جو حیدرآباد اور بیرون حیدرآباد بلا وقفہ جاری ہے۔ ان میں مقررہ مجالس درس اور عام اجتماعات شامل ہیں آپ ہر جمعہ مسجد رحمتیہ بازار سکندرآباد، ہر یکشنبہ مسجد حضرت امراللہ شاہ مغلپورہ بعد ظہر، بعد ازاں لٹل اسٹار اسکول رزاق پورہ قبل عصر درس دیا کرتے ہیں۔ جامع مسجد افضل گنج میں مسلسل ۱۲ سال تفسیر بیان فرمائی۔ علاوہ ازیں مہینہ کے مختلف ایام میں شہر کے مختلف علاقوں میں محافل قرآن و حدیث سے خطاب فرمایا کرتے ہیں۔ روزآنہ بعد نماز فجر مسجد قادریہ سید علی گوڑہ میں درس قرآن اور ہر ہلالی ماہ کے دوسرے اتوار کو اپنے مکان واقع مراد نگر میں حلقۂ ذکر و درس تصوف کا اہتمام کرتے ہیں حضرت علامہ طاہر رضوی صاحب نے گزشتہ پچاس برسوں کے دوران ہزاروں جلسہ ہائے میلاد و سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب فرمایا ہے۔ آپ نے دو مرتبہ حج و زیارت کی سعادت حاصل کی، دوسری مرتبہ حکومت سعودیہ کی دعوت پر تشریف لے گئے تھے حضرت علامہ طاہر رضوی صاحب کو عربی زبان و ادب پر پوری دسترس حاصل ہے۔ وہ عربی ادیب و شاعر کی حیثیت سے علمی دنیا میں احترام کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے آپ کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے توصیف نامہ پیش کیا و نیز اسلامی جمہوریہ ایران کے اسپیکر عزت مآب ناطق نوری نے حضرت کی خدمت میں تحفہ گزرانا۔

حضرت سید شاہ طاہر رضوی صاحب کا حلقۂ تلامذہ بے حد وسیع ہے آپ (سلسلہ ص۳۲ پر)

پروفیسر لطیف احمد سبحانی

غوث ساجد افسانہ نگار، انشائیہ نگار اور شاعر

مگر آج دن کا سورج لرزسا کیوں رہا ہے
یہ سنا تھا دکن گئی ہے شب تار تار آتے

۱۴؍جولائی ۹۶ء اتوار کے دن کا سورج آسمان پر لرزتا کانپتا ہوا نمودار ہوا۔ وہ بھی جانتا ہے کہ آج ایک انسان اس دارِ فانی سے کوچ کر گیا ہے۔ ہم نے ناگپور سے اورنگ آباد تک شبِ تار تار کی تمام منزلیں طئے کرتے ہوئے ۵۳۰ کلومیٹر کا طویل سفر پورا کیا اور سرزمینِ اورنگ آباد دکن پر جیسے ہی قدم رکھا تو یہ اندوہناک خبر ملی کہ پروفیسر غوث ساجد اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

یہ سنتا تھا کہ آسمان سر پر گھومتا ہوا نظر آنے لگا زمین پیر تلے سے نکلتی ہوئی دکھائی دینے لگی۔ دل بلیوں اچھلنے لگا۔ کلیجہ منہ کو آگیا۔ آنکھوں میں آنسو آکر خشک ہو گئے ؎

"دنیا سمٹ آئی ہے میرے دیدۂ تر میں"

غوث ساجد کی مزار پر محبت و عقیدت کے دو پھول۔ وہ مرہٹواڑہ (مہاراشٹرا) کے ایک نمائندہ افسانہ نگار، انشائیہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک شاعر بھی تھے۔ مشہور انگریزی شاعروں کی شاہکار نظموں کو اردو قالب میں ڈھالتے تھے۔ اردو زبان و ادب کا شیدائی

ایک مثالی پروفیسر، مخلص دوست، نیک دل انسان، پوری کائنات سے محبت رکھنے والا
اپنوں کو ٹوٹ کر چاہنے والا۔ سنجیدہ دل و دماغ کا مالک، قابلیت و لیاقت کا خزانہ
انگریزی داں اور ایک دردمند دل انسان تھا۔

غوث ساجد نے بی اے پاس کرنے کے بعد محکمۂ مال کی اہلکاری کو اپنا لیا۔ ۶۷
ایم اے انگریزی میں کیا۔ وہ ایل ایل بی بھی تھے۔ وظیفہ پر علیحدہ ہونے تک پٹن کے
صدر شعبۂ انگریزی اور لکچرر کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دیتے رہے جب ۲۰ رفرو
۱۹۵۵ء میں علاقہ مرہٹواڑہ کے ادب نوازوں نے "مطلع ادب" کے نام سے ایک ادبی انجمن
کی تو غوث ساجد بھی دیگر نثر نگاروں کے ساتھ اس انجمن میں شامل ہو گئے۔ یہیں سے
ادبی سرگرمیوں کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس انجمن کے وہ سکریٹری بھی رہے ہیں۔

انہوں نے ابتدا میں بچوں کے لئے کہانیاں لکھ کر اردو نثر نگاری کی دنیا میں
قدم رکھا۔ بچوں کی کہانیاں روزنامہ "انقلاب ممبئی" ہندوستان ٹائمز ممبئی، کھلونا
پھلواری دہلی، کلیاں لکھنو میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ پہلا افسانہ "تبسم حیدرآباد میں"
کے نام سے شائع ہوا تھا۔ بعد ازاں ان کی کئی تخلیقات شاعر بمبئی، شاہراہ دہلی
خیال کامٹی، پگڈنڈی امرتسر، ہم قلم کراچی وغیرہ میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہی ہیں
انہوں نے کئی طبع زاد افسانے بھی لکھے ہیں۔ ان کے افسانوں کے موضوعات بالکل نئے اور
ہوتے ہیں۔ زندگی کو تجربوں کی آنچ میں تپا کر اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ مشاہدے
نظر کی باریکی اور حقیقت بیانی پائی جاتی ہے۔ ان کا اسلوب بیان بالکل سادہ، شستہ
شگفتہ ہوتا ہے۔ انسانی نفسیات کی ہو بہو تصویر کھینچتے ہیں۔ میں نے ان کے افسانوں
گہرائی سے مطالعہ کیا ہے اور ان کی افسانہ نگاری کے فن پر تنقید و تجزیہ بھی کیا ہے کیونکہ
ایک بہترین افسانہ "پتھر اور لہو" ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر مرہٹواڑہ یونیورسٹی اورنگ آباد

ایم اے اردو کے نصاب میں شامل ہے مجھے درس و تدریس کے دوران ایم اے اردو کے طلبار اور طالبات کے سامنے غوث ساجد کی افسانہ نگاری اور ان کے فن پر لکچر دینا ہوتا ہے نیز ان کے افسانہ کی تفہیم و تشریح بھی کرنا ہوتی ہے۔ میں نے انہیں ایم اے اردو کے طلبار کی معلومات کے لئے مرہٹواڑہ کے افسانوی ادب پر ایک توسیعی لکچر دینے کے لئے کہا تھا پہلے تو انہوں نے انکار کیا پھر بڑی مشکل سے آمادہ بھی ہو گئے تھے۔ لیکن زندگی وفا نہ کر سکی واقعی زندگی بے وفا ہے اور موت محبوبہ، وہ اپنی محبوبہ کی یاد میں اب تک جیتے رہے ہیں۔

"پتھر اور پھول" کا مرکزی خیال دراصل ولیم گیبن کی شاہکار نظم "دی اسٹون" سے لیکر اسے افسانہ کا روپ دے دیا گیا ہے۔ جو ایک کامیاب کوشش ہے اس کے علاوہ کئی انگریزی کی مشہور نظموں کے اردو ترجمے بھی کیئے۔ انگریزی کے اچھے ادیبوں کی مشہور کہانیوں کو اردو کا جامہ بھی پہنایا ہے جو اردو ادب کے لئے ایک نیا کامیاب تجربہ ہے شیرازہ، جموں و کشمیر اور دیگر روزناموں اور ماہناموں میں یہ ترجمے برابر شائع ہوتے رہے ہیں۔ انتقال سے کچھ دنوں پہلے ولیم بلیک کی مشہور نظم کا اردو میں آزاد ترجمہ کیا ہے نظم کا نام رکھا ہے "مجسم بہار" وہ نظم اس طرح ہے۔

اپنی شبنمی زلفوں کو سنوار کر
تم صبح کے صاف دریچوں سے
ہماری سرزمین پر نظر ڈالتی ہو
تم سے پُر شوق التماس ہے
اپنی نگاہ لطف و کرم
مرکوز کردو ہمارے جزیرہ پر

جہاں تمہاری آمد کے عنوان سے
مرحبائی کے مسرور نغموں سے
سماع خانے آباد ہیں
کوہستانی پس منظر میں
چوٹیاں محو گفتگو ہیں
وادیاں بھی ہمہ گردش معروف ہیں
ہماری مشتاق و منتظر نظریں
تمہارے تابناک خیمہ پیر مرکوز ہیں
ہمارے دیار کمتریں پر
تمہارے قدم رنجہ ہونے کا
سب ہی کے لبوں پر اصرار ہے
اب چلی بھی آؤ
اور ہماری فضاؤں کو موقعہ دو
کہ وہ تمہارے پیرہن معطر پر
عقیدت کے بوسوں کی کثرت کریں
اور ہم محظوظ ہوتے رہیں
صبح و شام تمہاری خوشبوؤں سے
تم اپنے گلوں سے
بکھیر دو ہر سمت، راحت کے موتی
ہماری مریض عشق سرزمیں پر

اس کی آرائش و زیبائش کروں
اپنی خوبصورت انگلیوں سے
اس کے سینے کو بوسوں سے شادماں کروں
اور اپنے بیش بہا تاج سے
اس کے مضمحل سر پر زینت کروں
جو اپنی زلفیں سنوارتے ہوئے
مجسم انتظار رہے تمھارے لیئے

میری اُن سے پہلی ملاقات تقریباً پانچ برس قبل دیوگری کالج میں ہوئی تھی وہاں ان کے پیپرے جانچنے کے لئے آئے تھے پروفیسر عبدالوہاب نے اُن سے تعارف کروایا۔ پہلی ملاقات ہی میں انھوں نے بہت ساری باتیں کیں۔ کئی سوالات پوچھے۔ چائے سے تواضع کی۔ خوب تر ہے۔ ان سے اکثر ملاقاتوں کا شرف حاصل ہوتا رہا ہے۔ آخری ملاقات اُن کی بیٹی کی شادی میں ہوئی تھی عبدالستار مینی، افتخار احمد، مرزا احمد بیگ ہم سب کا انھوں نے بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا۔ بہت دیر تک ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ نان قلیہ خوب کھلاتے رہے۔ ہمیں پہنچانے کے لئے شامیانہ کے باہر تک آئے۔ ہاتھ ملایا مسکرائے اور خدا حافظ کہا۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ یہ آخری ملاقات ہوگی ورنہ اُن کا ہرگز ہرگز ہاتھ نہ چھوڑتا۔ بھلا انہیں بھی اتنی کیا جلدی تھی۔ فوراً ہاتھ چھڑا لینے کی وہ ہمیشہ کے لیئے بچھڑ گئے۔ وہ خلوص و محبت کا جیتا جاگتا پیکر۔ دوستوں کے دوست، مہمان نواز، مروت، و رواداری کا مجسمہ، انسانیت و شرافت کا پتلا۔ ایک نیک اور صالح انسان تھے ؎

ابھی تک ترے فسانے یاد ہیں فانیؔ ــــ تیرا نشان نہ رہا اور بے نشان نہ رہا

جے پی سعید نے جشن غوث صاحب کے موقع پر کیا خوب کہا تھا ؎

وہ جس نے خود سنواری اپنی قسمت غوث ساجد ہے
وہ جس نے ہر جگہ بانٹی محبت غوث ساجد ہے
لٹائی جس نے علم و فن کی دولت غوث ساجد ہے
بنایا جس نے خوابوں کو حقیقت غوث ساجد ہے

سبق اس کے عمل سے سیکھئے محنت کی عظمت کا
جو دیکھو شخصیت اس کی نمونہ ہے شرافت کا

ہے اس کی گفتگو شستہ، شگفتہ اس کی تحریریں
جو ہیں انداز شائستہ تو پُر مغز اس کی تقریریں
چراغ علم ایسا جس کی ہیں ہر سمت تنویریں
مسلسل کامیابی کا ذریعہ اس کی تدبیریں

ہے مری خوش نصیبی وہ میرا مونس ہے ہمدم ہے
اگر ہے غوث ساجد ساتھ تو کس بات کا غم ہے



بقیہ سلسلہ حضرت العلامہ طاہر رضوی قبلہ

کے ہزاروں شاگرد اقطاع عالم میں پھیلے ہوئے اور دینی خدمات میں مصروف ہیں۔ جن میں سے چند یہ ہیں حضرت سید عبدالرزاق قادری بانی لطیفیہ عربی کالج، مولانا سید جعفر محی الدین (امریکہ) مولانا سید شاہ عطا اللہ حسینی (پاکستان) مولانا عبدالحفیظ جنیدی (بنگلور)، مولانا پیر دقیر سلطان محی الدین صاحب جامعہ نظامیہ) مولانا مفتی محمد عظیم الدین (دائرۃ المعارف) موجودہ امیر جامعہ شیخ الجامعہ نظامیہ، نائب شیخ الجامعہ جامعہ نظامیہ کے شیوخ و اساتذہ اورینٹل کالج کے لکچررس اور بے شمار علماء و اساتذہ ●

ڈاکٹر عبدالمغنی
پٹنہ۔ بہار

پنڈت آنند نرائن ملّا — شخصیت اور شاعری

پنڈت آنند نرائن ملّا کی رحلت آزاد ہندوستان میں اردو کے لیے ایک المناک سانحہ ہے۔ پرانی نسل میں جو تقسیم ہند سے پچاس سال قبل پروان چڑھی تھی وہ اردو کے مخلص سپاہیوں یا سپہ سالاروں میں ایک نمایاں فرد تھے۔ آزادی ہند کے دو برس بعد ۱۹۴۹ء میں جب ان کا پہلا اور ضخیم مجموعۂ کلام "جوئے شیر" جناب آل احمد سرور کے بسوط تنقیدی دیباچے کے ساتھ شائع ہوا تو اس کا انتساب انھوں نے "مٹتی ہوئی اردو کے نام" حسب ذیل اشعار میں کیا تھا:

اک موت کا جشن بھی منا لیں تو چلیں ؛ پھر پونچھ کے اشک مسکرا لیں تو چلیں
آ تجھ کو گلے لگا کے مٹتی اردو ؛ اک آخری گیت اور گا لیں تو چلیں

یہ ایک دل شکستہ عاشقِ اردو کی اقبال کے لفظوں میں "صدائے دردناک" تھی:

تھی کسی درماندہ رہرو کی صدائے دردناک ؛ جس کو آوازِ رحیلِ کارواں سمجھا تھا میں

اقبال کا یہ شعر جشنِ آزادی کے دور میں آنند نرائن ملّا کے مٹائے جانے والے اردو کے جشن
دوست پر بہت ہی معنی خیز طریقے سے چسپاں ہو جاتا ہے جو انھوں نے ہندوستان کے رحیلِ کارواں

کے وقت درماندہ رہبرد کا علامتی مفہوم ایک بیزر درد حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے اس لیے کہ مرگِ اُردو کا جو جشن ملا نے اڑتالیس سال قبل منانا چاہا تھا اور اڑتالیس سال بعد بھی وہ ۱۹۹۷ء میں اپنے آخری سانس تک مناتے رہے وہ اُردو کی اس زندگی کی طرف اشارہ کرتا ہے جو حوصلہ شکن اور یاس انگیز یا تشویش انگیز حالات میں بھی ملاؔ جیسے عشاقِ اُردو کی جد و جہد کا ثمر ہے۔

جناب آنند نرائن ملاؔ کی شخصیت جناب مالک رام کی طرح اپنی وضع اور کردار کے لحاظ سے ہندوستان میں نشو و نما پانے والی اس مشترکہ تہذیب کی ایک مجسم علامت تھی جس کا سب سے حسین اور موثر ذریعۂ اظہار اُردو ہے۔ ملاؔ صاحب اتر پردیش ہائی کورٹ کے جسٹس کے عہدے سے ریٹائر ہونے کے بعد جب لکھنؤ سے الکشن لڑکر پارلیمنٹ میں آگئے تو وہ عملاً زبان اُردو اور تہذیب اُردو کی ایک جمہوری فتح تھی۔ اس کے بعد ملاؔ صاحب ملک میں اُردو کی سب سے بڑی تنظیم انجمن ترقی اُردو (ہند) کے صدر ایک مدت تک رہے۔ اس زمانے میں اُردو کی حمایت و وکالت ان کے بیانات سے مسلسل ہوتی رہی۔ قلب شہر دہلی میں اُردو گھر کا افتتاح کچھ نامساعد ماحول میں اسی وقت ہوا۔ "جوئے شیر" کی ایک اہم غزل کا مقطع اُردو کے لیے ناموافق حالات پر ملاؔ صاحب کا ایک ایسا فکر انگیز تبصرہ تھا جو گویا اُردو دشمنوں پر بجلی بن کر گرا اور دوستوں کے لیے اپنی مادری و تہذیبی زبان کے تحفظ کے لیے ایک نعرہ سا بن گیا : ؎

لبِ مادر نے ملاؔ لوریاں جس میں سنائی تھیں ؛ وہ دن آیا ہے اب اس کو بھی غیروں کی زباں سمجھو

اس سے بڑھ کر اُردو کے وجود کے ساتھ مکمل وابستگی کا اعلان ممکن نہیں۔ اس سلسلے میں پنڈت آنند نرائن ملاؔ کا لقب "پنڈت" اور تخلص "ملاؔ" بعض مواقع پر ایک ہی شخصیت میں اپنی

جانا ہے نہ صرف نہایت پُر لطف بلکہ پُر اثر بن گیا۔ گرچہ ایک تحقیقی روایت
کہ لفظ ملّا دراصل بہ فتح میم ایک خاندانی لقب ہے مگر بہ ضمّۂ میم اس کا عام تلفظ
ہی زبان زد۔ اس لفظی موشگافی سے قطع نظر پنڈت آنند نرائن ملّا کا آزاد ہندوستان
پہلی چوتھائی میں ایک زبردست اُردو نواز ہونا ایک بہت ہی جری اور اولوالعزم شخصیت
نشاندہی کرتا ہے۔

ملّا صاحب کی شخصیت میں انفرادیت کا جوہر خود ان کی نگاہ میں بہت نمایاں
اس سلسلے میں وہ اپنے شدید احساس کا برملا اظہار کرتے ہیں ۱۹۵۹ء میں ان کا جب
سرا مجموعۂ کلام "کچھ ذرّے کچھ تارے" شائع ہوا تو اس کے شروع ہی میں یہ شعر نظر آیا
ئی شعر میں یہ جادۂ ملّا تو نہیں — ایک الگ ہٹ کے نشان کفِ پا ہے تو سہی
بے شک یہ ایک دعویٰ ہے جو کوئی بھی شاعر کر سکتا ہے اور اس قسم کی تعلی دنیائے
شاعری میں بہت عام ہے لیکن ملّا یقیناً کوئی عام شاعر نہیں تھے پچھلے پچاس سال کے
میں نمایاں ہونے والے حقیقی شاعروں کی جو مختصر سے مختصر فہرست بنائی جائے گی اس
اگر ملّا کا نام نہ ہوا تو وہ ناقص ہوگی بجائے خود یہ بات بحیثیت شاعر ملّا کی اہمیت
تاکیدی نشان لگاتی ہے۔ ملّا کی شاعری کا آغاز آزادی سے تقریباً ایک چوتھائی
قبل ہوا اور ان کی شہرت بھی ہونے لگی اُردو کے مقتدر رسالوں میں شائع ہو کر ان کے کلام
دادِ سخن پائی انھیں نظم و غزل دونوں پر یکساں قدرت تھی گرچہ تغزل ہی ان کی خصوصیت
حالاں کہ اپنے وقت کے بعض اہم موضوعات پر ان کی متعدد نظمیں موجود ہیں

ملّا کی شاعری فن کی کلاسیکی قدروں کی حامل ہے لہٰذا دورِ جدید، عصرِ حاضر کے اُردو
شاعروں میں جو چند نام کسی بھی حیثیت سے اور کسی بھی درجے میں تاریخِ ادب کی زینت
لگے ان میں ایک پنڈت آنند نرائن ملّا ہیں شعر کی اصلیت کے متعلق موصوف کا حسبِ ذیل

بیان ان کے کلام پر بھی صادق آتا ہے۔

وہ شعر شعر نہیں اور کچھ بھی ہو ملاّ ؛ دلوں میں تیر کی صورت جو راہ کرنہ سکے

شعر کی یہ تاثیر ملاّ کی اکثر غزلوں میں پائی جاتی ہے اور بعض نظموں میں بھی۔ مثال کے طور پر سب سے پہلے غزلوں کے چند اشعار کا حوالہ کافی ہوگا۔

یہ ربطِ عشق خود اک حدِ فاصل ہوتا جاتا ہے ؛ جو پردہ اٹھتا جاتا ہے وہ حائل ہوتا جاتا ہے

کلامِ عشق بے سوال آ ہی گیا ؛ خود بخود اس کو خیال آ ہی گیا

سامنے آتے ہی ان کے چپ سا ہو جاتا ہوں میں ؛ جیسے خود اپنی تمناؤں سے شرماتا ہوں میں

بہار آتے ہی خونریزی ہوئی وہ صحنِ گلشن میں ؛ تجلی کانٹے تھے یوں پھولوں کو جوشِ انتقام آیا

(جوئے شیر)

جہاں میں کون کس کے درد پر ناشاد ہوتا ہے ؛ فسانہ جس کا ہوتا ہے اسی کو یاد ہوتا ہے

مدت سے اڑ رہا ہے اُفق پر غبارِ رسا ؛ اے والیٔ شوق یہ بھی اگر کارواں نہیں

غرورِ فتح میں جتنی جفائیں ہوتی جاتی ہیں ؛ یہ سب کل کی لڑائی کی بنائیں ہوتی جاتی ہیں

اس زندگی میں اور مصیبت کوئی نہیں ؛ خود زندگی ہوئی ہے مصیبت کبھی کبھی

خموشی ساز ہوتی جا رہی ہے ؛ نظر آواز ہوتی جا رہی ہے

کیوں زیست کا ہر ایک فسانہ بدل گیا ؛ یہ ہم بدل گئے کہ زمانہ بدل گیا

(کچھ ذرّے کچھ تارے)

ان اشعار میں کچھ دردِ دل ہے، کچھ فکرِ زمانہ اور جو کچھ ہے برجستگی اور عمدگی کے ساتھ سلاست بھی ہے، متانت بھی، روانی ہے، خیال انگیزی بھی، نہ ابہام ہے نہ انتشار، اگر قدرے فلسفہ ہے تو واضح اور طنز ہے تو دل نشین، نصیحت تلخی سے خالی ہے اور حسرت خیال انگیز حقیقت پسندی میں بصیرت مندی بھی شامل ہے یہ سب اردو غزل کے پختہ و بالیدہ کلاسکی آرٹ

رمائی ہے جس پر ملا کی دسترس بے خطا ہے بیسویں صدی کے دوسرے نصف کے ہنگاموں
ں شاعر نے اپنے فن کے سانچے اور پیمانے کو صحیح و سالم رکھا ہے یہ اس کے انداز تغزل
انی ہے اور اردو شاعری کی بنیادی استواری۔ ملا کا تجربہ اپنی روایت سے الگ نہیں اور
انفرادیت اجتماعیت کا ایک حصہ ہے

ملا کی نظم نگاری میں بھی نمونے کے طور پر چند تخلیقات کا ذکر ان کی قدرت بیان اور
آفرینی کے ثبوت کے لیے کافی ہوگا۔

دوسرے مجموعۂ کچھ ذرے کچھ تارے میں ایک پُراثر نظم "سوغات" ہے جو تقسیم ہند
ِ لاہور جاتے ہوئے لکھی گئی اور حسب ذیل شعر سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہوتی ہے۔

ل تجدید الفت کا ترانہ لے آیا ہوں ⁞ میں کیا آیا ہوں اک گزرا زمانہ لے کے آیا ہوں

یہ پوری نظم گویا جناب جگن ناتھ آزاد کی ایک غزل کے اس شعر کی، جو ایسے ہی موقعے پر
ی نشان دہی نظم میں کی گئی لکھا گیا تھا۔ تفسیر و تصویر ہے ؎

اپنے گھر میں آیا ہوں مگر انداز تو دیکھو ⁞ کہ اپنے آپ کو مانند مہمان لے کے آیا ہوں

بقیہ سلسلہ صکہ سے آگے

جائے گی۔

ارشاد فرمایا۔ گھر میں قدم رکھو تو اہل خانہ کو سلام کہو آپس میں ایک دوسرے
تو سلام کا لفظ عام کرو۔ معاشرہ امن و سلامتی کا گہوارہ بن جائے گا۔
مسلم کی پہچان یہ ہے کہ وہ خیر اور سلامتی کا ایسا پیکر ہوتا ہے کہ اس
بان اور ہاتھ سے کسی کو درد اور دکھ نہیں پہنچتا اور مومن تو نام ہی اس
ہے جو امن شعار امن پسند اور امن پرور ہوتا ہے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بنیادی انسانی حقوق کا تحفظ اور پولیس

پنجاب میں ایک پولیس آفیسر اجیت سنگھ سندھو سابق ایس ایس پی ترنتارن امرتسر کی خودکشی کے بعد یہ سوال اٹھایا جا رہا ہے کہ جن پولیس افسران نے پنجاب سے دہشت گردی کا خاتمہ کیا ان کے خلاف بنیادی انسانی حقوق کی پائمالی کے جرم میں اگر مقدمات چلائے گئے تو ان سے پولیس کا حوصلہ پست ہوگا اور کوئی پولیس آفیسر دہشت گردی کے مقابلے کے لئے سامنے نہیں آئے گا وغیرہ وغیرہ اس بات کو جہاں بعض پولیس افسران نے اٹھایا ہے وہیں فسطائی تنظیمیں آر ایس ایس، بی جے پی، وشوا ہندو پریشد وغیرہ بھی بہت پیش پیش ہیں۔

واضح رہے کہ ایک اندازے کے مطابق فی الوقت صرف پنجاب میں ۱۴۰ افسران کے خلاف بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے مقدمات زیر سماعت ہیں جن میں آئی پی ایس درجے کے افسران بھی شامل ہیں اور گیارہ سو مقدمات پینڈنگ ہیں۔

معلوم رہے کہ پنجاب کی خالصانی تحریک کے دوران پچیس ہزار انسانی جانیں تلف ہوئیں جن میں دہشت گرد اور پولیس والوں کے علاوہ بہت سے بے گناہ افراد مارے گئے اور بے گھر ہوئے تھے ان میں ایسے واقعات بھی ہیں جن میں فرضی مقابلہ دکھا کر لوگوں کو قتل کیا گیا ہے۔

جہاں تک دہشت گردوں کا تعلق ہے جو اب سپریم کورٹ کی رولنگ آنے کے بعد جرم بھی

جہاں تک دہشت گردوں کا تعلق ہے ان کی اکثریت تو ماری جا چکی ہیں یا جیلوں میں ہے مگر پولیس افسران اور کرم چاری جنھوں نے ڈیوٹی کے دوران قانون اور انسانی حقوق کی پامالی کی' ان کے خلاف مقدمات چل رہے ہیں۔ ترنتارن امرتسر کے سابق ایس ایس پی اجیت سنگھ سندھو کے خلاف بھی اسی قسم کا مقدمہ عدالت میں زیر سماعت تھا۔ اخباری بیان کے مطابق سندھو صاحب نے اس مقدمہ سے خوف زدہ ہوکر خودکشی کرلی۔ جس پر آج کل بعض پولیس افسران اور فرقہ پرست تنظیمیں شور مچا رہی ہیں۔

جہاں تک خودکشی کا تعلق ہے جناب سپریم کورٹ کی رولنگ آنے کے بعد جرم بھی نہیں رہ گیا ہے ایک جذباتی نفسیاتی کیفیت ہے جب آدمی حالات کا مقابلہ نہیں کر پاتا' یا فیصلہ کرنے کی قوت کھو بیٹھتا ہے تب وہ مایوسی کا شکار ہوکر خودکشی کرتا ہے جیسے دہشت گردی بھی کسی طرح کا نفسیاتی مرض سمجھا چاہیئے کیونکہ دہشت گردی میں انسان ماحول کو اپنے لئے سازگار بنانے کی خاطر ہتھیار اُٹھاتا ہے مسٹر اجیت سنگھ نے بھی اگر مقدمے سے گھبرا کر خودکشی کی ہے تو یہ شاید مایوسی اور ذہنی انتشار کی علامت ہے۔

یہ تو مانا کہ انھوں نے دہشت گردی کا جان توڑ مقابلہ کیا تھا۔ لیکن جس برائی کو مٹانے کے لئے وہ سردھڑ کی بازی لگا رہے تھے اس برائی کو خود اختیار کرنے کا کیا جواز تھا ان کی خودکشی بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنے خلاف الزامات کی [illegible] گھبرا گئے تھے اگر وہ [illegible] انھیں قانون و انصاف پر بھروسہ رکھنا چاہیئے تھا جیسا کہ ہر پولیس آفیسر پر مقدمہ دائر کرتے وقت یہی کہتا ہے۔

قانون شکنی اور انسانی حقوق کی خلاف ورزی کے نتیجے میں اگر کسی شخص کے خلاف خواہ وہ ملک کے بڑے سے بڑے عہدے پر فائز کیوں نہ ہو' اگر مقدمہ قائم ہوتا ہے تو اس میں اس کی حوصلہ شکنی کا کیا سوال ہے یہ تو ایک قانونی اخلاقی اور اصولی بات ہے کہ اگر کسی نے برائی مٹانے کے لئے خود برائی

کا ارتکاب کیا ہے تو اسے کیوں معاف کیا جائے اس طرح سے تو انصاف ہی کا خاتمہ ہو جائے۔
خود قانون کے رکھوالے اور انسانی حقوق کے محافظ ہی اگر انصاف کی ترازو میں تلنے کے لئے
نہیں تو دوسرا کون تلے گا جو قانون دوسروں کے لئے بنایا جاتا ہے اور کمزوروں کو دبانے کے لئے
ہوتا ہے وہ طاقتور کے خلاف پہلے استعمال ہونا چاہیئے۔
پولیس اور فوج کو ہتھیار، قانون و انصاف کی حفاظت کے لئے دیئے جاتے ہیں نا کہ بے
کے قتل کے لئے! ہمارا خیال ہے کہ پنجاب کے اس حادثے کو لے کر جو لوگ واویلا کر رہے ہیں۔ ان
مقصد اکالی حکومت پر نفسیاتی دباؤ ڈالنا ہے تاکہ بادل گورنمنٹ انصاف کے تقاضے پورے کر
سے باز رہے۔ شور مچانے والے ایک طرف مجرموں کو بچانا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف اکالی حکومت
بے اثر اور غیر مقبول بنانے کی کوشش میں ہیں جو بڑے افسوس کی بات ہے بادل صاحب کو سمجھنا چا
کہ اس سارے شر لیے کے پیچھے بی جے پی کا دایاں بازو آر ایس ایس اور ایک اخباری گروپ
دہشت گردی میں سرکار کی مدد کے نام پر بھاری دولت جمع کرتا ہے کا ہاتھ ہے کانگریس کے پٹھو پو
افسران بھی اس میں پیش پیش ہیں حالانکہ ان میں سے بعض تو عورتوں کو لے کھینچنے کی س
پا چکے ہیں۔
پنجاب میں بڑی دیر کے بعد عوامی حکومت قائم ہوئی ہے اور امن دامان بحال ہوا ہے حکومت
کہ وہ مفاد پرستوں کے دباؤ میں نہ آئے۔ خالصتانی تحریک کے دوران عوام کے اعتماد کو جو ٹھیس پہنچی
اسے دوبارہ قائم کرے، ہندو سکھ بھائی چارے کو مستحکم کرے اور ریاست میں امن و قانون کی
کو بہتر بنانے کے ساتھ ساتھ اقتصادی ابتری کو جلد سے جلد ختم کرے۔
قانون شکنی کرنے والے مفاد پرست افسران اور فرقہ پرست تنظیموں (آر ایس ایس
بی جے پی وغیرہ) کے اس واویلے سے اس بات کی قلعی کھل گئی ہے کہ یہ عناصر انصاف کے زاویے اور
بدلتے رہتے ہیں۔ پنجاب کے لئے ان کا اور پیمانہ ہے تو دہلی و یوپی اور مہاراشٹرا کے لئے دوسرا۔

اندرا گاندھی کے قتل کے نتیجے میں جو قتل عام ہوا تھا۔ اس کے مجرموں کا کیا ہوا اس وقت پولیس اور انتظامیہ کی مجرمانہ لاپرواہی کا کیا بنا۔ اس کے لئے شور کوئی نہیں۔

ہاشم پورہ میرٹھ کے ہم مسلم نوجوانوں کے قتل عام کے مجرموں کا کیا ہوا۔ اس کے لئے بھی کوئی شور نہیں۔

ہر مندر صاحب امرتسر اور بابری مسجد کی بے حرمتی پر بھی کوئی واویلا نہیں۔

ممبئی فسادات کے قتل عام کے مجرموں اور اس میں ملوث پولیس افسران کے خلاف بھی کوئی واویلا نہیں۔ واویلا اگر ہے تو پنجاب ہی میں ہے اور وہ بھی اس بات پر کہ انسانی حقوق مجرموں کے خلاف مقدمات نہ چلاؤ۔ ورنہ ان کا حوصلہ پست ہو جائے گا اور وہ آئندہ دہشت گردی کا مقابلہ نہیں کر پائیں گے یعنی ان میں انسانی حقوق کی پامالی کی طاقت نہیں رہے گی۔

یاد رہے کہ فسطائی طاقتیں قانون شکنی کی جس قدر حوصلہ افزائی اس وقت کر رہی ہیں اتنا کوئی بھی نہیں کر رہا یہ لوگ افراتفری اور انتشار پھیلا کر اقتدار اور دولت پر قابض ہونا چاہتے ہیں۔

ملک کا اس وقت سب سے اہم مسئلہ بڑے سیاست کار اور افسران کی بدعنوانیوں کا احتساب ہے جو بڑی دیدہ دلیری سے گھوٹالوں میں مصروف ہیں اگر اقتدار اور وسائل پر قابض لوگ بے ایمان ہو جائیں گے تو ایماندار کون رہے گا اور اگر بے ایمان، بدعنوان، قانون شکنی کرنے والے اور انسانی حقوق کے تحفظ کی خلاف ورزی کرنے والوں کو بچایا جائے گا تو سماج کی اصلاح کس طرح ممکن ہوگی۔ اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ کچھ لوگ ملک کو انارکی کی طرف لے جانا چاہتے ہیں اور اس سے سیاسی و مالی فوائد حاصل کرنا چاہتے ہیں ملک کے عوام اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیں اور صرف امن و انصاف پسند عناصر کی حوصلہ افزائی کریں۔

ڈاکٹر عبدالمغنی



آزادی سے قبل حیدرآباد کی عثمانیہ یونیورسٹی نے اردو ذریعہ تعلیم سے تمام علوم و فنون کی وہ
مکمل اعلیٰ تعلیم ملک کی اس نسل کو بلا امتیاز فرقہ و مذہب دی تھی جس کے بعض نمائندے
عصرِ حاضر میں بھی وزیرِ اعلیٰ، گورنر اور وزیر اعظم کے عہدوں تک پر فائز رہے ہیں
یہ کسی بھی ہندوستانی زبان کا وہ واحد کارنامہ بیسویں صدی میں ہے جس کی عظمت و افادیت
کا اقرار مہاتما گاندھی نے بھی کیا یہ ہندوستانی زبان جو اب عام طور پر صرف اردو کہی جاتی ہے
یونیسکو کے تازہ ترین سروے کے مطابق بولنے والوں کی تعداد کے اعتبار سے دنیا کی
دوسری سب سے بڑی زبان ہے اردو دستورِ ہند کے شیڈول نمبر ۸ میں
ایک قومی زبان بھی ہے اور بہار نیز اُترپردیش کی دوسری سرکاری زبان بھی ـــــ
باضابطہ اسمبلی کے ترمیمی ایکٹ کی منظوری کے ساتھ ۔

اردو یونیورسٹی کی ضرورت ملک و ملت دونوں کو اس لیے ہے
کہ انگریزی ذریعہ تعلیم اب ممکن نہیں رہا جب کہ دوسری کوئی ہندوستانی زبان انگریزی
کی جگہ نہیں لے سکتی اور اردو کے ذریعے تمام علوم و فنون (آرٹس اور سائنس) کا کم از کم
ایک کامیاب تجربہ آزادی سے قبل ہندوستان کی ایک ریاست آندھرا کے دارالسلطنت
حیدرآباد میں ایک مدت تک کیا جا چکا ہے یہ ضرور ہے کہ مختلف علوم کی بالخصوص تکنیکی
اصطلاحات کے ترجمے اور علمی ترقیات کی نصاب میں شمولیت کے معاملے میں اردو کو

اپنی روایتی رواداری اور مسلمہ وسعتِ نظر سے کام لینا ہوگا۔ ہر اصطلاح کا ترجمہ
ضروری نہیں اور اگر کیا جائے تو اس کا انگریزی مترادف بھی ساتھ درج
کیا جائے تاکہ آج کے بین الاقوامی دائرے میں زیادہ مشکلات کا سامنا نہیں
ہو۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے گزشتہ نصابات میں توسیع اور نصابی کتابوں میں تجدید
کی ضرورت ہے اس لیے کہ زبان اور مضمون کسی میں بھی ہم پچاس برس پیچھے
نہیں لوٹ سکتے۔ رائج الوقت زبان اور مضامین کا استعمال لازمی ہے۔

اردو یونیورسٹی کے نام سے کچھ لوگوں کو شاید وحشت سی ہو رہی ہے اور کچھ لوگ اسے فقط
مسلم یونیورسٹی یا پھر لسانی و ادبی یونیورسٹی بھی سمجھ رہے ہیں۔ غالباً اس صورتِ حال کی وجہ لفظ اردو
ہے۔ یہ صورتِ حال تقسیم ہند اور اس کے فرقہ وارانہ اثرات کی پیداوار ہے کہ اس تقسیم کے ذمہ دار نہ
مسلمان ہیں اور نہ اردو۔ اردو تو برصغیر میں صدیوں سے قومی یک جہتی کا ذریعۂ اظہار شروع سے آج
تک رہی ہے اور مسلمان وہ ہیں جنھوں نے موجودہ یا دورِ تاریخ کے ہندوستان کو ہندوستان بنایا۔
اس تناظر میں اردو اور اہلِ اردو زبانِ حال سے کہہ سکتے ہیں: ؎

میرے نغموں سے تو یہ جنت نشان بنتا گیا ۔ اور میں غبارِ خاطرِ ہندوستان بنتا گیا

آزادی سے قبل حیدرآباد کی عثمانیہ یونیورسٹی نے اردو ذریعۂ تعلیم سے تمام علوم و فنون کی وہ مکمل
"تعلیم ملک کی اس نسل کو بلا امتیاز فرقہ و مذہب دی تھی جس کے بعض نمائندے عصرِ حاضر میں بھی
وزیر اعلیٰ، گورنر اور وزیر اعظم کے عہدوں تک پر فائز رہے ہیں۔ یہ کسی بھی ہندوستانی زبان
کا وہ واحد کارنامہ بیسویں صدی میں ہے جس کی عظمت و افادیت کا اقرار مہاتما گاندھی نے بھی کیا ہے یہ
ہندوستانی زبان جو اب عام طور پر صرف اردو کہی جاتی ہے یونیسکو کے تازہ ترین سروے کے مطابق
بولنے والوں کی تعداد کے اعتبار سے دنیا کی دوسری سب سے بڑی زبان چینی کے بعد ہے۔ اردو
دستورِ ہند کے شیڈول نمبر ۸ میں ایک قومی زبان بھی ہے اور بہار نیز اتر پردیش کی دوسری سرکاری

زبان بھی، باضابطہ اسمبلی کے ترمیمی ایکٹ کی منظوری کے ساتھ ۔

ایسی زبان کی یونیورسٹی آزادی کے پچاس سال بعد بھی قائم کیوں نہیں کی گئی جب کہ آزادی سے قبل ایسی ایک یونیورسٹی حیدرآباد میں پوری شان سے نہایت نتیجہ خیز طور پر کام کر رہی تھی ؟ اس سوال کا کوئی جواب تقسیم ہند کی سیاست کے اثرات کے سوا نہیں، اس لیئے کہ اردو میں ملک کے دوسری کسی بھی زبان سے زیادہ صلاحیت ایک مکمل یونیورسٹی کا ذریعۂ اظہار بننے کی ہے شاید یہی وجہ ہے کہ اردو کو نظر انداز کر دینے کے بعد دوسری کسی قومی زبان کی یونیورسٹی اب تک چلائی نہیں جا سکی ۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ اب اردو یونیورسٹی کے قیام کا فیصلہ حکومت نے کیوں کیا اور کیا اس پر عمل ہو سکے گا ؟ فیصلہ تو ظاہر ہے کہ اردو آبادی کے مطالبہ پر اور اس کی احساس محرومی کو دور کرنے کے لیئے کیا گیا ۔ اس پر عمل حکومت کو کرنا ہے اگر ایسا ہوتا ہے تو نصاب کے مضامین اور طریق کار وغیرہ کے سوالات اٹھیں گے ۔

اردو دوستوں کو اس سلسلے میں کسی الجھن کا شکار نہیں ہونا چاہیئے ۔ اگر ایک اور مسلم یونیورسٹی سامنے آتی ہے تو یہی سہی ۔ اردو یونیورسٹی کی ضرورت ملک و ملت دونوں کو اس لیئے ہے کہ انگریزی ذریعۂ تعلیم اب ممکن نہیں رہا ہے کہ دوسری کوئی ہندوستانی زبان انگریزی کی جگہ نہیں لے سکے گی اور اردو کے ذریعے تمام علوم و فنون (آرٹس اور سائنس) کا کم از کم ایک کامیاب تجربہ آزادی سے قبل ہندوستان کی ایک ریاست آندھرا کے دارالسلطنت حیدرآباد میں ایک مدت تک کیا جا چکا ہے یہ ضرور ہے کہ مختلف علوم کی بالخصوص تکنیکی اصطلاحات کے ترجمے اور علمی ترقیات کی نصاب میں شمولیت کے معاملے میں اردو کو اپنی روایتی رواداری اور مسلمہ وسعت نظر سے کام لینا ہوگا ۔ ہر اصطلاح کا ترجمہ ضروری نہیں اور اگر کیا جائے تو اس کا انگریزی مترادف بھی ساتھ ساتھ درج کیا جائے تاکہ آج کے بین الاقوامی دائرے میں زیادہ مشکلات کا سامنا نہیں ہو ۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے گزشتہ نصابات میں توسیع اور نصابی کتابوں میں تجدید کی ضرورت ہے اس لیئے کہ زبان اور مضمون کسی

بھی ہم پچاس برس پیچھے نہیں لوٹ سکتے۔ رائج الوقت زبان اور مضامین کا استعمال
ا ہے۔

اُردو یونیورسٹی کے سند یافتہ طلبا کی ملازمت و تجارت وغیرہ میں پذیرائی ایسی
ہو سکتی ہے جس طرح علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے طلبا کی ہوتی رہی
اس لیے کہ اُردو یونیورسٹی دیگر کسی یونیورسٹی سے کم جدید نہیں ہو گی وہ ترقی پذیر بھی
ا لہٰذا اس کی اہمیت و ضرورت کے ساتھ ساتھ افادیت بھی غیر مشتبہ ہے۔ ان
باتوں کے لیے اہلِ اُردو کو اپنی مادری یا تہذیبی زبان کے ساتھ ابتدائی تعلیم کی سطح
روزمرہ کے استعمال تک وابستگی و وفاداری کا ثبوت اپنے پیہم ہمہ جہتی عمل سے
ہو گا۔ اس عمل پر اُن کی شناخت اور اجتماعی وجود کا انحصار بھی ہے اہلِ ملک خاص
اہلِ اقتدار کو اُردو کے خلاف تعصبات سے اپنا سینہ صاف کر کے مذہبی و
بی رواداری یعنی مروجہ اصطلاح میں سیکولرازم کا ثبوت دینا ہو گا۔ ہندوستان ایک
المذاہب اور کثیر الالسنہ جمہوریہ ہے جس میں اُردو کا ایک آئینی [illegible] مسلمہ شدہ ہے
شہریوں کے دیگر طبقات کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے بھی آئینی حقوق کا [illegible] مسلمان
اُردو داں یا اُردو نواز ہیں، وہ ملک کے مختلف علاقوں میں وہاں کی زبانوں سے
واقف بھی لیکن اُردو کا معاملہ قومی سطح پر مسلمانوں کی [illegible] اور سچائی کا ہے گرچہ اُردو
سیکولر زبان ہے جس میں ہر مذہب و ملت کا لٹریچر ہے و [illegible] خدمت و ترقی
بھی ہر مذہب و ملت کے افراد کا نمایاں حصہ رہا ہے۔ اُردو یا اردو یونیورسٹی کی ترقی
دوسری قومی یا علاقائی زبان کو خطرہ نہیں۔ اگر کسی کو اُردو کے مقابلے میں احساس کمتری یا
خوف ہو تو یہ اُس کی تنگ نظری اور کم ہمتی ہے اُردو نے ہندوستان کو جنت نشان
یا ہے اور بنائی رہے گی اسے غبارِ خاطر ہندوستان نہیں بنانا چاہیے ورنہ اس کا طعنہ صحیح ہو گا
کدہ میں اپنی قسمت جام برداری رہی ÷ اور اک اک مغ بچہ پیرِ مغاں بنتا گیا ●

تعارف نامہ اردو رائٹرس گلڈ

اردو رائٹرس گلڈ کے تعلق سے جو خیال ۶۰-۱۹۵۹ء میں، جب کہ میں انٹرمیڈیٹ (ماتز
بائیو گروپ) کا طالب علم تھا۔ پیدا ہوا تھا۔ اس عرصۂ خیال میں اس خیال کی تصویر بیڑوسی
ملک میں نمو پا چکی تھی۔ یہ آرزو تھی کہ اس نوع کی تصویر مادرِ گیتی پر بھی نمایاں ہو جائے تو
نمایاں ہوئی لیکن ۱۴ سال گزارنے کے بعد یہ تصویر "اقبال ایک تجزیاتی مطالعہ" (۱۹۷۴ء)
کی شکل میں نمودار ہوئی۔ اب تو اردو رائٹرس گلڈ کی عمر ۲۲ سال سے تجاوز کر چکی ہے اس عرصہ
میں بہت ساری کتابیں شائع ہو چکی ہیں اشاعتی توازن کو قائم رکھنے کے لئے ۱۹۷۷ء میں کتابی
مطالعہ اردو ادب، اقبالیات، شخصیات اور منتخبات کے پروجیکٹوں کی وضع کاری عمل میں
آئی تھی تاکہ اردو رائٹرس گلڈ باضابطہ پروگرام کے تحت کتابیں شائع کر سکے۔ اشاعتی سلسلے
کو بغیر کسی بیرونی یا سرکاری امداد کے جاری رکھنے میں اللہ کی مدد شامل رہی۔

۶/۷/۹۳ کو میں سڑک حادثہ کا شکار رہا۔ بعد سے بدتر حالت ہو گئی۔ ۷/۷/۹۴ کو
Dr. S.C. Gaur کے مشورہ کے مطابق پرتی اسپتال سے رجوع ہوا۔ ڈاکٹر نے دو کامیاب آپریشن
کئے۔ اب اللہ کا فضل و کرم ہے ۲½ سالہ اذیت کے حصار سے باہر نکلا۔ بائیں ہاتھ کی رفاقت میں
ہے قلم اس کے ہی سپرد ہے علاج و معالجہ کے ضمن میں دوستوں اور خیرخواہوں کی محبتوں کا ممنون ہوں!
تجدید اشاعت کا کام شروع کرنے کی سعی کی ہے فی الحال لکچر سیریز، مونوگراف اور ٹیکسٹ بک سیریز
کے اشاعتی سلسلے کے پروگرام تیار کئے گئے ہیں۔

لکچر سیریز: پروفیسر سید احتشام حسین اور ڈاکٹر مسیح الزماں کی یاد میں۔
مونوگراف ۔ ضیاء فتح آبادی اور سید ماجد الباقری کی یاد میں
ٹل بک سیریز: ڈاکٹر سید اعجاز حسین کی یاد میں مدعائے اشاعت یہی ہے کہ
طلباء کی درسی ضرورتوں کو اولیت دی جائے
قیمت کم سے کم رکھی جائے
شہر سے گاؤں، قصبات تک جنہیں پہنچانے کا وسیلہ تلاش کیا جائے۔
مفید اور معیاری تحریریں ہی شائع کی جائیں
قومی شعور کو پختہ اور بالیدہ کرنے کی کوشش کی جائے
تنگ نظر، محدود، فرقہ وارانہ مفادات پر قومی مفادات اور قومی مسائل کو ترجیح دی جائے
اخلاقی اور تہذیبی روایات پر خصوصی توجہ دی جائے۔
ایک سچے ہندوستانی سماج و معاشرے کی تشکیل و تعمیر میں شمولیت اختیار کی جائے
کوتاہ ذہنی اور تعیش پسندانہ فکر کے خلاف قلمی جہاد کیا جائے۔
شر، فساد، فتنہ، منافقت کے خلاف سچی اور پاک تحریریں شائع کی جائیں۔
اردو رائٹرس گلڈ کو سرکاری یا نیم سرکاری کسی طرح کی کوئی مدد حاصل نہیں (نہ کبھی رہی ہے) لیکن اچھی، بے باک، زندہ تحریروں کے شائع کرنے کی کوشش ضرور رہے گی۔
ماضی میں (حادثہ سے قبل) کچھ فروگذاشتیں راہ پاگئی تھیں۔ کتابوں یا مصنفوں کے انتخاب میں دیانتداری لازم ہے صالح ادب کے لئے صالح سرشت ضروری ہے اچھی تحریروں کی اشاعت میں ۲۵ نامہ تک کے اشتراک کو ملحوظ رکھا گیا ہے اشتراک کی مناسبت سے طبع شدہ تحریر خدمت ظاہر میں پیش کردی جائے گی۔ کتابوں کے فروخت کی ذمہ داری گلڈ پر نہیں ہوگی۔ مصنف کو تحریری اجازت نامہ داخل کرنا اور قواعد کی پابندی لازمی ہوگی۔

پتہ:- ساحل احمد۔ ایل آئی جی ۱۰ نیم سرائے اڈی اے کالونی۔ منڈیرا چک، الہ آباد ۲۱۱۰۱۱

غزلیں

ساحل احمد

اے شبِ ہجراں وہ گھر روشن ہوا
اشکِ غم عرضِ ہنر روشن ہوا

دی ستاروں نے مجھے دادِ ہنر
آسماں میرا سفر روشن ہوا

قتل گہہ میں روشنی لائی گئی
کیا کسی کا آج سر روشن ہوا

کیا ہوائے حرص پھر چلنے لگی
اے شجر خوف و خطر روشن ہوا

آبِ دیدہ ہو گئی خاکِ وطن
جب کوئی رختِ سفر روشن ہوا

سج گئی تصویر آنکھوں میں کوئی
کیا لکھی تقدیر آنکھوں میں کوئی

سرخ ڈورے کھینچ گئے ہیں دور تک
دیکھ لی تعذیر آنکھوں میں کوئی

ہو گئیں معتوب یادیں پھر مری
سرخ ہے شمشیر آنکھوں میں کوئی

آسماں پردہ یہ کیسا درمیاں
چبھ گیا ہے تیر آنکھوں میں کوئی

دستِ گل پر اداس مہکی تھی مگر
بج اٹھی زنجیر آنکھوں میں کوئی

خواب پلکوں پر ہی ساحل سو گئے
دیکھ لی تعبیر آنکھوں میں کوئی

مجتبیٰ حسین

یک [illegible]

کہتے ہیں کہ ایک صاحب سیر کے ارادہ سے دہلی آئے اور ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں مقیم
ے۔ سیر پر نکلنے سے پہلے انہوں نے سوچا کہ ہوٹل میں ملنے والے کھانے کے اوقات کے بارے میں
سے دریافت کر لیا جائے تاکہ اسی حساب سے دہلی کی سیر کا پروگرام بنایا جائے۔ چنانچہ انہوں نے
ایک بیرے کو بلا کر پوچھا۔

"میاں یہ بتاؤ تمہارے پاس کھانے کے کیا اوقات ہیں؟"

"بیرے نے کہا۔ حضور ناشتہ کا وقت [illegible] بجے سے گیارہ بجے تک، لنچ بارہ بجے
ین بجے تک، شام کا ناشتہ۔ شام میں چار بجے سے سات بجے تک اور رات کے کھانے کا وقت
ۃ بجے سے بارہ بجے رات تک ہوتا ہے"۔ اس پر یہ صاحب گہری سوچ میں ڈوب گئے اور بولے
یاں یہ تو نہایت ناموزوں اور نامعقول اوقات ہیں۔ اگر میرا سارا وقت کھانے میں ہی گذر
ائے تو دہلی کی سیر کب کروں گا؟"

اگرچہ یہ بڑا پرانا لطیفہ ہے لیکن پچھلے دنوں ہمارے دوست اوتار سنگھ جج نے کسی اور سلسلہ
یہ لطیفہ پھر سنایا۔ تو ہمیں اچانک محسوس ہوا کہ ہمارے دن کا بہت سا حصہ ایسے ہی فضول کاموں
خرچ ہو جاتا ہے اور سیر کا پروگرام معلق رہ جاتا ہے۔ دہلی میں رہتے ہوئے ہمیں پچیس برس
ہ کو آئے ہیں اور کوئی دن کا بہت سا حصہ ایسے ہی فضول کاموں میں خرچ ہو جاتا ہے اور سیر
رہ جاتی ہے۔ ہمارے معمولات پہلے سے طے ہوتے ہیں۔ فلاں بجے سے فلاں بجے تک سیر کرو پھر

فلاں بجے سے فلاں بجے تک شیو، غسل اور ناشتہ سے فارغ ہو جاؤ۔ پھر اخبار لے کر بیٹھ جاؤ کہ دیکھیں ملک کے سیاستدان کیا کر رہے ہیں اور کون لیڈر کونسی پارٹی میں جا رہا ہے۔ کتنے لیڈروں نے آج پیشگی ضمانت لے لی۔ کتنے نئے گھپلے منظرِ عام پر آئے ہیں اور کتنے لیڈروں نے پرانے گھپلوں سے باعزت بری ہونے کا شرف حاصل کیا۔ یہی دیکھئے کہ جب حوالہ کیس شروع ہوا تھا تو ہم نہایت اشتیاق سے اخبار پڑھا کرتے تھے۔ حالات ایسے پیدا ہوتے جا رہے تھے کہ لگتا تھا کہ حوالہ اور حوالات میں بہت کم فاصلہ باقی رہ گیا ہے۔ لیکن اب پتہ چلا کہ حوالہ کیس کے سارے ملزمین بری ہو گئے۔ ہمیں افسوس ہو رہا ہے کہ ملک کے اخبارات نے منوں اور ٹنوں کاغذ اس کیس کی خبروں کو چھاپنے پر ضائع کر دیا۔ خود ہماری زندگی کی کئی قیمتی ساعتیں انہیں خوشگوار بھی بنایا جا سکتا تھا اس کیس کی گتھیوں کو سمجھنے میں ضائع ہو گئیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ ان دونوں اخباروں میں پڑھنے کو ہوتا بھی کیا ہے سیاسی لیڈروں کے گھپلوں کی خبروں سے جب آپ فارغ ہوتے ہیں تو زنا بالجبر، اغوا، ڈکیتی، قتل و غارتگری کی خبریں آپ کی منتظر ہوتی ہیں، خدا بھلا ہمارے اہلیہ کا جن سے ہمارے ہزار ہا اختلافات سہی لیکن ان کی ایک بات کے ہم قائل ہیں جب بھی ہم صبح کے وقت بے چینی سے اخبار کا انتظار کرتے ہیں تو ہمیں یہ کہہ کر ٹوکتی ہیں "بری اور منحوس خبروں کو پڑھنے کے لئے تمہاری یہ بے چینی کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔ لوگ جس طرح کسی خوشخبری کو سننے کے لئے بے چین رہتے ہیں تم اسی طرح بری خبریں جاننے کے لئے آمادہ ہو جاتے ہو مجھ کو دیکھو کہ جب سے اخبار پڑھنا چھوڑ دیا کس قدر مزے میں ہوں" کبھی ہم غلطی سے ان کے ہاتھ سے اخبار منگواتے ہیں تو بلا مبالغہ اخبار کو چمٹے سے پکڑ کر یوں لے آتی ہیں جیسے اخبار نہ ہوا مرا ہوا چوہا ہو گیا۔ کبھی کبھی تو ناک پر رومال بھی رکھ لیتی ہیں۔ غرض بری خبریں پڑھنا اور بری خبریں پڑھ کر اپنے کو آپ کو پھر سے بری خبریں پڑھنے کے لئے تیار کرنا یہ ہمارا روز کا معمول ہے پچھلے ہفتہ ہم نے ایک دن ایسا بھی گذارا جب ہم نے سارے معمولات کو بالائے طاق رکھ دیا۔ گویا لطیفہ کی رکشتی میں کھانے میں اپنا وقت برباد نہیں کیا اور گزرتے رہے "ہم معمول کے مطابق "چہل قدمی" کرنے کو نکلے تو دیکھا کہ بوندا باندی ہو رہی ہے چنانچہ چہل قدمی کرنے نہیں گئے۔ یہ ہمارا اس دن کا پہلا معمول تھا جو ٹوٹ گیا۔ پھر نو بجے تک اخبار کا

نار کرتے رہے مگر وہ نہ آیا دوسرا معمول بھی ٹوٹ گیا۔ نو بجے کے بعد دودھ والا گھنٹی بجاتا ہے
ن بجی اور ہم نے دروازہ کھول دیا تو دیکھا کہ دودھ والے کے بجائے ایک سیلز گرل کھڑی ہے
۔ ایک نیا صابن آیا ہے۔ میں اسے بیچنے کے لئے نکلی ہوں، پانچ روپیہ میں ایک ٹکیہ ہے۔ چار
لینے پر ایک ٹکیہ مفت بھی ملے گی۔" بہت اچھا صابن ہے۔ آپ اسے اپنائیں گے تو دن بھر فرحت
حساس میں ڈوبے رہیں گے۔ ہم نے کہا صابن کی مدد سے اپنے اندر فرحت کا احساس پیدا کرنے
شش میں اب تک پچاس صابن کے برانڈ بدل چکے ہیں۔ ہمیں ایسا صابن اور ایسی فرحت نہیں چاہئے
ے پاس کوئی ایسا صابن ہو تو بتاؤ جو بدن کے میل دور کرنے کے علاوہ روح کو بھی پاکیزہ بنا
ہم تو اب اپنی روح اور اپنے من کو پاک وصاف کرنا چاہتے ہیں۔ "بولی" آپ
خوب آدمی ہیں جس مقصد کے لئے ہمارے سادھو سنت برسوں جنگلوں اور صحراؤں کی
چھانتے پھرتے ہیں آپ وہ مقصد صرف پانچ روپیہ میں حاصل کرنا چاہتے ہیں"۔
ہم نے کہا ـــــ "بی بی! آج تو ہمارا سارا معمول ہی چوپٹ ہوتا جارہا ہے اب تم
ث کرنے کا وقت بھی نہیں رہا۔ یہ لو بیس روپے اور دے جاؤ صابن کے پانچ
ـــــ"

وہ چلی گئی تو ہم نے سوچا کہ کیوں نہ آج کا دن ہی مختلف ڈھنگ سے گزارا جائے۔ ملک میں
ہا ہے وہ ہوتا رہے۔ سیاستداں چاہے کچھ بھی کریں۔ ادیبوں، فنکاروں اور حمایتیوں سے بھی
ہم نہیں ملیں گے۔ اس خیال کے آتے ہی ہم اپنے ایک ایسے دوست کے پاس چلے گئے جن سے پچھلے
برس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ (فون پر البتہ ہر ہفتہ بات ہو جاتی ہے) موصوف غیر شادی شدہ
ر اکیلے رہتے ہیں۔ ان کے آبا و اجداد نے اتنی جائیداد چھوڑی ہے کہ انھیں کوئی کام کرنے کی ضرورت
ہے۔ موسیقی کے دلدادہ ہیں۔ دن بھر موسیقی سنتے رہتے ہیں بعض دفعہ تو فون پر بھی موسیقی
یں اور اپنے پسندیدہ گانے سناتے رہتے ہیں۔ موسیقی میں یہ اور خود موسیقی ان میں اتنا ڈوب
کہ دونوں کا بیچ کر باہر نکلنا دشوار نظر آتا ہے۔ گویا "فنافی الموسیقی" ہیں دنیا سے اتنے بے خبر
رلس ڈیگال کو اب تک فرانس کا اور جمال عبدالناصر کو مصر کا صدر سمجھتے ہیں۔ پچھلے تیس پینتیس سال

سے اخبار کو ہاتھ نہیں لگایا۔ کہتے ہیں اخبار پڑھنے میں جو وقت ضائع ہوتا ہے اس میں کیوں نہ میں روی شنکر کا ستار ہی سن لوں۔ بہرحال ہمارے دوست نے جاتے ہی ہمیں گلے سے لگایا۔ بولے "آج میرا ارادہ چیکووسکی کی سمفنیاں سننے کا تھا مگر تم آئے ہو تو تمہاری خاطر آج کندن لال سہگل کو سن لیتے ہیں۔" وہ بات چیت کم کرتے ہیں۔ البتہ موسیقی کی دھنوں کے حساب سے ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ اور حرکات و سکنات میں فرق آنے لگتا ہے۔ بعض دفعہ تو آنکھوں سے آنسو بھی رواں ہو جاتے ہیں اور کبھی کبھار ایک عجیب و غریب مسکراہٹ ان کے سارے وجود میں پھیل جاتی ہے۔ دن میں گیارہ بجے سے شام کے پانچ بجے تک ہم کے ایل سہگل کو گھول کر کانوں سے پی گئے۔ موسیقی ہمارے سارے وجود میں کچھ اس طرح سما گئی کہ ایک مرحلہ پر ہمارا اپنا ہاتھ غلطی سے خود اپنے ہی زانو پر ذرا زور سے پڑ گیا تو یوں لگا جیسے ہم نے کسی طبلہ پر تھاپ ماری ہو۔ ذرا سی گردن کھجائی تو محسوس ہوا جیسے ہم نے ستار کے تاروں کو چھیڑ دیا ہے سہگل کے گانوں کے بیچ ہی ہمارے دوست کے نوکر نے کھانا کھلایا۔ کیا کھلایا یہ یاد نہیں رہا۔ سہگل کے گانے البتہ یاد ہیں اور ان کی معرفت ہمیں اپنی زندگی کے وہ دن اور ان دنوں سے وابستہ وہ باتیں بھی یاد دلاتی ہیں جو چالیس پینتالیس برس پہلے ہماری زندگی کا معمول تھیں۔

"جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن"

شام کے چھ بجے ہم نے جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو ہمارے دوست نے پوچھا "کہاں جانا ہے؟" ہم نے کہا۔ "آج سیتا رام کیسری جی کا نتیجہ آنے والا ہے۔ ذرا چل کر دیکھیں کہ کیا ہوا ہے؟"

ہمارے دوست نے پوچھا۔ "سیتا رام کیسری کون؟ کیا کرتے ہیں وہ؟ تمہارے دوست ہیں کیا؟ کبھی لے آؤ انھیں بھی۔ کسی دن انھیں بھی موسیقی سناتے ہیں۔" اور ہم نے دل ہی دل میں سوچا کاش کبھی سیتارام کیسری جی بھی موسیقی سن لیتے۔ ہمارے دوست نے اپنی گاڑی اور ڈرائیور کو ہمارے حوالہ کرتے ہوئے کہا "ایک مہینہ سے میں کہیں باہر نہیں گیا۔ یہ ڈرائیور یونہی مفت میں تنخواہ لے رہا ہے۔ کمبخت گانے بھی ڈھنگ سے نہیں سنتا۔ تم اسے لے جاؤ جب جی چاہے گاڑی واپس کر دینا۔ ہم باہر نکلے تو آسمان پر گھن گھور گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں بادل گرج رہے تھے اور ہمارا جی

چاہ رہا تھا کہ سہگل کے دیپک راگ سے جیسے دیپ جل اٹھتے تھے ویسے ہی میں راگ ملہار گانے لگیں۔ "برسو رے گرج گرج آج برسو رے" ڈرائیور نے پوچھا "صاحب کہاں چلئے گا؟" ہمارے ذہن میں کئی جگہوں کا خیال آیا۔ پریس کلب آف انڈیا، کناٹ پیلس کا کافی ہاؤس، بنگالی مارکٹ (جہاں پر ہر شام ادیبوں اور فنکاروں کا جمگھٹا رہتا ہے) لیکن نہ جانے کیوں ہمارے منہ سے "انڈیا انٹرنیشنل سنٹر" کا نام نکل گیا جہاں آج شام کو کیف دری مرحوم کی یاد میں "شام غزل" کا پروگرام آراستہ کیا جا رہا تھا۔ غزل کے ابھرتے ہوئے فنکار سدیپ کا ذکر تو بہت سنا تھا لیکن کبھی اسے گاتے ہوئے نہیں سنا تھا۔ یوں بھی غزل اور موسیقی کے سائے میں عرصہ سے ہماری کوئی شام نہیں گذری تھی۔ وہاں پہونچے تو دیکھا کہ لوگوں کی بھیڑ ہے تو ہم ایک نشست پر جا بیٹھے تو دیکھا کہ برابر والی نشست پر الیکشن کمشنر جی وی کرشنا مورتی بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہم نے سوچا کرشنا مورتی جی کتنے خوب آدمی ہیں، ستیارام کیسری جی کو الیکشن کے بکھیڑے میں پھنسا کر خود غزل گائیکی کا مزہ لینے کے لئے یہاں آ بیٹھے ہیں۔ شاید اس دن وہ بھی ایک مختلف دن گزارنا چاہتے تھے۔ اس محفل میں اے کے کریم (VEAM) ہی نہیں آئی ایس کریم بھی موجود تھے۔ نوجوان فنکار سدیپ نے اپنی آواز کا جادو جگایا اور سماں باندھ دیا۔ میر، ذوق، مجاز اور فیض کے بعد سدیپ نے مخدوم محی الدین کی غزل چھیڑی۔ بلا بھیجا ہے پھولوں نے گلستانوں سے

اس غزل نے ہم پر عجیب و غریب کیفیت طاری کر دی کیونکہ یہ وہ غزل تھی جسے کہنے کے فوری بعد مخدوم نے اسے سیاست کے دفتر میں سنایا تھا اس کے ابتدائی سامعین میں ہم بھی موجود تھے وہ دن وہ سماں وہ حیدرآباد، وہ چہرے، وہ سائے، وہ گلیاں اور وہ ماحول سب کچھ یاد آیا جو اس غزل کا پس منظر تھے لمحوں کی بازیافت نے ایک عجیب سی سرشاری ہم پر طاری کر دی بڑی دیر بعد ہم انڈیا انٹرنیشنل سنٹر سے باہر نکلے تو لوگوں کی بھیڑ ستیارام کیسری جی زندہ باد کے نعرہ لگا رہے تھے ڈرائیور نے کہا شاید ستیارام جی جیت گئے ہم نے پوچھا "کون ستیارام کیسری جی"؟ اس پر ڈرائیور نے پلٹ کر ہمیں غور سے دیکھا۔ ہم نے پھر اس سے کوئی بات نہیں کی۔ غرض یہ ایک مختلف دن تھا اس دن ہماری روح بھی صاف و شفاف پاکیزہ اجلی اور سبک محسوس ہوئی ہم نے سوچا کہیں یہ اس صابن کا اثر تو نہیں ہے جو سیلز گرل صبح میں ہمیں دے گئی تھی ●●

عبدالرشید

ایک طالب علم کا نادر سوال

مورخہ ۵ ار جون سیاست فورم میں جناب محمد اسحاق صاحب ماہر تعلیم کا ایک نادر مضمون ایک طالب علم کے نادر سوال کے جواب میں شائع ہوا ہے مضمون کچھ اتنا اہم ہے کہ نوجوان طلبہ اور والدین اپنے بچوں کو شروع کر سنائیں کیوں کہ اس میں بہت سی کام کی باتیں آگئی ہیں۔ جناب محمد اسحاق صاحب کے اس مضمون میں ایک پیراگراف کی کمی رہ گئی ہے۔ حالانکہ وہ اپنے ایک مضمون سوشیل سروس کی اہمیت میں مدر ٹریسا اور پاکستان کے عبدالستار ایدھی کی خدمات کو سراہا ہے یہ دونوں غریبوں اور مریضوں کی خدمت کے لئے ساری دنیا میں مشہور ہیں۔ مدر ٹریسا خود بھی نوبل انعام یافتہ ہیں۔ بے سہارا غریبوں اور مریضوں کی خدمت کا وہ ریکارڈ قائم کیا ہے جس کی نظیر ملنی آسان نہیں۔ مدر ٹریسا کے جذبہ ایثار و خدمت کے تھوڑے سے بہت اثر سے ہمارے کاموں میں عظیم تبدیلیاں نمایاں ہو سکتی ہیں عبدالستار ایدھی کے متعلق مشہور ہے کہ وہ دس برس پہلے تک ہی کوئی ایسی ہزار لاوارث نعشوں کو اپنے ہاتھوں سے دفن کا انتظام کر چکے ہیں ان کی عزت و شہرت، ان کے ان کام اور کرامتی مخلوق کے جذبۂ خدمت کا نتیجہ ہے ان کاموں کو شروع کرنے کیلئے نہ تو انھوں نے کوئی سوسائٹی بنائی نہ کوئی تنظیم۔ ہمارے اطراف بہت سے کام ہیں جنکو ہم کر سکتے ہیں آدمی کسی بڑے کام کے شروع کی فکر میں وقت خراب نہ کرے بلکہ مدر ٹریسا کے قول کے مطابق اگر آپ سو آدمی کو کھانا نہیں کھلا سکتے تو ایک آدمی کی خاطر کر دو ۔۔۔

ہر کولہ کے مہمان شاعر جمیل احمد خان کا خیر مقدم

حیدرآباد ۔ انجمن بقائے ادب کا ماہانہ غیر طرحی مشاعرہ ۲۶ رمئی کی شب زیر صدارت الحاج فیض اللہ خان فیض بمقام ہال رحمت اسلامیہ ماڈل اسکول بیدواڑی بیگم بازار منعقد ہوا۔ ہرکولہ کے مہمان شاعر جناب جمیل احمد خان کا خیر مقدم کیا گیا مہمان شاعر نے اپنی کئی نظمیں اور غزلیں سنائی اور خوب داد و تحسین حاصل کی۔ صدر انجمن بقائے ادب محمد عارف الدین نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا حبیب بٹ حیدرآبادی نے محفل کو زعفران زار بنایا۔ محمد ضیاء عرفان حسامی نے نظامت کے فرائض انجام دیئے ۔

ماہنامہ

شاداب
حیدرآباد

جلد (۱۳)
شمارہ (۱۰) اکتوبر سنہ ۹۷ء
قیمت =/۱۵ روپے

زرتعاون

مقامات	سالانہ	دو سال کے لئے	تا حیات
ہندوستان	۱۰۰ روپے	۱۸۰ روپے	۱۵۰۰ روپے
بیرونی ممالک	۳۰۰ "	۵۵۰ "	۴۰۰۰ "
امریکہ	۵۰ ڈالر	۹۰ "	۹۰۰ ڈالر
انگلستان	۳۰ پونڈ	۵۰ "	۵۰۰ پونڈ
پاکستان	۲۰۰ روپے	۳۵۰ "	۴۰۰۰ روپے

ترسیل زر کا پتہ : ماہنامہ شاداب ۱۴۷/۵-۱۱ ریڈ ہلز حیدرآباد ایڈیٹر پرنٹر پبلشر محمد قمرالدین صابری
نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپوا کر دفتر شاداب ۱۴۷/۵-۱۱ ریڈ ہلز حیدرآباد سے شائع کیا۔



★ ابنِ غوری

بات اردو کی
بات خوباں کی

زبان کی زندگی کے لیئے تین باتیں ضروری ہیں۔ وہ سنائی دے، لکھی پڑھی جائے اور دکھائی بھی دے۔

روز افزوں مشاعروں، قوالیوں اور فلمی گیتوں کے حُسن توسط سے اب یہ زبان ساری دنیا میں خوب خوب سنائی دے رہی ہے گویا داغ کے خواب ع

ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

کی تعبیر عظیم الشان نکلی ہے چشم بد د.....و.....ر

اب دوسری بات بلکہ اصل بات یہ ہے کہ یہ پڑھی اور لکھی جائے۔ بس یہیں پر ع

مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات

اور یہ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے یعنی خود اردو والے اور حکومت۔

سب سے پہلے تو ہم کو خود طے کرنا ہوگا کہ:

(۱) ہم اپنی اولاد / خاندان / احباب / خدام کو اردو سکھائیں گے۔ (غالباً دنیا میں یہی واحد زبان ہے جس کو اپنی مادری زبان بتانے والے اس کو پڑھنا اور لکھنا نہیں جانتے اور اس پر نادم بھی نہیں)۔

(۲) ہر ماہ اردو اخبارات / رسائل / کتب کے لیئے دس بیس روپے ہی سہی۔ خدا کو حاضر و ناظر

جان کر خرچ کریں گے۔ خصوصاً اُردو کے محترم معلموں اور معلمات اور مکرم ادیبوں کو جو اُردو کی روٹی کھا رہے ہیں / اُردو کے انعامات پا رہے ہیں۔

(۳) خطوط پر پتے اُردو میں لکھنے میں اب تو کوئی خدشہ نہیں کیوں کہ ہر مقام کا پن کوڈ ہونے کی سبب خط منزلِ مقصود پر تو لازماً پہنچ جائے گا۔ ہاں اگر اس ڈاک خانے میں کوئی اُردو داں نہ ہو تو تقسیم میں تاخیر ہو سکتی ہے۔ (راقم الحروف ۲۵ سال سے روزانہ اوسطاً ایک خط لکھ رہا ہے لیکن لیکن شاید ہی کوئی ضائع ہوا ہو۔ ہاں ایک عرصے سے کلکتہ شہر ناقابلِ اعتبار ہے)۔

دس بارہ برس پہلے تک آندھرا پردیش میں پوسٹ مین کے لئے اُردو دانی امتحان ہوا کرتا تھا (راقم الحروف بھی ایک بار ممتحن رہ چکا ہے) لیکن یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ وجہ؟ ہم خود ہیں کہ ہم نے اُردو میں پتے لکھنا چھوڑ دیا۔

خطوط کی طرح منی آرڈر اور رجسٹریشن فارم بھی اُردو میں لکھنا چاہئے۔ ہاں اگر کاؤنٹر کلرک اُردو سے نابلد ہو تو صرف مکتوب الیہ کا نام اور مقام انگریزی میں لکھا جا سکتا ہے (کلرک کو حق نہیں کہ وہ انگریزی یا ہندی کے لیے اصرار کرے۔ اس صورت میں پوسٹ ماسٹر سے شکایت کی جا سکتی ہے۔ یہ راقم الحروف کا تجربہ ہے)

(۴) اپنے نام کی تختی (اُردو اور علاقائی زبان) میں ہونی چاہئے۔

(۵) شادی وغیرہ کے رقعہ بھی اُردو ہی میں ہوں۔ ہاں صرف تاریخ اور وقت، انگریزی / ہندی میں ہو سکتے ہیں۔ (لوگ ایسی دعوت کو نہیں بھولتے نا!)

(۶) اپنے لیٹر پیڈ پر بھی اُردو ہونی چاہئے۔

(۷) اُردو پوسٹ گریجویٹ خواتین اپنے پڑوس کے بچوں اور عورتوں کو خدا کے واسطے اُردو سکھائیں۔ (مادری زبان کی حفاظت مادر ہی نہ کرے۔ واہ عجیب)

(۸) "اُردو سیکھئے" کے اسٹیکرس (علاقائی زبانوں میں) ہوٹلوں اور دکانوں میں لگوانے کیلئے

ہ اردو ادارہ کمرۂ مت باندھے۔

اب رہی بات حکومت کے ہاتھ کی۔ تو اس راقم الحروف کی ناقص رائے نہایت ادب کے ساتھ ہے کہ ہمیں حکومت سے معدودے چند صرف بنیادی اور دور رس مطالبات ہی کرنا چاہئیے (زیادہ مطالبات اردو دشمنوں کے پیٹ میں درد پیدا کرتے ہیں)۔

۱) سو شمار کی تو ایک بار کی جاء۔ اول سے دسویں / بارھویں تک اردو میڈیم مدارس اسامیوں کا تعین مضمون وار ہونا چاہئیے جیسا کہ کالج میں ہوتا ہے۔

۲) اسی طرح مدارس میں بھی اردو میڈیم کی خالی اسامیوں پر جز وقتی مدرسین کا تقرر لازماً ہونا چاہئیے۔ اس غرض کے لئے کم از کم موظف مدرسین تو مل ہی جائیں گے جب تک یہ فولادی نظام نہیں ہوگا۔ اردو میڈیم کشمکش ہی رہے گا اور خوابوں کی اردو یونیورسٹی قدانہ کرسے گی۔

انتظار سید میں ایک چشمہ بے آب

یہ تو کم آب رہ جائے گی) رہے تام اردو کا۔

۳) جہاں اردو میڈیم کے لئے طلبہ کی مطلوبہ تعداد نہ ہو وہاں زبانِ اول کی حیثیت سے تدریس کے لئے اردو معلم کی مستقل اور غیر مشروط آسامیاں ہونی چاہئیے۔

۴) غیر ہندی ریاستوں میں زبانِ اول اردو کے ساتھ ہندی بھی شریک ہو (۷۰ فی صد اردو اور ۳۰ فیصد ہندی) ورنہ طلباء ہندی سے محروم رہیں گے اور ان کے والدین بھی اس کے لیے قطعاً راضی نہیں ہوں گے کہ ان کے بچے ہندی کو قربان کرکے اردو پڑھیں (قربانی کا لطف تو اردو زبان کو قربان کرنے میں ہے) زبانِ دوم تو علاقائی زبان ہوگی یا عربی/فارسی/سنسکرت/ہندی۔ ہندی ریاستوں میں تو زبانِ دوم خود ہندی یا کوئی علاقائی زبان یا عربی / فارسی / سنسکرت ہوگی۔

۵) اگر کسی مدرسے میں اردو طلباء کی تعداد اتنی قلیل ہو کہ صرف اردو معلم کی اسامی بھی قائم نہ ہو سکتی ہو تو شہر کے چند منتخب مدارس میں اس کا انتظام ہو اس طرح کہ پڑوسی مدارس کے بچے

وہاں پہنچ کر شریک درس ہو سکیں۔

آندھرا پردیش میں منڈل نظام ہے تو یہاں ہر منڈل کے مستقر پر ایک اردو اسامی ہونا چاہیئے۔ اطراف کے دیہات کے طلبار کی خاصی تعداد یہاں جمع ہو جاتی ہے جب تک یہ ٹھوس انتظام نہ ہوگا اردو بچوں کے لئے اردو اجنبی ہی رہے گی چاہے "رہے نام اردو کا"۔

(۶) ہر سطح کے سرکاری امتحانات، تعلیمی اور ملازمتی۔ علاقائی زبان کے ساتھ اردو میں بھی ہوں۔

(۷) سرکاری کتب خانوں، عوامی اور تعلیمی اداروں کے بجٹ میں اردو اخبارات اور کتب کے لئے رقم مختص ہو۔

بعض بچکانی مطالبات سے گریز کرنا ہی بہتر ہے جیسے ووٹر لسٹ اور راشن کارڈ پر اردو کیوں صاحب ـ کیا ہم کو اپنی علاقائی زبان اتنی بھی نہیں سیکھنا چاہیئے کہ اپنا نام پڑھ اور لکھ سکیں! ـ (یہ تو ایک طرح کی بے وفائی ہے اپنی ریاست سے، بے رخی ہے اپنے برادرانِ وطن سے)۔ ع رکھیو سودا مجھے اس تلخ نوائی میں معاف

ایسے مطالبات خوشنما کھلونے ہیں جو حکومت کے لیے مشکل نہیں اور ایسے مطالبات بھی مناسب نہیں جن کے پورا ہو سکنے کے بعد ہم ان کو نبھا نہ سکیں۔ جیسے اردو میں ریلوے ٹائم ٹیبل کہ اس کی تعریف کرنے والے تو بہت ہوں گے اور خریدنے والے کم۔ ہاں صرف ریلوے قواعد کا کتابچہ زیادہ فروخت ہو سکتا ہے۔

اور اب بات خوباں کے جلوے کی یعنی یہ ہر جگہ نظر آئے۔ اردو والے جب یہ دیکھتے ہیں کہ ان کی زبان کہیں نظر نہیں آتی تو اس کا نفسیاتی اثر ان پر پڑتا ہے بات چھوٹی ہے مگر طاقت پرواز رکھتی ہے۔

(۱) ہر دفتر اور بینک کے تمام سائن بورڈ پر اردو ہونا چاہیئے ـ حکومت آندھرا پردیش نے تو

بہر حال اس ضمن میں ایک ہی جی او جاری کر دیا ہے لیکن ... ع

اب تم سے عمل کی بات کہیں کیا قلم سے ہم)۔

(۲) ریلوے اسٹیشنوں اور بس اڈوں پر ہر تختی/بورڈ اردو میں بھی ہو۔

(۳) دکانداروں اور خانگی دفاتر والوں سے گزارش کرنی چاہئیے کہ وہ تھوڑی سی جگہ اردو کے لئے بھی نکالیں۔ اس کام کے لئے اردو دستے تشکیل دیئے جائیں۔ سارے ملک میں اردو کے ادارے حشرات الارض کی طرح پھیلے ہوئے ہیں لیکن افسوس کہ اس ع

قافلۂ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں

(۴) ریلوے اور بس کے بک اسٹال پر اردو اخبارات/رسالے آج بھی دستیاب نہیں ہو۔ کیا یہ کام حکومت کرے گی؟ اس کے لئے تو مقامی اردو اداروں ہی کو قدم اٹھانا ہو گا۔

(۵) اردو والے جن بینکوں کے کھاتہ دار ہیں ان کو غالباً مجبور کر سکتے ہیں کہ وہ دفتر کی تمام تختیوں پر اردو لکھوائیں (حیدرآباد میں اسٹیٹ بنک آف انڈیا اور اسٹیٹ بنک آف حیدرآباد دو تین سال سے اردو کیلنڈر شائع کر رہے ہیں)۔

(۶) اردو فلموں کو ہندی سرٹیفکیٹ کی برسوں سے اجرائی اردو والوں کے چہرے پر بھرپور طمانچہ ہے۔ روزانہ محفلوں میں ہندی فلم' ہندی فلم سنتے سنتے کان پک گئے ہیں۔ آخر ہم اردو والوں کی غیرت کو کیا ہو گیا کہ ساری دنیا میں اپنی زبان کی بدنامی پر بے چین نہیں ہیں۔ دنی دا کے اس معاملے میں کوشش کس ادارے نے کس حد تک کی ہے؟) اگر پروڈیوسر/سنسر بورڈ اپنے تعصب کی بنا پر اردو سرٹیفکیٹ پسند نہیں کرتے تو کم از کم اتنا تو منوانا چاہیئے کہ اردو/ہندی دونوں درج کیا کریں۔

(۷) یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ٹی وی پر جتنے سیریل آرہے ہیں ان سب کی زبان شستہ اردو ہے لیکن یہ کیا غضب ہے کہ پیش پروگرام صرف ہندی میں ہوتے ہیں بلکہ

عنظ سماچار بھی ہندی کے ساتھ اُردو میں بھی ہونا چاہیئے، چاہے سماچار ہی سہی۔

(۸) ٹی وی پر اُردو میں کیسے پروگرام پیش ہوتے ہیں؟ صرف مشاعرے۔ کیا یہ مستحق نہیں کہ ٹرننگ پوائنٹ جیسے علمی پروگرام پیش کیئے جائیں۔؟

(۹) دو سال قبل آندھرا پردیش کی حکومت نے "خواندگی مہم" چلائی تھی لیکن افسوس کہ تلگو والوں کو تو خوب سیراب کیا گیا لیکن اُردو والوں کو تقریباً نظر انداز کر دیا گیا۔ اس وقت راقم الحروف نے چند نعرے وضع کیئے تھے یہاں اس خیال سے پیش کر رہا ہوں کہ شاید اُردو میڈیم کو مفید معلوم ہوں:

(۱) علم کی دلہن ۔ سدا سہاگن
(۲) تعلیم نسواں ۔ تعلیم جہاں
(۳) قدم بڑھاؤ ۔ قلم اٹھاؤ
(۴) حروف نہیں یہ تارے ہیں روشن گھر کرتے ہیں
(۵) دادا سیکھے پوتے کھائے ۔ عزت دونوں کو بڑھ جائے۔
(۶) فیصلہ اپنا ہے یہ جناب ۔ ہاتھوں میں ہو سب کے کتاب
(۷) ہندو مسلم سکھ عیسائی ۔ لکھیں مل کر بھائی بھائی
(۸) اُردو سیکھو جہاں ۔ پیار محبت کی ہے زباں
(۹) جلاؤ اُردو کی مشعل ۔ غالب کی پھر پڑھو غزل

حرفِ آخر : اُردو کے وہ ادیب و شاعر اور معلم جو انعام کے مستحق قرار دیئے جاتے ہیں (اللہ برکت دے ان کے قلم میں) اگر ان کی اولاد اُردو پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تو ان کو انعام کی آدھی رقم دی جانی چاہیئے اور باقی آدھی اُردو کے کسی فعال ادارے کو۔

ع یک گیا ہوں جنوں میں ؟؟؟

(اس تحریر کو ڈاکٹر حسینی شاہد حیدر آبادی مرحوم کے نام معنون کرتا ہوں کہ اگر وہ ہوتے تو خوش ہوتے!!) ●●

ڈاکٹر محسن عثمانی

شام میں ذریعۂ تعلیم عربی

کلیۃ الشریعہ کے شیخ وہبہ زحیلی ہندوستان آچکے ہیں اور ایک سیمینار میں ان سے میری ملاقات بھی ہو چکی ہے اسی کلیہ کے شیخ نورالدین عتر بھی یہاں کے ممتاز استاد ہیں اور نورانی شخصیت کے حامل ہیں شعبۂ عربی کے استاد دکتور عمر موسیٰ انور حسین جمعہ وغیرہ ہندوستان میں عربی زبان وادب کی تعلیم اور اس کے انتظامات کے بارے میں سوالات کرتے رہے۔ دمشق یونیورسٹی شام کی قدیم ترین یونیورسٹی ہے جو ۱۹۰۱ء میں قائم ہوئی تھی اور شام عربی دنیا کا پہلا ملک ہے جس میں عربی کو ہر شعبۂ علم کے لئے ذریعۂ تعلیم قرار دیا گیا انجینئرنگ کالج اور میڈیکل کالج میں بھی تعلیم عربی زبان میں ہوتی ہے۔ یہاں کی یونیورسٹی میں سالانہ امتحانات شروع ہونے والے تھے کلچرل ایکسچینج کے پروگرام کے تحت یو جی سی کی طرف سے یہاں کی جامعات کا جائزہ لینے لکچر دینے کے لئے مجھے بھیجا گیا تھا لیکن دہلی میں سرکاری کارروائیوں میں اتنی دیر ہوئی کہ یہاں تعلیم کا زمانہ ختم ہو چکا تھا اور امتحانات منعقد ہونے والے تھے۔ اس وجہ سے دمشق اور حلب یونیورسٹیوں میں جانا تو ہوا لیکن کوئی لکچر نہ ہو سکا البتہ لاذقیہ اور حمص یونیورسٹی کے ذمہ داروں نے مختصر نوٹس پر اپنے یہاں لکچر کا انتظام کر لیا۔ یہ لکچر ہندوستان میں عربی زبان وادب کی خدمات کے موضوع پر ہوتے تھے یہ سوالات اصل موضوع کے علاوہ تصوف، اقبال، ٹیگور، تاج محل یہاں تک کہ ہندوستان کی سیاست سے متعلق بھی ہوا کرتے تھے۔ شام کے سیاسی حالات کے بارے میں کوئی گفتگو اور تبصرہ ممکن ہی نہیں تھا

البتہ میں نے ہندوستان کی جمہوریت اور یہاں کی آزادیٔ فکر و قلم کو خوب سراہا۔ ملک کی حسن یونیورسٹی میں بھی جانا ہوا وہاں کی لائبریری کی خاص طور پر زیارت کی تاکہ معلوم ہو سکے کہ علم و ادب کی دنیا میں عربی زبان میں کیا کیا نئے اضافے ہوئے ہیں۔ شہر کی کتابوں کی دکانوں پر جانا میرا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ بیروت کے قریب ہونے کی وجہ سے یہاں عربی کتابیں بہت بڑی تعداد میں آتی ہیں۔ بیروت کے ناشروں کے یہاں شوروم بھی ہیں۔ واقف کار لوگوں نے بتلایا کہ بہت سی کتابیں یہاں بیروت سے زیادہ سستی ہیں۔ دمشق میں یونیورسٹی کی لائبریری اور المکتبۃ الظاہریہ کے علاوہ مکتبۃ الاسد ملک کا سب سے بڑا کتب خانہ ہے یہاں ملک کے کتب خانوں کے مخطوطات کا ذخیرہ جمع کر دیا گیا ہے اور ان مخطوطات کی حفاظت کے لئے تمام سائنٹفک طریقے استعمال کیئے جاتے ہیں یہ کتب خانہ کمپیوٹر کی جدید ترین سہولتوں کے ساتھ زائرین کے لئے کھلا رہتا ہے۔ کمپیوٹر کی بورڈ پر "عقائد" لکھ دیا جائے تو اس کی تصنیفات کی تمام فہرست دو سکنڈ کے اندر اسکرین پر آجائے گی۔ یہ کتب خانہ بہت وسیع، بلند، جدید عمارت میں ہے۔ نیچے کی منزل پر ہر روز کوئی سیمنار اور علمی پروگرام چلتا رہتا ہے میں جب یہاں داخل ہوا تو شامی اور ایرانی علماء نظر آئے اور سیمنار کا عنوان تھا "اہل بیت اہل سنت کی نظر میں۔" المجمع العلمی دمشق کا مشہور علمی اور تحقیقی ادارہ ہے اور اس کا مجلہ اپنے اعتبار سے بہت ممتاز ہے یہاں بھی جانے اور اس کے ڈائرکٹر سے ملنے کا موقع ملا۔ جہاں بھی جانا ہوتا عام طور پر عربی قہوہ سے تواضع کی جاتی۔

عربی زبان ادب سے واقفیت بھی اللہ کی کتنی بڑی نعمت ہے اصل فائدہ اور سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہے کہ انسان قرآن کریم کی زبان سمجھ سکتا ہے اور اسلامی علوم کی کتابیں براہ راست پڑھ سکتا ہے لیکن یہ فائدہ کچھ کم اہم نہیں ہے کہ اس کے واسطے سے عرب ملکوں کے علماء دانشوروں سے انسان تبادلۂ خیال کر سکتا ہے اپنے ملک کی علمی سرگرمیوں کا حال بیان کر سکتا ہے علمی و ادبی مباحثوں میں شریک ہو سکتا ہے۔

ادب وثقافت کی دنیا کا ایک ایک روزن اس کے لئے کھل جاتا ہے جس سے افکار تازہ پہنچ سکتے ہیں وہ افکار کا ناقدانہ جائزہ بھی لے سکتا ہے اور اپنے خیالات کی ترسیل بھی کر سکتا ہے

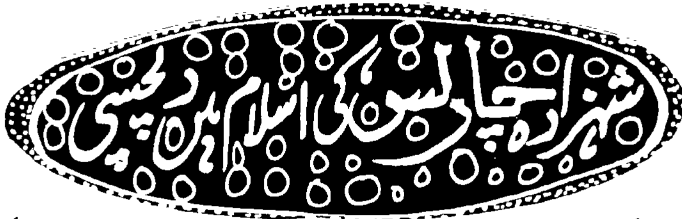
ایک تلخ حقیقت ہے جو برملا کہنے کی تو نہیں ہے لیکن خود احتسابی کی نیت سے اس کا اظہار بھی ضروری معلوم ہوتا ہے وہ یہ کہ عربی زبان ادب کی تعلیم کی جو اہمیت ہمارے ملک ہندوستان کی جامعات کے عربی اساتذہ کے دلوں میں ہونا چاہیئے ـــــ وہ موجود نہیں ہے اور اس معاملہ میں وہ ایک گونا احساس کمتری کے شکار رہتے ہیں اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہندوستان کے تعلیم یافتہ حلقوں میں یہ بات دیکھی جاتی ہے کہ ایک انجینئر اپنی اولاد میں کسی ایک کو انجینئرنگ کی اور ایک کو ڈاکٹر میڈیکل کی تعلیم ضرور دلاتا ہے۔ لیکن جامعات کے عربی کے اساتذہ جو اس زبان کے ذریعہ عزت حاصل کرتے ہیں اپنے بچوں میں کسی کو عربی زبان کی تعلیم نہیں دلاتے ہیں اور کسی عربی مدرسے میں بھیج کر عربی زبان اور اسلامی علوم سکھانے کی توفیق شاذ و نادر ہی کسی کو حاصل ہوتی ہے ملک میں اسلام کی شناخت کو باقی رکھنے اور دین و مذہب کے لئے سینہ سپر رہنے کی جتنی تحریکیں اٹھیں ہیں۔ ان میں قائدانہ رول اسلامی جماعتوں کا اور دینی مدارس کے ذمہ داروں کا ہوتا ہے جن کی تنخواہیں کم ہوتی ہیں۔ جن کی امیدیں قلیل ہوتی ہیں لیکن ان کے مقاصد جلیل ہوتے ہیں ○

● تبصرے کے لئے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

تبصرہ نگار کی رائے سے ایڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● جن حضرات کی مدتِ خریداری ختم ہو رہی ہے وہ ازراہ کرم تجدید کروالیں یا پھر کم از کم دفتر کو اطلاع کردیں۔ (ادارہ)

شاہنواز فاروقی



شہزادہ چارلس کی اسلام میں دلچسپی

اسے شہزادہ چارلس کی خوش بختی ہی کہا جائے گا کہ اب ذرائع ابلاغ میں ان کا ذکر ان کی گرل فرینڈ کے بجائے اس حوالے سے ہو رہا ہے کہ ان کی شخصیت میں سنجیدگی کا عنصر بڑھ رہا ہے اور وہ اسلامی تعلیمات میں گہری دلچسپی لے رہے ہیں۔ برطانیہ کے ایک اخبار کے مطابق شہزادے کے کچھ دوستوں نے یہ انکشاف کیا ہے کہ چارلس بکنگھم پیلس میں عربوں کا مخصوص لباس زیب تن کئے رہتے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ انہیں اس لباس میں (روحانی) سکون ملتا ہے۔ شہزادے کے بعض قریبی دوستوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ ان کے کتب خانے میں اسلام سے متعلق کتب کا ایک عمدہ ذخیرہ ہے اور وہ ان کتب کے مطالعے کے بعد اسلام کی عظمت کے قائل ہو گئے ہیں اور دوستوں سے ہونے والی گفتگو میں اسلام کی تعلیمات پر کھل کر بات کرتے ہیں۔ چارلس کے حوالے سے اس نوع کی خبریں عرصے سے شائع ہو رہی ہیں البتہ اس طرح کی خبروں میں اب رفتہ رفتہ ایک تواتر سا پیدا ہوا چلا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شہزادہ چارلس کی صورت میں مغربی دنیا اور اسلامی دنیا کے درمیان حائل دیوار میں ایک کھڑکی دونوں دنیاؤں کے لئے سود مند ثابت ہو سکتی ہے اگرچہ اسلامی دنیا اور مغربی دنیا اب اپنی اپنی جگہوں پر موجود رہ کر خود کلامی میں مصروف نہیں ان کے درمیان بہت سے پل وجود میں آ چکے ہیں لیکن بہر حال اگر شہزادہ چارلس کی صورت میں فریقین کے درمیان موجود دیوار میں کوئی کھڑکی کھل رہی ہے تو یہ اچھی بات ہے بلکہ ہماری خواہش تو یہ ہے کہ یہ کھڑکی رفتہ رفتہ دروازہ بن جائے۔

ایسا دروازہ جس سے آنا اور جانا دونوں ممکن ہوں۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس سے پہلے کہ یہ کھڑکی کھلے ہمیں کھڑکی سے جھانک کر اس پار کا ایک جائیزہ ضرور لے لینا چاہیئے۔

کسی واقعہ یا منظر کے جائیزے کا ایک اصول یہ ہے کہ وہ واقعہ یا منظر کسی فطری اصول کے تحت یا از خود رونما ہوا ہے یا اسے رونما کرایا گیا ہے۔ اگر کوئی واقعہ از خود رونما ہوتا ہے تو اس کی معنویت کچھ اور ہوتی ہے اور اگر وہ کسی کی کدوکاش کا نتیجہ ہوتا ہے تو اس کی معنویت کچھ اور ہوتی ہے چنانچہ شہزادہ چارلس کے سلسلہ میں دیکھنے کی پہلی بات یہ ہے کہ وہ اسلام سے جس شغف کا اظہار کر رہے ہیں وہ ان کی ذاتی تلاش کا نتیجہ ہے یا اس کی پشت پر کچھ اور محرکات کام کر رہے ہیں اگر اس کی پشت پر کچھ دوسرے محرکات کارفرما ہیں تو ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ البتہ ہمیں یہ بات ٹھیک ٹھیک معلوم ہونی چاہیئے۔ کسی بھی چیز کے سلسلہ میں خوش گمانی یا بد گمانی میں مبتلا رہنا نقصان دہ بات ہوتی ہے۔ لاعلمی میں قائم ہونے والے رابطوں اور آگہی کے ساتھ قائم ہونے والے رابطوں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ یہ باتیں ہم نے اس لیئے عرض کی ہیں کہ اس کے باوجود کہ مغربی دنیا اسلامی ملکوں کو اپنے شکنجے میں جکڑے ہوئے ہے لیکن اس کے باوجود اسے اندیشہ ہے کہ یہ شکنجہ کسی بھی وقت کمزور پڑ سکتا ہے اور مسلم دنیا اس گرفت سے آزاد ہو سکتی ہے چنانچہ اس کی خواہش یہ ہے کہ مسلم دنیا کی ہر قابل ذکر قوت سے رابطہ رکھا جائے۔ اس مسئلہ کا ایک پس منظر ہے۔ انقلاب ایران نے مغربی دنیا اور خاص طور پر امریکہ کو ششدر کر دیا لیکن اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہوئی تھی کہ ایران کی قیادت اور مغربی دنیا کے مابین اور خاص طور پر امریکہ کے ساتھ ایران کے تمام رابطے منقطع ہو گئے تھے جس کا سارا نقصان امریکہ اور اس کے اتحادیوں کو ہوا چنانچہ وہ چاہتے ہیں کہ تمام تر اختلافات اور دو طرفہ مسائل کے باوجود اسلامی دنیا کے ہر ملک اور ہر ملک کی تمام قابل ذکر جماعتوں اور گروہوں کی قیادت سے رسم و راہ رہے۔ جہاں تک برطانیہ کا تعلق ہے تو وہ اپنے ماضی کے تعلق سے اس سلسلہ میں زیادہ دلچسپی رکھتا ہے۔ انگریز اپنے طویل نوآبادیاتی پس منظر کے حوالے سے مسلم دنیا کے امریکیوں سے زیادہ بہتر

طریقہ سے جانتے ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ مسلم دنیا بالآخر مذہب کے بنیادی اصولوں کی طرف مراجعت کرے گی جو ڈھکوسلا مسلم دنیا میں عرصے سے چل رہا ہے وہ بہت زیادہ دن تک نہیں چلے گا۔ مسلم دنیا جیسے جیسے اسلام سے مطابقت پیدا کرے گی ویسے ویسے اس کا اسلوب سیاست بدلے گا اور پھر اس کے ساتھ ان اصطلاحوں میں گفتگو نہیں کی جاسکے گی جن اصطلاحوں میں اب گفتگو کی جارہی ہے ایسی صورت میں وہ لوگ مسلم دنیا سے بامعنی رابطہ قائم کرنے میں مددگار ثابت ہوں گے جن کا امیج ایک مذہبی ہوگا اور جن کی شہرت اسلام دوست کی ہوگی۔ چنانچہ ممکن ہے کہ شہزادہ چارلس کو ایسی ہی کسی صورتحال کے لئے تیار کیا جارہا ہو۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ محض ایک قیاس ہے اور قیاس غلط بھی ہو سکتا ہے۔

لہذا شہزادے کی اسلام سے بڑھتی ہوئی دلچسپی کو صرف اس تناظر میں دیکھنا قرآن انصاف نہ ہوگا۔ ممکن ہے چارلس کی اسلام سے دلچسپی مطالعے کا نتیجہ ہو لیکن عام طور پر اس نوع کی تبدیلیاں عام کتابیں پڑھنے کے بجائے کتاب زندگی پڑھنے سے آتی ہیں اور شہزادے کی کتاب زندگی کے کئی ابواب ایسے ہیں جو انہیں اسلام کی جانب مائل کرنے کا سبب بن سکتے ہیں۔

پہلا باب تو ان کی خانگی زندگی ہے جو مایوسیوں اور ناکامیوں سے عبارت ہے انسان اپنی زندگی میں بعض ایسے تجربات سے دوچار ہوتا ہے جو اسے ان سوالات تک پہنچا دیتا ہے جن کا جواب حاصل کئے بغیر انسان ایک پل بھی چین سے نہیں جی پاتا انسان اپنے علم، اپنے ماحول اور اپنے مذہبی و خاندانی پس منظر سے جواب اخذ کرتا ہے جواب تسلی بخش نہ ہوں تو انسان کی جستجو اسے ان سرچشموں تک لے جاتی ہے جن پر عام حالات میں کبھی جانا پسند نہ کرتا۔ چنانچہ ممکن ہے کہ چارلس بھی ایسے ہی تجربات کے ذریعہ اور ایسے ہی سوالات کے جواب کی تلاش میں اسلام تک پہنچے ہوں۔

جہاں تک مغرب کے عام خواص و عوام کا تعلق ہے تو ان کے لئے اسلام کی پانچ چیزیں انتہائی کشش کا باعث ہیں۔

(۱) توحید (۲) اسلام کے مطلق اخلاقی تصورات (۳) خاندان کی مرکزیت کا تصور (۴) دین و دنیا

کی یکجائی (۵) اور اسلام کا تصور عدل اور تصور مساوات۔

انسان کا ایک مسئلہ یہ ہے کہ جو چیزیں اس کے پاس نہیں ہوتیں انہی میں رغبت محسوس کرتا ہے مغرب کے لوگوں کا مسئلہ بھی یہی ہے۔ وہ اسلام کے ان تصورات میں زیادہ دلچسپی لے رہے ہیں جو ان کی زندگی میں یا تو کبھی تھے ہی نہیں اور اگر تھے تو اب ان کی زندگی سے خارج ہو چکے ہیں۔ عقیدۂ توحید میں انہیں اس لیے کشش نہیں ہے کہ تثلیث کا نظریہ انہیں اپیل نہیں کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی زندگی ہر اعتبار سے انتشار اور اس حوالے سے ایک نوع کے شرک کا منظر پیش کر رہی ہے کلیسا نے بہت سے اخلاقی تصورات کو زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کے شوق میں "اضافی" بنا دیا ہے اور اخلاقی تصورات کا معاملہ یہ ہے کہ اگر وہ مطلق اور ناقابلِ تغیر نہیں تو پھر انہیں اخلاقی تصورات ہی نہیں کہا جا سکتا۔ اسلام کے مذکورہ بالا باقی تین تصورات بھی مغربی دنیا کے لوگوں کے لئے اس حوالے سے باعث کشش ہیں کہ وہ ان تصورات سے اپنی زندگی کو عاری پاتے ہیں معاملے کے یہ تمام رخ مغربی دنیا کا عمومی تجربہ ہیں۔ اس میں کسی عام شخص اور شہزادے کی کوئی تخصیص نہیں۔ چنانچہ ممکن ہے کہ چارلس کی اسلام سے بڑھتی ہوئی دلچسپی کا سبب یہی محرکات ہوں۔ بہرحال وجہ جو بھی ہو۔ چارلس کی اسلام دوستی کئی اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے اس معاملے کی پشت پر اگر کوئی منصوبہ موجود نہ ہو تو پھر یہ اہمیت مزید بڑھ جائے گی ●●●

—— (بقیہ : عظیم ہستی) ——

کو اسی کام کے لئے کئی دن لگ جاتے ہیں۔ اسی لیے مرد کو انسانیت کا دماغ اور عورت کو اس کا دل کہا گیا ہے دماغ میں خلل پڑ جائے تو بھی انسان جی لیتا ہے لیکن اگر دل کی دھڑکن بند ہوئی تو زندگی ختم ہو جاتی ہے اگر عورت نے اپنی صلاحیتوں کو جانا اور مرد نے اس کی اہمیت کو سمجھا تو پھر زندگی مسکرا اٹھتی ہے ▲▲

مسلم ملکوں کا ایک نیا فورم

روز بروز گھٹتی ہوئی دنیا میں مختلف سطحوں پر نئے نئے اتحاد تشکیل پارہے ہیں اور ان میں توسیع کا عمل جاری ہے مسلم ممالک نے بھی مختلف سطحوں پر ماضی میں آرگنائزیشن آف اسلامک کنٹریز کانفرنس (او آئی سی) عرب لیگ و خلیجی تعاون کونسل جیسے اتحاد تشکیل دیئے لیکن صرف ایک او آئی سی کے سوا بقیہ سب بے معنی ہوکر رہ گئے اور اپنے خول سے باہر نہیں نکل سکے او آئی سی بھی بین الاقوامی سطح پر اپنی سیاسی حیثیت تسلیم کروانے میں اب تک بحیثیت مجموعی ناکام رہی ہے۔ تیل پیدا کرنے والے مسلم ممالک کی تنظیم اوپیک ایک زمانے میں بڑی موثر حیثیت رکھتی تھی لیکن رکن ممالک کے اختلافات اور تنظیم کے اصولوں کی خلاف ورزی نے اس کا وزن بھی گھٹادیا ایسے میں مسلم ممالک کے ایک ایسے اتحاد کی ضرورت بہت دنوں سے محسوس کی جارہی تھی جو اپنی بین الاقوامی حیثیت تسلیم کروانے خواہ یہ او آئی سی کی تجدید نو کے ذریعہ عمل میں آئے یا ازسر نو کسی نئے نام سے یہ اتحاد تشکیل پائے مسلم ممالک کے درمیان اس طرح کے اتحاد کی ضرورت کا احساس ترکی کے اسلام پسند حلقوں میں سب سے زیادہ پایا جاتا تھا اور یہی وجہ ہے کہ وہاں کی رفاہ پارٹی کے انتخابی منشور میں بھی مسلم ممالک کی مشترک دفاعی تنظیم اور ان کی اقوام متحدہ کی تشکیل کی کہی گئی تھیں ترکی میں اس احساس کے شدید ہونے کی خاص وجہ یہ تھی کہ ترکی یورپ و ایشیا کی سرحد پر واقع ہے اور یورپ میں ہونے والی تبدیلیوں کا مشاہدہ بہت قریب سے کرسکتا ہے یورپ میں ناٹو جیسی دفاعی تنظیم بہت پہلے سے موجود ہے جس کا خود ترکی بھی ایک رکن ہے اب وہاں یوروپی یونین کی تشکیل کا عمل جاری ہے اور اس کی وجہ سے یورپ

مختلف ممالک باہمی تعاون کی ایک لڑی سے جڑ گئے ہیں اور ان کی محتاج اور دوسرے ممالک پر
ر کا بڑی حد تک خاتمہ ہو چکا ہے۔ لہذا ترکی کا وہ حلقہ جو اسلام پسند ہے اور جو امت کی سطح پر
چتا ہے اسے اسلامی ممالک کی موجودہ بے بسی کا احساس شدید ہے اور وہ ان ممالک کے درمیان
اس طرح کا اتحاد و اتفاق دیکھنا چاہتا ہے جو انہیں مغرب کی غلامی اور محتاجی سے نکال کر اپنے
یں پیر کھڑا کر سکے اور یہی وجہ ہے کہ ترکی میں رفاہ پارٹی جب برسر اقتدار آئی تو اس کے وزیر اعظم
لدین اربکان نے مغرب کی مخالفت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ایران، لیبیا اور پاکستان جیسے مسلم
ے کا دورہ سب سے پہلے کیا اور اقتدار میں آنے کے جلد ہی بعد اکتوبر کے مہینے میں آٹھ ترقی
ر مسلم ممالک کے۔ انڈونیشیا، ترکی، پاکستان، ملائیشیا، ایران، بنگلہ دیش، نائیجیریا اور
۔ رہنماؤں کو ترکی میں ایک اقتصادی اتحاد کی تشکیل کے لئے دعوت دی جس کا نام ڈی 8 تجویز
یا یعنی 8 ترقی پذیر مسلم ممالک اور ابھی 15 جون کو ان کے ممالک کے سربراہوں نے استنبول
س کی تشکیل کو قطعی شکل دے دی اور ایک ایسے اقتصادی منشور پر دستخط کئے جس کا بنیادی مقصد
۔ سے پہلے ان ممالک سے غربت کو ختم کرنا ہے۔ مسلم ممالک کی اس تنظیم کو گرچہ جغرافیائی نوعیت
یتری حاصل نہیں ہے لیکن ان میں عقیدے کا اشتراک باہمی تعاون کو فروغ دینے کے لئے کافی
ما ہے مزید برآں یہ کہ اگر اس کے بہتر نتائج سامنے آتے ہیں تو دیگر مسلم ممالک بھی اس تنظیم
ں سے آ جائیں گے اور اس طرح ان کے جغرافیائی حدیں بھی ترتیب پا جائیں گی۔ البتہ مصر کا رویہ
ع ہی سے کچھ اچھا نہیں رہا ہے اس نے اتحاد بنائے جانے کی تجویز کے وقت بھی اس کی مخالفت
د جب دیگر رہنماؤں کے ساتھ ترکی نے مصری صدر حسنی مبارک کو شرکت کا دعوت نامہ بھیجا تو انہوں
دہری دکھائی اور سربراہ اجلاس میں خود شریک ہونے کی بجائے اپنے وزیر خارجہ کو بھیجا اور اس
ت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اتحاد میں شامل دوسرے ممالک کے درمیان بھی کچھ اختلافات موجود ہیں اور مغربی
یورپ زور و شور سے انہیں ہوا دینے میں مصروف ہے تاکہ یہ اتحاد اپنے آغاز ہی میں دم توڑ جائے۔

محمد اسحاق

غریب ذہین طلبہ کا تعلیمی مستقبل

قریب ۴۰ سال پہلے کی بات ہے کہ راقم محض اتفاق سے ایک دولت مند امیر کبیر کی محفل میں موجود تھا۔ کچھ ہی دیر میں ان کا ایک ملازم جو ان صاحب کے پاس تیس برس سے کام کر رہا تھا دست بستہ حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ میرا بیٹا آج میٹرک کے امتحان میں درجہ اول سے کامیاب ہوا ہے وہ چاہتا ہے کہ انٹرمیڈیٹ کے بعد انجینئرنگ کورس میں داخلہ لے۔ اس کے خیالات تو بہت اونچے ہیں لیکن میں غریب کہاں پڑھا سکتا ہوں اگر آپ ماہانہ 35، 30 روپے وظیفہ جاری کر دیں تو یہ پڑھ کر انجینئر بن جائے گا یہ سب سن کر صاحب کے چہرہ پر کچھ خفگی اور پریشانی کے آثار ابھر آئے۔ ان کے لئے یہ کوئی اچھی خبر نہیں تھی جب کہ خود ان کے لڑکے اس قابل نہیں تھے اس ملازم کا لڑکا ریاضی میں ۹۲ فی صد نشانات لایا تھا۔ صاحب نے اس کو مشورہ دیا کہ کہیں دفتر میں اس کو ملازم رکھ دو اور وظیفہ کی بات کو وہ ٹالنے لگے۔ وہ سراپا التجا بنا ہوا تھا اور لڑکا سہما ہوا تھا۔ یہ منظر اس بندہ سے دیکھا نہ گیا۔ ہمت کر کے مجھے درمیان میں کہنا پڑا میں نے کہا دیکھئے آپ بہت سے غریبوں کو ماہانہ چار پانچ سو روپے وظیفہ دیتے ہیں اور غریب لڑکیوں کو شادی میں مدد کرتے ہیں یہ سب وقتی امداد ہے لیکن اس کے لڑکے کی تعلیم کے لئے مدد ایک ایسی نہر ہے جس کا فیضان برسوں تک نہیں بلکہ کئی نسلوں تک جاری رہے گا۔ اس قسم کی دخل در معقولات پر صاحب نے مجھے خشمگیں نگاہوں سے دیکھا پھر کیا سمجھ کر کہا اچھا دو سال کے لئے ماہانہ بیس روپے وظیفہ جاری کر دیں گے اس زمانہ میں یہ بہت بڑی

تھی وہ طالب علم انٹرمیڈیٹ کی بجائے پالی ٹکنیک میں شریک ہوکر پھر درجۂ اول سے کامیاب
ہوگیا۔ اس کو انجینئرنگ کے دوسرے سال میں داخلہ مل سکتا تھا لیکن وظیفہ بند ہوجانے سے اس
کی ترقی کی شاہ راہ پر دیوار کھڑی ہوگئی۔ وہ بہت تلملایا۔ لیکن کچھ نہ کر سکا۔ بالآخر انھیں ریلوے
میں ملازمت مل گئی۔ اس لڑکے کی ذہانت اور ملازمت سے متاثر ہوکر صاحب نے اپنی لڑکی سے
اس کی شادی کردی۔ وہ ترقی کرکے ریلوے کے انجینئر بن گئے ان کے بچے میڈیسن اور انجینئرنگ میں
پہنچ گئے۔

آپ نے مرزا فرحت اللہ بیگ کا مضمون "ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی، میری زبانی" ضرور
پڑھی ہوگی۔ نذیر احمد اپنی غربت کی وجہ بچپن میں دہلی کی کسی مسجد میں مولوی صاحب کی خدمت میں رہ
گئے۔ روزآنہ پڑھنے کے علاوہ محلہ کے کسی رئیس کے گھر سے روزآنہ کھانا لانے کی ذمہ داری اُن ہی
کی تھی۔ جب وہ اس رئیس کے مکان جاتے تو نواب صاحب کی ایک چھوٹی صاحبزادی شرارت سے
ان کے کان پکڑ کر چیٹتی اور مصالحے پیسنے کے لئے نذیر احمد کو بٹھا دیتی۔ چند ہی برسوں میں اُن
کے علم و فضل کی دہلی میں دھوم مچ گئی۔ اسی لڑکی سے اُن کی شادی ہوئی جو ان کے کان کھینچتی اور ستاتی
تھی۔ اس قسم کی مثالیں آپ کو اپنے اطراف و اکناف میں خود آپ کے خاندان میں مل جائیں گی اور
کوئی تعجب نہیں کہ اس مضمون کے اصل ہیرو آپ بھی ہوسکتے ہیں مصنف کی کتابوں تعلیمی مسائل اور
مسلم ایک تحریک میں آپ اس قسم کی بہت سی مثالیں مل جائیں گی ہر سماج کی طرح مسلم معاشرہ میں تین
طبقات موجود ہیں۔ غربت کی سطح سے نیچے۔ اوسط اور بالائی طبقہ۔ غریب طبقہ کا اوسط 40 فی صد ہوگا
شخص اپنے بچوں کو پڑھانے لکھانے کا خیال ضرور ہے لیکن پنڈت نہرو کی زبان میں پہلے پیٹ بھر جائے
تو غریب تعلیم کی سوچ سکتا ہے۔ گذشتہ بیس پچیس برسوں میں ایک نمایاں تبدیلی آگئی ہے وہ یہ کہ
غریب امیر ہر شخص اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے فکرمند ہے۔ یہ خوشگوار تبدیلی ایک انقلاب کی آمد کی
علامت سے کم نہیں بہت سے غریب ماں باپ اپنے بچوں کو تعلیم دلانے کی خواہشمند ہیں۔ دوسرا اوسط طبقہ

ہے۔ دوسرا طبقہ جو تعلیم یافتہ ڈاکٹر انجینئر آرہے ہیں اس کے لئے بھی یہ طبقہ بہت قربانیاں
دے رہا ہے۔ جو بالائی طبقہ ہے ہمارے معاشرہ کا دس فیصد ہو سکتا ہے۔ وہ اپنے بچوں کے لئے تعلیم کو
بھی سی تجارتی [illegible] ایک انڈسٹری میں تبدیل ہو چکی ہے اعلیٰ تعلیم
صرف انھیں [illegible] کے حصول کا جذبہ ہو۔ لیکن آج کل
دولت اور پیسہ نے تعلیم کی بنیادی [illegible] کردیا ہے جس کو ڈاکٹر بننا تھا وہ کلرک
بنا ہے اور جو [illegible] ہونا تھا وہ ڈاکٹر یا انجینئر ہے اس پر قوم کا عظیم نقصان ہے ان میں غریب
اور ذہین طلباء اعلیٰ پیشہ ورانہ تعلیم کے پوری طرح مستحق ہونے کے باوجود وہ داخلہ فیس اور تعلیمی
اخراجات برداشت نہیں کر سکتے اس لئے ان کی محرومیاں ان کے ذہنی اور روحانی کرب کو اور
زیادہ کردیتی ہیں جب وہ دیکھتے ہیں کہ ان سے بہت پیچھے کے رینک پانے والے خانگی کالجوں میں نشستیں
حاصل کر کے ڈاکٹر وغیرہ بن گئے ہیں۔

یہاں دراصل ہمارا اصل مقصد یہی ہے کہ ملت کا یہ زرینہ سرمایہ یوں ہی [illegible] رہ جاتا ہے!
لیڈر، دانشور اور علمائے دین نے اس اہم نقصان پر آج تک بہت کم توجہ دی ہے۔ ہمارے اطراف [illegible]
بہت سے غریب ذہین طلباء ہیں جنھیں مرجھاتے ہوئے سب ہی نے دیکھا ہے سارے ہندوستان میں [illegible]
انتظامیہ کے تحت [illegible] کالجس، اعلیٰ پیشہ وارانہ کالج، میڈیسن، انجینئرنگ، فارمیسی، ایم بی اے
[illegible] کالجس آف ایجوکیشن، پالی ٹیکنک کھل گئے ہیں جو قابل قدر خدمات انجام دے رہے ہیں
پر وقت کا [illegible] ہے کہ ہم ایسے غریب ذہین طلباء کے لئے پالیسی کے طور پر کم از کم پانچ فی صد
کی حد تک نشستیں محفوظ کردیں جب [illegible] خدمات [illegible] اعلیٰ فنی کالجوں میں مسلم آبادی
کے لحاظ سے [illegible] نشستیں محفوظ [illegible] خود اپنے تعلیمی اور [illegible]
[illegible] یہ دراصل ملت کی بہتری [illegible] ہے جس کی طرف سنجیدگی سے غور
کرنے کی ضرورت ہے ہماری تعلیمی کوششوں میں ایک نئی انقلابی تبدیلی آجائے گی جس کے نتائج دس برس



ڈاکٹر عالیہ خان

خدا نے آدم کے ساتھ اس کی شریک زندگی کو پیدا کر کے ایک کمی کو پورا کر دیا اور ساتھ ہی زندگی میں ہلچل پیدا کر دی۔ عورت کے وجود نے اضطراب کو سکون بخشا اور پھر زندگی سبزہ زار کی طرح چمک اٹھی۔ جیسے جیسے دنیا نے ترقی کی، مرد اپنے قوائے جسمانی کی برتری کی وجہ سے عورت کو ثانوی درجہ دینے پر مجبور ہو گیا۔ مردوں نے ملک فتح کئے حکومتیں قائم کیں اور پھر قانون بھی انہی نے بنائے اسی طرح دنیا اسی ڈگر پر چلنے لگی۔ کیا عورت نے کچھ نہیں کیا؟ جی نہیں اگر دیکھا جائے تو مرد والے نے جو کچھ بھی کیا، اس میں عورت کسی نہ کسی طرح شامل رہی۔ کائنات کی رونق [illegible] چہل پہل [illegible] اس کی سرگرمیاں، اس کی دلکشی سب عورت کے دم سے ہی ہے اور یہ عظیم ہستی [illegible] دائرہ میں ضم ہو گئی۔ عورت بھی حکومت کرتی چلی آ رہی ہے [illegible] ملک پر نہ سہی [illegible] حکومت ہے۔ اس کا گھر اس کی چھوٹی سی ریاست ہے جس کی وہ مختار ہے [illegible] ہستیاں اسی کی گود میں پل کر جوان ہوئیں۔ جس قوم نے [illegible] نہ ہو سکی۔ کیونکہ ہر بچے کا بچپن ماں کا رہین کرم ہے جب بچہ پہلی مرتبہ آنکھ [illegible] ہے تو وہ اپنی ماں [illegible] ہے ہر بچہ کے سامنے جو نمونہ مستقل طور پر رہتا ہے وہ اس کی ماں ہے سو معلوم [illegible] ایک اچھی ماں ہو سکتی ہے ماں کے ہاتھوں وہ پروان چڑھتا ہے [illegible] اسے کھلاتی ہے اسے بہلاتی پھسلاتی ہے اور اس کی ہر حرکت پر پیار سے خوشی سے جھومنے لگتی ہے اور جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا جاتا ہے تو ماں اپنے

تخیل میں اس کا درخشاں مستقبل دیکھتا ہے۔ اپنے رنگین تخیل کے سامنے اسے ساری دنیا کی بادشاہت بھی ہیچ لگتی ہے۔ بچہ ماں کی خصلت کا آئینہ ہوتا ہے۔ گھر میں وہ سارے دلوں اور ساری آنکھوں کی مقناطیس ہوتی ہے۔ بچوں کے چال چلن اور طور طریقے پر ماں کا اثر زیادہ ہوتا ہے۔ اس لئے گھر میں ماں کا نیک مثال ہونا ایک بڑی نعمت ہے جس قسم کا ماحول بچہ کو ملے گا وہی اثر وہ قبول کرے گا اور پھر ساری عمر اس پر برقرار رہے گا جو خیالات بچپن میں وہ حاصل کرتا ہے تمام عمر ان پر برقرار رہتا ہے۔ بچہ کی پہلی خوشی، اس کا پہلا غم، اس کی پہلی کامیابی، اس کی پہلی ناکامی، اس کا پہلا کارنامہ وہ کبھی نہیں بھول سکتا۔

بچپن انسان کی زندگی کا بہترین زمانہ ہوتا ہے ساتھ ہی ساتھ اہم اور نازک بھی۔ اس عمر میں خیالات کا جو خزانہ جمع ہو جاتا ہے وہ بچہ کے لئے بے حد ضروری ہوتا ہے اگر کسی وجہ سے خیالات ملیامٹ ہو جائیں تو اس کے نازک سے ذہن کو ٹھیس لگتی ہے کہ اس کو سنبھلنے کے لئے کافی دن لگ جاتے ہیں۔ یہ فرق کہ "جو ہاتھ جھولا جھلاتا ہے وہی حکومت کرتا ہے۔ سماج کو بنانے میں عورت کا حصہ ہے اور سماج کا دارومدار قوم پر ہے اور قوم کے ہر فرد کی پرورش عورت ہی کے سائے میں ہوتی ہے اس طرح عورت گویا سنسار کے مرکزی نظام کی روح رواں ہے۔ مثل مشہور ہے کہ "مصیبت کے وقت ماں ہی یاد آتی ہے۔ دنیا کے کام دھندوں جھگڑوں بکھیڑوں، مشوروں اور تسلی و تشفی کیلئے ماں ہی نظر آتی ہے۔ گویا سارے جہاں کا سکون اس کے آنچل تلے مل جاتا ہے۔ شاید اسی لئے کہتے ہیں کہ ماں کے قدموں تلے جنت ہے۔ اس سے اچھا معلم، اس سے اچھا ساتھی، اس سے اچھا رہنما، اس سے اچھا ہمدرد، اس سے اچھا تیمار دار کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔ عورت کو محبت کی دیوی کہا گیا ہے یہ وہ اس وقت ہے جب وہ اپنے فرض، اپنے فن، اپنی صلاحیت، اپنی طاقت کو بہتر طور استعمال کرے۔ اس کے لئے ضروری نہیں کہ وہ ماہر نفسیات ہو۔ کہتے ہیں کہ کسی بچے کو سکھانے کے لئے عورت کے لئے صرف چند گھنٹے درکار ہوتے ہیں

انجمن کمپیوٹر تربیتی مرکز

تقسیم ملک سے پہلے اُردو کی حالت بہت اچھی تھی لیکن اس کے بعد اُردو کا زوال شروع ہو گیا۔ ایسا اس غلط فہمی کی وجہ سے ہوا کہ اُردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے جب کہ اُردو ہندوستان میں پیدا ہوئی اور وہ ہندوستان کی زبان ہے۔ ان خیالات کا اظہار ریاست جموں و کشمیر کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے ۴ مئی ۱۹۹۷ء کو انجمن ترقی اُردو (ہند) کے زیر انتظام قائم انجمن کمپیوٹر تربیتی مرکز کا افتتاح کرنے کے بعد اُردو گھر میں منعقد جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے انجمن ترقی اُردو (ہند) کے محدود ذرائع آمدنی پر افسوس کا اظہار کیا اور اعلان کیا کہ وہ بہت جلد انجمن کے لئے ایک مستقل فنڈ کا بندوبست کریں گے۔ انہوں نے اپنے چند صاحبِ ثروت دوستوں سے بھی مدد دلانے کا یقین دلایا۔ ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے جموں و کشمیر میں اُردو کی صورت حال کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہاں اُردو سرکاری زبان ہے۔ اس کے باوجود بعض علاقوں میں اُردو کی حالت اطمینان بخش نہیں ہے ہم اس کی طرف توجہ کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے اُردو کو مقبول عام بنانے کے لئے کی ضرورت پر زور دیا۔

قبل ازیں ڈاکٹر خلیق انجم نے انجمن ترقی اُردو (ہند) کی علمی، ادبی اور تحریکی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ انجمن اُردو کے جائز حقوق کے لیئے ہر سمت اور ہر سطح پر کام کر رہی ہے۔ انجمن اُردو زبان کی بقا اور ترقی دونوں کے لئے کام کر رہی ہے ۔۔ آج ہم نے بڑے نامساعد حالات میں کمپیوٹر ٹریننگ سنٹر قائم کیا ہے جس میں ڈی ٹی پی اور دوسرے کورس کی تربیت دی جائے گی

اور طلبا سے بہت معمولی فیس لی جائے گی۔ انھوں نے اس موقع پر اُردو گھر کی تعمیر میں شیخ محمد عبداللہ کے رول کا ذکر کیا اور کہا کہ اُس زمانے میں انھوں نے بیس ہزار روپے کی خطیر رقم سے مدد فرمائی تھی۔

جلسے کے مہمانِ خصوصی جناب م۔ افضل (سابق رکن پارلیمنٹ) نے اُردو کے حوالے سے انجمن کی خدمات کا ذکر کیا اور کہا کہ اس کے کام کے میدان بہت وسیع ہیں۔ انجمن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم بہت باعمل اور فعال شخص ہیں۔ صدر انجمن پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی رہنمائی میں وہ اُردو زبان کے لئے جو کچھ کر رہے ہیں وہ لائقِ تحسین ہے۔ م۔ افضل نے جناب اندر کمار گجرال کے وزیر اعظم منتخب ہونے پر خوشی کا اظہار کیا اور کہا کہ پہلی بار اُردو سے سچی محبت کرنے والا وزیر اعظم ہمیں میسر ہوا ہے اور ہمیں امید ہے کہ اب اُردو کو اس کے جائز حقوق حاصل ہوں گے اور اس کی حالت میں سدھار آئے گا۔

جلسے کے صدر پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے اس موقع پر ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی خدمت میں ایک سپاسنامہ پیش کیا اور کہا کہ ڈاکٹر فاروق عبداللہ پہلی بار انجمن ترقی اُردو (ہند) کی دعوت پر یہاں تشریف لائے ہیں۔ ہماری کوشش ہوگی کہ آئندہ بھی انجمن سے ان کے تعلقات قائم و دائم رہیں اور ہمیں ان کا تعاون ملتا رہے۔ پروفیسر آزاد نے ریاست جموں و کشمیر کو اُردو کا گہوارہ قرار دیا اور کہا کہ جموں و کشمیر ہندوستان کی واحد ریاست ہے جس کی سرکاری زبان اُردو ہے۔

جلسے میں جامعہ اُردو علی گڑھ کے رجسٹرار جناب انور سعید کی شاعری کا مجموعہ "درد" کی رسم اجرا فاروق عبداللہ کے ہاتھوں انجام پائی۔ اس سے پہلے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے انجمن کی مطبوعات کا ایک سیٹ اور پروفیسر جگن ناتھ آزاد اور ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنی اپنی مطبوعات کا ایک ایک سیٹ ڈاکٹر عبداللہ کی خدمت میں پیش کیا۔ آخر میں ڈاکٹر اسلم پرویز نے شکریہ ادا کیا۔



محمد عبد الرحیم قریشی
صدر کل ہند مجلس تعمیر ملت

سیکولرزم
تعبیر اور ہندوستان کیلئے معنویت

--

عدلیہ کی تشریحات

سیکولرازم کی اس ہندوستانی تعبیر کو سپریم کورٹ نے مختلف موقعوں پر اپنی تشریحات کے ذریعہ واضح کیا ہے اور اس کو دستور کی ایسی بنیادی خصوصیات میں شمار کیا ہے جس کو پارلیمنٹ قانون سازی کے اختیارات کے تحت بدل نہیں سکتی۔ سپریم کورٹ نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ مذہبی معاملات کی تعبیرات متعلقہ مذہب کے اصولوں کے تحت ہوں گی اور کسی بیرونی نظریہ یا اصول کا اطلاق نہیں کیا جائے گا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سپریم کورٹ کے ان مستند تبصروں میں سے چند کو پیش کیا جائے۔

"مذہبی امور کی آزادی کی تشریح کمشنر ہندو مذہبی اوقاف مدارس بنام ایل۔ ٹی۔ سوامیار کیس کے فیصلے میں سپریم کورٹ نے اس طرح کی کسی مذہب کے لازمی حصہ میں کیا شامل ہے اس کا یقین بنیادی طور پر خود اس مذہب کے اصول کے حوالہ سے کیا جائے گا۔ اگر ہندوؤں کے کسی مذہبی فرقہ کے اصولوں میں یہ مقرر کیا گیا ہے کہ دن کے خاص اوقات میں مورتی کو بھوجن دیا جائے کہ سال کے متعین حصوں میں متعین طریقہ پر وقفہ دار رسومات انجام دیئے جائیں یا مقدس کتب کی تلاوت روزانہ ہو یا مقدس آگ میں نذر ڈالی جائے تو ان تمام کو مذہب کا جزو قرار دیا

جائے گا اور محض یہ حقیقت کہ اس میں رقم کا صرفہ ہوتا ہے یا پجاریوں اور نوکروں کو ملازم رکھا ہوتا ہے یا قابل فروخت چیزیں استعمال کی جاتی ہیں ان کو سیکولر سرگرمیاں ہیں اور ان کو دفعہ ۲۶ (ب) کے مفہوم اندر مذہب کے معاملات قرار دیا جائے گا۔ (AIR 1954 SC 282 at 290)

مشہور کیشوانند بھارتی کیس میں اس وقت کے چیف جسٹس ایس ایم سکری نے کہا یہ کہا جا سکتا ہے کہ بنیادی ساخت ذیل کے خدوخال پر مشتمل ہے۔

۱۔ دستور کی بالادستی
۲۔ حکومت کی دستوری و جمہوری شکل
۳۔ دستور کا سیکولر کردار
۴۔ قانون سازیہ، عاملہ اور عدلیہ کے درمیان اختیارات کی علیحدگی (تقسیم)
۵۔ دستور کا وفاقی کردار

متذکرہ صدر ساخت کی تعمیر اساسی بنیاد یعنی فرد کی عظمت اور آزادی پر ہوئی ہے انتہائی اہمیت کی بات ہے اس کو ترمیم کی کسی شکل کے ذریعہ برباد نہیں کیا جا سکتا۔

متذکرہ صدر بنیاد اور متذکرہ صدر بنیادی خدوخال صرف ابتدائیہ میں ہی نہیں بلکہ کے پورے منصوبہ میں آسانی سے دیکھے جا سکتے ہیں۔ (A.I R 1973 SC 1461-1535-36)

۴۲ ویں دستوری ترمیمی بل ۱۹۷۸ء کے ذریعہ دستور کے ابتدائیہ میں سیکولر لفظ داخل کیا اور اس کے ذریعہ یہ وضاحت کر دی گئی کہ سیکولر سے مراد ایسی دستوری ریاست ہے جہاں تمام مذاہب کا مساوی احترام کیا جائے گا۔

تلخ تجربوں کے باوجود یہ بات واضح ہے کہ سیکولر کردار ہندوستانی سیاسی وحدت بنیادی ساخت کا ناقابل ترمیم جزو ہے اور سیکولر کردار سے مراد یہ ہے کہ اس ریاست کا کوئی نہ ہو۔ ریاست میں تمام مذاہب کے ساتھ مساویانہ سلوک کیا جائے اور شہریوں کو مذہب

عمل اور اشاعت کی آزادی حاصل ہے۔ سیکولرازم کی اس قابل قدر تعبیر کے باوجود اس حقیقت سے
انکار مشکل ہے کہ ملک کے سیکولر کردار کو مضبوط اور طاقتور کرنے کی بجائے اسے مسلسل نقصان پہونچایا
جاتا رہا۔ سیکولر کردار کو زندہ حقیقت بنانے اور عملی روپ میں اجاگر کرنے کی راہ میں سیکولر کہلانے والی
قوم پرست تقریباً سب ہی سیاسی جماعتیں حائل رہیں یا انھوں نے سنجیدگی کے ساتھ اس سلسلہ میں کوئی
موثر کوشش نہیں کی۔ حکومتوں اور ارباب اقتدار کی جانب سے ایسے اقدامات کئے جاتے رہے جو ریاست
کے سیکولر کردار کے منافی تھے۔ اقلیتوں کو دوسرے درجہ کا شہری بنانے کی بات کہی جاتی ہے۔ مذہبی
اقلیتوں اور بالخصوص مسلمانوں کے خلاف صرف شک و شبہ ہی نہیں بلکہ نفرت پھیلانے کی مسلسل اور
منظم کوششیں ہوتی رہیں۔ ان کی ہمت شکنی تو درکنار ان کو روکنے کے لئے کوئی موثر قدم نہیں اٹھا
گیا اخبارات و جرائد نفرت کا پرچار کرتے رہے ان کو روکنے کے لئے کوئی موثر قدم نہیں اٹھایا گیا
اخبارات و جرائد نفرت کا پرچار کرتے رہے ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ اقلیتی جرائد کے
احتجاجی لب و لہجہ پر ان کے خلاف مقدمات چلائے گئے۔ درسی کتب کے ذریعہ سیکولر کردار کو مضبوط بنانے کے
بجائے فرقہ وارانہ منافرت بڑھانے والے اسباق شائع کئے گئے۔ تاریخ کو اس مقصد کے لئے مسخ کرکے
پیش کیا جانے لگا۔ درسی کتب کی جانچ کے بعد کئی رپورٹیں پیش ہوئیں لیکن کوئی موثر قدم ان کی اصلاح کے
لئے اٹھایا نہیں گیا۔ فرقہ وارانہ جنون نے خون آشام و تباہ کن فسادات کے ذریعہ مسلمانوں کی زندگی اجیرن
کردی یہ بابری مسجد کے انہدام کے ذریعہ مخالف سیکولرازم ہندوتوا طاقتوں نے جہاں ایک طرف دن دھاڑے
غارتگری کی بدترین مثال قائم کی وہیں عدلیہ کو بے وقار کردیا اور قانون کی بالادستی کے اصول کو تباہ کرکے
ملک کے سیاسی نظام کے بارے میں اعتماد کو متزلزل کردیا۔ ڈسمبر ۹۲ء اور جنوری ۹۳ء میں بمبئی،
سورت اور دیگر دوسرے مقامات پر مسلمانوں کے خلاف ہنگاموں میں حکومت اور پولیس کا رویہ
انتہائی متعصبانہ رہا۔ مخالف سیکولرازم عناصر اور فرقہ وارانہ فسادات برپا کرنے والوں کو عزت کا مقام

دیا جانے لگا۔ حکومت کی تقاریر اور سرکاری کاموں میں ہندو علامتیں [illegible] رسومات اختیار کی جانے لگیں۔ [illegible] اور ایسی ہی کئی باتوں کی وجہ سے بعض وقت ایسا احساس ابھرتا ہے کہ اب اس ملک کے لئے سیکولرازم میں معنویت نہیں رہی۔ بعض اصحاب یہ بھی کہنے لگے ہیں کہ جب اکثریت نے سیکولرازم کو رد کردیا، اقلیت کو کچھ نہ مل سکا اور حکومت نے خود اس کو بے آبرو کردیا تو اب سیکولرازم کی بات ہی بے معنیٰ ہوگئی۔ یہ نقطۂ نظر صحیح نہیں ہے۔ اکثریت نے سیکولرازم کو رد نہیں کیا، اگر رد کیا ہوتا تو مرکز اور ریاستوں میں ہندوتوا پارٹیوں کی مضبوط حکومتیں قائم ہوتیں۔ موجودہ سیاسی صورتحال خود اس بات کا بڑا ثبوت ہے کہ ہندو بھائیوں کی اکثریت نے ہندوتوا کو قبول نہیں کیا ہے اس لئے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اہم سوال یہ ہے کہ اگرچہ سیکولر کردار کو مسلسل کمزور کرنے کی کوشش کی جاری ہیں۔ کیا ملک کے بہتر مستقبل کے لئے سیاسی نظام کا سیکولر ہونا ضروری ہے یا نہیں۔ اس سوال پر جتنا غور کیا جائے یہی جواب قابل قبول ہوگا کہ سیاسی نظام کا سیکولر ہونا ضروری ہے ایسی صورت میں سیکولر کردار کو مضبوط کرنے کی کوشش کرنا چاہئے اور انھیں یہ یقین رکھنا چاہئے کہ ملک کے سیکولر کردار کے استحکام کی ہر کوشش ملک کی ایک بڑی خدمت ہے۔ مسلمانوں کو بھی اپنے تلخ اور دل دوز تجربات کے باوجود سیکولرازم استحکام کے لئے ہر ممکن کوشش کرنی چاہئے اور خود کو خول میں بند کر لینے کے بجائے سر اور اہل وطن کے ساتھ اور سماجی تال میل مکالمے اور تبادلۂ خیالات کے ذریعہ ایسی فضا پیدا کرنے کی کوشش کرنا چاہئے جو ملک کے سیکولر کردار کے استحکام کے لئے سازگار ہو۔

ہندوتوا کیا ہے؟

اس وقت وہ سیاسی جماعتیں جو سیکولر کہلاتی ہیں کمزور اور غیر منظم ہیں اور ہندوتوا کی نمائندہ جماعت بی۔ جے۔ پی نے پارلیمنٹ میں سب سے بڑی جماعت کا موقف حاصل کرلیا ہے بلکہ دو ہفتوں تک مرکز میں اقتدار کا مزہ بھی چکھا ہے۔ اقتدار کے پیالے کا منہ تک آکر چھن جانے سے اس کو اپنی سیاسی حکمت عملی

تبدیلی کرنی پڑی۔ یہ احساس پیدا ہوا کہ جب تک مسلمانوں اور دلتوں کے دونوں کا تناسب اس کے حق میں نہ آئے وہ مرکزی اقتدار پر قبضہ نہیں کر سکتی۔ اس احساس نے مجبور کیا کہ دلتوں اور مسلمانوں کو اپنی طرف مائل کرنے کی حکمت عملی اختیار کرے۔ یوپی میں بہوجن سماج پارٹی کے ساتھ اتحاد اسی حکمت عملی کا حصہ ہے بلکہ بی جے پی یہ کوشش ہوگی کہ یہ اتحاد چاہے کتنے ہی جھٹکے اس کو کانشی رام اور مایاوتی دینے لگیں۔ آئندہ انتخابات تک برقرار رہے تاکہ اس اتحاد کے نتیجہ میں دلتوں کے ووٹ بی جے پی کو ملیں اسی طرح مسلمانوں کو اپنی طرف راغب کرنے کے کئی پروگرام چل رہے ہیں ان کا ایک روپ یہ بھی ہے کہ بی جے پی خود کو مثبت سیکولرازم کا علمبردار بنا کر پیش کر رہی ہے اور دوسروں پر نام نہاد سیکولر PSEUDO - SECULARISM اختیار کرنے کا الزام لگا رہی ہے اور یہ کہا جانے لگا ہے کہ ہندوتوا سیکولرازم کے خلاف نہیں ہے۔ ہندوتوا کے تصور کو ہندو مہاسبھا کے دمانک ساورکر نے ایک سیاسی نظریہ کے طور پر پیش کیا اسی کو آر ایس ایس کے بانی ڈاکٹر ہیڈگیوار نے اختیار کیا اور ان کے جانشین ایم ایس گولواکر نے ہندو راشٹر کو ایک اصطلاح کی شکل دے کر اس کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا۔ بی جے پی کے تمام سرکردہ قائدین نے آر ایس ایس کے سرگرم رکن رہے ہیں اور ہیں۔ ایم ایس گولواکر کی تحریرات آر ایس ایس کے لئے بائبل جیسی مذہبی کتاب کا مقام رکھتی ہے اور ان ہی کے نظریات پر آر ایس ایس کار فرما ہیں ہندوتوا یا ہندو راشٹر کا جو نظریہ گولواکر کی تحریروں اور تقریروں سے واضح ہوتا ہے کہ یہ وہ ہے کہ مسلمان عیسائی اور پارسی ہندوستانی قومیت سے تعلق نہیں رکھتے یہ اگر قوم دشمن نہ ہو تب بھی یہ غیر ہندو ہیں۔ ہندوستان اس وقت تک ایک طاقتور ملک نہیں بن سکتا جب تک کہ ان عناصر کو ... ختم نہ کیا جائے۔ گولواکر نے اپنی کتاب وی آر اور نیشن ہڈ ڈیفائنڈ WE OR OUR NATIONHOOD DEFINED میں لکھا ہے۔

”اس ملک ہندوستان میں اس کی نسل کو اپنے ہندو ... ہندو کلچر ہندو زبان

(سنسکرت اور اس کی نسل کے قومی خاندان) کے ساتھ رہنا چاہیئے۔ ہندو قوم کا وجود ضروری ہے۔ ہندو قوم کے سوا کسی اور کا وجود نہ رہے۔ وہ تمام جن کی قومیت یعنی ہندو نسل، مذہب، تمدن اور زبان سے تعلق نہ ہو وہ حقیقی قومی زندگی کے حلقہ سے خارج ہیں۔ ... وہی قومی محب وطن ہیں جو ہندو نسل اور قوم کی شان و شوکت کی آرزو دل میں رکھے، سرگرم عمل ہوتے ہیں اور اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے جد وجہد کرتے ہیں۔ دوسرے تمام یا تو قومی کاز کے غدار اور دشمن ہیں یا نرم دلانہ نقطۂ نظر اختیار کیا جائے تو بیوقوف ہیں۔" (صفحہ ۴۳، ۴۴)

اس نکتہ پر زور دیتے ہوئے کہ مسلمان اور دوسری اقلیتیں ہندوستانی قوم کا جزو نہیں ہیں گولوالکر نے اسی کتاب کے صفحہ ۵۳ پر لکھا ہے۔

"اس ملک میں ہندو ہی قوم ہیں اور مسلمان اور دوسرے اگر حقیقت میں مخالف قوم نہ ہو تو کم سے کم جسدِ قوم سے خارج ہیں۔"

اس کی مزید وضاحت انھوں نے صفحہ ۵۵ پر یوں کی ہے۔

"اس ملک کے عوام کو مذہب، کلچر اور نتیجتاً زبان کے اعتبار سے ہندو ہونا چاہیئے تاکہ "جن پد" کے تصور میں حقیقی طور پر شامل ہو سکیں جو قدیم ہندوؤں کے راشٹر نظریئے (قومیت کے تصور) کا ایک جزو ہے۔"

گولوالکر نے ہندو سماجی قانون یعنی ذات پات کے نظام ورن آشرم پر بھی ہے جو اونچ نیچ کے اس نظم کو نہیں مانتے انھیں ملیچھ یعنی ناپاک قرار دیتے ہوئے لکھا ہے۔

"اس ملک میں طاقت اور شوکت کے عوامل کے علاوہ، ایک اچھے ملک اور ایک اچھی قوم کے توصیفی عوامل بتلاتے ہیں کہ سماج میں وہ چاروں طبقات ہونا چاہیئں جن کا تصور مذہب نے دیا ہے اور (اس سماج) کو لٹیرے اور ملیچھوں سے آزاد ہونا

چاہیئے۔ بعد کے لفظ (ملیچھ) سے مراد وہ سب ہیں جو ہندو مذہب، اور تمدن کے مقرر کردہ سماجی قوانین کو نہیں مانتے۔" (صفحہ ۱۰۱)

اقلیتوں کے مسئلہ کا ایک خاص حل بھی گوالکر نے اپنی اس اہم کتاب میں پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"بیرونی عناصر (یعنی مسلمانوں، عیسائیوں اور دوسری اقلیتوں) کے لئے دو راہیں کھلی ہوئی ہیں۔ یا تو وہ قومی نسل میں ضم ہو جائیں اور اس کے کلچر کو اختیار کر لیں یا پھر قومی نسل کے رحم و کرم پر اس وقت تک رہیں جب تک کہ وہ ان کو اجازت دے اور قومی نسل کی جب مرضی ہو ملک چھوڑ کر چلے جائیں۔ یہ اقلیتوں کے بارے میں ہوش مندانہ نقطۂ نظر ہے یہی واحد منطقی اور صحیح حل ہے چالاک قدیم قوموں کے تجربات سے ثابت شدہ اس نقطۂ نظر کے مطابق ہندوستان میں بیرونی نسلوں کو یا تو ہندو [illegible] اختیار کرنا اپنا [illegible] ہندو مذہب کا احترام کرنا اور اس سے عقیدت رکھنا سیکھنا چاہیئے، ہندو نسل اور کلچر یعنی ہندو قوم کی شان و شوکت کے سوا کوئی اور خیال ذہن نشین نہیں ہونا چاہیئے اور ہندو نسل میں ضم ہونے کے لئے اپنا علیحدہ وجود کھو دینا چاہیئے یا ملک میں ہندو قوم کے مکمل تابعدار بن کر رہیں۔ کوئی مطالبہ نہ کریں، ترجیحی سلوک تو دور کی بات ہے کسی مراعات حتیٰ کہ شہریت کے حقوق کا استحقاق بھی نہ رکھیں۔" (صفحات ۴۷، ۴۸)

ہندوتوا۔ ملک کے لئے خطرہ

ہندوتوا کا تصور خالص فسطائی نسل پرستانہ تصور ہے جس میں ملک کی شہریت کا حق صرف اور صرف ہندو سماج کی چار ذاتوں کو دیا گیا ہے اور ان سب کے لئے جو ہندو نہیں ہیں دو راستے تجویز کیئے گئے ہیں کہ یا تو وہ اپنے عقیدہ، مذہب، تہذیب و تمدن کو چھوڑ کر ہندو مذہب، تہذیب و

تمدن اختیار کرلیں یا ملک میں شہریت کے حقوق سے محروم ہندو سماج کے تابعدار اور غلام بن کر رہیں
ساتھ ہی چونکہ ہندوتوا میں حقوق اور مرتبہ کا تعین ہندو سماج قوانین کے تحت ہوگا اس لیئے ہندو سماج
کی اکثریت کو جن کا تعلق شودر، دلت اور دلت ذاتوں سے ہے انتہائی کم تر حقوق کے ساتھ اعلیٰ ذاتوں
کا تابعدار بننا ہوگا۔ اس نیتے ہندوتوا کو اس کے ناقدین نے برہمنی مزاج کا نام دیا ہے
ہندوتوا کے بارے میں ان ناقابلِ تردید حقائق کے بعد کیا سیکولرازم کے ان دعووں کو جو آر
ایس ایس بی جے پی کے لیڈرس اور رام جیٹھ ملانی جیسے ان کے ہم نواؤں کی جانب سے کئے جارہے ہیں تسلیم کیا جاسکتا
ہے جو سابق تجربات کی ناکامی کی وجہ سے سیکولرازم سے مایوس ہوکر ہندوتوا کے سایہ میں عافیت تلاش کررہے
ہیں ان کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی پیٹ کے درد سے تنگ آکر خودکشی کا ارادہ کرلے۔ ہندوتوا کے زیر
سایہ میں سیکولرازم کا پودا مرجھا کر ختم ہوجائے گا اور جمہوریت مرجائے گی جہاں دیگر مذاہب اور
عقائد کو جاننے والوں کو شہریت سے خارج کردیا جائے کیا اس ملک اور ریاست کو سیکولر کہا جاسکتا
ہے اور کیا سیکولر ریاست کی وہ تعبیر جو ہمارے دستور سازوں نے اختیار کی تھی عملی صورت اختیار
کرسکتی ہے؟ بالکل نہیں۔ ایسی ریاست میں حقوق و فرائض کا تعین ہندو سماجی قوانین کے تحت ہوگا
ہندو سماجی قوانین کا اہم اور بڑا ماخذ منوسمرتی ہے۔ کیا منوسمرتی کی بنیاد پر بنے دستور میں ہندو شہریوں
کے درمیان بھی مساوی حقوق کی مساوات ہوگی۔ نہیں۔ اس طرح ہندوتوا سے ملک کی جمہوریت بھی ختم
ہوجائے گی۔ اگر ہندوتوا قوتیں اپنے منصوبے کو روبہ عمل لانے میں کامیاب ہوجائیں تو مذہبی اقلیتیں
اس ناقابلِ برداشت صورتحال میں جو کرسکتی ہیں کریں گی لیکن خود ہندو سماج میں وہ پسماندہ اور دلت
طبقات جنہیں جمہوریت کے فوائد کا تجربہ ہوچکا ہے اور جو اقتدار کی شوکت کا مزہ چکھ چکے ہیں اور
چکھ رہے ہیں قطعاً برداشت نہیں کریں گے اور اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔ یہ بھی یاد رہے
کہ پارلیمنٹ میں اعتماد کی قرارداد پر بحث کے دوران ٹامل منیلا کانگریس کے ارکان اور خاص طور پر
پی چدمبرم نے جو اب وزیر مالیات ہیں اور ڈی ایم کے کے ارکان نے بی جے پی کے نظریات پر تنقید کرتے ہوئے

کہا کہ وہ کسی ایک کلچر کو مسلط کرنے کی کوشش کو برداشت نہیں کریں گے۔ ملک مختلف تمدنوں کا گہوارہ ہے۔ یہ بھی ذہن میں رہے کہ شمال مشرقی ہندوستان کے ناگا اور میزو عوام نے جن کی اکثریت عیسائی ہے اس وقت، ہتھیار ڈالنے اور ہندوستانی شہریت کو قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کی جبکہ ان کو نہ صرف ان کے رواجی قانون کی برقراری کی طمانیت دی گئی۔ بلکہ اس کے مطابق اپنے قبائلی طریقوں پر مقدمات کے تصفیوں اور فیصلوں کی اجازت دی گئی۔ کیا یہ ان حقوق سے دستبردار ہوں گے یا پھر اپنی پرانی روش کو اختیار کریں گے؟ اس سوال کا جواب مشکل نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ اگر متعدد توا کامیاب ہو جائے تو سارے ملک میں بحران پیدا ہوگا۔ مشرق و مغرب اور جنوب کے غیر ہندی علاقوں میں شورش برپا ہوگی، سارے ملک کے ہندو پسماندہ اور دلت طبقوں میں بھی بے چینی پیدا ہوگی اور ان سب کا نتیجہ ملک کی کمزوری، انتشار اور بکھراؤ کے سوا کچھ اور نہ ہوگا۔

سیکولر کردار کو مضبوط کیجئے:۔

یہ بات واضح ہونا چاہیئے کہ ملک کا جمہوری اور سیکولر کردار صرف اقلیتوں یا مسلمانوں کے مفاد میں ہی نہیں بلکہ ملک کی ترقی اور خوشحالی کے لئے ضروری ہے کیوں کہ بحران اور انتشار کی کیفیت میں کوئی ملک نہ ترقی کر سکتا ہے اور نہ خوشحالی لا سکتا ہے۔ اتنا ہی نہیں ملک کی ایک سیاسی وحدت کی حیثیت میں بقاء اور اس کو بکھراؤ سے بچانے کے لئے جمہوری و سیکولر کردار اور تمدنی رنگارنگی کی برقراری اور ان کو فروغ دینا ضروری ہے۔ یہی حب الوطنی اور وطن دوستی کا تقاضہ ہے●●

شاداب میں اشاعت کے لئے تخلیقات کا غیر مطبوعہ ہونا ضروری ہے۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی لفافہ آنا ضروری ہے۔

مسلم اقلیت کے مسائل اور سیکولر پارٹیاں

ہندوستانی دستور نے یہاں اقلیتوں کو جو حقوق اور مراعات
نا ہیں اور عدلیہ نے مختلف مواقع پر جو رہنما اصول بنائے ہیں وہ ہندوستان میں اقلیتوں کو ایک
وقار زندگی گزارنے کے لئے بڑی حد تک معاون ہوسکتے ہیں لیکن انتظامیہ اور سیاسی پارٹیوں کی
انب سے ان کی جس طرح خلاف ورزی کی جاتی رہی ہے وہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔ بالخصوص یہاں کی
سلم اقلیت کو سب سے زیادہ محرومیوں اور مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ یہاں تک کہ دھیرے
ھیرے اس کو بالکل ایک کنارے کر دیا گیا ہے ایسا صرف فرقہ پرست کہی جانے والی پارٹیوں
جانب سے نہیں ہوا بلکہ ان پارٹیوں کی جانب سے بھی ہوتا رہا ہے جو نام نہاد سیکولرزم کا لبادہ اوڑھے
ہتے ہیں کانگریس، جنتا دل، سماج وادی پارٹی، بہوجن سماج پارٹی، تلگو دیشم پارٹی،
ی ایم کے، اے آئی ڈی ایم کے، آسام گن پریشد، سماج وادی جنتا پارٹی، جنتا پارٹی، تمل منیلا
انگریس اور بائیں بازو کی پارٹیاں بھی اس میں برابر کی شریک ہیں ان کے بارے میں کہا جاتا
ہے کہ یہ اقلیت دوست ہیں لیکن گزشتہ صرف ایک دہائی کے واقعات اس کے شاہد ہیں کہ ملک
ی سب سے بڑی اقلیت سے متعلق کئی اہم مسائل سرد خانے کی نظر کر دیئے گئے ہو سکتا ہے کہ ایسا کرنے
کے اسباب ان پارٹیوں کے درمیان مختلف رہے ہوں لیکن ایسا ہوا ضرور یہاں چند ایک کا اعادہ
یا جا رہا ہے۔

ہاشم پورہ اور ملیانہ ۱۹۸۷ء میں اتر پردیش کے شہر میرٹھ میں جو بدترین فرقہ وارانہ فسادات

ہوئے اس میں 22 مئی کو پلاٹون کمانڈر ایس پی سنگھ اور پی اے سی کے جوان ہاشم پورہ سے کم از کم 25 مسلم نوجوانوں کو غیر سرکاری تعداد 47 ہے گرفتار کرکے الگ لے گئے اور انہیں قتل کرکے گنگ نہر میں پھینک دیا۔ ایمینسٹی انٹرنیشنل اور پی یو ڈی آر نے ان نوجوانوں کو غائب کرنے کا ذمہ دار پی اے سی کو ٹھہرایا۔ صوبائی حکومت کی جانب سے مقرر کی گئی مختلف تفتیشی کارروائیوں (گیان پرکاش کمیٹی رپورٹ اور صوبائی سی آئی ڈی رپورٹ) بشمول انٹلی جنس رپورٹوں میں 66 افراد کے اس واقعہ میں ملوث ہونے کی نشاندہی کی گئی ہے (جب کہ اتر پردیش حکومت نے صرف ۱۹ ناموں کا اب تک انکشاف کیا ہے) یہ رپورٹیں کہاں ہیں؟ کب یہ دن کی روشنی دیکھ سکیں گی؟ مجرمین پر کب مقدمہ چلایا جائے گا اور کب انہیں قرارواقعی سزا ملے گی؟ بعد کی حکومتیں کانگریس، سماج وادی پارٹی اور بہوجن سماج پارٹی (بشمول بی جے پی جو اپنے فرقہ پرست ذہن کے لئے جانی جاتی ہیں) ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے اس کے لئے جواب دہ ہیں۔ مزید یہ کہ مہلوکین کے اعزہ واقربا کو بطور معاوضہ صرف پچاس ہزار روپے فی کس ادا کئے گئے جب کہ 1984ء کے سکھ مخالف فسادات میں ہلاک ہونے والوں کے رشتہ داروں کو دس لاکھ روپئے فی کس معاوضہ ادا کیا گیا۔ یہ شرمناک امتیاز آخر کیوں ہے؟

ناری نکیتن کی شادیاں گزشتہ مہینہ ہی 2 ارمئی 1997ء) میرٹھ کی ضلع انتظامیہ نے وہاں کے دو ناری نکیتنوں کی 2 مسلم لڑکیوں کی شادی وہاں کے قاضی کو بتائے بغیر (جیسا کہ روایت رہی ہے) ہندو لڑکوں سے ہندو رسوم کے مطابق کردی۔ کیا وہ لوگ جو اس انتہائی اشتعال انگیز حرکت کے مرتکب ہوئے تھے۔ انہیں برخاست کیا گیا یا انہیں معطل ہی کیا گیا؟ بصورت دیگر کیا کسی صوبائی حکومت کی سرپرستی میں اگر کچھ ہندو لڑکیوں کی شادیاں مسلم لڑکوں سے کردی جائے تو کیا اس کے ذمہ دار افراد یوں ہی چھوڑ دیئے جائیں گے؟ آر ایس ایس وشو ہندو پریشد، بجرنگ دل بھارتیہ جنتا پارٹی، شیوسینا، ہندو مہاسبھا، آریہ سماج اور انہیں جیسی دوسری تنظیمیں آسمان سر پر اٹھالیں گی۔

اس معاملے میں مسلم دوست، سیکولر پارٹیوں کا ردعمل کیا رہا؟ ایک معنی خیز خاموشی کیوں؟ ظاہر ہے کہ یہ معاملہ دلتوں، قبائلیوں، سکھوں، عیسائیوں یا بودھیوں سے متعلق نہیں تھا۔

بھاگلپور کے فسادات اکتوبر نومبر 989ء کے بھاگلپور فسادات میں کم از کم ایک ہزار جانیں گئیں ان میں صرف مسلمان 982 تھے زخمیوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی۔ یہ فسادات تقریباً 250 گاؤں تک پھیل گئے 42 مسجدیں شہید کردی گئیں۔ دس مقبروں کو زمین بوس کر دیا گیا۔ نو مدرسوں کو نذر آتش کر دیا گیا، چھ امام باڑوں میں توڑ پھوڑ کی گئی۔ بھاگلپور فسادات انکوائری کمیشن کی رپورٹ جولائی 995ء میں بہار اسمبلی کی ٹیبل پر رکھی گئی۔ پینل چیرمین جسٹس رام نندن پرساد نے اپنا اختلافی نوٹ لگایا جب کہ اکثریت، جسٹس سنہا اور شمس الحسن نے کلی طور پر اس کا ذمہ دار سینیئر پولیس افسر کو قرار دیا۔ انہوں نے وشوا ہندو پریشد اور بھارتیہ جنتا پارٹی کے کارکنوں پر نکتہ چینی کرتے ہوئے اس وقت کے انسپکٹر جنرل پولیس جی پی دسورے اور بھاگلپور کے ایس پی کے نام بھی لیے تھے ہندوستانی مسلمان تحیر اور ناامیدی کے ساتھ رپورٹ کے نتیجہ کا انتظار کر رہے ہیں اور اس کو لالو پرشاد یادو کی حکومت انسانیت کے تئیں اس گھناؤنے جرم کے ذمہ داروں کو کس طرح کی سزا دیتی ہے تعجب ہوتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو انسانی حقوق بھی نہیں دیئے جاسکتے۔

بابری تہذیب، غارت گری اور مسلمانوں کو کچلنے کا آزاد ہندوستان میں سب سے شرمناک واقعہ 6 دسمبر 992ء کو اجودھیا میں بابری مسجد کی منصوبہ بند شہادت ہے اور پورے ہندوستان میں مسلمان کا قتل عام ہے (مہاراشٹرا 275، گجرات 261، اترپردیش 208، آسام ت 11، آندھراپردیش 22 کیرالا 16 کرناٹک 75 تمام میں کانگریس کی حکومت تھی۔ مدھیہ پردیش 125، راجستھان 57، بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومت، اڑیسہ 2، بہار 51، جنتا دل حکومت اور مغربی بنگال میں 37 بایاں بازو محاذ کی حکومت) ان معصوم مسلمانوں کا قصور یہ تھا کہ بابری مسجد کی ہندو جنونیوں کے ہاتھوں افسوسناک شہادت کے خلاف انہوں نے احتجاج کیا تھا۔ 13 دسمبر تک سرکاری طور پر ہلاک ہونے والوں کی تعداد 1200 اور زخمیوں کا

4 ہزار تھی جنوری 1993ء میں ممبئی کے فسادات کی کہانی الگ ہے انتہا پسند ہے۔ ان عام سوئیڈ میں مجرمین پر مقدمہ چلانے ادسا ئنوں سرزد ہونے کے سلسلہ میں کیا کارروائی کی ہے؟ الہ آباد ہائی کورٹ کی لکھنؤ بینچ جھگڑے کو آخر کب تک حل کرے گی؟ کس طرح کے مجرمانہ مقدمات بھارتیہ جنتا پارٹی، وشو ہندو پریشد، بجرنگ دل اور شیوسینا کے لیڈران کے خلاف قائم کئے گئے؟ انکوائری کمیشن اپنا رپورٹ کب مکمل کرے گا؟ ... کے سرزد ہوئے پر بڑے مقدمات کا کیا حال ہے؟ کوئی بھی سیکولر پارٹی ان متعلقہ سوالات کے جواب دینے کوئی دلچسپی نہیں رکھتی۔

حیدرآباد میں پولیس فائرنگ ۶ دسمبر ۱۹۹۶ء کو بابری مسجد کی شہادت

چار برس مکمل ہونے پر مدینہ بلڈنگ کے قریب مظاہرہ کرنے والے مسلمانوں پر حیدرآباد پولیس اچانک فائرنگ شروع کردی جس میں ایک مسلمان تاجر نبر سر موقع ہلاک ہو گیا مختلف پارٹیوں اور تنظیموں کے مسلسل مطالبے پر کہ حادثہ کی تفتیش ہائی کورٹ کے ایک جج سے کرائی جائے حکمراں تلگودیشم پارٹی نے تفتیش کا حکم صادر کیا۔ نتیجہ کیا رہا؟ کیا اعلاہا کا ... پر مقدمہ قائم کیا گیا؟ جواب اب بھی باقی ہے؟ اس سے پہلے یکم جنوری ۱۹۹۶ء کو حیدرآباد پولیس مسلم نوجوانوں کی ایک تعداد کو ٹاڈا کے تحت گرفتار کر لیا تھا جب کہ انھوں نے عابد سیئر میں نماز خاطر آمدورفت روک دی تھی۔ ان افسوسناک واقعات میں شوٹ پولیس والے ... سیر ہوئے ہیں۔ خیال رہے کہ ان دونوں واقعات کے وقت بھارتیہ جنتا پارٹی اقتدار میں نہیں تھی

شہید نگر عیدگاہ کا تنازعہ

... ۶ ... ضلع عادل آباد (آندھرا پردیش) دونوں نوجوانوں کو دن کی روشنی میں گولی مار کر بے دردی سے ہلاک کر دیا اور چھ دہم بری طرح زخمی ہوئے۔ یہ ایک احتجاجی بھیڑ پر پولیس کی ایک طرفہ کارروائی تھی مقامی لوگ عیدگاہ کی زمین پر پولیس کی نگرانی میں مقامی انتظامیہ کے ذریعے ہو ... والی ایک ناجائز

کے خلاف ... ... نادے رہے تھے پولیس غضبناک ہو اٹھی، مکانات میں توڑ پھوڑ کی، جائیداد کو لوٹا ... تول کو ہراساں کیا۔ ایک عبادت گاہ کی بے حرمتی کی اور ایک مقامی مدرسے کے ایک باورچی کو پہلی منزل سے اٹھا کر نیچے پھینک دیا ... مار پٹائی کرتے ہوئے 49 مقامی مسلمانوں پر جھوٹے مقدمات لگا کر انھیں جیل ... مجرمین کی نشاندہی کی جا چکی ہے پھر بھی مایاوتی کی صوبائی حکومت نے واقعہ سے آنکھیں ... عدالتی یا سی بی آئی کسی طرح کی کوئی انکوائری نہیں ہوئی۔ ملزمین پر کوئی مقدمہ نہیں قائم ہوا اور یہ سب کچھ دلتوں کی ایک نام نہاد سیکولر پارٹی کے ذریعہ ہو رہا ہے۔

کوکراجھار میں ہلاکتیں 19 سے 25 جولائی 1994ء کے درمیان آسام کے تین ضلعوں کوکراجھار، بونگائی گاؤں اور بارپیٹا میں بوڈو انتہا پسندوں نے ہلاکتوں کا ننگا رقص برپا کر دیا۔ ایک سو زیادہ غیر مسلح معصوم مسلمان مرد، عورتیں اور بچے ہلاک کر دیئے گئے اور تقریباً ایک لاکھ افراد بے گھر کر دیئے گئے (سرکاری اعداد و شمار 54 ہزار سے زیادہ ہیں) المیہ کا ... ترین پہلو یہ تھا کہ بارپیٹا جہاں اس وقت کے وزیر اعظم آنجہانی ہتیشور سیکیا ... رہے ہوئے تھے وہاں سے صرف 15 کلومیٹر کی دوری پر بانس باری کے ایک عارضی امدادی کیمپ میں 70 سے زیادہ پناہ گزیں مسلمانوں کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ کیمپ سے ملحق پولیس والوں کے خلاف کارروائی کرتے ہوئے بوڈو انتہا پسندوں نے بغیر کسی امتیاز کے دہشت زدہ پناہ گزینوں پر رات کی تاریکی میں بندوقوں کے دہانے کھول دیئے۔ اس وقت سے تقریباً 3 سال کا عرصہ گذر چکا ہے نہ تو غلط کار پولیس والوں پر مقدمہ قائم کیا گیا اور نہ ہی قاتل گرفتار کئے جا سکے اس قتل عام نے صابرہ اور شتیلا کے فلسطینی پناہ گزیں کیمپوں پر اسرائیلی فوجیوں کی بربریت کی یاد تازہ کر دی۔ کیا جلد یا بدیر وہ وقت آئے گا جب آسام کی موجودہ ... حکومت اس قتل عام کے ستم رسیدوں کو انصاف مہیا کر سکے گی؟

جامعہ ملیہ اسلامیہ کا معاملہ اس سلسلہ کا سب سے تازہ معاملہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا ہے جہاں طلباء

اساتذہ اور ملازمین مشترکہ طور پر جامعہ کے تاریخی اقلیتی کردار کی بحالی کے لئے تحریک چلا رہے ہیں کہ تحریک آزادی کا ایک نشان ہے اس کا آغاز مشہور مجاہدین آزادی مولانا محمد علی جوہر، مولانا محمود الحسن حکیم اجمل خان، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، اے ایم خواجہ اور دوسروں نے کیا تھا جامعہ ملیہ اسلامیہ 1988ء سے 1939ء میں قائم جامعہ ملیہ اسلامیہ سوسائٹی کے تحت نیم یونیورسٹی کی حیثیت سے کام کرتی رہی۔ یہ سوسائٹی ۱۹۶۰ء کے انڈین سوسائٹیز ایکٹ کے تحت منظور شدہ تھی سوسائٹی کا پہلا اور سب سے اہم مقصد جیسا کہ ایسوسی ایشن کی یادداشت میں درج ہے یہ تھا کہ ہندوستان بالخصوص مسلمانوں کو مذہبی اور سیکولر تعلیم فراہم کی جائے۔ جامعہ سوسائٹی کا ایک بنیادی اصول یہ تھا کہ سوسائٹی کے تحت چلنے والے اداروں میں ہر سطح کی تعلیم کے لئے ذریعہ تعلیم اردو زبان ہوگی۔ اسے بھی 1988ء کے ایکٹ سے مکمل طور پر نکال دیا گیا۔ جامعہ کو نیم یونیورسٹی سے ایک مرکزی یونیورسٹی کا درجہ دیتے وقت اس کے نام کے علاوہ بنیادی اسپرٹ اور اصول سب کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ جامعہ کے احتجاجی طلباء اور اسٹاف کا سادہ لفظوں میں مطالبہ یہ تھا کہ مسلم اقلیت کو اس کے اپنی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور ان کو چلانے کے دستورِ ہند کی دفعہ 30(1) کے تحت دیئے گئے بنیادی حق کا تحفظ کیا جائے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ 13 سیاسی پارٹیوں کے حکمراں اتحاد یا باہر سے حمایت کرنے والی پارٹیوں میں کسی نے بھی اس معاملہ کو سنجیدگی سے نہیں لیا اور نہ ہی 1988ء کے اس غلط فیصلے کو کالعدم کرنے کی بات کہی۔ اگر جامعہ کے طلباء کا ایک قیمتی سال ضائع ہوتا ہے تو کیا ہوگا؟ اس طرف سے پہلے ہی توجہ دی جانی چاہئے کہ ایک پُرامن احتجاج کوئی غلط رخ، ناپسند رخ اختیار کرلے۔

اقلیتوں کو تعلیم کا حق

ہندوستانی اقلیتوں کو دستور کی دفعہ 30(1) کے تحت تعلیمی ادارے قائم کرنے اور انہیں چلانے کا جو حق حاصل ہے۔ اس سے متعلق ایک اہم معاملہ کو سپریم کورٹ نے ابھی ابھی دفن کردیا ہے۔ سابق چیف جسٹس اے ایم احمدی نے ۱۱ ممبروں پر مشتمل بنچ اپنے ریٹائرمنٹ سے پہلے اس معاملے کی سماعت کے لئے قائم کی تھی اس [illegible] کے ایک رکن جسٹس راما سوامی

جولائی کے مہینے میں ریٹائر ہونے والے ہیں بجائے اس کے کہ اس بنچ کو مقدمہ کی جلد از جلد سماعت اور بوقت ضرورت فاضل اوقات میں سماعت کرنے کا حکم دیا جاتا تاکہ کارروائی فاضل جج کے ریٹائر ہونے سے پہلے مکمل ہو جائے اور فیصلہ آسکے لیکن موجودہ چیف جسٹس نے اس بنچ ہی کو تحلیل کر دیا اور معاملہ ایک بار پھر اپنی ابتدائی جگہ پہنچ گیا۔ اس طرح اقلیتی تعلیمی اداروں کو ایک بڑا مالی بوجھ آئندہ اور سال کے لئے مزید برداشت کرنا پڑے گا۔ یہ ہے حکمراں اور ان کی حمایتی سیکولر سیاسی پارٹیوں کا دُور رُخا پن۔

یہ ان تکلیف دہ مسائل میں سے چند مسئلے ہیں جن سے گزشتہ ایک دہائی میں ہندوستانی مسلم اقلیت دوچار ہوئی ہے۔ ایک لمحہ کے لئے ماضی کے نیلی کے قتل عام اردو زبان کو وقف جائیداد پر غاصبانہ قبضہ، ٹاڈا کے تحت گرفتاریوں کو باقی رکھنا، تعلیم ملازمت اور اقتدار میں شرکت ہر سطح پر مساوی مواقع جیسے مسائل کو بھلا دیجئے پھر بھی بلین ڈالر کا سوال یہ ہے کہ کیا نام نہاد سیکولر پارٹیاں اس مقصد کے لئے اٹھیں گی اور مناسب کارروائی کا آغاز کریں گی۔ مصیبت کی ماری مسلم اقلیت کو انصاف دلائیں؟ (انگریزی سے ترجمہ بشکریہ دعوت دہلی)

(بقیہ سلسلہ "غریب ذہین طلباء کا مستقبل")

اس میں بہت اچھے ہوں گے۔

آخر میں مولانا سید سلمان ندوی کی بات دہرانے کو جی چاہتا ہے کہ ایک غریب طالب علم کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کر دو تو پھر اس کی دوسری تیسری نسل میں کوئی غریب باقی نہیں رہے گا بھارتی تامل زبان کا اقبال کی طرح قومی شاعر ہے وہ کہتا ہے کہ ہزاروں کی تعمیر، تالاب، سرائے بنانا ضرور ثواب کے کام ہیں لیکن ان سب سے بڑا کام ایک غریب بچہ کو تعلیم سے سنوارنا

تنظیمیں

شاہد کلیم

وہ ایک لمحہ

سفید دھرتی کا خواب
میری اداس آنکھوں میں ناچتا ہے
سفید دھرتی ہے کہ جس کا
کوئی نشاں نہیں ہے
وہ ایک لمحہ
کہ جب نظر میں
سفید دھرتی کا عکس
کہ جس کی زنبیل میں پڑی ہیں
حیاتِ فانی کی ساری خوشیاں
مجھے میسر کہاں ہے اب تک
میں ایک مانجھی
وشال ساگر میں
اپنی کشتی کو کھے جا رہا ہوں
اننت سمتوں میں
جانے کھیتا رہوں گا کب تک ؟

حادثہ

تشنگی کا ذائقہ
کیوں نیا پاتا نہیں ؟
زخمِ دل کا مرثیہ
کیوں لکھا جاتا نہیں ؟
گوش بر آواز ہوں
کیوں کوئی فریاد یا نغمہ میں سن پاتا نہیں ؟
خوشبوؤں کی لہر سے
کیوں مرے احساس پر
میٹھا نشہ چھاتا نہیں ؟
اتنے سارے جاں فزا رنگین نظارے
کیوں مجھے کچھ بھی نظر آتا نہیں ؟
حادثہ ایسا بھی
پیش آتا ہے کیا ؟
زندگی رہتے ہوئے
آدمی پتھر میں
ڈھل جاتا ہے کیا ؟

سلیم شہزاد

نظم

ہوا

ہوا بھی شہرزاد ہے
ہزاروں روپ میں سنا رہی ہے جو کہانیاں
اور اس کے ایک روپ سے
ہزار رنگ ہیں عیاں
میں جس طلسم زاد سے گزر رہا ہوں
شہرزاد بھی مرے جلو میں ہے
کبھی سموم ہے، کبھی صبا ہے وہ
کبھی پری ہے اور کبھی بلا ہے
اسے نہ باندھ پایا کوئی شہریار
صرف اپنی داستان سے
میں جس مقام بے مقام سے گزر رہا ہوں
اس کے جذب و کیف کی کہانیاں بھی
خود مجھے سنا رہی ہے شہرزاد
اس کے ایک روپ میں
ہزار ان کہی کہانیاں چھپی ہوئی
جن کے شہر و بحر و کوہ و دشت پہ
کبھی صدا ہے اور کبھی صدائے باز

ہوا کے رنگ ہیں عیاں

ہوا جو شہرزاد ہے
ہوا کا سلسلہ ہے شمع قصر شہریار سے
[illegible]

جواد رضوی

مسٹر اڈوانی کی سورن جینتی رتھ یاترا



بی جے پی کے صدر مسٹر اڈوانی کچھ دنوں سے بھارت کے مختلف ریاستوں کی یاترا پر ہیں جس کو انہوں نے "سورن جینتی یاترا" کا نام دیا۔ یہ جو ہندوستان کی آزادی کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر بقول ان کے اس مقصد سے نکالی جا رہی ہے کہ سارے ملک میں قوم پرستی کے جذبے کو بڑھاوا دیا جائے اور ان کے نعرے ہیں۔ " بھوک، خوف اور کرپشن " سے عوام کو آزادی دلائی جائے۔

یہاں قارئین کو یہ یاد دلا دوں کہ اب سے ٹھیک ۷ برس پہلے اڈوانی جی نے ایک اور مشہور یاترا نکالی تھی اور جن جن ریاستوں سے یہ یاترا گزر رہی تھی وہاں کچھ ہی دنوں بعد فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے تھے اور نتیجتاً ملک میں ایسے افسوسناک حالات پیدا کر دیئے گئے تھے کہ وشوناتھ پرتاب سنگھ کی حکومت کو گدی چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔

لیکن موجودہ یاترا کی نوعیت مختلف نظر آتی ہے اس مرتبہ مذہب اور فرقہ وارانہ سوالات موجودہ تبدیل شدہ حالات کے پیش نظر اور مصلحتاً پس پشت ڈال دیئے گئے ہیں اور قوم پرستی اور ہندوستانی عوام کی جنگ آزادی کی باتیں زور و شور سے کی جا رہی ہیں اور یہ ظاہر کیا جا رہا ہے کہ بی جے پی جنگ آزادی کی شاندار روایات کو آگے بڑھانے والی ایک اہم پارٹی ہے حال ہی میں اڈوانی نے آندھرا پردیش کے دورہ کے دوران کریم نگر میں بہت ہی قوم پرستانہ قسم کا انٹرویو دیا ہے۔

یہ تمام باتیں سن کر فارسی کا ایک پرانا مقولہ بے اختیار زبان پہ آ رہا ہے۔ "دروغ گو را حافظہ نباشد"

دے دے کہ "یکف چراغ دارد" اور دوسری عالمی جنگ کے دوران نازیوں کے پروپگنڈے کے منتر کا یہ کہنا تھا "جھوٹ کو اتنے بار دھراؤ کہ لوگ سچ سمجھنے لگیں" کیونکہ قوم پرستی اور آزادی کی تحریک بی جے پی اور جس کے بطن سے اس پارٹی نے جنم لیا یعنی آر ایس ایس اور ہندو مہا سبھا کا کوئی تعلق رہا ہے بلکہ وہ جنگ آزادی کے مخالف تھے اور آزادی کی تحریک کو کچلنے انگریز سامراجیوں کا دیا تھا۔ یہ لکھتے ہوئے میں مبالغہ سے یا غلط بیانی سے کام نہیں لے رہا ہوں بلکہ اس تعلق سے چند آپ کے گوش گذار کرنا چاہتا ہوں۔

بی جے پی کی جد اعلیٰ ہندو مہا سبھا تھی جس کی بنیاد مشترکہ طور پر ساورکر اور شیاما پرشاد نے ۱۹۱۹ء میں رکھی تھی اس کے تین سال بعد ۱۹۲۲ء میں ساورکر نے "ہندو تا" کے نام سے ایک لکھی اور ۱۹۲۳ء میں ایک اور کتاب شائع کی گئی جس کا نام تھا "ہندو کون ؟" اس طرح فضا تیار کرتے اور سیاسی ماحول پیدا کرنے کے بعد ۱۹۲۵ء میں ہندو مہاسبھا کو ایک آل انڈیا سماج کی حیثیت سے منظر عام پر لایا گیا۔ اس کے کوئی پندرہ، سولہ سال بعد ۱۹۴۲ء میں جب گاندھی جی "ہندوستان چھوڑ دو" کا نعرہ لگایا اور انگریز سامراجیوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا تھا شری شیاما پرشاد مکرجی جو جن سنگھ کے بانی اور بی جے پی کے سرپرست تھے۔ بنگال میں فضل الحق لیگ کی حکومت میں بحیثیت وزیر خزانہ شامل تھا انہوں نے ۲۶ جولائی ۱۹۴۲ء کو (یعنی چھوڑ دو تحریک شروع ہونے کے صرف ۱۵ روز پہلے) بنگال کے انگریز گورنر کے نام اپنے لکھا تھا کہ "میں آپ کی توجہ ان حالات کی طرف مبذول کروانا چاہتا ہوں جب کانگریس اس صوبہ (بنگال) میں بڑے پیمانے پر جد وجہد شروع کی تو ظاہر ہے کہ کوئی شخص جنگ کے دوران عوام کے جذبات کو ابھارنے منصوبہ بنانے اور جس کی وجہ سے صوبہ (بنگال) میں امن وامان ہو اور بد امنی پیدا ہو جائے تو کوئی بھی حکومت اس کا مقابلہ کرنے گی جو اس

سوا قتدار ہے"۔ (مکرجی کی سوانح.... ایک ڈائری کے اوراق سے اقتباس صفحہ (۱۷۹) ملاحظہ فرمائیے)۔

اس اقتباس سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ ہندوستان چھوڑ دو تحریک کو کچلنے کے مقصد سے سامراجی حکومت نے ظلم و استبداد کی جو غیر جمہوری پالیسی اختیار کی ہے اس کو مکرجی بالکل حق بجانب سمجھتے تھے۔ کیا ایسی ہی قوم پرستی کا پرچار ڈوانی جی اپنی موجودہ رتھ یاترا میں کررہے ہیں؟

اسی زمانہ ۱۹۴۲ء میں تاریخ کے ایک اسکالر سمپت گوہا نے اپنے مضمون میں (جو انڈین ایکسپریس بابت ۱۷ اگست ۱۹۹۲ء کو شائع ہوا تھا) لکھا تھا کہ بنگال کے گورنر نے ۱۹ اگسٹ ۱۹۴۲ء (یعنی ہندوستان چھوڑ دو تحریک شروع ہونے کے کچھ ہی دنوں بعد) کو فضل الحق منسٹری (مسلم لیگ) کا اجلاس طلب کیا اور منسٹروں سے کہا کہ حکومت (سامراجی) کانگریس کی جدوجہد کو کچلنے کے لئے جو منصوبہ بنائی ہے وہ اس کی تائید کریں یا پھر منسٹری سے استعفیٰ دیدیں۔ کیکن کسی بھی منسٹر نے (بشمول شری مکرجی) استعفیٰ نہیں دیا اور گورنر نے اس جدوجہد (آزادی) کو کچلنے زبردست مہم شروع کردی۔

یہی وہ لوگ ہیں جو اب ہندوستان کی آزادی کے پچاسویں سالگرہ منانے میں سب سے آگے نظر آرہے ہیں۔ آخر کیوں؟

اسی نوعیت کا ایک اور دلچسپ واقعہ سن لیجئے۔ سندھ (اڈوانی جی کا وطن) میں مسلم لیگ کی ملی جلی حکومت تھی جس میں ہندو مہاسبھا کے نمائندے بھی شامل تھے اور جب سندھ اسمبلی نے پاکستان کے قیام کے مطالبہ کی تائید میں قرارداد منظور کی اس کے باوجود ہندو مہاسبھا کے منسٹروں نے حکومت (مسلم لیگ کی حکومت) سے استعفیٰ نہیں دیا) (دیکھئے انڈین نیشنل کانگریس کی تاریخ) از ڈاکٹر بی سیتارامیا صفحہ ۱۵۲)

جس دن (۹ اگست ۱۹۴۲ء) گاندھی جی اور ان کے ساتھیوں کو گرفتار کیا گیا تو ساورکر جی نے ہندوؤں سے اپیل کی کہ وہ کانگریس کے اس اقدام (یعنی ہندوستان چھوڑ دو تحریک) کی تائید نہ کریں۔

سنگھ پریوار کے مذکورہ بالا تاریخی واقعات سے واقف ہونے کے بعد بھلا کس کو یقین

آئے گا کہ اس پیریوڈ کے صدر نے یہ یاترا اس لئے شروع کی ہے کہ مجاہدین آزادی نے جو
کا ہندوستان بنانے کا خواب دیکھا تھا وہ (اٹل جی) اس کو حقیقت میں تبدیل کرنا چاہتے۔

بات دراصل یہ ہے کہ بی جے پی کے لیڈر یہ سمجھتے ہیں کہ متحدہ محاذ کی حکومت زیادہ
تک برسر اقتدار نہیں رہ سکتی اور عام انتخابات ہندوستان کی آزادی کے پچاسویں سالگرہ
بھی منعقد کیئے جا سکتے ہیں ▲

✡ سی نیواس پیاسا

بھارتیہ جنتا پارٹی کی تازہ ترین سورن جینتی رتھ یاترا نے ملک میں دائیں بازو کی
کو ایک نیا موڑ دے دیا ہے۔ ہندوستان کی آزادی کی جد وجہد میں دائیں بازو کا جو کردا
اس کو دیکھتے ہوئے دائیں بازو کی قوم پرستی کے دعوے نہایت مشکوک اور عجیب سے لگ
بھارتیہ جنتا پارٹی کے صدر لال کرشن اڈوانی جو کہ سورن جینتی رتھ یاترا کی قیادت کر رہے ہیں
خود ملک کے بٹوارے کے بعد ہندوستان منتقل ہوئے تھے اور ابتدا ہی سے وہ راشٹریہ سوا
سنگھ (RSS) اور ہندو مہا سبھا سے وابستہ رہے اور ہندوستان کی آزادی کی مخالفت کرتے ر
راشٹریہ سوائم سیوک سنگھ RSS نے آزادی کی جد وجہد میں آخری بار ۱۹۳۲ء اس وقت
لیا تھا جبکہ آر ایس ایس کے بانی سربراہ ڈاکٹر ہیگڈے وار نے ناگپور میں جھنڈا ستیہ گرہ
لیا تھا راشٹریہ سوائم سیوک سنگھ اور ہندو مہا سبھا دونوں نے ۱۹۴۰ء میں مہاتما گاندھی کی زیر
شروع کی گئی ستیہ گرہ کی اور ۱۹۴۲ء میں "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک کی الگ الگ مخالفت
گرو گوالکر نے "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک کے بارے میں یہ تبصرہ کیا تھا۔ "کچھ ہوا چلی
درختوں کو ہلا گئی اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوا" اٹل بہاری واجپائی پہلے پہلے تو جد وجہد آ
میں حصہ لینے پر مائل تھے۔ لیکن بعد میں اُلٹے قدم پیچھے ہٹ گئے۔ گوالیار میں ایک مجسٹریٹ
میں انہوں نے دیئے گئے بیان میں کہا تھا کہ "مجاہدین آزادی نے سرکاری املاک کو جو نقصان

ہے اس واقعہ سے ان کا کوئی سروکار نہیں ہے۔ اس لحاظ سے اس بات پر کوئی حیرت نہیں ہوتی کہ دونوں پارٹیاں اور دونوں پارٹیوں کے لیڈرس کبھی یہ بات نہیں بتلاتے کہ جدوجہد آزادی میں ان دونوں پارٹیوں اور ان کے لیڈروں نے ایک حصہ ادا کیا ہے۔ اب اگر لال کرشن اڈوانی اپنی میٹنگس میں شہید بھگت سنگھ اور چندر شیکھر آزاد کی تصاویر لگاتے ہیں اور ان مجاہدین آزادی کو اعزاز دینے کی باتیں کہتے ہیں تو اس پر کوئی یقین نہیں آتا۔

آر ایس ایس کے ایک طبقے نے جیسے کاشی ناتھ پوندار اور ڈی دی گوکھلے نے جب "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک میں شرکت کی خواہش کی تھی تب سزا کے طور پر ان سے کہا گیا کہ ... برطانوی فوج میں بھرتی ہو جائیں۔ گرو گوالکر نے رسومات کے سنٹرل پراونسس کے برطانوی گورنر کو ایک مکتوب ارسال کیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ ہندوستان چھوڑ دو تحریک سے ان کی تنظیم کا کوئی سروکار نہیں ہے دائیں بازو نے ملک بھر میں آج کی تاریخ تک مہاتما گاندھی کو بابائے قوم تسلیم نہیں کیا۔ اٹل بہاری واجپائی کو اس بات کا اعزاز ملا ہے کہ ملک کے وہ پہلے وزیر اعظم ہیں جنہوں نے کہ راج گھاٹ پہنچ کر مہاتما گاندھی کو خراج عقیدت پیش نہیں کیا۔ لال کرشن اڈوانی اب جب کبھی گاندھی جی کے اقوال کے حوالے سے بات کہتے ہیں تو عجیب لگتا ہے گاندھی جی نے "رام راجیہ" کی جو بات کہی تھی اس بات کا آر ایس ایس کے ہندو سوراشٹرا کے قیام کے نظریئے سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے گاندھی جی کو اپنے ہندو ہونے پر فخر تھا لیکن وہ تمام مذاہب کے دلدادہ تھے۔ وہ کمزوروں، اقلیتوں پر حکمرانی کا نازیوں جیسا کوئی منصوبہ نہیں رکھتے تھے۔ گاندھی جی کا ہندومت رواداری پر مبنی تھا جبکہ آر ایس ایس بی جے پی کا ہندومت عدم رواداری کی بنیاد پر ہے بھارتیہ جنتا پارٹی اب مسلمانوں کو حب الوطنی کا سبق پڑھانے نکلی ہے حالانکہ مسلمانوں نے ملک کی جدوجہد آزادی میں ایک نہایت اہم اور تاریخی کردار ادا کیا ہے مسلمانوں کی جدوجہد آزادی صدیوں پر محیط ہے۔ ہندوستان کی جدوجہد آزادی کی مخالفت کرنے والوں کے منہ سے حب الوطنی کے درس اچھے نہیں لگتے۔ انہوں نے مسلم لیگ کے ساتھ

صرف برطانوی مفادات کا تحفظ کیا تھا۔ غیر ملکی چینل کو ۱۳ رجون کو دیئے گئے ٹی وی ا
میں مسٹر لال کرشن اڈوانی کا یہ ادعا کہ ۱۹۹۰ء کے فسادات میں متاثر ہوئے افراد ہی اس
کا ثبوت ہیں کہ مسٹر اڈوانی کا ایسا ادعا کھلے جھوٹ پر اور مسخ کئے گئے حقائق پر مبنی ہے لوگو
یادداشت میں جہاں سے "رام رتھ" یاترا گذری تھی وہ ان ریاستوں میں جہاں سے رام ر
خون خرابے سے لہولہان کر گئیں تھی بی جے پی لیڈروں کا دعویٰ یہ ہے کہ اس خونریز رتھ یا
نتیجے میں ان کی پارٹی کا ارکان کی تعداد پارلیمنٹ میں دو سے بڑھ کر ۸۶ تک جا پہونچی
اتنی اکثریت پانے کے باوجود بھی اس کو مرکزی میں اقتدار نہ مل سکا۔ مسٹر اڈوانی نے یہ
کہا کہ رام رتھ یاترا نکالنے کے دو سال بعد ۱۹۹۲ء میں فسادات ہوئے تھے۔ لیکن انڑ
انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ ۱۹۹۲ء میں ملک بھر میں خونریز فسادات اس لیئے برپا ہوئے
ان کی پارٹی نے دھوکہ بازی کر کے ایک عبادت گاہ مسمار کردی تھی۔ اس عبادت گاہ کی مسما
بعد بی جے پی لیڈروں نے یہ کہا تھا" قوم کے لئے ایک شرمناک یادگار" کو ڈھادیا گیا۔ ان
بات سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ دیگر عقائد کے لئے ان کے دلوں میں کیسی نفرت بھری ہو
وہ ان افراد کے خلاف بھی زہر اگلتے رہتے تھے جو کہ چار سو سال سے ملک میں اس عبادت گ
تحفظ کرتے رہے تھے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ایسی پارٹی اور ایسی پارٹی کے لیڈر بنیاد پرستی کے
کوئی شعلہ بیانی کر سکتے ہیں۔ کیا ایسی پارٹی کو ملک میں اقتدار کی باگ ڈور سونپی جا سک
عام آدمی تو اس سوال پر حیران ہے ●○●

اردو لکھیئے اردو پڑھیئے اردو بولیئے

ماہنامہ

شاداب
حیدرآباد

جلد (۱۳)
شمارہ (۱۱) نومبر ۱۹۹۷ء
قیمت =/۱۵ روپے

زر تعاون

ہندوستان	سالانہ	۱۰۰ روپے	دو سال کے لئے ۱۸۰ روپے	تاحیات	۱۵۰۰ روپے
خلیجی ممالک	″	۳۰۰ ″	″ ۵۵۰ ″	″	۴۰۰۰ ″
امریکہ	″	۵۰ ڈالر	″ ۹۰ ″	″	۹۰۰ ڈالر
انگلستان	″	۳۰ پونڈ	″ ۵۰ ″	″	۵۰۰ پونڈ
پاکستان	″	۲۰۰ روپے	″ ۳۵۰ ″	″	۴۰۰۰ روپے

ترسیل زر کا پتہ : ماہنامہ شاداب ۱۴۷-۵-۱۱ ریڈ ہلز حیدرآباد ایڈیٹر پرنٹر پبلشر محمد قمر الدین صابری
نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپوا کر دفتر شاداب ۱۴۷-۵-۱۱ ریڈ ہلز حیدرآباد سے شائع کیا۔

فہرست

ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی قسط اول

سرسیّد کے مذہبی افکار و نظریات

۱۸۵۷ء کی جدوجہد آزادی کے بعد ہی سرسید احمد خاں کی شخصیت کی مکمل تصویر ہندوستان کے افق پر جلوہ گر ہوتی نظر آتی ہے۔ انھوں نے اصلاحی مشن اور تعلیمی تحریک کی عظیم اور مقدس مہم سر کر کے تمام ہندوستانیوں بالخصوص اسلامیان ہند کو اپنی شناخت اور عزت و وقار کا تعلیمی سبق سکھایا۔ سرسید اس لحاظ سے مظلوم رہے کہ ان کی شخصیت کے مطالعے میں انصاف اور غیر جانبداری سے کام نہیں لیا گیا۔ سرسید اصلاً نہ ہی ایک مفسر تھے نہ ہی ایک محدث، نہ ہی سیاست کے حاذق و ماہر اور نہ ہی تاریخ کے بڑے عالم۔ لیکن یہ المیہ رہا ہے کہ انھیں کبھی تو ایک سیاست داں کے معیار پر دیکھا گیا، کبھی ایک مفسّر کی کسوٹی پر پرکھا گیا، کبھی ایک مورخ کی حیثیت سے موضوع بحث بنایا گیا اور کبھی تفسیر کے ترازو پر تولتے ہوئے مفسّر قرآن کی حیثیت سے ان پر کلام کیا گیا۔ راقم کے نزدیک سرسید کی اصل حیثیت ایک مصلح کی ہے۔ اصلاح و تعمیر کے مرکز و محور پر قائم رہتے ہوئے انھوں نے مختلف موضوعات و مباحث پر لب کشائی کی اور اپنے قلم کا زور صرف کیا۔ اس طرح دوسرے تمام موضوعات پر سرسید کی کاوشیں اصلاح و تربیت جیسے کار عظیم کے مظاہر قرار دیئے جاسکتے ہیں جہاں بلاشبہ سرسید کے مخلص اور قریبی دوست مولانا حالی کے بقول خلوص اور نیک نیتی کے

باوجود بعض مقامات پر ان سے رکیک لغزشیں سرزد ہو گئی ہیں (۱) دوسری
بالخصوص مذہبی اور معاشرتی نقطۂ نظر سے منصفانہ مطالعے میں ان کے دو
اس کے مخصوص احوال و کوائف نیز اس کے تقاضوں کو پیش نظر رکھنا ہوگا
شخصیت اور اس کے مخصوص دور کو نظر انداز کر کے دیانت دارانہ مطالعہ محض
مزعومہ ثابت ہوتا ہے۔

سرسید کی زندگی کے مختلف گوشوں کو موضوع بحث بنا کر جدید ہندوستان
ان کی معنویت بے نقاب کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے اور سچ تو یہ ہے
معاشرت، تاریخ اور تعلیم و تربیت پر ان کی کوششیں جدید ہندوستان کی ت
میں گراں بہا سرمایہ ثابت ہوئیں اور بالخصوص مسلمانوں کے سیاسی، تہذیبی
معاشرتی وجود و تشخص کی ضامن بن گئیں۔ اس مقالے میں سرسید کے مذ
افکار و نظریات کو دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس احساس و شعور کے ساتھ
شعبہ ہائے زندگی کے برعکس سرسید کی زندگی کا یہ گوشہ جتنا اہم ہے اتنا ہی ن
اور سنگین ہے اس لیے کہ سرسید نے مذہب کی قلمرو میں عقل و منطق کی بحا
جو منصوبہ بند کوششیں کی ہیں وہ بعض اوقات جادۂ اعتدال سے منحرف نظ
یاں اور بعض مذہبی امور و معاملات کی توضیح و تعبیر میں حزم و احتیاط کے
کا دامن ان سے چھوٹ جاتا ہے (۲)۔

مذہبی امور و معاملات کی توضیح و تشریح کے میدان میں سرسید کی
کو ان کے اختیار کی پسند قرار دی جائے یا حالات و کوائف کے تحت مجبوری
تعبیر کیا جائے۔ یہ پہلو جتنا واضح ہوگا سرسید کے سلسلے میں غیر جانبدا

متوازن رائے قائم کرنے میں اتنی ہی آسانی ہوگی۔ سرسید چوں کہ جدید ہندوستان میں اصلاح کا علم لے کر آئے تھے اور ہر شعبۂ زندگی میں مسلمانانِ ہند کی مرفہ الحالی ان کی مصلحانہ سرگرمیوں کا خاص موضوع بن گیا لیکن قومی فلاح و بہبود کی بہ راہ مسلم معاشرے میں تعصب و قدامت پرستی پر مبنی بے جا رسوم و روایات سے پُرخوار و پُرخطر بن گئی تھی۔ وقت کی ناگزیر ضرورت تھی کہ مذہبی پہلو سے حقائق و معارف کو واضح کیا جاتا مذہبی معاملات و مباحث میں شغل و انہماک سے متعلق سرسید کی مجبوری خود ان کی زبانی سنیئے۔

"ایڈیسن اور اینڈلیسن کے وقت میں انگلستان کی ترقی تہذیب دنیاوی امور میں کچھ مشکل نہ تھی کیوں کہ اس کی ترقی کے لیئے اس وقت میں کوئی مذہبی تبدیلیٔ خیال مانع نہیں تھا ... اب دیکھو کہ مسلمانوں کی حالت اس کے بالکل برخلاف ہے۔ ان کا کوئی قول، کوئی فعل کوئی یقین روحانی ہو یا جسمانی، دینی ہو یا دنیاوی مذہب سے خالی نہیں۔ ان کے ہاں دنیاوی معاشرت اور مذہبی معاملات میں کچھ تفریق و جدائی نہیں ہے۔ کوئی امرِ حسن معاشرت یا تہذیب کا فرض کر لو جو محض دنیاوی ہو۔ اس پر ضرور بالضرور احکام عشرہ مذہبی میں سے کوئی نہ کوئی حکم جاری ہوگا یعنی فرض، واجب، سنت، مستحب، مباح، حلال، حرام، مکروہ، کفر، بدعت ــــ پس مسلمانوں کی خراب حالتِ معاشرت کی ترقی بغیر اس کے مذہبی بحث آئے کیوں کر ہو سکتی ہے۔ (۳)

سرسید جس وقت ہندوستان میں اصلاح و تعمیر کے ذریعے مسلم قوم کی خوش حالی و فارغ البالی کا نقشہ تیار کر رہے تھے مسلم قوم بالخصوص سیاسی، سماجی تعلیمی اور معاشی زبوں حالی کا شکار تھی۔ انگریزی تعلیم اور سائینس سے نفرت کی حد تک دوری مسلمانان ہند کی ہمہ جہت تباہی و بربادی کی اصل وجہ تھی جس کے ڈانڈے آبا و اجداد کی رسوم و روایات سے بے جا محبت، تقلید جامد اور تعصب و ہٹ دھرمی سے مل رہے تھے تباہی و بربادی اور زوال و انحطاط دل دوز مناظر و مظاہر نے سرسید کے قلب و ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ چنانچہ وہ گوشۂ امن و عافیت تلاش کرنے کی بجائے میدانِ کارزار میں چل پڑے اور پھر مسلمانانِ کو عروج و اقبال کی شاہراہ عام دکھانے کے لیے تن من دھن کا سارا اثاثہ لگا دیا۔ انھوں تنزل و ادبار کا حاذق طبیب کی حیثیت سے جائزہ لیا اور پھر اصل علت معلوم کر کی کوشش کی۔ ان کا خیال بجا اور درست تھا کہ اگر شاخوں کی بجائے جڑ کی اور درستگی کا سامان کیا جائے تو درخت خود ہی ثمر بار ہو جائے گا (۴)

تعصب اور قدامت پرستی سرسید کے نزدیک مسلمانوں کے تخلف و ادبار کی واحد علامت تھی جس نے ومن یوتی الحکمۃ فقد اوتی خیراً کثیراً اور الکلمۃ الحکمۃ ضالۃ المومن فحیث وجدھا فھو احق کا زریں سبق طاقِ نسیاں پر رکھنے کو مجبور کر دیا تھا۔ اس ہلاکت انگیز مرض سے نبرد آزما کی مہم میں سرسید اپنے ایک مخلص دوست اور رفیقِ کار کو جن الفاظ میں متنبہ کرتے

وہ مذہب سے قربت اور اسلام دوستی پر سند ہیں

"اگر مسلمان تعصب اور تقلید جامد کا قلادہ اپنی گردنوں سے اتار پھینک کر

حدیث کی روشنی کے متلاشی نہیں ہوتے اور جدید علوم و معارف سے مذہب کا تقابل نہیں کرتے تو اسلام ہندوستان سے کالعدم ہو جائے گا۔" (۷)

اس میں شبہ نہیں کہ مغرب میں جدید علوم و فنون کی اشاعت کی تحریک نے شرق و مغرب میں ہلچل پیدا کر دی اور سیاسی، تعلیمی اور معاشی زبوں حالی بتدریج ختم ہونے لگی، لیکن اس میں بھی صداقت ہے کہ مذہب میں شکوک و شبہات کی گنجائش روز افزوں ہو گئی اور الحاد و دہریت کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ شاعر مشرق کے اس کلام میں اسی تشویش کا اظہار ہوتا ہے ؎

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ (۸)

عیسائی مشنریاں اسلام کے رخِ زیبا کو داغ دار کرنے کے لیے پوری طرح سرگرم عمل تھیں اور دلائل و براہین کا سہارا لیتے ہوئے طرح طرح کے اعتراضات کے وار کر رہی تھیں جن کا مقصد صرف یہ تھا کہ اہلِ مذہب کی نگاہوں میں مذہب مشکوک و مشتبہ قرار پائے اور اس کی وقعت ختم ہو جائے۔ دوسری طرف مسلمانوں کا وہ طبقہ جو انگریزی تعلیم کا مدح خواں تھا اور عقل و سائنس کے محیر العقول کرشموں سے متاثر تھا مذہب کے معاملے میں تذبذب کا شکار ہو گیا تھا۔ یہ طبقہ مذہبی امور و معاملات کو عقلی لحاظ سے دیکھنے کا خواہشمند تھا۔ سشرر صاحب لکھتے ہیں۔

"سیّد صاحب کے پاس بعد کے زمانے میں متعدد انگریزی طلباء کے ایسے خطوط آئے جن کا ماحصل یہ تھا کہ اگر آپ نے ہماری رہبری نہ کی ہوتی تو ہم مذہب اسلام چھوڑنے کو تیار تھے۔ یہ خطوط سیّد صاحب کو اس قدر عزیز تھے

کہ ان کو احتیاط سے رکھ چھوڑا تھا۔ ان کو وہ اپنی ہمدردیٔ اسلام اور اپنی کوشش خیر کی سند اور اپنی نجات کا ذریعہ خیال کرتے تھے۔" (۹)

ان احوال و کوائف میں سر سید کا مذہبی فکر پروان چڑھتا ہے جہاں عقل کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ سر سید کے بقول :

"یہ ضرور نہیں انسان میں ایک اور وحی کی ودیعت ہونے کی ضرورت کو پیش کرتی ہیں جس کو عقلِ انسانی یا عقلِ کلی سے تعبیر کیا جاتا ہے یہی ودیعت ہے جس نے انسان کو نئی نئی ایجادوں اور حقائق اشیا کی تحقیقاتوں اور علوم و فنون کے مباحثوں پر قادر کیا ہے۔ یہی ودیعت ہے جس سے انسان انبساط کی طرف مائل ہوتا ہے وہ غور کرتا ہے کہ کن محسوس اور ذہنی چیزوں سے وہ خوشی حاصل کر سکتا ہے پھر وہ ان کو جمع کرنے اور ترتیب دینے یا ایجاد کرنے میں کوشش کرتا ہے۔ یہی ودیعت ہے جس سے انسان کا دل ہر ایک واقعہ کی نسبت اس طرح مائل ہوتا ہے کہ یہ کیوں ہوا اور پھر اس سے کیا ہوگا۔ یہی ودیعت ہے جس کے سبب سے انسان کے دل میں خالق کا، سزا و جزا کا اور معاد کا خیال پیدا ہوتا ہے۔" (۱۰)

ہمارے سامنے یہ حقیقت عیاں ہے کہ دورِ اوّل میں یونانی منطق اور فلسفہ نے فہم قرآن کے سلسلے میں چیلنج کیا تھا جس کا جواب اہلِ اعتزال اور مسلم فلسفیوں نے مذہب کی عقلی توضیح و تشریح کی شکل میں دیا۔ اسی طرح انیسویں صدی میں عقل و سائنس کا دور دورہ ہوا تو اس نے مذہب اور اہلِ مذہب کو چیلنج کیا

ضرورت اس بات کی متقاضی ہوئی کہ سائنٹیفک طریقے سے ہی مخالفین مذہب کے اعتراضات کے جوابات دیئے جائیں اور اسی طرح انگریزی علوم سے متاثر ہو کر برادران مذہب کے شکوک و شبہات کا رفع و ازالہ کر کے اسلام کی صاف و شفاف صورت پیش کر دی جائے۔ چوں کہ سرسید مغربی تعلیم کے مداح تھے اس لیئے وہ اس کو نسخۂ شفا سمجھ کر اپنے ہم مذہبوں میں عام کرنا چاہتے تھے لیکن وہ اس تعلیم کے مضر اثرات و نتائج سے بے پرواہ نہیں تھے۔ چنانچہ ان اثرات کو زائل کرنے اور خطرات سے مقابلہ کرنے کی عظیم ذمہ داری بھی انہوں نے قبول کرنے کا عزم کر لیا۔ حالانکہ یہ منصب علماء کا تھا لیکن انھوں نے مغربی علوم کو مذہب کے علم برداروں کے لئے ناجائز قرار دے کر اپنے آپ کو مذہب کے حصار میں قلعہ بند کر لیا تھا اور اس طرح وقت کے تقاضوں سے چشم پوشی کرتے ہوئے وہ ان کا ساتھ نہ دے سکے تھے۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے اس تجزیے میں صداقت اور معنویت ہے۔

جب سرسید نے اسلام اور مسلمانوں پر معاندین اسلام کی آویزش و یلغار کا عینی مشاہدہ کیا تو انھوں نے مشرق و مغرب کی اس رزم گاہ میں پیش قدمی کرنے کا فیصلہ کر لیا جو دراصل علمائے وقت کے کرنے کا کام تھا، لیکن چوں کہ علماء علوم جدیدہ پر عبور نہ رکھتے تھے اس لیئے وہ اس کی جانب متوجہ نہ ہوتے۔ مخالفین اسلام کی چیرہ دستی اور علماء کی خموشی و بے اتفاقی نے چار و ناچار سرسید کو اس عظیم مشن میں لگ جانے کا وہ حوصلہ دے دیا جس سے امام غزالی، ابن رشد، ابن حزم اور حافظ ابن تیمیہ اپنے زمانے میں لیس تھے اگرچہ سرسید کا جذبۂ اصلاح صادق اور بڑا مخلصانہ تھا۔ ان میں بڑا جوش و ولولہ تھا، ذہین و فطین تھے اور مخربری کی بے پناہ صلاحیت تھی لیکن یہ سچ ہے کہ وہ ان بزرگوں کی طرح قرآن و سنت کے رمز شناس و نکتہ داں نہ تھے اور نہ ہی فلسفے کے

اسرار و نوامیس سے کما حقہ آشنا تھے جس کی بنا پر تمام تر خلوص و نیک نیتی کے باوجود تاویل و تفسیر میں حد سے تجاوز کر گئے اور بعض اہم و مسلمہ امور و مسائل میں علمائے سلف سے منحرف ہو گئے (۱۲)

مغربی علوم کی تشویق و ترغیب کا قطعاً یہ مطلب نہیں تھا کہ سرسید مشرقی علوم کو حقارت بھری نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ تعلیم کے مروجہ طریقوں کو انہوں نے بے سود قرار دیا اور حالات و ضروریات کے تحت معاشی آسودگی، سیاسی استقلال اور مقدس مذہبی اقدار و روایات کے تحفظ کے لئے اس تعلیم کو ناگزیر قرار دیا۔ مشرقی اور مغربی علوم سے متعلق اپنے موقف کی وضاحت میں جہاں گویائی کی ہے وہاں مغربی علوم کے ساتھ ہی ساتھ مشرقی علوم سے ان کی محبت وابستگی کا ثبوت ملتا ہے۔

"مسلمانوں کو یہ لازم ہے کہ عربی زبان کی تحصیل نہ چھوڑیں۔ یہ ہمارے باپ دادا کی مقدس زبان اور ہمارے قدیم ملک کی زبان ہے جو فصاحت و بلاغت میں سنسکرت زبانوں میں لاثانی ہے مگر افراط و تفریط نہ ہو، لیکن جب کہ ہماری معاش، ہماری بہتری، ہماری زندگی با آرام بسر ہونے کے ذریعے انگریزی زبان سیکھنے میں ہیں تو ہم کو اس طرف بہت توجہ کرنی چاہیئے۔"

سرسید کے اقوال و افکار کے آئینے میں یہ بات واضح ہے کہ انہوں نے مغربی تعلیم کو معاشی فلاح و بہبود کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ اسے شاندار ماضی اور مذہبی روایات کے بقاء و تحفظ کا اثاثہ بھی قرار دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اسلامی تعلیمات اسی وقت کرو فر کے ساتھ

معاشرے میں جلوہ گر ہو سکتی ہیں جب انھیں عصری علوم و فنون کے ذریعے زمانۂ حال کے موافق بنا دیا جائے سرسید کے ایک سوانح نگار کے الفاظ میں:

"Syed Ahmed had deep respect for the past and he was far from being an enemy of religion. He wanted to modernize and at the same time to preserve all that was of value in religious customs and tradition."

ترجمہ: "سرسید احمد خان کو ماضی کی عزت و وقار کا بڑا خیال اور لحاظ تھا۔ مذہب دشمنی سے انھیں دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ وہ مذہب کو زمانۂ حال کے موافق بنانا چاہتے تھے۔ اسی طرح وہ تمام مقدس اور قیمتی مذہبی اقدار و روایات کی بقاء و تحفظ کے خواہاں تھے۔"

سرسید کی مذہبی خدمات کے جائزے میں جہاں یہ پہلو مستحضر رہنا چاہیئے کہ انتہائی ناخوش گوار اور نامساعد حالات نے مذہبی امور و مسائل میں دلچسپی و انہماک پر مجبور کیا، وہاں یہ پہلو بھی نظروں سے اوجھل نہ ہو کہ مذہب سے محض وقتی یا جذباتی لگاؤ نہیں تھا۔ ایسا قطعی نہیں ہے کہ وہ سیاسی، سماجی اور معاشی اصلاح کے میدان میں جب کود پڑے تو انھوں نے ان انقلابی افکار و نظریات کو مسلمانانِ ہند میں مشتہر کرنے کے لیے مذہب کو محض بیساکھی کی حیثیت سے اختیار کرنا پڑا۔

حالی کے الفاظ میں ــــ "مذہب کی ہی آغوش میں انھوں نے پرورش

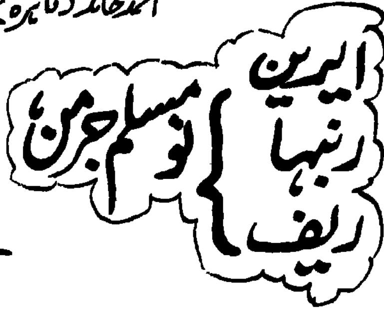
پائی تھی اور مذہب کی گود میں ہی ہوش سنبھالا تھا۔" (۱۵)
اس ضمن میں "موج کوثر" کے مصنف کی رائے نقل کرنا بے محل نہ ہوگا کہ سرسید کی زندگی پر مذہب کا بڑا گہرا اثر تھا۔ اس وقت مذہب کی ترویج و اشاعت اور علوم اسلامیہ کے فروغ کے دو بڑے مراکز تھے۔ ایک شاہ عبدالعزیزؒ کا مدرسہ دوسرے مرزا جان جاناں کے خلف شاہ غلام علیؒ کی خانقاہ۔ پہلے میں ولی اللّٰہی مسلک کی پیروی ہوتی تھی اور دوسرے میں طریقۂ نقشبندیہ مجددیہ کی۔ سرسید نے روحانیت کے ان دونوں چشموں سے فیض حاصل کیا۔ (۱۶)
سرسید کے نزدیک کسی بھی شعبۂ زندگی میں عزت و سرخروئی اسی وقت مل سکتی ہے وہی عروج و اقبال قابل اعتبار ہو سکتا ہے جس میں دین و شریعت کو نظر انداز نہ کیا ہو۔ ڈاکٹر اور انجینیر بن جانا، ستاروں سے آگے جہاں کی تلاش میں خود مستغرق رہ آسمانوں پر دنیا بسا لینا، دریاؤں کی تہوں تک پہنچ جانا، یہ سب مبارک اور قابل ہے لیکن مذہب کا لبادہ زیب تن کرتے ہوئے فرزندان اسلام کو خطاب کرتے ہوئے گویا ہوتے ہیں۔

"یاد رکھو کہ اسلام جس پر تم کو جینا ہے اور جس پر تم کو مرنا ہے۔ اس کو قائم رکھنا ہی سے ہماری قوم، قوم ہے۔ اے عزیز بچو! اگر کوئی آسمان کا تارا ہو جاوے مگر مسلمان نہ رہے تو ہم کو کیا۔ وہ تو ہماری قوم میں ہی نہ رہا۔ پس اسلام کو قائم رکھ کر ترقی کرنا قومی بہبودی ہے"۔ (۱۷)

حوالہ جات و حواشی: — (۱) الطاف حسین حالی، حیات جاوید ص ۷۷ فروری ۱۹۵۷ء (۲) پروفیسر عتیق احمد صدیقی (مرتب) سرسید بازیافت ملاحظہ فرمائیے۔

کا مضمون "سرسید کے مذہبی افکار" ص ۲۱۰، ۱۹۹۰ء سرسید اکادمی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
(۳) اسماعیل پانی پتی۔ مقالات سرسید ج ۱۳، ص ۳۶۲ طبع اول فروری ۱۹۶۵ء
لاہور مجلس ترقی ادب ۔ (۴) Sir Verney Lovett, A History of
The Indian Nationalist 1920 London P.5 (۵) البقرہ
۲۶۹ (۶) ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ الترمذی، جامع الترمذی، ج ۲، ص ۹۳ (۷) سید
راس مسعود، خطوط سرسید۔ ملاحظہ فرمائیے "۱۲ جنوری ۱۸۸۰ء کا مکتوب سرسید
از لندن" ص ۱۷، ۱۹۲۴ء نظامی پریس بدایوں۔ (۸) ڈاکٹر محمد اقبال، کلیات اقبال،
بانگ درا، ص ۲۰۹ صدی ایڈیشن ۱۹۸۹ء، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ (۹) عبد الحلیم
شرر، سرسید کی دینی بصیرتیں ص ۹، ۱۹۱۳ء لکھنؤ (۱۰) سرسید احمد خان، تفسیر القرآن
وھو الہدیٰ والفرقان۔ ج ۳ ص ۱۷، ۱۹۵۴ء آگرہ نیز ملاحظہ فرمائیں تہذیب الاخلاق
میں سرسید کا مضمون "نقل اور عقل میں مخالفت" یکم ذی قعدہ ۱۳۱۱ھ ج ۱، ص
۲۸، ۲۹، (۱۱) نور الحسن نقوی، سرسید اور ہندوستانی مسلمان ص ۷۹، ۱۹۷۹ء طبع اول،
ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ (۱۲) پروفیسر سعید احمد اکبر آبادی، سرسید کا دینی
شعور و فکر علی گڑھ میگزین، علی گڑھ نمبر ص ۹۲۔۹۳، ۵۵-۱۹۵۴ء (۱۳) سید اقبال علی
سید احمد خان کا سفرنامۂ پنجاب دیکھئے سرسید کی تقریر امرتسر ٹاؤن ہال ۲۹ جنوری
۱۸۸۴ء ص ۱۵۷، اشاعت دوم ۱۹۷۹ء ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی (۱۴) پروفیسر
شان محمد، سرسید احمد خان۔ پولیٹیکل بیوگرافی ص ۶۲، ۱۹۶۹ء میناکشی پرکاشن میرٹھ
(۱۵) حالی، حیات جاوید، ص ۱۴۳ (۱۶) محمد اکرام موج کوثر ص ۷۸، ۷۹، ۱۹۸۷ء دہلی۔
(۱۷) مجموعہ لکچرز سرسید ص ۱۸۰ بحوالہ عشرت علی خان قریشی (مرتب) (باقی آئندہ شمارہ)

احمد حامد (قاہرہ) ترجمہ مسعود حسن حسنی



"آج انسانیت دینِ اسلام کی محتاج ہے"

ایرین رنبہا ریف جرمنی کی رہنے والی ہیں، ان کی پیدائش ۱۹۴۰ء میں ہوئی ان کے والدین کا تعلق بھی جرمنی ہی سے ہے، ان کے والدین کا پیشہ طبابت تھا وہ اچھے فزیشن اور قلب کے ماہر امراض و ممتاز معالج تھے انہوں نے اپنی ساری زندگی اور ساری کوششیں اپنی اکلوتی بیٹی کی تعلیم و تربیت پر صرف کر دیں تاکہ وہ بھی ایک اچھی ماہر ڈاکٹر اور کامیاب زندگی گذار سکے، بیٹی نے اپنے والدین کے ارمانوں کو پورا کیا اور اس کی آرزو تھی کہ وہ بھی اپنے والدین کی طرح ماہر ڈاکٹر بنے، اس کا اندازہ اس کے قول سے ہے کہ "یہ ایسا انسانی پیشہ ہے جس کے ذریعہ انسان دوسروں کی تکلیفوں کو محسوس کرتا ہے۔"

اور وہ کہتی ہے ہم نے اپنے ایک ساتھی سے شادی کر لی۔ اور طالب علمی کے زمانہ میں میرا اس کا بہت ساتھ رہتا تھا، درجے میں سب سے فائق ہونے کی وجہ سے میرے اساتذہ مستقبل میں بہترین توقعات وابستہ کئے ہوئے تھے کہ میں کوئی غیر معمولی کارنامہ انجام دوں گی اور کچھ ایسی ہی توقعات میرے ساتھی نے بھی مجھ سے وابستہ کی تھیں۔ میں فارغ ہونے کے دو سال کے بعد میرا شوہر بن گیا اور ہم اس بات پر متفق ہو گئے تھے

کچھ عرصہ اولاد سے بچیں گے۔

ایک بڑے اسپتال میں جس میں ہم دونوں ساتھ ساتھ کام کرتے تھے مجھ کو کافی ترقی ہوئی اور میری شہرت میں اضافہ ہوا جس نے میری پرسکون زندگی کو جہنمی زندگی بنا دیا، کیونکہ میری شہرت سے اس کے اندر حسد کا مادہ پنپنا شروع ہو گیا۔ میں نے اس کے احساسات کو ہلکا کرنے کی بڑی کوشش کی، لیکن اس کا احساس بڑھتا رہا اور اس نے اپنی ذمہ داریوں میں لاپرواہی برتنا شروع کر دی اور نشہ آور چیزوں کا استعمال بڑھا دیا، گھر میں مجھ سے سختی کے ساتھ پیش آتا، اور اس کی سختی اس حد تک بڑھی کہ اسپتال میں میری بے عزتی ہوئی۔ اس کے باوجود میں نے برداشت سے کام لیا (صبر وضبط کے پیمانہ کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا) آخر کار میں نے علاحدگی کا مطالبہ کر ڈالا اور یہ مطالبہ اس کے نشہ میں دھت رہنے کی وجہ سے یا میری اہانت کرنے کی وجہ سے نہ تھا جیسا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ معاملات وقتی ہیں بعد میں رفع دفع ہو جائیں گے بلکہ یہ مطالبہ اس کی حد سے بڑھی ہوئی سختی برداشت نہ کر سکنے کی وجہ سے تھا، جس کی وجہ سے میں اپنے کاموں کی طرف پوری توجہ نہ کر سکتی تھی جس کے سبب مجھ کو اپنے والدین کی ناراضگی مول لینی پڑتی تھی، میں نے گھر چھوڑ دیا، اور میں نے ان غموں سے جو مجھ کو شوہر کے ساتھ زندگی گزارنے کی صورت میں جھیلنے پڑے تھے حتیٰ کہ مجھ کو انہی کی وجہ سے اسپتال میں ذلت اٹھانی پڑی تھی دور رہ کر اپنی زندگی اسپتال میں گزارنے لگی۔

جرمن خاتون رہنما ریف کہتی ہیں کہ میں نے اپنے فرانس کے سفر کے دوران اپنی ان تمام ذلتوں کو بھلا دیا جو مجھ کو میرے اس شوہر کی جانب سے پہونچی تھیں جس کو میں ناپسند کرتی تھی اور وہ مجھ کو ناپسند کرتا تھا۔

اور اس کے بعد میں نے اپنے آپ کا جائزہ لیا اور اپنی اس سہیلی سے گفتگو کی جو کئی سال پہلے فرانس سے اپنے شوہر کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارنے کے لئے چلی گئی تھی میں نے اسے مسلمان شوہر کے ساتھ خوشگوار زندگی گذارتے ہوئے پایا وہ اس کے ساتھ انسانیت بھرا سلوک کرتا تھا، اس کے سلوک کی وجہ سے میری سہیلی نے اسلام قبول کرلیا اور جب ان کا میری ان مشکلات کا علم ہوا جو مجھ کو میرے شوہر کی وجہ سے لاحق تھیں، تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ اگر اسلام قبول کرلو تو تم اس سے علاحدگی اختیار کرسکتی ہو، کیونکہ کوئی بھی مسلمان عورت غیر مسلم شوہر کے ساتھ نہیں رہ سکتی ہے۔ میں نے اپنی سہیلی سے اسلام قبول کرنے کے بارے میں پوچھا، اس نے کہا پہلے اسلام سے واقفیت حاصل کرو، اپنے حقوق و واجبات کو پہچانو اور " اشهد ان لا اله الا الله واشهد ان محمد اعبده ورسوله " کو زبان سے ادا کرو، مسلمان ہونے کے سبب طلاق کا مطالبہ کرو، عدالت فوراً تمہارے حق میں فیصلہ دے دی گی۔

پیرس میں تین دن قیام کے بعد میں برلین واپس ہوگئی، برلین واپسی کے بعد میں اسلامی مرکز گئی، اپنے اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا اور اس کا سارٹیفکٹ حاصل کیا اس طرح شرابی وحاسد شوہر سے میری طلاق ہوگئی۔

شروع شروع میں اسلام سے ناواقف تھی، لیکن پھر بھی میں نے سکون محسوس کیا اسلام کے بارے میں مجھ کو صرف اتنی واقفیت تھی کہ اس نے مجھ کو مصیبت سے نکالا ہے اور مستقبل میں پیش آمدہ حالات گزشتہ معاملات کے مقابلہ میں سہل ہوں گے۔

اس کے بعد میرا جرمنی میں رہنا مناسب نہیں تھا میں نے ایک بار پھر پیرس کی طرف کوچ کیا، اور وہاں میں چھ سال تک مقیم رہی ان چھ سالوں میں اسلام سے واقف ہوئی

کیونکہ اسلام ہی نے میری پراگندہ حال زندگی کو اچھی زندگی سے بدلا اور ان تمام غموں سے مجھ کو چھٹکارا دلایا جو مجھ کو لاحق تھے کیونکہ اس سے پہلے ہر چیز میں میری حیثیت ایک ذلیل بیوی کی تھی کیونکہ بار بار میری آہانت کرنا ہی میرے شوہر کا مقصد تھا اور اس کے اندر میری کامیابیوں اور اس کی ناکامیوں کے سبب حسد کا مادہ پیدا ہوگیا تھا جس نے ہماری ازدواجی زندگی کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔

اور ان چھ سالوں میں اسلام سے واقفیت کے سلسلہ میں میری سہیلی نے اور اس کے شوہر نے میری بڑی مدد کی۔

میں غور کرنے سے اس نتیجہ پر پہونچی کہ حقیقتاً اسلام ہی انسانیت کو کینہ اور بغض سے نجات دلانے والا ہے اور انسان کو بے چینی سے نکال کر اطمینان و سکون کی زندگی عطا کرتا ہے۔

جرمن خاتون کہتی ہیں کہ اسلام ہی ایک ایسا دین ہے جس نے انسان کو انسانیت کی قیمت عطا کی ہے (جو انسان کو انسانیت کی قدر و منزلت سکھاتا ہے) "اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک جان سے پیدا کیا اور پھر اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا"۔ اور تمام مخلوقات پر انسان کو فضیلت عطا کی اور انسان کو بہترین شکل میں پیدا کیا تاکہ اس سے مردوں اور عورتوں کی کثرت ہو اور مرد عورت سے سکون حاصل کرے۔ اس لئے کہ یہ دونوں ایک ہی جان سے ہیں، جب سکون ناپید ہوجائے تو اچھے طریقے سے علاحدگی اختیار کرلی جائے۔ شادی کی سب سے مہذب ترین شکل اسلام میں ہے اور دنیا میں جتنے بھی مذہب ہیں ان تمام میں مذاہب کے مقابلہ میں اسلام ہی سب سے زیادہ مہذب مذہب ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج مطہرات کے ساتھ محبت کا، نرمی کا اور

شفقت کا معاملہ کیا جس کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی بیویوں کی نگاہ میں بڑے محبوب تھے۔

یہی وہ حقیقی رحمت تھی جس کو انسانوں کے درمیان خاص طور پہ زوجین کے درمیان آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھیلایا۔

جرمن ڈاکٹر (رنیہا ریف) کہتی ہیں کہ دنیا کو اس وقت اسلامی تعلیمات کی ضرورت ہے صرف اسلام ہی موجودہ دور کے مسائل کو حل کرسکتا ہے وہ انسان کو بلند مرتبہ عطا کرتا ہے اور انسان کے لئے صرف یہی کافی ہے کہ وہ ایسے مقام پر ہو جس سے وہ اسلامی حقیقت کو سمجھنے کا اہل ہوسکے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو عزت دینے کا ارادہ فرمالیا ہو، تاکہ اس کو اپنے منتخب لوگوں میں شامل فرمالے، اس کو دین اسلام کی دولت سے نوازے اور پھر وہ اس پر عمل پیرا ہو اور میں نے ان لمحات کا جو میں نے امراض قلب کے علاج کے دوران گزارے اور جسم انسانی کے نظام کا مطالعہ کیا تو میں اس نتیجہ پر پہونچی کہ اللہ تعالیٰ ہی مطلق قوت وقدرت والا ہے، اسی نے اس جسم کو پیدا کیا اس نے اس کو زندہ رکھا اور وہی اس کو موت دے گا اور انسان کا کام علم کے فلک میں چکر کاٹنا ہے۔

ہم ہرگز انسان کی پیدائش کے راز تک نہیں پہونچ سکتا۔ یہ راز صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔

جو انسان یہ چاہتا ہے کہ وہ انسان مسلمان ہو اور اس کا دین برحق ہو اس پر یہ لازم ہے کہ وہ اپنے لئے اور تمام مخلوقات کے لئے جو زمین و سمندر و فضا میں بستی ہے یہ بات یقینی بنالے کہ اللہ تعالیٰ تنہا حاکم ہے تنہا خالق ہے اور وہ قادر مطلق ہے اس

کوئی شریک نہیں ہے اور اس کا خالق کی الوہیت کا وہ اعتراف کرے (جو ہر چیز سے بلند و بالا ہے اور اسی نے کائنات کو پیدا کیا اور اس کائنات کے بھرنے کے لئے انسان کو پیدا کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس انسان کو زمین میں خلیفہ بنایا اور فرشتوں کو اس کو تسلیم کرنے اور اس کو سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ اور اس انسان کو زندگی کا سامنا کرنے کے لئے چھوڑ دیا تاکہ ان کی کثرت ہو اور نسل کی افزائش ہو (اور جوڑا بنانے کے بعد چھوڑا) پھر ان میں رسولوں اور نبیوں کو مبعوث فرمایا تاکہ ہر نبی اپنی قوم کو خیر اور توحید کے راستہ کی طرف لے جائے لیکن اللہ تعالیٰ نے جو کہ تنہا ہے جس کا کوئی ساجھی و شریک نہیں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری ہی رسول و نبی کے لئے منتخب کیا (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی و رسول بنا کر مبعوث فرمایا) چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کا دین لوگوں تک پورا پورا بغیر کم و کاست کے پہونچا دیا اسی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء اور خاتم الادیان ہیں۔ اسلام ہی اس زمانے میں حقیقی ضرورت ہے اور جس انسان کی روح میں بگاڑ آچکا ہے جس کی عقل خراب ہو چکی ہے، جس کی فکر ان خالص مادیات کی وجہ سے منتشر ہو چکی ہے جو معبود ہو چکی جس کو لوگ سجدہ کرتے ہیں اور بس کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں اس انسان کی اصلاح کی ضرورت ہے آج دنیا دعوتِ اسلامی کی محتاج ہے کہ وہ انسان کو اس کی بربادی کے راستہ سے نجات دلائے۔

بیشک اسلام ہی صرف ایسا مذہب ہے جو دنیا کو اور لوگوں کو اس خرابی سے نجات دلانے والا ہے جو انسان کے اندر سرایت کر چکی ہے اس لئے کہ اسلام کی ایک ایسی روحانی طاقت ہے جو ختم نہیں ہوتی ہے اور یہ طاقت قرآنِ کریم میں ہے جو

سارے جہاں کے لئے دستورِ زندگی ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے ان تمام امراض کے جو قیامت تک انسان کو لاحق ہونے والے ہیں علاج بیان فرمائے ہیں
جرمن نومسلمہ کہتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے زندگی کا کوئی گوشہ بھی قرآن مجید میں نہیں چھوڑا بلکہ زندگی کے بہتر سے بہتر طریقوں کی طرف رہنمائی فرمائی ہے جس میں شبہات وتحریفات کی کوئی گنجائش نہیں ہے اس لیئے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو زمین پر اپنا نائب بنانا چاہتا ہے اور پاک وصاف بنانا چاہتا ہے، لیکن انسان اپنے نفس کے شیطان کی اتباع کرتا ہے اور جو شخص اپنے نفس کے شیطان کی اتباع کرے گا اس کو شیطان کی گمنڈ گیاں ملیں گی۔
اللہ تعالیٰ نے کعبہ مشرفہ کو مکہ مکرمہ کے لئے منتخب فرمایا، اور کعبہ وہ گھر جس کا ساری دنیا کے مسلمان حج کرتے ہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اسی پاک زمین میں پیدا فرمایا نہ کہ اس گھر میں۔ مکہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش لوگوں کے لئے عبرت وموعظت ہے اس سے یہ واضح ہوگیا کہ بیت الحرام وہی مرکز ہے جس کے اردگرد ساری دنیا طواف کرتی ہے اسی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کا تعلق بھی اسی مرکز سے تھا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی سارے جہاں کے لئے مبعوث فرمائے گئے تھے) تاکہ اللہ تعالیٰ ساری دنیا کو رسالت کے نور سے منور کردے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بے مثال عقل کے ذریعہ کہ آپ نے ہر شخص کو اس کے رتبہ کے مطابق خطاب کیا۔ آپ نے بتوں کا خاتمہ کیا اسلام پورے کرۂ ارض پر پھیل گیا اور قیامت تک پھیلتا رہے گا اور بیت الحرام طائفین کی جگہ ہوجائے گی) اور عنقریب سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآ

ساری دنیا کو اپنے ساتھ لے نکلے لیگی اور اس کی جد و جہد، اس کی جنگ، اس کا جہاد اس دعوت کی جانب سے ہوگا جو دعوت اللہ کے دین کے قواعد کی مضبوطی کے لئے ہوگی وہ سیرت جو لوگوں میں جذب کی کیفیت طاری کرتی ہے اور جو لوگوں کو اسلام سے واقف کراتی ہے، قرآن کریم وہ کتاب ہے جو حق کے ساتھ حق کی طرف سے نازل ہوئی تاکہ دن رات دین بن جائیں اور قرآن دنیا کا دستور بن جائے۔

آپ جانتے ہیں کہ میں نے ایک عربی مسلمان سے شادی کرلی اور میں حج کے فریضہ سے بھی فارغ ہوگئی ہوں، اور میں تمنا کرتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اولاد سے نواز ے جن کی میں اسلامی تعلیمات کی روشنی میں تربیت کروں اور وہ اسلام کی خدمت کریں۔ (بشکریہ المسلمون، مصر)

شاداب

میں اشاعت کے لئے تخلیقات کا طبع شدہ ہونا ضروری نہیں ہے لیکن غیر مطبوعہ، صاف اور خوشخط ہونا ضروری ہے

☼ تبصرے کے لئے دو جلدوں کا آنا لازم ہے

☼ جواب طلب امور کے لئے جوابی خط یا مناسب ڈاک ٹکٹ کا آنا ضروری ہے

(ادارہ)

محمد حسین ۵ سالہ عالم اسلام کا سب سے کم عمر قاری

امت اسلامیہ کے بین الاقوامی اجتماع یعنی حج بیت اللہ کے دوران منعقدہ قرآنی پروگرام میں ۵ سالہ ایرانی بچے نے اپنے عملی شرکت کے ذریعہ دیگر ممالک سے آئے حاجیوں کو حیرانی میں ڈال دیا۔ مکہ مکرمہ میں ایک شام قرآن کے نام "موسوم پروگرام" میں اس کمسن بچے نے اپنی صلاحیت حفظ، قرآن اور قرآنی مفاہیم سے اپنی غیر واقفیت سے مصری علماء اور حافظان و قاریانِ قرآن کو مرحبا اور آفرین کہنے پر مجبور کر دیا۔ عاشقانِ قرآن کے درمیان یہ خبر بڑی تیزی سے پھیل گئی لوگ جوق در جوق اس سے ملاقات کے لئے آنے لگے۔

محمد حسین کی غیر معمولی صلاحیت کی خبر سنتے ہی سعودی عرب کے وزیر د نے اس بچے سے الگ ملاقات کی اور تقریباً دو گھنٹے تک اس بچے نے وزیر کی مجلس میں موجود ماہرین علم قرآن کے سوالوں کا جواب دیا۔ اس کے بعد سعودی عرب کے حکمراں خاندان کی خصوصی مجلس میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ مجلس میں شرکت کی۔ اس مجلس میں سعودی عرب کے علاوہ دنیا کے دیگر ممالک آئے ہوئے مشہور حفاظ و قاریان قرآن اور عوام قرآن کے ماہرین موجود تھے حسین نے تقریباً دو گھنٹے تک ان علماء کے سوالوں کا جواب دیا۔

مکہ مکرمہ میں محمد حسین کے والد سے، جو خود بھی حافظ و قاری قرآن ہیں ملاقات و گفتگو کے دوران معلوم ہوا کہ محمد حسین نے ۲ سال چار مہینے کی عمر سے قرآن آموزی کا سلسلہ شروع کر دیا تھا اور محمد حسین کی والدہ نے جو خود بھی حافظ قرآن ہیں۔ اپنے بچے کی تربیت میں بڑی محنت کی ہے محمد حسین کو دودھ پلاتے وقت وہ قرآنی آیات کی تلاوت کیا کرتی تھیں اور گہوارہ جنبانی کرتے وقت بھی وہ اپنے بچے کو قرآنی آیات کی لوریاں سنایا کرتی تھیں تا وقتیکہ بچہ گہری نیند میں ڈوب نہ جائے۔

محمد حسین کے والد نے بتایا کہ ان کے بچے کو پورا قرآن حفظ ہے اور قرآن کے ترجمے سے بھی وہ بخوبی واقف ہے۔ وہ سورہ و آیات کی تعداد، آیات کی ترتیب ہر صفحہ قرآن پر آیت مبارکہ کے ابتدائی کلمات اور ہر آیت مبارکہ کی ابتداء اور آخر سے بخوبی واقف ہے قرآن مجید کے علاوہ گلستانِ سعدی اور دیوانِ محتشم کاشی کے اشعار بھی اسے بخوبی حفظ ہیں۔

جب محمد حسین کے والد سے یہ سوال کیا گیا کہ آپ کا بچہ دو ڈھائی سال کی عمر میں لکھنا پڑھنا تو نہیں جانتا تھا تو پھر آپ نے تدریس کا ایسا کونسا طریقہ اختیار کیا کہ اس میں ایسی مہارت پیدا ہو گئی تو انہوں نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ محمد حسین کی تعلیم و تربیت کے لئے میں نے جو طریقہ کار اپنایا ہے وہ اشاروں پر مبنی اور ایسے بچوں کے حق میں زیادہ مؤثر کارآمد ہے جو ابھی مدرسہ نہ گئے ہوں اور لکھنا پڑھنا نہ جانتے ہوں۔ اس روش کے تحت ہر اشارہ بچے کو ایک معنی و مفہوم سے آگاہ کر دیتا ہے اور بچے ان اشاروں کے ذریعے پورے قرآن کے معنی و مفہوم کو بڑی آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ قرآن کیا کہتا ہے مسلسل مشق و تکرار کی مدد سے مختصر سی مدت میں بچہ ان علامتوں و اشاروں سے مانوس ہو جاتا

محمد حسین کی تربیت کے لئے مجموعی اعتبار سے ۷ تا ۸ علامتوں سے استفادہ کیا گیا۔
گفتگو کے دوران محمد حسین نے والد کے گئے اشاروں کی روشنی میں ان قرآنی آیات تلاوت بھی کی۔ حاضرین نے خواہش کی۔ ہر آیت کریمہ کی تلاوت کے بعد والد نے بعد آنے والے صفحے کی پہلی آیت کے بارے میں سوال کیا تو اس بچے نے نہ صرف اسے صفحہ یا اگلے پانچ صفحات کی پہلی آیتوں کو سنا دیا۔

محمد حسین کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ روزمرہ کی گفتگو میں بھی قرآنی آیات کا بخوبی استعمال کرتا ہے۔ بچے کے والد نے بتایا کہ دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلے وقت بھی محمد حسین قرآنی آیات سے استدلال کرتا ہے چاہے دوسرے بچے اس کی بات سے قاصر ہی کیوں نہ ہوں۔ گھر والوں سے بات چیت کے دوران محمد حسین برابر قرآنی آیات کا برمحل استعمال کرتا ہے۔

اپنی بات کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے محمد حسین کے والد نے بتایا کہ حجت الاسلام والمسلمین محمد حسین اس وقت حوزہ علمیہ قسم میں زیر تعلیم ہے ان کے والد سے بچے کی تعلیمی سرگرمیوں کے بارے میں وضاحت طلب کی گئی تو انہوں نے بتایا کہ محمد حسین سردست درس "صرف" تمام کرچکا ہے اور "نحو" کی تعلیم حاصل کرنے میں سرگرم ہے اور آیت اللہ مشکینی کی تجویز کے مطابق محمد حسین حوزہ علمیہ کے وظیفہ حاصل کرنے والے طالب علموں میں سے ایک ہے اور غیر ذہانت اور سرعت مطالعہ کی وجہ سے وظیفہ کی رقم کتابوں کی خریداری میں بہت معاون۔
ان کے والد سے پوچھا گیا کہ آپ کا بچہ غیر معمولی بچہ ہے تو انہوں نے جواب دیا نہیں ایسا نہیں ہے بلکہ اس کی استعداد درمیانی حد سے قدرے بالاتر ہے محمد حسین کے گھر والوں کے علاوہ انکی بڑی بہن بھی حافظ قرآن ہے اور چھوٹا بھی حفظ قرآن میں مشغول ہے ○

سید حامد

اسی
کھیلے ہوشیاری کے ساتھ

بہار کی ریاست بہار میں شری لالو پرشاد یادو نے شری جیوتی باسو کے نقشِ قدم پہ چل کر سلامتی کے بل پر مسلمانوں کے محسن ہونے کا دعویٰ کیا۔ مسلمانوں نے دبی زبان سے کہا ہماری پسماندگی کی طرف بھی تو دھیان دیجئے۔ ٹکا سا جواب مل گیا۔ مسلمانوں کی نمائندگی سرکاری ملازمتوں میں کم ہوتی چلی گئی۔ مضحکہ خیز حد تک کم۔ یہ بات بھی سامنے آ گئی کہ ان میں فی الحال اپنے ترقی یافتہ اہلِ وطن کے ساتھ مقابلہ کی سکت باقی نہیں ہے ہر طرف سے مایوس ہو کر انہوں نے کہا کہ ہمیں پچیس سال کے لئے نوکریوں میں ریزرویشن دے دو تاکہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو جائیں۔ یہ کہنا تھا کہ ہنگامہ برپا ہو گیا۔ کہا ایک بار پھر وطن کو تقسیم کرانے کے منصوبے ہیں۔ ایسا صرف انتہا پسندوں نے نہیں کہا۔ رواداروں اور سیکولر شعاروں نے بھی یہی بات کہی اور یہی کے اسی درجہ حرارت کے ساتھ کہی۔ خود مسلمانوں میں اس مانگ پر پھوٹ پڑ گئی برادریوں کو بدگمان کر دیا گیا کہ یہ ان کے خلاف نام نہاد اشراف کی سازش ہے جو لوگ تحفظات کے مطالبے کو لے کر اٹھے تھے انہوں نے سوچا کہ لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ اس کم فہم خود آزاد ملت کو اس کا نفع نقصان کون سمجھا سکتا ہے پھوٹ پڑنے سے بہتر ہے کہ حسب سابق وہ ایوانِ اقتدار اور دفاتر کا طواف کرتے رہیں۔ خاک چھانتے

رہیں۔ لیکن ان میں کرسی پر بیٹھنا انہیں نصیب نہ ہوا۔ غیر مسلمان تو نادار ہیں، جاہل ہیں، کٹھ حجت ہیں خود آزاد ہیں۔ حکومت کو کیا ہوا تھا جو سب کو آنکھ سے دیکھنے کا دعویٰ کرتی ہے اور اہلِ ہند کو کیا ہوا تھا جنھوں نے پیمان تھا کہ انصاف ارتقار کے شانہ بشانہ چلے گا۔

اُردو کو ہی لے لیجئے۔ ہمارے اہلِ وطن نے جن میں انتہا پسند اور اعتدال دونوں شامل ہیں دل ہی دل میں طے کر لیا کہ اُردو کو پنپنے نہ دیں گے اس کے حق میں کرتے رہیں گے لیکن رزق کی راہ اور نشو ونما کا باب اس پر بند کریں گے۔ اور کام انتہائی چابکدستی کے ساتھ انجام دیا اور یہ سب کچھ کانگریس کے زیر سایہ اور ہدایت ہوا جو رواداری اور سیکولر شعاری کا دم بھرتی ہے شری پرشوتم داس ٹنڈن، ڈاکٹر سمپورنانند اور (ان سے بڑھ کر) پنڈت گوبند ولبھ پنت نے اردو کا عرصہ حیات تنگ کر دیا اور اردو والوں نے واویلا کیا اس کی حق طلبی کے لئے کی مہم ذاکر صاحب کی سربراہی میں شروع کی۔ محضر پیش کیا۔

ذاکر صاحب اس اثنا میں ہندوستان کے نائب صدر اور صدر ر۔ نے اپنے ہی پیش کئے ہوئے محضر کی طرف مڑ کر نہ دیکھا۔

طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا

صیاد کی دانشمندی اور اقبال مندی اور صید کی نادانی اور بے اتفاقی اور بے بسی کی پناہ آپ کہیں گے کہ صدر اور نائب صدر حکومت کے کام میں مداخلت نہیں کر تسلیم لیکن مداخلت نہیں کر سکتے اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ اسے بھی چھوڑ دیئے، کانگریس فرقہ پرست اور رواداری مخالف عناصر کی بھرمار تھی وزیر اعظم جواہر لال نہرو کی عمرا

لڑتے گذری۔ اس حمام میں بڑے بڑے ننگے تھے لیکن انہیں انجیر کے پتے کی ستر پوشی اور وضع اخفا پر اطمینان تھا لیکن متحدہ محاذ میں سیکولر پارٹیاں ہی شامل ہیں اور اس کے وزیر اعظم اندر کمار گجرال پر تو اردو والے جان دیتے چلے آئے ہیں ان کی سربراہی میں جو کمیٹی اردو کی صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے پچیس سال ہوئے بنی تھی اس کی رپورٹ کو اردو والوں نے سینے سے لگایا۔ آنکھوں کا سرمہ بنایا۔ اب یہ عالم ہے کہ عالم ہے کہ اردو الا گجرال صاحب کے دفتر یا گھر کے اردگرد پھٹک بھی نہیں سکتا۔ ان کی رپورٹ پر جو طاقِ نسیاں میں رکھی ہوئی تھی گرد کی ایک دبیز تہہ اور جم گئی۔ اردو کے ساتھ انصاف کی اپیل کرنی تھی۔ تو ابتدائی اور ثانوی سطح پر اس کی تعلیم کا انتظام کرتے اردو یونیورسٹی اور اردو کونسل یہ سب نمائش کی باتیں ہیں گو کہ ہمیں انہیں بھی دو رہنا چاہیئے ان سے جو کچھ بھی مل جائے غنیمت ہے بہر حال ہم نے اپنی اوقات دیکھ لی۔ بدنصیب اردو کا ذکرِ خیر ہو چکا۔ چلیئے تیرہ بخت مسلمانوں کی طرف پھر لوٹتے ہیں۔

چند ماہ ہوئے چند باخبر مسلمان دلی میں جمع ہوئے انہوں نے مسلمانوں کی تعلیمی حالت کا جائزہ لیا وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر نویں پنجسالہ منصوبے میں جو بنایا جا رہا ہے چند کلیدی امور کے لئے خاص کر سرمایہ کاری کردیا جائے، رقوم نامزد کردی جائیں تو مسلمانوں کی تعلیم کو فروغ ملے گا اور جمود ٹوٹے گا چنانچہ انہوں نے مندرجہ ذیل پر مشتمل ایک کلیدی منصوبہ بنایا۔

۱۔ تعلیم نسواں (۲) اصلاحی اور تفوقی تربیت (ریمیڈیل اینڈ این رچمنٹ کوچنگ) ۳۔ دینی مدارس میں عصری مضامین کا شمول (۴) دینی تعلیمی بورڈ کا قیام (۵) مسلمانوں کے زیر اہتمام اسکولوں کا ارتقاء (۶) مولانا آزاد فاؤنڈیشن کے سرمایہ میں اضافہ (۷) سائنس

ٹکنالوجی اور مینیجمنٹ کی یونیورسٹی کا قیام ۔

اس پر کل لاگت ایک ہزار کروڑ روپیے آئی تھی جو نویں منصوبہ کی لاگت کی ایک ادنی کسر تھی۔ ہمارے دروازوں پر دستک دی گئی، جواب ہر جگہ مثبت ملا عمل ہر جگہ منفی ۔ پلاننگ کمیشن کے ڈپٹی چیئرمین ڈنڈوتے نے جو کھلا ذہن رکھتے ہیں۔ مذکورہ تجاویز کا خیر مقدم کیا ان کے مشیروں سے تفصیلی گفتگو ہوئی ۔ بومئی صاحب نے جو افرادی وسائل کے وکاس کے وزیر ہیں سائلوں کی پذیرائی دل بڑھا دینے والے انداز سے کی۔ فرمایا کہ ان کے تجربہ میں یہ پہلی مثال ہے کہ کسی گروپ نے غیر رسمی طور پر پلاننگ کے عمل میں اس طرح شرکت کی ہو، محکمہ تعلیم کے سکریٹری شری داس گپتا کا رخ بھی وزیر محترم کی طرح حوصلہ افزا تھا۔ سیاسی سطح پر پارلیمنٹ کے مسلمان نمائندے مل کر وزیر اعظم شری دیوے گوڑا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ایک ہزار کروڑ کا مطالبہ کیا۔ دل بڑھا دینے والی آوازیں آئیں ۔ اعلان بھی ہوئے اور نصف اعلان بھی ۔ راقم سطور نے پلاننگ کمیشن کی متعلقہ اسٹرینگ کمیٹی میں یہ معاملہ اٹھایا اس نے مسلمان گورنروں اور مسلمانوں ممبران پارلیمنٹ کو خط لکھے خورشید عالم خاں صاحب نے وزیر اعظم اور متعلقہ وزیروں کو لکھا بھی لیکن مسلمانوں کے ہاتھ کچھ نہیں آیا اس سے پہلے مسلمانوں کے باہمی اختلافات کو عذر بنالیا جاتا تھا اس بار تو مسلمان دانشور اور اراکین ایوان سب نے مل کر اپنی مانگ حکومت کے سامنے رکھی تھی اور وہ مانگ رکھ کر بیٹھ نہیں گئے، تعاقب کرتے رہے لیکن نتیجہ صفر رہا۔ ہنوز روز اول ۔

یاد کیجئے کہ متحدہ محاذ کی تشکیل میں مسلمانوں کا ان کی تائید کا ہاتھ تھا وہ اپنی سادہ لوحی میں یہ سمجھ بیٹھے کہ کانگریس جیسی دیوہیکل پارٹی خسروانہ بے نیازی کے ساتھ اقلیتوں کو نظر انداز کرے تو کیا عجب لیکن بہت سی سیکولر پارٹیوں کی ملی جلی حکومت تو ایسا نہیں کرے گا ۔

ـلـ نے دیکھ لیا کہ مسلمانوں کو غیر اہم سمجھنے یا اپنے اسیروں میں شمار کرنے اور نظر انداز
ـے میں وہ کانگریس سے پیچھے نہیں، آگے ہے۔ اس نے بھی وہی حربے، دل خوش کن
نات، وعدہ وپیمان اور لقمے پھینکنے کے اختیار کر لیئے ہیں۔ آپ ہی بتائیے
ب یہ درماندہ طبقات اقلیت کہاں جائیں، جس کے مقدر میں اپنی سرکاروں
اپنے اہلِ وطن کے روشن خیال طبقے کی طرف سے منفی ہمدردی لکھی ہوئی ہے جس کی
ـے آواز سیاست کے نقار خانے میں سنائی ہی نہیں دیتی۔ ارباب اختیار سن
لیتے ہیں تو سنی ان سنی کر دیتے ہیں۔

مسلمانوں کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ان کے بیشتر اہلِ وطن وہ اہلِ وطن جو سیکولر
ـار رکھتے ہیں ان موروثی تعصبات سے یکسر آزاد نہیں ہیں جو اکثریت کے انتہا
ـدوں اور فرقہ پرستوں کی زبان پر دھڑلے سے آتے رہتے ہیں اور یہ خیال بھی
ـے دل میں بیٹھ گیا ہے کہ مسلمان علاحدہ رو اور الگاؤ پسند ہیں، پسماندہ ہیں
ـہ پیچھے کی طرف دیکھتے ہیں اور ہندوستان کے غنیم بجز ایک پاکستان سے
ـی چھپے کی ہمدردی ہے اور ان پر اگر بپتا پڑ رہی ہے تو وہ ان کے پرکھوں کے
ـے کا نتیجہ ہے وجہ کچھ بھی ہو بھارت کی ترقی میں یہ حائل ہیں انہیں نہ نگلتے بنے
نہ اُگلتے۔

بھارت ان کے ساتھ باوجود ان کے تاریخی انحرافات کے رواداری کا برتاؤ کر رہا ہے
ـ سلامتی کا خواہاں اور ان کے لئے نیک شگون ہے۔ اس کے لئے انھیں ہمارا آبھاری
ـا ہیئے۔ انہیں احتجاج اور فریاد کرنے کا حق کس نے دے دیا ہے۔..

معافی تلافی کی تلقین حرف طفل تسلی ہے مسلمانوں کو زمینی حقیقتوں کو آنکھیں کھول کر

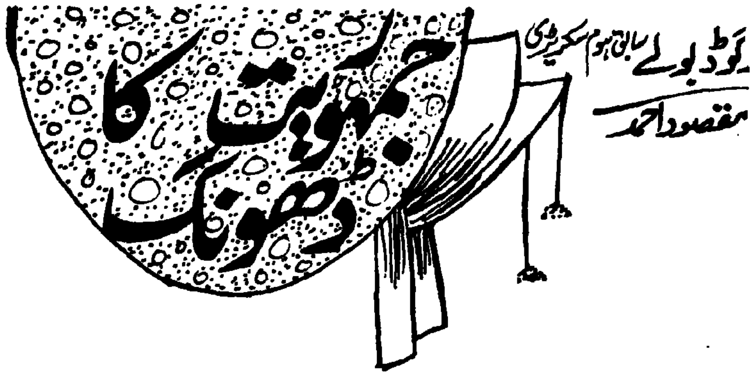
دیکھنا چاہیئے، بجھنا چاہیئے۔ کوئی بھی پارٹی یا پارٹیوں کا کوئی بھی مرکب صاحب اقتدار ہو مسلمانوں کی ترقی، خوشحالی اور عافیت کے لئے کبھی مثبت اور تعمیری رویہ اختیار نہیں کرے گا۔ وہ اس سے زیادہ منفی عافیت کی امید کرسکتے ہیں۔

ہاں حکومتوں اور پارٹیوں کے رخ میں تبدیلی تبھی ہوگی جب مسلمان (اپنی خانہ جنگی کو ختم کئے بغیر بھی کہ یہ ان کے بس کی بات نہیں ہے) ضروری امور پر متحد ہوجائیں گے اور حکومتوں اور پارٹیوں کو یہ باور کرادیں گے کہ یہ شان بے نیازی انہیں مہنگی پڑے گی اس امتحان گاہ میں جہاں ووٹ ڈالے جاتے ہیں وہاں پارٹی یا پارٹیاں پوری اتریں گی جو اقلیتوں کے بنیادی مطالبات کو پورا کرنے کا وضاحت اور دستار کے ساتھ وعدہ کریں حکومت اور ارباب حکومت اور ملازمین حکومت کا طواف کرنے اور لقموں کی آس لگانے سے کسی قوم کا مقدر نہ آج تک بدلا ہے نہ کبھی بدلے گا۔ ہاں کچھ نمائندے کچھ رہبر اس طرح اپنی نجی ہوس کی پیاس بجھالیتے ہیں اور قوم اس کی قیمت عرصے تک ادا کرتی رہتی ہے

تو صاحب نسخہ کیمیا ر یہ ہے کہ بنیادی امور پر متحد ہوجائیے۔ جہالت دور کیجئے صحت اور صفائی کی طرف دھیان دیجئے، معاشرے کو سدھاریئے، سنواریئے، اپنی پسماندگی کے باوصف ملک کی ترقی کے لئے اہلِ وطن کے ساتھ شانہ بشانہ کوشش کیجئے۔

برادرانِ وطن کے ساتھ عزت نفس کو قربان کیئے بغیر تعلقات کو استوار کیجئے سیاسی کھیل ہوشیاری کے ساتھ کھیلئے یہ سوچنا کہ آپ کے سیکولر مزاج اہل وطن کوئی مثبت رخ آپ کے تئیں اختیار کریں گے اور آپ کو زوال سے ابھارنے کیلئے کوشش کریں گے عام خیالی ہے سہل انگاری ہے خود فریبی ہے جو اپنی مدد آپ نہیں کرتا کوئی اس کی مدد کو نہیں آتا۔

یہ قدرت کا قانون ہے *



۲۱ ستمبر کو اتر پردیش کے چیف منسٹر کی حیثیت سے کلیان سنگھ کی تخت نشینی کی صورت میں
دراصل ہندوستانی جمہوریت کے روبہ زوال سفر میں ایک اور سنگ میل کو پار کیا ہے انتہائی
ن کی بات ہے کہ ملک کی آزادی کے سنہری سالگرہ کے سال میں ایک ایسا شخص جس پر ملک
ین دقانون کے تحت فرد جرم عائد ہو چکی ہے اس نے ایک اہم ترل اور اعلیٰ عہدے پر
ہونے کی جسارت کی ہے ان کا تعلق بھارتیہ جنتا پارٹی سے ہے جو پارلیمنٹ میں سب
ی اکثریت رکھتی ہے یہ پارٹی اب اپنے آپ کو اخلاقی قدروں کے اعلیٰ معیار پر بتاتی ہے
دکو ان قدروں کی تعلیم دینے میں پیش پیش ہے

بابری مسجد۔ بابری مسجد انہدام کے شرمناک معاملہ نے اس ملک میں سیکولر اساس
یں ہلا کر رکھدی تھیں۔ انہدام کے ایک ہفتہ کے اندر ہی اس کی تحقیقات کا کام سی بی آئی
نپ دیا گیا اور اس نے کلیان سنگھ کے ساتھ ۳۹ افراد کے خلاف ۵ راکتوبر ۱۹۹۳ء کو
م عائد کر دی۔ اسپیشل کورٹ کے ججوں کے بار بار تبادلے کی وجہ سے عدالت کو یہ فیصلہ کرنے
ر سال کا عرصہ لگ گیا کہ ملزمین پر مقدمہ چلانا ضروری ہے عدالت کے اس فیصلے کے بعد
غص جو قانون کی عظمت کا حامی ہے یہ امید کرتا تھا کہ بی جے پی کلیان سنگھ کو دوبارہ چیف منسٹر

کی ذمہ داری سونپنے کا فیصلہ نہیں کرے گی۔ لیکن یہ امیدیں بھی خاک میں مل گئیں اور یہ واضح ہو گیا کہ قانون کی حکمرانی کے تئیں قومی سیاسی پارٹیوں کے دعووں کی کیا حقیقت ہے۔

عوام کی یادداشت کو روایتی طور پر کمزور سمانا جاتا ہے اس لئے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان واقعات پر ایک نظر ڈال لی جائے جو بابری مسجد انہدام کا سبب بنے اور اس تعلق سے کلیان سنگھ کے رویے پر بھی نظر ڈالی جائے۔ اسپیشل کورٹ میں زیر غور فوجداری مقدمے کی معقولیت کے اندر جھانکے بغیر محض ان امور کا جائزہ لیا جائے گا جن کی صداقت پر کوئی تنازعہ نہیں ہے اور جو نوشتہ ریکارڈ پر موجود ہیں۔

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا اس سے پہلے نے پر کی جانے والی کھدائی اور زمین کی لیو لنگ LEVELLING کے کاموں سے کی جائے جو اجودھیا کمپلیکس کو سرکاری تحویل میں لینے کے بعد مارچ اور مئی ۱۹۹۲ء کے دوران میں کی جا رہی تھی این آئی سی کے ممبران پر مشتمل جس وفد نے اپریل ۱۹۹۲ء میں اجودھیا کا معائنہ کیا تھا اسے اس عمارت یا ڈھانچے کا پلان نہیں دکھایا گیا تھا جس کو سطح (LEVEL) کی جانے والی جگہ پر بننا تھا وفد نے اپنی رپورٹ میں منجملہ اور باتوں کے علاوہ یہ سفارش کی تھی کہ صوبائی سرکار متعلقہ زمین (جائیداد) کی ہیئت کو تبدیل کرنے کی جانب اس وقت تک کوئی قدم نہ اٹھائے جب تک کہ اس سلسلے میں عدالت کوئی حتمی فیصلہ نہ لے لے۔

اس کے بعد جے پی اور اس کے پریوار تنظیموں نے ۹ جولائی ۱۹۹۲ء کو ایک کنکریٹ پلیٹ فارم کی تعمیر کے لئے کارسیوا شروع کی متعلقہ زمین ریاستی حکومت کی تحویل میں تھی پھر بھی اس نے یہ ظاہر کیا کہ اسے نہیں معلوم کہ کارسیوا کون لوگ کر رہے ہیں حالانکہ جس طرح بھاری بھرکم مشینوں اور سازوسامان کے ساتھ کارسیوا ہو رہی تھی اس میں اس شبہ کی گنجائش تک پیدا نہیں ہوتی کہ یہ کام

اس کے شامل ہونے سے بغیر کم ازکم اس کی اجازت کے بغیر نہیں ہو رہا تھا۔

حکومت ہند کی روانہ کردہ ٹیم جواب اجودھیا گئی اس کے ساتھ بھی ڈھٹائی اور تحقیر آمیز اختیار کیا گیا۔ سپریم کورٹ کے ذریعہ بھیجے گئے ایک جائزاتی کمیشن کے ساتھ بھی رہی بن آمیز بے رخی کا برتاؤ تھا اور ملک کی اعلیٰ ترین عدالت کو معلومات فراہم کرنے میں بھی دانی سے کام لیا گیا۔ بی جے پی نے خود کو ایک خونخوار شیر پر سوار کر رکھا تھا جس پر سے اُترنے لیب اسے معلوم نہ تھی۔ آخر کار وزیر اعظم کی مداخلت کے بعد ہی ۲۶ جولائی ۱۹۹۲ء کو کار سیوا بند ہو سکی۔

یقین دہانیاں ــــــ این آئی سی کی نومبر ۱۹۹۱ء کی میٹنگ میں چیف منسٹر کلیان سنگھ نے جو یقین ان کرائیں ان پر بھی نظر ڈال لینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ اس طرح ہیں۔

★ مصالحتی کوششوں کے ذریعہ اس معاملے کے حل کے لئے سب طرح کی کوششیں ئیں گی۔

★ اس وقت تک جب تک کہ مسئلے کا ایک حتمی حل نہ نکل جائے، یوپی کی حکومت متنازعہ ن کی محافظت کے لئے خود کو کلی طور پر ذمہ دار سمجھے گی۔

★ کارروائیوں میں عدالت کے تمام احکامات پر مکمل طور پر عمل کیا جائے گا اور

★ الہ آباد ہائی کورٹ میں چلنے والے مقدمے کے فیصلے کی خلاف ورزی نہیں کی جائے گی

ریکارڈ شاہد ہے کہ کس طرح ان یقین دہانیوں سے توہین آمیز طریقے سے روگردانی ۔ ملک کے کسی اور معاملے میں سپریم کورٹ نے روزمرہ کی شنوائی کا رویہ نہیں اپنایا کس ی شنوائیاں ۲۳ اور ۲۵ تا ۳۰ نومبر اور یکم تا ۴ دسمبر کو مسلسل ہوئیں اور آخری شنوائی ۶ دسمبر ہی۔ ۶ دسمبر کی شنوائی کو جو ڈھانچے کے مسمار کئے جانے کے بعد ہوئی، چھوڑ کر عدالت ہر یقین دہانی لیتی تھی تاکہ صوبائی حکومت کو اس سلسلے میں بندش میں رکھا جاسکے اور وہ خود کو

متنازعہ عمارت کی حفاظت کے لئے تیار رکھے۔ ظاہر ہے یہ تمام یقین دہانیاں عدالت کو کلیان سنگھ کی رضامندی کے بغیر نہیں دی گئی ہوں گی۔

مرکزی حکومت بھی ریاستی حکومت سے مسلسل رابطہ قائم کئے ہوئے تھی اور مرکز نے عمارت کی حفاظت کے لئے متعدد مشورے بھی دیئے تھے اور چیف منسٹر کی حیثیت سے کلیان سنگھ نے عمارت کی حفاظت کے لئے قطعیت کے ساتھ یقین دہانی کرائی تھی۔ فروری ۱۹۹۳ء میں مرکزی حکومت کی جانب سے جاری کردہ وہائٹ پیپر میں اس ضمن کی طویل مراسلت کی تفصیل درج ہے۔

سب سے اہم پہلو۔ اس مسئلے کا دوسرا اہم پہلو اور بھی ہے چیف منسٹر یوپی کی حیثیت سے کلیان سنگھ نے پولیس افسران کو ہدایات دیں کہ ان گرم حالات سے نپٹنے کے لئے فورس کا استعمال نہ کریں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ضابطہ و قانون کی پامالی ہوتی رہی اور اعلیٰ احکام بے بس تماشائی بنے رہے۔ گویا ۱۸۵۵ء کا واقعہ دوہرایا گیا جب ہندو اور مسلمان کھل کر لڑ رہے تھے ۔ فیض آباد گزیٹیر اس واقعہ کو یوں بیان کرتا ہے کئی عدد شاہی رجمنٹ موجود تھیں لیکن انہیں حکم تھا کہ کوئی مداخلت نہ کریں ۔

تو یہ ہے پس منظر جس میں یوپی کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے کلیان سنگھ کی دوسری تاجپوشی کو دیکھنا چاہیئے ۔ توہین عدالت کے معاملے میں سپریم کورٹ نے انہیں صرف برائے نام کی سزا یعنی ایک روز کی قید اور ایک روپیہ جرمانہ پر ہی چھوڑ دیا تھا جبکہ کورٹ نے توہین عدالت کے جرم میں کرناٹک کے ایک آئی ایس افسر کو ایک ماہ سزا دی تھی۔ کلیان سنگھ اعلان کرتے ہیں کہ عوام کی عدالت قانون کی عدالت سے زیادہ اہم ہے مسٹر کلیان سنگھ کا دوبارہ چیف منسٹر کی حیثیت سے گدی نشین ہونا اس عدالت کے منہ پر بھی ایک طمانچہ ہے ۔ (دعوت ۱۶ اکتوبر ۹۷ء سے ماخوذ)

بھارت رتن سی وی رامن

فیچر

صدر جمہوریۂ ہند کی جانب سے ۲ جنوری ۱۹۵۴ء کو عالمی برادری کی منفرد خدمات
نے والے اشخاص کی خدمات کے اعتراف کی غرض سے ہندوستان کا اعلیٰ ترین اعزاز
رتن عطا کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ انسانی تاریخ کے صفحوں پر انمٹ
چھوڑنے والی بلند و بالا شخصیتوں کی خدمت میں خراج عقیدت پیش
یہ ایک طریقہ ہے آزادی کی پچاسویں سالگرہ کے تاریخی موقع پر ایسی ممتاز
یں کو یاد کرنا اور ان سے فیض حاصل کرنا چاہیے۔
چندر شیکھر وینکٹ رامن ان سائنسدانوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے
ں برائے سائنس کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔ ان کی زندگی کا مقصد
ور صرف سائنس تھا بلاشبہ وہ ہندوستان کے اعلیٰ ترین سائنسداں تھے
نی ابھی تک پیدا نہیں ہوا۔

سی وی رامن ۷ رنومبر ۱۸۸۸ء کو ترچیراپلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی عمر
انھوں نے اپنی غیر معمولی ذہنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ سترہ
ر میں رامن مدراس کے پریسیڈنسی کالج میں داخلہ لیا اور ۱۹۰۴ء کے دوران
ں بی اے کامیاب کیا۔ وہ ساری یونیورسٹی میں فرسٹ آئے۔ انھوں نے ۱۹۰۷ء میں

طبعیات میں ایم اے کا امتحان امتیاز کے ساتھ کامیاب کیا۔ ایم اے میں تعلیم کے دوران "فلاسفیکل میگزین" میں ان کا ایک طبع زاد مضمون شائع ہوا۔

رامن طبعیات میں دلچسپی رکھتے تھے اور اس شعبہ میں ریسرچ کرنا چاہتے تھے لیکن والدین کے بے حد اصرار پر انہوں نے ۱۹۰۷ء کے دوران انڈین آڈیٹ واکاونٹس سروس کے مسابقتی امتحان میں شرکت کی اور اول درجہ میں کامیابی حاصل کی۔ انھیں کلکتہ میں ڈپٹی اکاونٹنٹ جنرل مقرر کیا گیا۔ دس سالہ ملازمت کے دوران نمایاں خدمات کے عوض ان کی بے پناہ تعریف وتوصیف کی گئی۔

ابھی وہ ۱۹ سال ہی کے تھے کہ انھیں "انڈین ایسوسی ایشن فار دی کلٹیویشن آف سائنس" کا رکن مقرر کیا گیا۔ اس ادارہ کو ممتاز طبی ماہر ڈاکٹر مہندر لال سرکار نے کلکتہ میں قائم کیا تھا۔ ۱۹۰۷ء تا ۱۹۱۷ء کے دوران سوائے مختصر عرصہ کو چھوڑ کر رامن شام سے لے کر رات دیر گئے تک ہندوستانی آلات موسیقی کے صوتی آہنگ اور بصریات OPTICS پر تحقیق میں گذار دیئے اور اپنے تحقیقی نتائج کو ہندوستان اور بیرونِ ہند سائنس کے جرائد میں شائع کرواتے۔

۱۹ ویں صدی کی آخری چوتھائی کے دوران انگلش اسکول آف میتھمیٹکل فزکس نے کئی رسالے شائع کئے جن میں سے ایک تھیوری آف ساونڈ پر لارڈ ریلیے کا لکھا ایک رسالہ بھی تھا اس مقالہ نے رامن کی فکر کو مہمیز کیا اور انھوں نے ۱۹۰۷ء کے دوران پہلی دفعہ سارنگی سے پیدا ہونے ۱۹۰۷ء کے دوران پہلی دفعہ سارنگی سے پیدا ہونے والی آواز پر سنجیدگی سے تحقیق کرنی شروع کی۔ Calcutta Acoustical Society نے اس شعبہ میں ان کی بنیادی تحقیقات کے اعتراف میں انھیں سوسائٹی کی اعزازی

رنگینیت عطا کی۔

اشیاء کی آگے پیچھے حرکت کے نظریہ اور لہروں کے ارتعاش سے ان کی واقفیت نیز ہرمن وان ہیمبولڈس کے تحقیقات نے ان کی صوتیات سے دلچسپی کو بصریات کی طرف موڑ دیا۔ یقیناً رامن نے بصریات، [illegible] اور بلوری طبعیات کے شعبوں میں بہترین تحقیقات کیں۔ لیکن صوتیات سے انھیں ہمیشہ بے حد شغف رہا۔

۱۹۱۷ء کے دوران کلکتہ میں نئی قائم شدہ پلت چیئر کے لئے کسی موزوں شخصیت کی تلاش میں تھے اور سی وی رامن ان کی پہلی ترجیح تھے۔ رامن فوری طور پر اپنی منفعت بخش سرکاری ملازمت چھوڑ کر پلیت پروفیسر بننے پر راضی ہو گئے۔ ان دس برسوں کے دوران انہوں نے ۲۵ کتابیں شائع کیں جن میں آلاتِ موسیقی کے صوتی آہنگ پر ان کی اپنی منفرد تخلیق بھی شامل ہے جسے بیرونِ ہند گرم جوشی کے ساتھ قبول کیا گیا۔

پروفیسر رامن کی بزلہ سنجی، بلندیٔ فکر، غیر معمولی تقریری صلاحیت اور اختصارِ بیانی ان کے شاگردوں کے لئے ایک نعمت تھی۔ انہوں نے اپنے شاگردوں کو سائنسی تحقیقات اور تخلیقی کاموں کی انجام دہی کے لئے ہمت افزائی کی۔ ان کی تجربہ گاہ سائنسی مزاج کی آبیاری کا ایک بہترین ذریعہ ثابت ہوئی۔

۱۹۲۱ء میں برطانوی سلطنت میں واقع جامعات کی کانگریس میں شرکت کے لئے کلکتہ یونیورسٹی کی جانب سے رامن کو بطور مندوب بھیجا گیا جہاں انہوں نے بصریات اور صوتیات سے متعلق اپنی نادر تحقیقات کو عملی طور پر پیش کیا جنھیں کانگریس میں شریک ماہرینِ طبعیات کی بھاری تعداد نے بے حد پسند کیا۔

اس سفر کے دوران رامن نے اتفاقی طور پر اس نتیجہ پر پہنچے کہ سمندر کے [illegible] کا رنگ

دراصل روشنی کا انتشار ہے نہ کسی دوسری شئے کی موجودگی۔ ہندوستان لوٹنے کے بعد رشنی کے انتشار پر تحقیقات کیں اور اس نتیجہ پر پہونچکر ایک بہترین اور مرلوط مقالہ رائل سوسائٹی آف لندن کو روانہ کیا جس پر ۱۹۲۳ء کے دوران کلکتہ یونیورسٹی نے انھیں ڈی ایس سی (آنرز) کی ڈگری عطا کی۔ ان کی غیر معمولی تحقیقی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر رائل سوسائٹی آف لندن نے انھیں فیلو آف دی رائل سوسائٹی کا اعز کیا اس وقت ان کی عمر صرف ۳۶ سال تھی۔

اس کے فوری بعد برٹش ایسوسی ایشن فاردی اڈوانسمنٹ آف سائنس اور ا کی دیگر ممتاز یونیورسٹیوں نے انھیں مدعو کیا۔ امریکہ کی فارمن یرج لیبارٹری آ فزکس کے ماہرین طبعیات اور اسکالرس کے لئے انھوں نے باضابطہ تقر کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ مغربی یورپ کے کئی ممالک کے دورہ کے بعد وہ ۱۹۲۵ کلکتہ واپس لوٹے۔ رامن اپنے سفر یورپ کے دوران کئی ممتاز ماہرین طبعیا جیسے نیل بھور، میاکس پلانک، خابواتے اور سی یہاں سے ملاقات کی اور سا امور پر مباحث کیئے

۱۹۲۲ء کے دوران ایکس رے سے متعلق کومپن فکٹ پر پروفیسر اے ایچ کو مٹ طبعیات کا نوبل انعام دیا گیا اس کے بعد رامن نے یہ ثابت کیا کہ ایکس ریز انتشار بصری مطابقت کا نتیجہ ہے چنانچہ انھوں نے ۱۶ر فبرودی ۱۹۲۸ء کو ممتا سائنسی جریدہ "نیچر" کو اس ضمن میں ایک خط لکھا جس میں انھوں نے بتایا کہ اگر گلا کے بے حد شفاف پارہ میں سے سورج کی ایک طاقتور شعاع کو گذارا جائے تو وہ منتشر ہے انھوں نے اپنے نظریہ کو عملی طور پر ثابت بھی کیا۔

اس منفرد دریافت پر انہیں نوبل انعام دیا گیا اوران کی تحقیق کو رامن افکٹ کا نام دیا گیا۔ انہوں نے ۱۰ ڈسمبر ۱۹۳۰ء کو اسٹاک ہوم میں یہ انعام حاصل کیا۔ اس موقعہ پر انہوں نے قدیم ہندوستانی عظمت" مہاتما بدھ کی نفس کشی عدم تشدد اور ساری دنیا سے محبت وا خوات کا ذکر کیا۔

تئیس سال بعد رامن اسٹاک ہوم سے وطن واپس ہوئے اور کلکتہ کو چھوڑ دیا۔ انہیں بنگلور کے انڈین انسٹیٹیوٹ آف سائینس کے شعبۂ طبعیات کا ڈائرکٹر اور صدر مقرر کیا گیا۔

۱۹۳۴ء کے دوران انہوں نے بنگلور میں انڈین اکیڈیمی آف سائینس کی بنیاد رکھی اور اپنی موت تک اس ادارے کے صدر نشین برقرار رہے اس کے علاوہ پندرہ روزہ کورنٹ سائینس بھی ان ہی کی کاوشوں کا نتیجہ تھا لندن سے شائع ہونے والے "نیچر" کے خطوط پر شروع کیا گیا تھا اپنی ذاتی تحقیقات کے علاوہ رامن نے ہندوستان میں سائینسی استحکام کے لئے بھی گرانقدر خدمات انجام دیں۔

انہوں نے انڈین سائینس کانگریس کے استحکام کے سلسلہ میں بھی سرگرمی سے حصہ لیا تاکہ ہندوستان کے نوجوان سائینسداں آگے بڑھیں اور اس ادارے کے ذریعہ اپنی صلاحیتوں کو ابھاریں۔ رامن کئی برسوں تک اس ادارے کے جنرل سکریٹری اور صدر رہے۔

جب انہوں نے محسوس کیا کہ بنگلور کے انڈین انسٹیٹیوٹ آف سائینس کا ماحول ان کی تحقیقات کے لئے سازگار نہیں ہے تو انہوں نے اس سے اپنی ۵ سالہ وابستگی ختم کرلی۔ رامن نے ذاتی طور پر رامن ریسرچ انسٹیٹیوٹ قائم کیا جہاں پر ڈاکٹر لیچ جے

اور ڈاکٹر وکرم سارا بھائی جیسے نوجوان ساتھیوں کی رفاقت میسر آئی۔ کچھ عرصہ بعد
ان دونوں نے بھی مادر وطن کی وسیع تناظر میں خدمت کے لئے اس ادارہ کو چھوڑ
دیا۔ اپنی زندگی کے آخری دہے میں رامن اکیلے ہی اپنے کام میں لگے رہے۔
انہوں نے اپنے انسٹیٹیوٹ میں ایک بلوریں میوزیم قائم کیا اور تحقیقات میں
منہمک رہے۔ رامن نے دھاتوں اور ہیروں میں رنگ کے منبع کو دریافت کرنے
اور سمجھانے کے لئے تجربات کیئے۔ ہیروں سے ان کی دلچسپی غیر محدود تھی اور وہ اسے
مخصوص اشیاء کا بادشاہ کہا کرتے تھے۔

رامن اثر کی دریافت کے فوری بعد ان پر اعتراضات کی بارش ہونے لگی یہ
سلسلہ بعد میں بھی جاری رہا۔ انہوں ۱۹۴۱ء کے دوران فرینکلن میڈل عطا کیا گیا۔ رامن کو
روس، ہنگری، چیکوسلواکیہ اور رومانیہ کا رکن رابطہ مقرر کیا گیا اس کے علاوہ وہ فرانس
اکیڈمی آف سائنس کے غیر ملکی شریک کار بھی مقرر کیے گئے۔ ۱۹۶۱ء میں ویٹیکن نے
انہیں پونٹیفیشل اکیڈمی آف سائنس کے لئے منتخب کیا۔ پیرس، گلاسکو،
فری برگ، بمبئی، کلکتہ، مدراس اور ڈھاکہ کی یونیورسٹیوں نے انہیں ڈی ایس سی
اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں عطا کیں۔ ۱۹۴۷ء میں رامن کو طبعیات کا نیشنل پروفیسر
مقرر کیا گیا اور ۱۹۵۴ء میں جب قومی اعزاز دیا گیا جس کا نام بھارت رتن تھا جو
اسی سال سے شروع کیا گیا تھا۔ ۱۹۵۸ء میں سوویٹ یونین نے پروفیسر رامن کو لینن امن
انعام عطا کیا۔

رامن نے ایک دفعہ سائنسدانوں کے ایک گروپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ
سائنس کو تجربہ گاہوں کے باہر کائنات میں تلاش کرنا چاہیئے۔ نیز خود سائنسدان

ہلے سے اخذ کیے گئے سائینسی نتائج کو پیش نظر رکھ کر کام کرنے کے بجائے
د اپنے میں تخلیقی صلاحیت پیدا کریں۔ رامن کی سائینسی دریافتیں فطرت کو
جھنے کی ان کے بے پناہ تجسس کا نتیجہ تھیں۔
جس طرح انھیں موسیقی سے لگاؤ تھا اسی طرح اپنی زندگی سے بھی پیار
تھا انھیں فطرت سے محبت تھی چنانچہ اپنے گھر کے اطراف خوبصورت باغیچہ لگایا۔
دنیا ان کی زندگی اور سائینس ان کی معبود تھی ایک دفعہ گاندھی جی
سے خدا اور مذہب کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ
" اگر کہیں خدا کا وجود ہے تو ہمیں اسے کائینات میں تلاش
کرنا چاہیئے۔"
رامن نے ۲۱ نومبر ۱۹۷۰ء کو بنگلور میں اپنی زندگی کی آخری سانس لی
دنیا ان کی سائینسی خدمات کی وجہ سے انھیں ہمیشہ یاد رکھے گی۔
رامن افکٹ جس کی وجہ سے انھیں جو نوبل انعام ملا وہ ملک کے لئے
طبعیات کے شعبہ میں ابھی تک حاصل ہونے والا پہلا اعزاز ہے۔

جموں کشمیر اردو فورم میں پروفیسر آزاد کا خطبۂ صدارت

آزادیِ ہندوستان کی گولڈن جوبلی کی تقریبات کے سلسلے میں اردو فورم کا ایک مشاعرہ جامبولوچن ہال میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی زیرِ صدارت منعقد ہوا۔ جس میں جگن ناتھ آزاد کے علاوہ مالک رام آنند، نور صدیقی، محمد تسلیم منتظر، جوگندر طائر، امین بانہالی، رہبر جلبیدی کے کے شاکر، سلطان عارف اور آنند لہر نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ اور مستفید کیا۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا کہ آزادی کے بعد سے اردو زبان کے لیے ملک میں مشکلات کا ایک طویل سلسلہ چل نکلا جو آج تک جاری ہے ملک کی سیاسی پارٹیاں انتخابات سے پہلے اردو کے حامیوں کے ووٹ بٹورنے کے لیے اردو اردو کا شور مچانا شروع کر دیتی ہیں اور انتخابات کے بعد اردو کے بارے میں ایسی چپ سادھ لیتی ہیں جیسے ہندوستان میں اردو نام کی کوئی موجود نہیں زبان۔ چند ایک سیاسی لیڈروں کو چھوڑ کر جو اردو کے لیے مخلص ہیں زیادہ تر ایسے ہیں جو اپنی تقریروں میں تو کہتے ہیں کہ اردو کسی ایک فرقے کی زبان نہیں ہے بلکہ سارے ہندوستان کی زبان ہے لیکن پرائیوٹ بات چیت میں اسے مسلمانوں کی زبان کہتے ہیں اور بربنائے تعصب اس زبان کو نقصان پہنچانے کے درپے رہتے ہیں

جگن ناتھ آزاد نے کہا کہ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اس وقت ہندوستان کے وزیرِ اعظم

اندر کمار گجرال اور نائب صدر کرشن کانت پورے خلوص کے ساتھ اردو کے حامی ہیں۔ اگر ان کی موجودگی میں اردو کو اس کا حق نہ مل سکا تو یہ ملک کی بدنصیبی ہوگی۔

ایک اور خوش قسمتی ہم ریاست جموں و کشمیر والوں کی یہ ہے کہ یہاں کے تین بڑے خطوں میں جو جغرافیائی اعتبار سے ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں اردو صرف رابطے کی زبان ہی نہیں ہے بلکہ یہ صحیح معنوں میں تینوں خطوں یعنی کشمیر، جموں اور لداخ کے لوگوں کے درمیان دلوں کو ملانے کا کام بھی انجام دے رہی ہے جگن ناتھ آزاد نے چیف منسٹر جموں و کشمیر ڈاکٹر فاروق عبداللہ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ عنقریب ہی جموں و کشمیر میں اردو اکیڈیمی کا قیام عمل میں آرہا ہے اور امید ہے کہ اردو اکیڈیمی کے قیام کے بعد جموں کشمیر میں اردو کی سرگرمیاں اور تیز ہو جائیں گی۔

جموں و کشمیر اردو فورم کی اردو کے لئے خدمات کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے اردو فورم اور اس کے صدر جناب این بنجارہ کو دلی مبارکباد پیش کی اور کہا کہ ہندوستان میں ہمارے سامنے مسئلہ اردو زبان کا ہے نہ کہ اردو ادب کا۔ اس لئے ہمیں سمیناروں کی طرف اپنی توجہ کچھ کم کر کے زیادہ تر توجہ ابتدائی اسکولوں میں بچوں کو اردو تعلیم بالغان کے پروگرام کے تحت بڑی عمر کے لوگوں کو اردو پڑھانے کا انتظام کرنے میں صرف کرنا چاہیئے۔

جلسہ کے آخر میں ایک متحدہ طور پر قرار داد پاس ہوا جس میں حکومت جموں و کشمیر سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ جموں میں اردو اکاڈمی کے قیام کو اپنے کاموں کا ترجیحی فہرست میں شامل کرے۔

اردو لکھیئے، اردو پڑھیئے، اردو بولیئے

الکٹرانک میڈیا میں اردو کا حصہ

نئے وزیر برائے اطلاعات ونشریات جناب جے پال ریڈی نے اپنی وزارت کی باگ ڈور تھامتے ہی اردو داں طبقہ پر یہ احسان تو کرہی دیا کہ انھیں ان غیر اردو الفاظ اور اصطلاحات سے نجات دلادی جو طویل عرصہ سے زبردستی اردو نیوز بلیٹن پر ٹھونسے جارہے تھے۔ ان الفاظ واصطلاحات کے استعمال کے خلاف اردو داں طبقہ ایک عرصہ سے جدوجہد کررہا تھا۔ ان کا موقف تھا کہ جب اردو کے الفاظ، اصطلاحات موجود ہیں تو پھر کسی دوسری زبان کا استعمال کیوں کیا جاتا ہے مگر وزارت شاہی پر قابض بعض متعصب افسران اردو داں طبقے کی صدائے احتجاج کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اردو کا گلا گھونٹنے پر بضد تھے کیونکہ وہ ایک مخصوص رجعت پسند نظریاتی مسلک کے پیرو کار ہیں اور ملک میں اختلاف، شرپسندی اور افتراق پھیلانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

۲۸ جولائی کو پارلیمنٹ میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی اعلیٰ قیادت نے کشمیر کے جنگجوؤں کے تعلق سے وزیر اعظم کے بیان کو لے کر خواہ مخواہ کی نکتہ چینی کی تو عام طور پر ٹھنڈے مزاج کے مالک گجرال صاحب کو بھی غصہ آگیا اور جب بھاجپا کے ایک لیڈر نے ریڈیو اور دوردرشن سے نشر ہونے والے بیانات واعلانات میں تضاد ہونے کا الزام لگایا تو گجرال صاحب نے غصہ ضبط نہ کرسکے اور انھوں نے کہہ دیا کہ "وہاں بھی تو تمہارے ہی

لوگ بیٹھے ہوئے ہیں"۔ گجرال صاحب کے یہ الفاظ محض غصہ کا اظہار نہیں تھے بلکہ ایک حقیقت کا اعتراف تھا۔ ایک ایسی حقیقت سے نہ صرف اردو داں بلکہ ملک کے عام دانشور بخوبی واقف ہیں۔ البتہ وزیر اعظم کے الفاظ نے اس حقیقت پر مہر صدیق ثبت کر دی ہے۔

اب جب کہ جے پال ریڈی صاحب نے پرسار بھارتی بل کے پندرہ ستمبر سے نفاذ کا نفاذ کا اعلان کر دیا ہے تو اردو داں طبقے کی تشویش میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ پرسار بھارتی بل کے نفاذ کے بعد آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن دونوں ایک ہی ایک کارپوریشن کی شکل میں خود مختار ادارہ بن جائیں گے اور سرکاری کنٹرول سے آزاد ہو جائیں گے۔ ابھی تک یہ دونوں ادارے حکومت کے ماتحت تھے اور جن کی باگ ڈور وزارت اطلاعات و نشریات کے ہاتھ میں تھی۔ تشویش کی بات یہ ہے کہ جب آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن وزارت اطلاعات و نشریات کے ماتحت تھے تب ان اداروں کے ذمہ دار افسران نے اردو کا گلا گھونٹنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ حالانکہ وزارتیں ہمیشہ حکمراں پارٹیوں کے سیاسی مفادات کو ملحوظ رکھتے ہوئے کام کرتی ہیں اور ابھی تک ہر سیکولر جماعت کے منشور میں اردو کی ترویج و ترقی شامل رہی ہے مگر اس کے باوجود افسران اپنی من مانی کرتے رہے ہیں۔ لیکن اب جب کہ یہ ادارے خود مختار کارپوریشن کی شکل میں کام کریں گے تو ان متعصب افسران کو خوب کھیل کھیلنے کا موقع مل جائے گا اور وہ اردو کو زک پہنچانے کے عمل کو اور بھی تیز کر دیں گے کیوں کہ انھیں حکمراں جماعت کے سیاسی ایجنڈے کی تکمیل کی کوئی ذمہ داری نہیں ہوگی۔

آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن پر حاوی اس مخصوص ٹولے نے اردو داں طبقے کو

نقصان پہنچانے کے بجائے ملک کو زبردست نقصان پہنچایا ہے۔ انھوں نے یہ بات
نظر انداز کر دی کہ ملک کی ترقی جب ہی مستحکم اور پائیدار ہو سکتی ہے جب ترقی سماج
کی تمام سطحوں پر ہو اور سماج کو تشکیل دینے والے تمام فرقے اس ترقی میں حصہ دار ہوں۔
اس میں کوئی شک نہیں کہ الکٹرانکس میڈیا یعنی ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے ملک کی
ترقی میں بہت اہم رول ادا کیا ہے اور ملک کے دور دراز کے کونوں میں واقع ایسے علاقوں
کو بھی جذباتی اور فکری طور پر ایک دوسرے کے قریب کر دیا ہے جہاں تک سفر کرنا آج
بھی کار دارد ہے ایک ایسے ملک میں جہاں پچاس سال قبل آزادی کے وقت شرح تعلیم
انتہائی شرمناک حد تک کم تھی ریڈیو نے ملک میں ذہنی بیداری کے لیے زبردست کام
کیا ہے مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان پچاس سالوں میں ریڈیو نے اردو اور
اردو داں طبقے کے ساتھ نہایت نامناسب سلوک کیا ہے اب جب بات چھڑ ہی گئی
ہے تو آل انڈیا ریڈیو کی اردو پالیسی پر بھی ایک نظر ڈال ہی لی جائے۔

آل انڈیا ریڈیو آل انڈیا ریڈیو دنیا کا سب سے بڑا نشریاتی
نیٹ ورک ہے۔ اس نیٹ ورک میں ۱۰۵ ریجنل ریڈیو اسٹیشن، ۶۵ مقامی ریڈیو
اسٹیشن ہیں جو کہ ۲۴ زبانوں اور ۱۴۶ بولیوں میں پروگرام نشر کرتے ہیں ان تمام ریڈیو
اسٹیشنوں سے روزانہ ۲۱۰۰ گھنٹوں کے پروگرام نشر کیے جاتے ہیں ان کے علاوہ
۳۱ کمرشیل براڈکاسٹنگ ریڈیو اسٹیشن ہیں جو کہ فلمی موسیقی اور انٹرٹینمنٹ پروگرام نشر
کرتے ہیں جو ملک کے نوے فیصد علاقے اور ۹۷ فیصد آبادی تک پہنچتے ہیں۔ خبروں
کے نیشنل نیوز بلیٹن ۱۹ زبانوں میں نشر کیے جاتے ہیں ان کے علاوہ ۱۹ زبانوں اور
۴۵ بولیوں میں ۱۳۴ سے بھی زیادہ ریجنل نیوز بلیٹن نشر کیے جاتے ہیں لیکن آپ کو

یہ جان کر حیرت ہوگی کہ ان ۲۱۰۰ گھنٹے یومیہ پروگراموں میں اردو کا حصہ ۲۴ گھنٹے بھی نہیں ہے۔

البتہ چوں کہ پاکستان، افغانستان، بنگلہ دیش اور غیر ممالک کے اردو داں طبقے تک بھارتی حکومت کے موقف کی تشہیر ایک اہم ضرورت ہے اس لیے ریجنل / علاقائی نشریات کے علاوہ پندرہ گھنٹہ کی ایک اور سروس بھی ہے لیکن اس کے پروگراموں میں عموماً ملک سے باہر کے سامعین کے لئے دلچسپی کا سامان ہوتا ہے۔ اس لیے داخلی سطح پر اس سروس کے سامعین کی تعداد کوئی خاص نہیں ہے۔

ٹیلی ویژن اردو میں ریڈیو پروگراموں کا حال تو آپ نے دیکھ لیا لیکن ٹیلی ویژن کی نشریات کا حال بھی کوئی زیادہ حوصلہ افزا نہیں ہے۔ حالاں کہ اپنے اثر کے لحاظ سے ٹیلی ویژن کو بصری فوقیت حاصل ہے صحیح معنوں میں ٹیلی ویژن، کھیل اور ڈائرکیٹ ٹو ہوم ٹیلی ویژن نشریات نے دنیا کے پھیلاؤ کو ایک گاؤں کی طرح محدود کر دیا ہے اور زندگی کے ہر شعبے میں انتہائی انفرادی فکر کو اس طرح متاثر کیا ہے کہ بڑی بڑی سماجی، معاشرتی، معاشی اور نظریاتی تبدیلیاں ظہور میں آرہی ہیں۔

ریڈیو کی طرح ٹیلی ویژن پر بھی سرکار کا کنٹرول ہے ۱۹۵۹ء میں ٹیلی ویژن نشریات کا آغاز ایک "تعلیمی چیانل" کے طور پر ہوا تھا ۱۹۸۲ء تک ٹیلی ویژن کی رفتار بہت سست تھی لیکن اس کے بعد سابق وزیر اعظم آنجہانی راجیو گاندھی کی ذاتی توجہ کی بدولت ٹیلی ویژن دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگا۔

آج ملک میں پرائمری چیانل کے ۶۰۰ ٹرانسمیٹر اور میٹرو چیانل کے ۲۷ ٹرانسمیٹر کام کر رہے ہیں ان کے علاوہ چھ ٹرانسمیٹر خصوصی چیانل نشر کرتے ہیں۔ ان سب کے

علاوہ مختلف علاقائی زبانوں کے پروگرام دس سیٹلائیٹ چینلوں سے نشر کیے جاتے ہیں ایک چینل پر موؤی کلب چلتا ہے اور ایک انٹرنیشنل چینل بھی کام کر رہا ہے۔ دوردرشن پرائمری یا نیشنل چینل پر ہر ہفتہ ۱۱ گھنٹے، میٹرو چینل پر بھی ۱۰، ۱۱ گھنٹے اور خصوصی چینل پر ۲۰ گھنٹے کے پروگرام ٹیلی کاسٹ کرتا ہے۔ اب ذرا دیکھیئے ٹیلی ویژن پر اُردو کی کیا حالت ہے۔

ان کے علاوہ ۱۵ مقامی ٹی وی اسٹیشن اور ہیں جو ہفتے میں اپنی علاقائی زبانوں میں ۷۰ گھنٹے کے پروگرام نشر کرتے ہیں مگر ان سب میں اُردو کو صرف ساڑھے چھ گھنٹے مل پاتے ہیں۔ ان اعداد و شمار میں وہ مخصوص علاقائی زبانوں میں روزانہ فی چینل دس گھنٹے کے پروگرام نشر کرتے ہیں۔ یہ سیٹلائیٹ چینل آسامی، بنگالی، تلگو، ٹامل، کشمیری، اڑیا، کنڑا، ملیالم، مراٹھی اور گجراتی میں پروگرام نشر کرتے ہیں۔ لیکن بے چاری اُردو کے لیئے کوئی سیٹلائیٹ چینل نہیں ہے۔ غالباً وزارت اطلاعات و نشریات کے نزدیک یہ زبان ایسی بے وقعت ہے کہ اس میں خصوصی پروگرام نشر کرنا ہی بے کار ہے۔ حالاں کہ ایمانداری سے دیکھا جائے تو اُردو ہی ایک ایسی زبان ہے جس کے بولنے اور سمجھنے والے ملک کے ہر حصے میں کثیر تعداد میں موجود ہیں۔

اُردو زبان کا پھیلاؤ ۱۹۹۱ء کی مردم شماری کے مطابق ملک میں مسلم آبادی (جموں کشمیر کی آبادی کو شمار کیئے بغیر) دس کروڑ پندرہ لاکھ تھی جو کل آبادی کا بارہ فیصد تھی آسام، بنگال، کیرالا، اور ٹاملناڈو کے بعض علاقوں کو چھوڑ کر دیگر تمام ملک میں مسلمانوں میں اُردو کا چلن عام ہے۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیے)

ماہنامہ

شاداب

حیدرآباد

جلد (۱۳)

شمارہ (۱۲) ڈسمبر ۱۹۹۷ء

قیمت ۱۰ روپے

ایڈیٹر : محمد قمرالدین صابری

جائینٹ ایڈیٹر : رشید الدین

مینجنگ ایڈیٹر : قدیر انصاری

مجلس مشاورت :- محترمہ عائشہ بیگم ۔ ڈاکٹر منشاء الرحمن خان منشاء

محترمہ سیدہ مہر پروفیسر تراب علی ڈاکٹر یوسف الدین محمد منظور احمد منظور

منیر احمد صدیقی

شرحِ تعاون

ہندوستان	سالانہ	۱۰۰ روپے	دو سال کے لئے	۱۸۰ روپے	تاحیات ۱۵۰۰ روپے
خلیجی ممالک سے	"	۳۰۰ "	"	۵۵۰ "	" ۴۰۰۰ "
امریکہ	"	۵۰ ڈالر	"	۹۰ "	" ۹۰۰ ڈالر
انگلستان	"	۲۰ پونڈ	"	۵۰ پونڈ	" ۵۰۰ پونڈ
پاکستان	"	۲۰۰ روپے	"	۳۵۰ روپے	" ۴۰۰ روپے

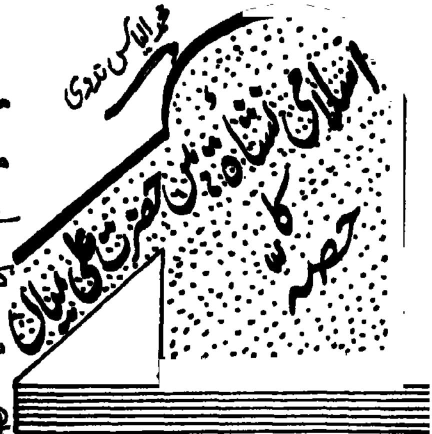
ترسیلِ زر کا پتہ : ماہنامہ شاداب ۱۴۷-۵-۱۱ ریڈہلز حیدرآباد

ایڈیٹر پرنٹر پبلشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ شاداب ۱۴۷-۵-۱۱ ریڈہلز حیدرآباد سے شائع کیا۔

فہرست

شاداب میں اشاعت کے لئے مضامین و تخلیقات کا طلبیدہ ہونا ضروری نہیں ہے

غیر مطبوعہ ہونا ضروری ہے۔ ★ تخلیقات صاف و خوشخط روانہ کیجئے



نوجوان صاحبِ قلم ندوی فاضل
مولوی محمد الیاس بھٹکل
مصنف سلطان ٹیپو شہید
نے یہ مقالہ ۳؍ اکتوبر ۱۹۹۷ء
کو رابطہ ادب اسلامی ہند
سیمینار پٹنہ میں پڑھا۔ امید
ہے یہ مقالہ قارئین کو اس عربی کتاب
کے ترجمہ "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" پڑھنے پر مجبور کرے گا۔

موجودہ پندرہویں صدی ہجری کے بارے میں آثار و قرائن یہ بتا رہے ہیں کہ یہ صدی اسلامی صدی ہوگی، پچھلی صدیوں کے مقابلہ میں اگرچہ مسلمانوں کے مسائل و مصائب میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے لیکن دوسری طرف عددی اور مادی اعتبار سے مسلمانوں نے سابقہ صدیوں کے مقابلہ میں غیر معمولی ترقی کی ہے اس وقت اقوام متحدہ میں عالمی آبادی سے متعلق شعبہ کی رپورٹ کے مطابق روئے زمین پر بسنے والے ۶ ارب انسانوں میں مسلمان تقریباً ڈیڑھ ارب کے ساتھ پچیس فی صد کے قریب پہونچ چکے ہیں۔ حالانکہ ابھی ۱۴۷ سال قبل ۱۸۵۰ء میں مسلمانوں کا جملہ عالمی تناسب بمشکل 19 فیصد تھا۔ دنیا کے جملہ ۲۲۸ ممالک میں اس وقت ۵۵ مسلم ممالک ہیں۔ چالیس پینتالیس سال قبل تک ان میں سے ۱۶ ممالک فرانس، برطانیہ اور روس کے قبضہ میں تھے اور عالمی جغرافیہ میں پندرہ مسلم ممالک ہی نظر آ رہے تھے۔ رقبہ میں مسلمانوں کی ترقی کا حال بھی اس سے زیادہ ہی خوش کن ہے ابھی انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں برصغیر میں مغلیہ سلطنت اور افریقہ کے اکثر مسلم ممالک کے زوال

سے مسلمان صرف ۶۵ لاکھ کے قریب مربع کلو میٹر پر حاکم تھے جو دنیا کا ۵ فیصد سے بھی کم حصہ تھا لیکن اس وقت الحمدللہ ۱۹۹۷ء میں ۳۰ کروڑ . ۵ لاکھ مربع کلو میٹر سے بھی زائد رقبہ کے ساتھ پوری دنیا کے ۲۵ فیصد رقبہ پر مسلمان حکومت کر رہے ہیں اس کے علاوہ دنیا کی سب سے بڑی صنعتی دولت پیٹرول کے ۸۴ فیصد حصے مسلمانوں کے قبضہ میں ہیں یورپ و امریکہ میں اسلام کے شیدائیوں میں حیرت انگیز طور پر اضافہ ہو رہا ہے۔ افریقی و ایشیائی ممالک سے مسلمانوں میں تعلیمی تناسب بڑی تیزی سے بڑھ رہا ہے غرض یہ کہ مجموعی طور پر پوری دنیا میں اس وقت اسلام ہی سب سے مقبول ترین مذہب کی شکل میں سامنے آگیا ہے۔

اسلام کی اس نشأۃ ثانیہ میں اللہ نے اپنے جن نیک و مقبول بندوں کو ذریعہ و وسیلہ بنایا ہے ان میں ایک نام اپنے نیک و صالح والدین کی دعاء نیم شبی کے زیر اثر خالص روحانی و علمی ماحول میں پرورش پانے والے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم کی ذات گرامی کا ہے۔ جن کا شجرۂ نسب بقول ماہر القادری "اصلھا ثابت وفرعھا فی السماء تؤتی اکلھا کل حین باذن ربھا" کے مصداق ہے۔

اسلامی نشأۃ ثانیہ میں مولانا کے حصہ کو ہم خطبات و تالیفات کے دو خانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ اول الذکر کی بھی دو قسمیں کی جا سکتی ہیں۔ اول وہ دعوتی تقریریں اور عوامی مواعظ جن کے اندر نہ صرف پیغام عمل اور پیام فکر ہے بلکہ وہ ادب پاروں کے رنگارنگ گلدستے بھی اور بقول شاہ حلیم عطا صاحب "اس میں وہ علمی نکتے سننے کو ملتے ہیں جو علماء سلف کی یاد تازہ کرتے ہیں" اور بقول صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب "جس میں فصاحت طلاقت لسانی کا رس گھولتی ہے" جس کو سن کر ملک کے مایہ ناز خطیب شورش کاشمیری کو بھی فردوس کی روشوں کا گمان ہوتا ہے۔ جہاں زبان تنوع حاصل کرتی ہے اور دماغ فکر و نظر کے جادوں پر ٹہلنے لگتا ہے اور شورش صاحب اپنی کتاب فن خطابت

میں مولانا کو ہندوستان کے حجازی خطیب کا نام دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور جن تقاریر کو سن کر
شیخ وقت حضرت مولانا زکریا صاحب کاندھلوی نے یوں فرمایا کہ "میرا جی چاہتا ہے کہ یہ تقریریں
لاکھوں کی تعداد میں عربی انگریزی اور اردو میں چھپیں اور ایک ہزار نسخوں کا میں خود پیشگی خریدار ہوں"
دوسری قسم علمی و سیاسی سطح کے چوٹی کے لوگوں سے خصوصی و ذاتی ملاقاتوں کے ذریعہ ان کو
اور نظام مملکت کو صحیح اسلامی و دینی اصولوں کے مطابق ڈھالنے کی مولانا کی ترغیب ہے۔ جن میں
والی حجاز شاہ فیصل مرحوم اور جنرل ضیاء شہید وغیرہ جیسے لوگ شامل ہیں۔

اسی طرح ہم مولانا کی تصنیفی خدمات کو یوں دو خانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ اول دینی مدارس و اسلامی
معاہد کے لئے دینی تعلیمی نصاب کی تیاری میں مولانا کی وہ غیر معمولی کوششیں ہیں جس میں بیک وقت
بقول مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم زبان و دین کو اس طرح پیوست کر دیا گیا ہے جس طرح گوشت
اور ناخن کو اور جس کو مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ نے بچوں کے علم کلام سے تعبیر کیا ہے اس میں سرفہرست
قصص النبیین اور القراءۃ الراشدہ کے مختلف اجزاء کے علاوہ مختارات وغیرہ شامل ہیں اور جو
اس وقت برصغیر سے زیادہ عربی ورلڈ کے مدارس وغیرہ میں داخل نصاب ہیں اور جس میں انبیاء
کے واقعات کی تشریحات کو صاحب فی ظلال القرآن نے ایمانی حقائق کی نقاب کشائی سے تعبیر کیا ہے
تحریر کی دوسری قسم مختلف اوقات و ماحول میں متعدد مجلات و رسائل میں لکھے جانے والے
ہزاروں مضامین کے علاوہ اسلام کی حقانیت کو ثابت کرنے والی وہ مستقل تالیفات و تصنیفات ہیں
جس سے ہزاروں بندوں کے قلوب شمع ہدایت سے فروزاں ہوئے اور لاکھوں نوجوان مغرب کے
ملحدانہ افکار و نظریات سے محفوظ ہیں۔ استاذ مکرم مولانا نذر الحفیظ صاحب ازہری اپنے سفر نامہ ترکی
شہر آرزو استنبول میں لکھتے ہیں کہ اس وقت ترکی میں وزارت داخلہ کی خفیہ رپورٹ کے مطابق وہاں
آنے والی اسلامی بیداری کی تلی لہر میں مولانا کی کتابوں کا بڑا ہاتھ ہے اور اس وقت ترکی میں تین متکلم

شخصیات کی کتابیں سب سے زیادہ پڑھی جا رہی ہیں ان میں مولانا بھی شامل ہیں۔ ان کتابوں میں سرِ فہرست ماذا خسر العالم اور تاریخ دعوت و عزیمت وغیرہ ہیں۔ موضوع کی وسعت کے پیش نظر اس وقت ہمارا روئے سخن اول الذکر کتاب تک محدود رہے گا۔

آخر ماذا خسر العالم میں وہ کیا بات ہے کہ عالم عرب میں اس کی شہرت کا یہ عالم ہے کہ آج وہاں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں کہ جو ہندوستان کو تو نہیں جانتے لیکن صاحب ماذا خسر سے ضرور واقف ہیں۔ بعض علاقوں میں کتاب خود صاحب کتاب سے زیادہ شہرت رکھتی ہے بیسویں صدی عیسوی کے نامور صاحب قلم اور داعی و مبلغ عالم اسلام کے چوٹی کے مفکر اور اخوانی رہنما سید قطب اس کی وجہ بیان کرتے ہیں۔

" اس کتاب نے مسلمانوں میں خود اعتمادی پیدا کی ہے۔ اس سے ان میں ماضی پر اعتماد اور مستقبل کے بارے میں امید و حوصلہ پیدا ہوا ہے۔ کتاب میں صرف جذبات کو ابھارنے اور عصبیت کو جوش دلانے کے بجائے اپنے دعوے کے بارے میں ٹھوس علمی حقائق سے کام لیا گیا ہے جو بیک وقت وجدان و شعور اور فکر و نظر دونوں کو اپیل کرتے ہیں۔ تاریخی واقعات اور اس عصر کے ماحول و متعلقات ایسے منصفانہ طریقہ پر پیش کئے گئے ہیں جس میں مصنف کی روشن دماغی صاف جھلکتی ہے پھر فیصلہ واقعیت اور صداقت اور قلب و ضمیر کی بصیرت کے سپرد کیا گیا ہے جس کی وجہ سے کتاب کے مباحث کی تمام کڑیاں مربوط و پیوست نظر آتی ہیں اور کہیں بھی کسی مسئلہ میں مقدمات سے نتائج اخذ کرنے میں غیر واقعیت یا تکلف کا ثبوت نہیں ملتا۔ یہ علمی مرقع خط ارضی کے صحیح خد و خال نمایاں کرتا ہے۔ جس کی ترتیب میں مؤلف نے کسی خود رائے یا ضد کا مظاہرہ نہیں کیا۔ یہ تاریخ کا ایک کامیاب نمونہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسلمان کو یورپ کے اسلوب نگارش سے بے نیاز ہو کر تاریخی مباحث پر کس طرح قلم اٹھانا چاہئیے۔ غرض یہ کہ اس موضوع پر تمام قدیم و جدید لٹریچر میں جو چند بہترین کتابیں میری نظر

سے گذریں اس میں یہ ایک کتاب ہے۔"

محترز معامعین اا ب تک انسانی و اسلامی تاریخ میں اس بات پر بہت ہی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی تھی کہ دنیا میں مسلمانوں کا سیاسی زوال کیوں اور کب ہوا اور اس کے ظاہری اسباب کیا تھے۔ اب تک یہی سمجھا جا رہا تھا کہ عالمی نقشہ میں مسلمانوں کے سیاسی عروج سے صرف مسلم امت ہی کو فائدہ پہونچا اور ان کے زوال کے اثرات بھی انہی تک محدود رہے۔ لیکن دنیا کی رہنمائی سے مسلمانوں کے کنارہ کش ہو جانے سے عالم انسانیت کو نقصان پہونچا اور بحیثیت ایک امت دعوت کے اس خدا شناس ملت کے ہاتھ سے قیادت کے چھن جانے اور مادہ پرست انسانوں میں عالمی قیادت کے آجانے سے جو زوال آیا اس کو مستقل موضوع بنا کر تحقیقی و علمی کام ہونے کے برابر تھا، ضمنی حیثیت سے تو اس پر متعدد تالیفات میں روشنی ڈالی گئی تھی اس کتاب کے منظر عام پر آنے سے یہ نقطۂ نظر سامنے آیا کہ خود انسانیت کی حقیقی بھلائی کے لئے بھی مسلمانوں کا اس وقت پورے عالم میں منصب قیادت پر فائز ہونا ناگزیر ہے اور اس کتاب کی اشاعت سے خود مسلمانوں کے اندر بھی اپنی مجرمانہ کوتاہی پر ندامت و شرمندگی کے ساتھ عالمی قیادت کو حاصل کرنے کا جذبہ و ولولہ پیدا ہوا اس کتاب میں سب سے پہلے علمی دنیا میں جاہلیت کی اصطلاح کو ما قبل عہد نبوی یا کسی زمانے یا وقفہ کے ساتھ خاص کرنے کے بجائے یہ دکھایا گیا کہ جاہلیت انسانی فکر کی مخصوص ساخت کا نام ہے جو اس وقت ابھرتی ہے جب انسان خدا کے مقرر کردہ اخلاقی و دینی حدود کو پار کر جاتا ہے اور اس معنیٰ میں یہ جاہلیت آج بھی مغرب میں اپنی علمی و صنعتی ترقی کے باوجود موجود ہے مغرب کے لیے چیلنج اور مشرق کے لئے تازیانہ بننے والی اس کتاب کی یہی وہ خصوصیات ہیں جس کی وجہ سے کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر اور مشہور مغربی مستشرق سارجن کو یہ کہنا پڑا کہ اگر برطانیہ میں کسی کتاب کی درآمد پر پابندی لگانے کا رواج ہوتا تو میری سفارش ہوتی کہ اس کتاب کے داخلہ پہ پابندی عائد کی جائے بالآخر ۱۹۹۵ء میں فرانس

سکے ہوائی اڈہ پر مغربی تہذیب پر مدلل تنقید کی پاداش میں جن تین عالمی مسلم شخصیات کی کتابیں ضبط کی گئیں ان میں ایک صاحب ماذا خسر بھی تھے۔ ام القریٰ یونیورسٹی کے پروفیسر محمد قطب کہتے ہیں کہ ماذا خسر نے پہلی بار سب سے پہلے بڑی خود اعتمادی سے مغربی فکر و فلسفہ اور تہذیب کا تجزیہ کیا ہے اس کی تحریروں پر اعتماد بحال ہوتا ہے لندن یونیورسٹی میں میڈل ایسٹ سیکشن کے چیئرمین ڈاکٹر بکنگھم کو بھی اس کتاب کے مطالعہ کے بعد اس اعتراف کے بغیر چارہ کار نہیں رہا کہ اس صدی میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے لئے جو کوشش بہتر سے بہتر طریقے پر کی گئی ہے یہ کتاب اس کا ایک نمونہ اور تاریخی دستاویز ہے۔

مشہور ادیب و مورخ استاذ محمد المبارک نے زبان حق سے یہ گواہی دی کہ میرے نزدیک ماذا خسر کا یہ علمی تحفہ اس صدی کی چند بہترین کتابوں میں سے ہے۔ عالم اسلام کے ممتاز قائد مفتی امین الحسینی صاحب مصنف کتاب کے نام ۲۷ رجون ۱۹۵۴ء کو ایک خط میں لکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ آپ نے نہ صرف ملت کی بیماریوں کی تشخیص کی ہے بلکہ اس کا علاج بھی تجویز کیا ہے جامع ازہر میں کلیۃ اللغہ کے سربراہ ڈاکٹر عبد المنعم احمد یونس کا کہنا ہے شیخ ندوی اپنی ان تحریروں کے ذریعہ نہ صرف مسلمانوں بلکہ پوری انسانیت کے مربی و محسن بن گئے ہیں اس کتاب میں اسلام کی روح کو اس کے صحیح اصولوں کے مطابق سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے اور مورخانہ انصاف کا اس قدر لحاظ رکھا گیا ہے کہ سید قطب مرحوم کو بھی اپنی معرکۃ الآرا تفسیر فی ظلال القرآن میں اس کے اقتباسات نقل کرنے پڑے ہیں اور خود برصغیر میں حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے بھی اپنی کتاب نقش حیات میں اس کا حوالہ دیا ہے۔

کتاب میں جس اسلوب کا لحاظ رکھا گیا ہے اس کیلئے خطیب وقت اور محقق عصر علامہ یوسف القرضاوی کی گواہی کافی ہے جن کا کہنا ہے کہ شیخ ندوی کا اسلوب نہ صرف ادیبانہ بلکہ ساحرانہ ہے وہ ایسے داعی ہیں جو انسانوں کی نفسیات اور ان کی عقلی سطح سے مطابق گفتگو کرتے ہیں تمام انسانی طبقات

کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کرنے کی بے پناہ صلاحیتوں سے اللہ تعالیٰ نے انھیں نوازا ہے وہ
زمان و مکان اور انسانی طبائع و مزاج کی پوری رعایت رکھتے ہیں، شیخ ندوی کی جس تاریخ کے بارے
میں اتنی تیز ہے کہ جو اہم دعوتی و تربیتی نتائج وہ نکالتے ہیں ہمارا ذہن بھی اس طرف نہیں جاتا۔ آئمۂ حرم
ئو بھی صحنِ حرم سے پوری انسانیت کے نام اپنے جمعہ و عیدین کے خطبات میں بارہا ماذا خسر العالم کے
ئوالے سے گفتگو کرتے سنا گیا ہے۔

دنیا کی سب سے قدیم اور باوقار یونیورسٹی جامع ازہر کے شیخ الازہر کو بھی یہ اعتراف کرنا پڑا کہ
یہ کتاب اس صدی کا بہترین تحفہ ہے اپنے وقت کے محدث شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ نے ۱۰ ڈسمبر ۱۹۸۹ء
میں حضرت مولانا کے نام ایک خط میں آپ کے دعوتی اسلوب کی خوبیوں کو کچھ یوں بیان کیا ہے کہ آپ کا
لم شہد خالص کی طرح شفا کا کام دیتا ہے اور زخم کا مرہم ثابت ہو کر دین کی لگن پیدا کرتا ہے، برصغیر
کے نامور مورخ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر خلیق احمد نظامی کو جو خود
بی اس میدانِ تاریخ میں مولانا کے ہم پایہ تھے یہ اعتراف کرتے سنا گیا کہ اس کتاب میں ایک
حساس ملی شعور کی آنکھیں شاہراہ مقصود کا پتہ دیتی ہیں اس نے مغرب کو اس تہذیب کے مہلک
ثرات سے باخبر کیا ہے جو خودکشی کے لئے اپنے دامن میں خنجر چھپائے ہوئے ہے مولانا کی علمی و ادبی
اوشوں کا رشتہ ملت کی ضروریات حالات کے تقاضوں دعوت و اصلاح کے مطالبوں اور احیائے
ین کے جذبات سے کچھ اس طرح جڑا ہوا ہے کہ اگر ان تاریخی تصانیف کا پس منظر ذہن میں نہ ہو تو
ت اسلامیہ کا ذہنی و فکری تاریخ کا جیتا جاگتا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ پاکستان کے مشہور صاحب قلم
وثر نیازی مرحوم اس کتاب سے متاثر ہو کر اپنے ایک سفرنامہ میں یوں لکھتے ہیں کہ جدید و قدیم نسلوں کو
بی زبان قلم سے متاثر کرنے کا زبردست ملکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی شخصیت میں رکھا ہے وہ پوری دنیائے
سلام میں کئی حیثیتوں سے اپنا ثانی نہیں رکھتے، جامع ازہر کے سابق پروفیسر محمد یوسف مکی نے علمی دنیا میں

ببانگ دہل اس بات کا اعلان کیا کہ میرے نزدیک اس کتاب کا مطالعہ ہر اس شخص کے لئے ضروری ہے جو اس وقت کسی بھی ناحیہ سے اسلام کی سربلندی کے لئے کوشاں ہے آخر کیا بات ہے کہ اس کتاب کو پڑھ کر برصغیر کے مشہور نقاد عامر عثمانی بھی یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ مجھے مولانا کی تحریر میں غزالی کی فکر، شبلی کا قلم اور ابن تیمیہ کا جوش و اخلاص کارفرما نظر آتا ہے۔

غرض یہ کہ مغربی تہذیب پر نقد اور اسلام کے دفاع کے سلسلہ میں مدافعانہ و معذرت خواہ اسلوب کے بجائے خوددارانہ اور جارحانہ اسلوب کی وجہ سے عربی ممالک میں عدالت کی بحثوں اور پارلیمان کی تقریروں میں اس کتاب کے حوالہ دیئے جاتے ہیں اس وقت یہ کتاب نہ صرف کئی ممالک کے نصاب تعلیم میں بلکہ عالمی اسلامی تحریک اخوان المسلمین کے تربیتی کورس میں بھی داخل ہے آنے والے مورخین جب بیسویں صدی عیسوی میں اسلامی بیداری کی لہر کے پس منظر میں کارفرما عوامل کا جائزہ لیں گے تو انھیں یہ کتاب یقیناً سرِ فہرست نظر آئے گی جس کی مقبولیت کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۹۸۲ء تک اس کے مصر، بیروت و شام وغیرہ سے عربی میں سولہ (۱۶) قانونی ایڈیشن نکل چکے تھے اور آخری ایڈیشن بھی ایک لاکھ نسخوں پر مشتمل تھا جو کسی بھی دینی کتاب کے لئے جو علمی و تحقیقی ہو ایک عالمی ریکارڈ سے کم نہیں اردو کے دس یا رہ ایڈیشن کے علاوہ انگریزی، فارسی، ترکی اور روسی وغیرہ کے دسیوں ایڈیشن اس کے علاوہ ہیں اور یہ بھی صرف قانونی ایڈیشنوں کا ایک مختصر خاکہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت مولانا کو ان کی علمی و دینی خدمات کی بدولت ملی غیر معمولی مقبولیت ہی کا نتیجہ ہے کہ پورے ہندوستان میں مولانا ہی کو سب سے پہلے فیصل ایوارڈ کے لئے منتخب کیا گیا جس کی حیثیت اس وقت عالم اسلام میں نوبل پرائز کی ہے اور بقول محترم مولانا عبداللہ عباس صاحب ندوی "اپنے عمر کی رفتار سے زیادہ تیز علمی و دینی سفر کرنے والا اللہ کا یہ مقبول بندہ عمر کے اس مرحلہ میں بھی

جب اس کو آرام کی سب سے زیادہ ضرورت ہے کبھی آکسفورڈ کے اسلامی سنٹر میں صدارت کرتا ہوا نظر آ رہا ہے تو کبھی رابطہ عالم اسلامی کے یا دقار ڈائس پر شیخ بن باز کے ساتھ دکھائی دیتا ہے کبھی ہند کے وزیراعظم سے ملی مسائل پر گفتگو کرتے دکھائی دیتا ہے تو کبھی ترکی و مراقش کی علمی مجالس میں۔ اس کی یہی وہ ملی تڑپ اور کڑھن ہے جس کی بناء پر اس کے حق میں آئمہ حرم اور شیوخ ازہر سے ابوتا اور مشیخنا کے الفاظ سن کر ہم ہندوستان کا سر فخر سے اونچا ہوتا ہے اور بقول پاکستانی سپریم کورٹ کے جج مولانا تقی عثمانی صاحب ان سب خدمات کے عوض اس کی پوری زندگی دعوت الی الاسلام کا دوسرا نام بن گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ ملت کی اس عظیم امانت کو تا دیر سلامت رکھے۔ آمین

(بقیہ : ہمارے گجرال صاحب اور تہنیت)

دستورِ فنِ مدح یہی ہے قدیم سے

اور گجرال صاحب آپ کے چہیتے شاعر فیض کی زبان سے ؎

پھر سے بجھ جائیں گی شمعیں جو ہوا تیز چلی : لا کے رکھو سرِ محفل کوئی خورشید اب کے

پھر سے بجھ جائیں گی شمعیں، کے آگے قوسین میں (خدا نہ کرے)

★★★

رپورٹ: عمران نقوی

حرمین شریفین کے سفر نامے

عالمی رابطہ ادب اسلامی ایک بین الاقوامی تنظیم ہے جس کی تشکیل ۱۹۸۶ء میں عمل میں آئی
اس کے بنیادی مقاصد میں نقدِ ادب کے اسلامی اصول کی تدوین، فنونِ لطیفہ کو با مقصد اسلامی ادب
کے تابع کرنا، تاریخ ادب اسلامی کی تدوینِ نو، اسلامی ادوار کی قابلِ قدر اور دلکش ادبی تخلیقات
کی جمع و تدوین، غیر اسلامی تحریکات، ادب کا فکری مقابلہ اور اسلامی ادب کو عالمی معیار عطا کرنے
کے لیے مختلف ممالک کے اسلامی ادباء سے گہرے روابط پیدا کرنا شامل ہے۔ تنظیم کا قیام اگرچہ
ہندوستان میں عمل میں لایا گیا لیکن اس کے مقاصد کے اجمالی جائزے سے ہی واضح ہو جاتا ہے
کہ عالمی رابطہ ادب اسلامی کی تحریک پورے عالمِ اسلام کا احاطہ کرتی ہے تنظیم کے بانی اور صدر
مسلم دنیا کے ممتاز مفکر مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی ہیں ـــــ عالمی رابطہ ادب اسلامی ہر سال
ہندوستان اور اس سے باہر بین الاقوامی سیمیناروں کا اہتمام کرتا ہے، اب تک اعلیٰ معیار کے ۱۲ علمی
مذاکرات منعقد ہو چکے ہیں۔ نومبر ۱۹۹۶ء میں جامعہ سبیل السلام حیدرآباد میں منعقد ہونے والے
مذاکرے کا عنوان تھا "ملفوظات و مواعظ ادب کے آئینے میں" رابطہ کی پاکستان میں شاخ
کے صدر ممتاز ادیب، دانشور اور پرنسپل اورینٹل کالج پنجاب ڈاکٹر ظہور احمد اظہر ہیں، دیگر عہدہ
داروں میں حافظ فضل الرحیم، پروفیسر تحسین فراقی اور ڈاکٹر محمود الحسن عارف شامل ہیں۔ گذشتہ
دالوں رابطۂ ادب اسلامی پاکستان کے زیرِ اہتمام دو روزہ بین الاقوامی سیمینار کا انعقاد لاہور میں

کیا گیا۔ موضوع تھا " حرمین شریفین کے سفرنامے جدید تحدیات کے تناظر میں" اس سیمینار میں متعدد اسلامی ممالک کے مندوبین نے شرکت کی۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت صدر پاکستان سردار فاروق احمد خاں لغاری نے کی، مہمان خصوصی مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی، گورنر پنجاب شاہد حامد اور محبوب احمد حنیف جسٹس وفاقی شرعی عدالت پاکستان تھے۔ پروفیسر ظہور احمد اظہر نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا اور مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی ہندوستان نے تعارفی کلمات ادا کیئے۔

صدر مملکت سردار فاروق احمد خاں لغاری نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ اسلامی ممالک اس وقت اپنے اپنے معاشروں کی تشکیل نو سے گذر رہے ہیں اور یہ تعین کر رہے ہیں کہ ان کی حیات اجتماعی کن خطوط پر تشکیل پانی چاہیئے۔ اس وقت مغربی تہذیب کی یلغار ہے مغرب اسلام کو اپنا بڑا حریف قرار دے چکا ہے۔ اس لیے اس یلغار کا مقابلہ کرنے کے لیئے عالم اسلام کو زبردست علمی و فکری تحریک اور ثقافتی انقلاب کی ضرورت ہے۔ ہمارے اہل قلم کا فرض ہے کہ وہ ایسے ادب کو فروغ دیں جو عوام الناس کو اسلام کی ہمہ گیریت اور آفاقیت سے روشناس کر سکے۔ انھوں نے کہا کہ رابطہ ادب اسلامی کی پاکستانی شاخ آج اپنا پہلا بین الاقوامی سیمینار منعقد کر رہی ہے اور اس میں شرکت میرے لیئے بڑے اعزاز کی بات ہے؛ سفرنامے زیادہ تر زائرین کے قلبی و روحانی تاثرات اور واقعات کے مظہر ہوتے ہیں۔ ان میں یقیناً بہت سی معلومات بھی ہوتی ہیں۔ لیکن حرمین شریفین کے سفرنامے بالعموم معاصر دنیا کے پیچیدہ اور دقیق عمرانی مسائل سے زیادہ بحث نہیں کرتے اس لیے یہ بات واضح نہیں کی کہ اس سیمینار کے ذریعہ عصر حاضر کے چیلنجوں کا تجزیہ کرنا کس حد تک ممکن ہوگا۔ عصر حاضر کے چیلنج تو ایک بہت وسیع موضوع ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ملت اسلامیہ کے ادیبوں اور دانشوروں کے سامنے اس وقت غور و فکر کا سب سے اہم موضوع عصر حاضر کے چیلنج اور

ان کا بھرپور جواب ہونا چاہیئے۔

صدر مملکت نے کہا کہ رابطۂ ادب اسلامی نے بہت اچھا کیا کہ حرمین کے سفرناموں کو عصر حاضر کے چیلنجوں کی روشنی میں دیکھنے اور ان کا جائزہ لینے کا ارادہ کیا۔ بہت سے اسلامی ممالک میں ایسی تحریکیں اور تنظیمیں برسرِ عمل ہیں جو اپنے اپنے معاشروں کی تشکیل نو اسلام کے تصورات کے مطابق کرنا چاہتی ہیں انھیں کم و بیش ہر جگہ مزاحمت کا بھی سامنا ہے جس سے مسلمان ممالک داخلی تصادم کی لپیٹ میں آچکے ہیں، میں کسی خاص ملک کا حوالہ نہیں دینا چاہتا لیکن آپ جیسے اہلِ علم سے مخفی نہیں کہ کون کون سے مسلم ممالک اور معاشرے داخلی تصادم کی گرفت میں ہیں۔ یہ تمام عوامل عالم اسلام کے لیے بہت بڑے چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس تنظیم کے لیے یہ بہت مناسب ہوگا وہ ان چیلنجوں کی حقیقت اور نوعیت کا تعین کرنے اور ان کے موزوں جوابات فراہم کرنے کے لیے امت مسلمہ کی رہنمائی کرے۔ صدر مملکت نے رابطہ کے سیمینار کے لیے چند موضوعات بھی تجویز کیئے جن کے عنوانات "اکیسویں صدی اور عالم اسلام کو درپیش فکری و علمی چیلنج" تہذیب مغرب اور اسلام کے تصادم کا پس منظر، جدید سائنسی ترقی اور عالم اسلام، عالمی ذرائع ابلاغ اور عالم اسلام کی موجودہ حالت، اسباب زوال امت اور اس کی نشأۃ ثانیہ کی تدابیر اور عوامل تھے، صدر مملکت نے کہا کہ ان موضوعات کے حوالے سے جو ادب فروغ پائے گا وہ اسلامی ادب کہلائے گا، کیوں کہ اسلامی ادب کہلائے گا، کیوں کہ اسلامی ادب انسانی ادب ہے اور اسلام کا پیغام پوری انسانیت کیلئے ہے۔

وفاقی شرعی عدالت کے چیف جسٹس محبوب احمد نے کہا کہ آج پوری دنیا کو دہشت گردی کا سامنا ہے، جبکہ حالات کا تقاضا ہے کہ دنیا میں امن و سلامتی کا بول بالا ہو۔ انھوں نے کہا کہ مسلمان من حیث القوم دہشت گرد نہیں ہیں۔ ہم مسلمان کا فروغ چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اسلام دشمن طاقتیں کھل کر سرگرم عمل ہیں۔ ہمیں ان طاقتوں سے با خبر اور ہوشیار رہنا ہوگا۔ اور اپنی صفوں میں مکمل

اتحاد اور مضبوطی لازا ہوگی۔ دنیا کی جدید چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لئے قرآن پاک اور احادیث نبوی کی تعلیمات پر عمل کرنا ضروری ہے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ناظم مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن حسنی ندوی نے اپنے خطاب میں کہا کہ لاہور جیسے علمی ادبی و ثقافتی مرکز میں آ کر مجھے حقیقی مسرت ہوئی ہے۔ یہ وہ شہر ہے جہاں مجھے علامہ اقبال سے ملاقاتوں کا شرف حاصل ہوا انہوں نے کہا کہ آج کے حالات میں ضرب کلیمی کی ضرورت ہے ضروری ہے کہ ہماری گفتار اور ملیفہ تحریر میں ضرب کلیمی شامل ہو پاکستان میں یہ ضرب کلیمی زیادہ موثر ثابت ہوسکتی ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر ظہور احمد اظہر نے خطبہ استقبالیہ پیش کرتے ہوئے رابطہ ادب اسلامی کے اعراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔ انہوں نے کہا کہ یہ اسلامی دنیا کے ادبا کی تنظیم ہے جو اس بات پر زور دیتی ہے کہ ایسا ادب تخلیق کیا جائے جو انسانی فلاح کا نقیب اور عصر حاضر کے جدید تقاضوں کے مطابق ہو۔

رابطۂ ادب اسلامی پاکستان کا اگلا اجلاس وفاقی وزیر برائے مذہبی امور راجہ محمد ظفرالحق کی صدارت میں شروع ہوا۔ اس اجلاس میں جن حضرات نے مقالے پیش کیے ان کے نام اور مقالوں کے عنوانات یہ تھے۔ ابن جبیر اور عبدالماجد دریابادی کے حرمین کے سفرناموں کا تقابلی مطالعہ ڈاکٹر جلال السعید سفتاوی (مصر) اولین سفرنامہ حجاز ڈاکٹر طفیل ہاشمی (اسلام آباد) حرمین کے اردو سفرناموں کے علمی و ادبی اسالیب۔ ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی (علی گڑھ) علامہ اقبال کا تخیلی سفرنامہ حرمین۔ ڈاکٹر سید محمد اکرم شاہ اکرم (لاہور) اپنے گھر سے بیت اللہ تک ــــ ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی (بنارس) تمام مقالات بہت اہم تھے اور ان کے مشمولات کو دورِ جدید کے تقاضوں سے خوبی کے ساتھ مربوط کیا گیا تھا۔ راجہ ظفرالحق نے اپنے صدارتی کلمات میں رابطے کے تحت منعقد اہم موضوع پر سیمینار کے انعقاد پر مسرت کا اظہار کیا اور اس امر پر زور دیا کہ عربی زبان کی تدریس اور

اشاعت کا کام اگر سرگرمی سے شروع ہو جائے تو ملتِ پاکستانیہ میں ایک بڑا ذہنی اور روحانی انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے اس ضمن میں ذرائع ابلاغ کو بھرپور کردار ادا کرنا چاہیئے۔

تیسرا اجلاس رابطہ ادب اسلامی ہندوستان کے بانی صدر، نامور عالم دین مولانا سید ابوالحسن علی الندوی کی صدارت میں ہوا۔ مہمانانِ خصوصی ڈاکٹر انوار حسین صدیقی، پروفیسر اجتبیٰ ندوی، ڈاکٹر ضیاء الحسن ندوی، ڈاکٹر خورشید رضوی اور شیخ عبدالحفیظ مکی تھے۔ یہ سیمینار کا طویل ترین اجلاس تھا جس میں بڑے پُر مغز مقالے پڑھے گئے۔ جن کی تفصیل یوں ہے۔ "سفر حجاز" ایک نئے نثر سفرنامہ (ڈاکٹر تحسین فرتی) دورِ جدید کے تحدیات کے پس منظر میں ایک منفرد سفرنامہ حج ڈاکٹر محمود احمد غازی (اسلام آباد) ماہر القادری کا کاروانِ حجاز ــــ ڈاکٹر سید عبدالباری (اودھ یونیورسٹی) نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کا سفر حرمین۔ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی (دہلی یونیورسٹی) علی طنطاوی کے من نفحات الحرم اور مولانا دریابادی کے سفرِ حجاز کا تقابلی مطالعہ۔ نذر الحفیظ ندوی (ہندوستان) الرحلۃ الحجازیہ۔ مولانا سید واضح رشید ندوی (ہندوستان) نواب صدیق حسن خان کا سفرنامہ حج۔ پروفیسر ڈاکٹر عبدالباری (علی گڑھ) غلام رسول عمر کا سفرنامہ حجاز، زاہد منیر عامر (لاہور) قیامِ پاکستان سے پہلے کے چند اردو سفرنامے۔ ڈاکٹر ابین اللہ وثیر (لاہور) یوسف اماسی کے حرمین کے سفرنامے کا ایک جائزہ۔ خالد حسن ہندادی (قطر) ابن جبیر اندلسی کا سفرنامہ۔ ڈاکٹر خالق داد (لاہور)

رابطے کے سیمینار کی چوتھی نشست کی صدارت مشہور رسالے "کاروانِ ادب" کے مدیر ممتاز عالم سید محمد رابع ندوی نے کی۔ اس اجلاس کے مقالہ نگاران میں ڈاکٹر ابوبکر صدیق (بنگلہ دیش) ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی (پاکستان) پروفیسر اجتبیٰ ندوی (جامعہ ملیہ اسلامیہ کی دہلی) شامل تھے۔

رابطے کے اس دو روزہ سیمینار کا آخری اجلاس وزیر اعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف کی

صدارت میں ہوا۔ اس میں مندوبین کے تاثرات اور بعض پیش کی جانے والی قرار دادیں خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں۔

عالمی رابطہ ادب اسلامی پاکستان کے اس دو روزہ سیمینار میں پڑھے جانے والے مقالات حرمین کے سفرناموں کے بڑے تفصیلی جائزوں پر مشتمل تھے۔ ان مقالات سے اندازہ ہوا کہ دیگر اسلامی زبانوں اور خصوصاً اردو میں حرمین کے سفرناموں کی تعداد حیران کن ہے۔ اس سیمینار سے یہ اندازہ بھی ہوا کہ اچھی اخلاقی اور روحانی قدروں کو فروغ دینے کے لئے اس طرح کے مذاکروں کا انعقاد کتنا مفید اور ملتِ اسلامیہ نیز پاکستان کے قومی تشخص کو اُجاگر کرنے میں کس قدر موثر ہو سکتا ہے اکادمی ادبیات جیسے ہمارے سرکاری اداروں کو جنہیں خطیر رقم گرانٹ میں ملتی ہے کے لئے یہ لمحۂ فکر یہ ہے۔ توقع کی جاتی ہے کہ رابطہ ادب اسلامی پاکستان شاخ سید ابوالحسن ندوی کی فکری رہنمائی میں ایسے ادب کو ترویج دینے میں کامیاب ہوگی جو زندگی کی اعلیٰ قدروں کو فروغ دیتا ہے ●

(باقی سلسلہ ص ۳۵ سے آگے)

مگر ایسا نہیں ہوا۔ انہوں نے دو فرقوں میں اختلافات پیدا کرنے اور نفرت کے بیج بونے کی کوشش کیں۔ زہریلی تقریریں کیں۔ ان کے مجرم ہونے کے لئے ان کی بھی تقریریں کافی ہیں، ان کو مستوجب سزا ثابت کرنے کے لئے یہی ایک بڑا ثبوت کافی تھا، میرا غالب گمان یہ ہے کہ اس معاملہ میں ن ۴۹ افراد کے نام لئے گئے ہیں ان کے خلاف قانونی چارہ جوئی کا عمل بھی دوسرے مقدمات کی طرح اپنی فطری رفتار سے جاری رہے گا اور اس کا فیصلہ ہونے میں کئی برس لگ جائیں گے کیونکہ یہی ہمارے لک کی ریت ہے اور جب تک ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ سے اس کا فیصلہ ہوگا بعض ملزم پرلوک معمار چکے ہوں گے اور عوام کو اپنے کارنامے سنائیں گے تاکہ اس سے سیاسی فائدہ اُٹھایا جاسکے اس لئے میڈیا اور م کو اس سے ہوشیار رہنا چاہیئے اور ان کے گمراہ کن پروپگنڈے کے جال میں ہرگز نہیں پھنسنا چاہیئے۔ انہوں ایک مقدس مسجد کو منہدم کرکے ہندوازم کو بدنام کیا جو رواداری کی شاندار روایات کیلئے دنیا بھر میں مشہور ہے انہیں ان کی غنڈہ گردی کی پاداش سے بچنے کا ہرگز موقع نہیں دیا جانا چاہئے۔ (بشکریہ ہندوستان ٹائمز ۱۲ دسمبر ۱۹۹۷ء)

ترجمہ: سید عبدالحفیظ سید وی

جارج واشنگٹن کے پڑپوتے کا قبولِ اسلام

امریکہ کی صدارتی تاریخ کی ایک اہم ترین شخصیت جارج واشنگٹن کے پڑپوتے نے اپنی یہ واردات قلبی سعودی ریڈیو کی انگریزی سروس کے سامنے بیان کی تھی جسے "الدعوۃ" نے مرتب کر کے شائع کیا تھا۔ اس کا یہ ترجمہ تعمیر حیات سے لیا گیا ہے۔

س : براہ کرم آپ اپنا تعارف کرائیں اور بتائیں کہ اسلام کی قبولیت کے اسباب محرکات کیا پیش آئے؟ اس کا آغاز کب سے ہوا۔؟

ج : واشنگٹن کے قریبی صوبہ ورجینیا میں میری پیدائش ہوئی۔ میرے والد امریکی بحریہ میں ایک افسر تھے۔ وہ امریکی صدر جارج واشنگٹن کے پوتے تھے۔ میری نشوونما اور تعلیم و تربیت کے سارے مراحل خاندان ہی میں طے ہوئے۔ میرے آباء واجداد کا ایک بڑا فارم ہے جو چار سو سال سے ہماری ملکیت ہے۔

بچپن ہی سے عیسائیت کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی جستجو میرے اندر تھی، میں جس پادری سے بھی یہ سوالات کرتا وہ مجھے مطمئن کرنے میں ناکام ہو جاتا، مجھے یقین ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کا وجود اور حضرت عیسیٰ کا وجود دونوں الگ الگ ہے، یہ دور میری زندگی کا مشکل ترین دور تھا۔ پھر صحافتی زندگی میں جب نے قدم رکھا تو مجھے ایک کیمرہ مین کی حیثیت سے رسالہ ٹائم کی طرف سے لبنان کی خانہ جنگی

کی تصویریں کھینچنے کے لئے بیروت جانا پڑا، یہ واقعہ ہے کہ ایک عرب اور مسلمان ملک کے سفر کا تصوّر کرکے مجھے خوف وگھبراہٹ ہو رہی تھی۔ اس کے لئے امریکی فلموں اور میڈیا نے میرے دل و دماغ میں یہ بات اچھی طرح اتاردی تھی کہ مسلمان تشدّد پسند اور ظالم ہوتے ہیں وہ انتہائی جاہل اور جنگلی ہوتے ہیں، انسانی تہذیب سے ان کا کوئی تعلق نہیں، لیکن لبنان میں داخل ہوتے ہی میرے تمام نظریات وعقائد یکسر باطل ثابت ہونے، میں نے بچشم خود مشاہدہ اور تجربہ کیا کہ مسلمانوں اور عربوں سے متعلق جو کچھ مغربی میڈیا نے تصوّرات دیئے ہیں وہ جھوٹ اور گمراہ کن پروپگنڈہ ہیں ۔

جن مسلمانوں سے لبنان میں مختلف مقامات پر ہماری ملاقاتیں ہوئیں انہوں نے ہمیشہ خطرات سے ہمیں محفوظ رکھنے میں جان کی بازی لگادی کھیر سے کھانے پینے اور آرام وراحت کے تمام وسائل مہیا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ جب (عیسائی فوجوں) کی کمین گاہوں سے مجھ پر گولی چلائی گئی اور میں زخموں سے چور ہوگیا تو ان مسلمانوں نے میرے علاج میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا اور اس طرح انہوں نے میری دیکھ بھال کی جیسے میں ان کا بھائی اور فرد خاندان ہوں، اس وقت میری عمر صرف بیس سال تھی، جس ہوٹل میں میرا قیام تھا وہیں قریب میں ایک مسجد تھی جس کے امام سے میں ملاقاتیں کرتا اور اسلام کے بارے میں ان سے معلومات حاصل کرتا رہتا۔ ان ملاقاتوں سے میرے اندر اسلام سے دلچسپی پیدا ہونے لگی لیکن اس وقت میں نے نہ قرآن پڑھا تھا اور نہ ہی حدیث سے واقف تھا، لیکن مسلمانوں سے گفتگو اور مسلسل ملاقاتوں اور ان کے قرب نے میری تمام غلط فہمیوں کو دور کردیا، میں ان مسلمانوں کے ساتھ جنگ کے محاذ پر جاتا تھا تاکہ تصویریں لے سکوں، پھر میں واپس امریکہ آگیا، میں نے از سر نو مسیحی عقائد اور مختلف عیسائی فرقوں سے متعلق مطالعہ کرنا شروع کیا۔ گرجا گھروں میں پادریوں سے بھی ملا مجھے لیکن تشفی نہ ہوسکی ۔

پھر مجھے افغانستان اس وقت جانا پڑا جب روس نے اس قدیم اسلامی ملک پر زبردست یورش کردی، واشنگٹن میں افغانستان کی آزادی کے لئے جدوجہد کرنے والی ایک کمیٹی نے مجھے رپورٹنگ کے لئے افغانستان بھیجا تھا۔ میری یہ بھی ذمہ داری تھی کہ افغان مجاہدین کی ضروریات کا جائزہ لوں اور مالی و فوجی امداد کا اندازہ کروں۔ ہم نے بعض افغان مجاہدین کو واشنگٹن اور نیویارک مدعو کیا تاکہ وہ امریکن کانگریس کے ارکان سے تبادلۂ خیال کرسکیں۔

س : آپ کے افغانستان کے بارے میں کیا مشاہدات واحساسات رہے ہیں؟

ج : میں نے عام افغان مجاہدین کے اندر جو اسلامی روح پائی اس نے مجھے متحیر کردیا، میں نے دیکھا کہ وہ عین معرکۂ جنگ میں وقت آنے پر نمازوں کے لئے کھڑے ہو جاتے۔ وہ کہا کرتے کہ اپنے خالق و مالک کو راضی کرنے کے لئے ہم یہ عبادت کرتے ہیں۔ میں جب انہیں جوش و جذبہ سے جہاد کرتے دیکھتا اور نہتے ہوتے ہوئے بھی ایک بڑی فوج سے لڑتے دیکھتا تو اپنے دل میں کہتا کہ یہ لوگ کمزور اور نہتے ہونے کے باوجود اپنے طاقتور دشمن پر یقیناً فتح و غلبہ حاصل کرلیں گے، اس لئے ان کے دلوں میں وہ ایمان موجزن ہے جس سے روسی فوج محروم ہے۔ میں نے قیامِ افغانستان کے دوران ہی احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مطالعہ شروع کردیا، ایک حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رفقاء سے فرماتے تھے کہ ایمان کی بدولت کامیاب و کامران ہوں گے۔ اس میں شک نہیں کہ ایمان کی قوت سے بھرپور افغانستان کے مجاہدین بالآخر جدید ترین جنگی سازوسامان سے لیس روسی فوج کو شکست دینے میں کامیاب ہو گئے۔

س : آپ کی زندگی میں دوسرا موڑ کب آیا؟

ج : افغانستان سے واپسی کے بعد میں صحافت کے بجائے اپنے اصل پیشہ کیمو یلن کا کام کرنے لگا۔ ۱۹۸۸ء میں نیویارک میں ہم نے اپنے دوستوں کے تعاون سے ایک کمپنی کی بنیاد ڈالی۔ راک اینڈ

رول گانے والوں کی ایک ٹیم ہم نے تشکیل دی۔ وہاں سے ہماری دوسری زندگی۔ جو سراسر لہو و
لہب اور رقص و سرور اور شراب و شباب کی زندگی میں قدم قدم پر لذتوں سے لطف اندوز
ہوتی ہے۔ امریکی سوسائٹی میں ان مشہور فلمی ستاروں سے ہماری ملاقاتیں بھی ہوئیں جن کے بارے
میں ہم اخبارات میں پڑھا کرتے تھے۔ اس زمانہ میں ہم نے دولت اکٹھی کرنی شروع کی۔ ایک
سال کے اندر ہی میرے پاس ستر ہزار ڈالر جمع ہو گئے۔ اس طرح میری زندگی میں پہلی بار اتنی بڑی
رقم جمع ہو گئی۔

مجھے ایک بڑے دولت مند کی شادی کی تقریب میں ناروے مدعو کیا گیا تاکہ اس تقریب
تقریب کی فلم بندی کر دوں۔ اس میں اچھے خاصے پیسے ملے۔ ۱۹۹۲ء میں راک اینڈ رول کے مشہور
مغنی ایلٹن جان کے ساتھ سفر میں جانا پڑا تاکہ اس کے سفر کو میں کیمرہ میں محفوظ کروں۔ یورپ
کی سیاحت کے دوران وائنا میں ہماری ملاقات پناہ گزینوں کے ذمہ دار اقوام متحدہ کے ایک عہدیدار
سے ہوئی اس نے خواہش ظاہر کی کہ آپ صرف دو دن کے لئے بوسنیا ہو کر آئیے اور وہاں کی خانہ
جنگی کی بھی تصویریں لے لیجئے ۔ میں نے اس کو جواب دیا کہ میں نے خانہ جنگی کی اتنی تصویریں
اتاری ہیں جو بہت سی جنگوں کے لئے کافی ہیں۔ (اریٹیریا، ایتھوپیا، پولیساریو، مراکش، بیروت
اور افغانستان وغیرہ کی تصویریں لے چکا ہوں۔ لیکن اس شب جب میں اپنے ہوٹل واپس آیا تو ٹیلی ویژن
پر بوسنیا کی خبریں دیکھ کر میری رائے بدل گئی۔ ہم نے ٹی وی پر دیکھا کہ سرائیوو میں خواتین اور معصوم
بچوں نے مدد حاصل کرنے کے لئے جو لائن لگائی تھی اس پر سربیوں نے زبردست گولہ باری کی ہے
خبر میرے لئے بڑے زبردست صدمہ کا باعث بنی اور میرے احساسات کو اس نے جھنجھوڑ کر رکھ
دیا۔ اس لئے کہ افغانستان اور دوسرے مقامات پر بے گناہ بچے اور عورتیں جنگ میں قتل ہوئیں
لیکن اصل جنگ میں مقابلہ مردوں کا مردوں سے تھا لیکن بوسنیا میں جو جنگ ہو رہی تھی وہ تو مکمل

طور پر مسلمانوں کے خلاف تھی۔ ہر اس چیز کو چن چن کر نشانہ بنایا جارہا تھا جس کا تعلق اسلام اور مسلمانوں سے تھا۔ یہ جنگ جو سراسر ایک بھیانک نسلی جنگ تھی۔ دوسرے دن میں اقوام کے دفتر میں کام کرنے والے اس دوست کے پاس دوبارہ پہونچا تاکہ سرائیو جانے کا پروگرام ترتیب دیا جائے۔ ہم نے جب اس کی اطلاع رسالہ ٹائم کے صدر دفتر کو دی تو ذمہ داروں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ دو دن کے بجائے آپ دو ہفتے وہاں رہیں لیکن میں نے کہا کہ میں صرف دو ہی دن کے لئے نکال سکتا ہوں تاکہ اپنی کمپنی کے ضروری کام انجام دینے کے لئے نیویارک واپس جا سکوں۔

س : پھر آپ نے بوسینا میں کیا دیکھا ؟

ج : سرائیو پہونچنے کے دوسرے ہی دن ہم نے بوسینا کی شاہراہوں پر بڑے ہولناک مناظر دیکھے، فرانسیسی بکتر بند گاڑی میں بیٹھ کر میں ایرپورٹ کے راستے میں واقع ہسپتال گیا تاکہ وہاں کے مناظر کو کیمرے میں محفوظ کرسکوں۔ ہسپتال پہونچا ہی تھا کہ میں نے دیکھا کہ سرب فوجی زبردست گولہ باری ہسپتال پر کر رہے ہیں۔ ہسپتال سے باہر ایک زخمی کو ہم نے فوراً اندر پہونچایا لیکن فرانسیسی محافظ دستے تو واپس چلے گئے ہم وہیں ہاسپتال میں ٹھہر گئے اور تقریباً سولہ گھنٹے ان ڈاکٹروں اور نرسوں کے ساتھ ہم نے گذارے۔ جو شب و روز کھانے پینے سے بے پرواہ ہو کر انتہائی تندہی اور توجہ و محنت سے مریضوں کی دیکھ بھال، علاج میں مشغول تھے۔ انہیں آپریشن کے لئے ضروری اور بنیادی سامان نہیں مل رہے تھے۔ ان کے پاس انجکشن اور دوائیں نہیں تھیں۔ آکسیجن کی شدید کمی تھی۔ پانی اور بجلی سے بھی یہ ہسپتال محروم تھا۔ بجلی کے بجائے شمع سے کام لیا جارہا تھا، بے ہوش کرنے والی دوا تک نہیں تھی، باوجود یہ کہ ہسپتال میں آپریشن کے وسائل اور جدید ترین مشینیں موجود تھیں لیکن بجلی نہ ہونے کے سبب بے کار تھیں۔ دوسری طرف سرب فوجیوں کی مسلسل گولہ باری نے سارا نظام درہم برہم کر رکھا تھا۔ آکسیجن کے پائپ خالی رکھے ہوئے تھے چار مہینے سے یہ صورت حال تھی۔ ہم نے اقوام

کے آفس میں فون کرکے دریافت کیا کہ آکسیجن کا انتظام ہو سکتا ہے کیا ہاسپٹل میں مریضوں کو
غذائی اشیاء مہیا کی جاسکتی ہیں۔ لیکن اقوام متحدہ کے افسران نے یہ عذر کیا کہ اگر ہم کسی ٹرک
کے ذریعہ یہ سامان پہونچانے کی کوشش بھی کریں گے تو سرب فوجیں اپنی گولہ باری سے اس کو
ناکام بنادیں گی اس لئے ہم آپ کی مدد نہیں کرسکتے" اس لئے ہمارے پاس صرف تیرہ[13] ٹرک ہیں
جن پر غذائی اشیاء لدی ہوئی ہیں۔ ہم کسی ایک ٹرک سے دست بردار ہونے کے لئے تیار نہیں ہیں
ہم نے وہاں موجود بوسنیا کے مسلمان فوجیوں سے گفتگو کی اور کہا کہ کیا آپ کوئی باربردار ٹرک تیار
کرسکتے ہیں۔ انہوں نے آمادگی ظاہر کی۔ جیسے ہی ہمیں یہ ٹرک مہیا ہوگیا ہم نے بوسنیا کے مسلمان
فوجیوں کے تعاون سے سفید رنگ کے ٹرک کو رنگ دیا اور اس کے ہر طرف اقوام متحدہ کا
مونوگرام بنادیا۔ ہم نے ہسپتال کو درکار اشیاء کی فہرست بنائی۔ پھر اقوام متحدہ کے مرکزی دفتر سے
غذائی اور طبی سازوسامان لیا اور خود ڈرائیور بن کر ٹرک سے ایرپورٹ کے راستے سربوں کی
چوکیوں سے گذرتے ہوئے ہسپتال پہونچ گئے۔ سربوں نے ہم سے تعرض نہیں کیا۔ دوسرے دن
اقوام متحدہ کے دفتر کو حیرت اور تعجب ہو رہا تھا کہ میرے پاس تو کاغذات ایک صحافی کے ہیں اور
میں اقوام متحدہ کا ڈرائیور کیسے بن گیا۔ سربوں کی وحشیانہ گولہ باری سے بچ کر سلامت ہسپتال تک پہنچنا
ایک معجزہ ہی تھا۔ اگر ہم اپنے کو غیر ملکی صحافی بنا دیتے تو سرب ہمیں یقیناً گولیوں سے اڑا دیتے۔ اس
لئے کہ بیسویں صدی کی جو خانہ جنگیاں ہوئی ہیں ان میں سب سے زیادہ صحافی سربوں کی گولیوں سے مارے
گئے ہیں ہم نے شام ریجی ذمہ داروں سے بھی مدد لی۔ انہوں نے ہسپتال کے لئے طبی اور غذائی اشیاء فراہم
کی اور آکسیجن بھی وافر مقدار میں دوسرے شہر زغرب سے بھجوائی۔

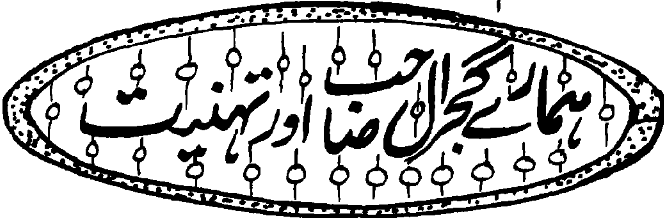
ن: اس کے بعد آپ نے کیا کیا؟

: مجھے محسوس ہونے لگا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک خاص مقصد سے بھیجا ہے۔ میں نے تین دن [illegible]

کے بجائے مزید تین ہفتے یہاں ٹھہرنے کا فیصلہ کرلیا۔ میرے قیام کا تیسرا اور آخری ہفتہ تھا۔ مجھے ضروری تصویریں اتارنی تھیں کہ اچانک ایک کمین گاہ سے مجھ پر گولیاں چلائی گئیں جو میرے ایک باز اور دوسری گولی میری ٹانگ میں لگی۔ بوسینا کے مسلمان ڈاکٹروں نے فوری طبی مدد پہونچائی ا کے بعد مکمل علاج کے لئے میونخ (جرمنی) چلا گیا۔ جہاں امریکی ہاسپٹل میں ڈیڑھ دو مہینے علاج کی غرض سے مقیم رہا۔ ڈاکٹروں نے زخم دیکھ کر بتایا کہ اگر دو سال تک اچھی طرح علاج ہوا تو آپ چل پھر سکتے ہیں لیکن میں نے ان کی ہدایات کو نظرانداز کرکے یہ فیصلہ کرلیا کہ مجھے بوسینا میں اپنی جدوجہد جاری رکھنا ہے چنانچہ میں نے پلاسٹک کے تھیلوں سے اپنے پاؤں کو لپیٹ لیا اور ہم ہاسپٹل پہنچ گیا ایک مہینہ کے اندر ہی چلنے پھرنے کے قابل ہوگیا۔ جرمنی ہی میں ہم نے بوسینا کے لیئے دوائیں جمع کرنے کی مہم شروع کردی جب اچھی خاصی مقدار ضروری دواؤں کی ہوگئی تو میں بوسینا واپس چلا گیا یہاں مجھے ایک ایسے عجیب و غریب تجربے سے گزرنا پڑا جس سے میرے اندر گہرا زخم اور بہت غیر معمولی نفسیاتی صدمہ پہونچا۔ بلکہ اس نے میری زندگی کا رخ یکسر بدل کر رکھ د

مجھے ایک دن معلوم ہوا کہ بوسینا کا ایک چھوٹا سا شہر سرب فوجوں کے محاصرہ میں ہے میں نے وہاں جانے کا فیصلہ کیا۔ کروٹ اور بوسینا کے فوجیوں نے میرے اس فیصلہ کی مخالفت کی اور متنبہ کیا کہ آپ بہت بڑا خطرہ مول لے رہے ہیں ہر طرف سربی فوج گھات لگائے بیٹھی ہے یقیناً وہ ہم کو گولیوں سے بھون دیں گے آپ یہ سفر نہ کریں تو بہتر ہے خودکشی کے مترادف ہے یہ سفر لیکن میرا فیصلہ وہاں جانے کا اٹل تھا ہم رات کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ جب اچھی طرح تاریکی چھا گئی تو ہم نے سفر کا آغاز کردیا۔ آخر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ سرب فوجیوں نے ہم پر گولیوں کی بوچھار کردی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمیں بال بال بچالیا' جس موٹر میں سوار تھے وہ بری طرح تباہ و برباد ہوگئی۔ انجن، ٹائر اور شیشے مکمل طور پر تباہ ہوگئے۔ ہم واپس آگئے، دوسری موٹر لی اور ایک دوسرے راستے کا انتخاب کیا۔

یوسف ناظم



اُردو زبان کی کئی خوبیاں ہیں پہلی خوبی تو یہ ہے کہ یہ خود اُن بیاہی دوشیزہ کی طرح حجاب میں ہے لیکن اس کی دھوم ہندوستان ہی میں نہیں سارے جہاں میں ہے اور دوسری خوبی جو خاص اہم خوبی ہے یہ ہے کہ یہ زبان ہمیشہ فرشتوں کی یاد دلاتی ہے۔ فرشتوں سے متعلق اُردو میں اشعار تو خیر ہیں ہی ہیں لیکن محاورے بھی کئی ہیں۔ جن میں سے ایک محاورہ اپنی سبک روی کی وجہ سے علمی کتابوں سے ہوتا ہوا فلمی مکالموں میں بھی رائج ہو گیا ہے۔ اور اب ہر فلم میں کم سے کم ایک مکالمہ لازمی طور پر ایسا ہوتا ہے جس میں فرشتے ضرور مذکور ہوتے ہیں اور جب سے ہمارے (ہمارے کے لفظ پر جتنا بھی زور ہو سکے دیجئے) گجرال صاحب ہندوستان کے وزیراعظم ہوئے ہیں۔ ہر کسی کی زبان پر یہی ہے کہ ہم کیا ہمارے فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا کہ گجرال صاحب ایک دن یہ کام کر بیٹھیں گے۔ اب ان سے کوئی کہے کہ فرشتہ صفت انسانوں کے تعلق سے قدرت نے جو فیصلے کر دیئے ہیں وہ صرف صادر کیئے جاتے ہیں مشتہر نہیں کیئے جاتے۔ اور یوں بھی فرشتوں میں گفت و شنید کا طریقہ رائج نہیں ہے۔ وہ فرشتے ہیں آدمی نہیں ہیں دن رات خبریں نشر کرنے اور حشر برپا کرنے میں مصروف رہیں۔ آدمی جس رفتار سے لسانیات کے مدارج طئے کر رہا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ چند دنوں بعد الیکٹرانک میڈیا اتنا عام ہو جائے گا کہ لوگ کانوں میں ایک منی آلہ سماعت (پلگ) لگا کر سویا کریں گے اور جو نہی کوئی اہم خبر نشر ہوگی وہ بیدار ہو جائیں گے

صرف یہی نہیں آدمیوں کے خوابوں کے بھی ویڈیو کیسٹ کی تیاری کا انتظام ہو جائے گا جو خواب بھی اچھا یا برا وہ رات میں دیکھیں گے صبح بیڈ ٹی کے ساتھ اس کا کیسٹ دیکھ سکیں گے۔

گجرال صاحب کے وزارت عظمیٰ کے منصب پر فائز ہونے کے بعد ہندوستان کے حالیہ کلچر میں اچانک ایک خوش گوار تبدیلی رونما ہوئی ہے وہ یہ کہ پورے ملک میں "شرافت" سے متعلق نیک جذبات، اچھے خیالات اور عمدہ نظریات ابھر کر سامنے آگئے ورنہ شرافت، ایک بھولی بسری چیز ہو کر رہ گئی تھی۔ ان کا وزیر اعظم بننا تھا کہ ہر گوشے، حلقے اور کونے سے جو بھی آواز آئی یہی آئی کہ گجرال صاحب بے حد شریف آدمی ہیں۔ حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جن کی زبان پر کسی کے لیے برسوں سے کوئی کلمۂ خیر نہیں آیا تھا۔ انہی کا کلمہ پڑھنے لگے (ہماری بات چھوڑیئے ہم تو اردو والے ہیں) ہم سوچتے ہیں کہ کیا ہندوستان میں شرافت کا اتنا زبردست قحط پڑا تھا کہ لوگ کسی شریف آدمی کو دیکھ کر چونک پڑیں کہ ہائیں آپ یہاں کہاں آگئے۔ آدمی اپنی وارفتگی اور جوش میں اپنے دل کی بات کتنی صفائی سے کہہ جاتا ہے۔ ہے نا خوشی کی بات ۔۔۔ ایسے ہی موقعوں پر کہا جاتا ہے کہ آپ کے منہ میں گھی شکر (کہا جاتا ہے کا مطلب کہا جاتا تھا اب گھی اور شکر کے ذکر سے دل پر چوٹ پڑتی ہے) بہرحال یہ بات طشت از بام ہو گئی کہ ہمارے یہاں شرافت کا استقبال کیا جانے لگا ہے۔ اس استقبال میں اس کے اقبال کی بھی بات مضمر ہے کیا تعجب اب شرافت رفتہ رفتہ ہی سہی کسی، ازم کی صورت اختیار کرے اور جدید وضع کا لباس پہن کر جنت نگاہ بن جائے۔ شرافت کے لیئے جدید فیشن کا لباس بے حد موزوں رہے گا یہ سب کو نظر آنی چاہیئے بلکہ مسلسل نظر آتی رہنی چاہیئے۔

گجرال صاحب کے وزیر اعظم بننے کے بعد ہی ہم ہندوستانیوں کو پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ غیر منقسم ہندوستان میں جہلم نام کی ایک جگہ بھی تھی اور یہی وہ جگہ ہے جہاں گجرال صاحب پیدا ہوئے۔ ورنہ

عام خیال یہ تھا کہ جہلم پنجاب کے پانچ دریاؤں میں سے ایک دریا ہے۔ غلط فہمی دراصل یوں پیدا ہوئی کہ گنگا نام کا کوئی شہر یا جمنا نام کی کوئی بستی ہمارے یہاں موجود نہیں ہے۔ اب گجرال صاحب کی وجہ سے لوگوں کے علم میں یہ بات آئی کہ جہلم صرف ستلج و بیاس کی طرح بہنے والی کوئی چیز نہیں اور نہ چناب و سندھ کی وضع کی موج در موج اور گہر در آغوش کوئی دریا ہے بلکہ باضابطہ ایک زمینی علاقہ ہے (گو کہ اس کا مزاج آبی ہے) لوگوں کو اب اندازہ ہوا کہ دوآبہ کی طرح مردم خیز بھی ہے۔ اب تو جہلم میں اپنے بسنے والے لوگ باآوازِ بلند کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا ایک "آبہ" دوآبے سے بھی زیادہ جاندار ہے شعر کی تکمیل کے لئے اصولاً دو مصرعے ضروری ہوتے ہیں لیکن بعض ایک مصرعہ بھی پورے ایک شعر کے اغراض و مقاصد کی تکمیل کے علاوہ معانی و مطالب کی ترسیل کے لیئے کافی و شافی ہو سکتا ہے مثلاً ؏

بزرخ بالا کُن کہ ارزانی ہنوز

لیکن یہ شاید فارسی مصرع ہے اُردو مصرعہ بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس میں مشکل یہ ہے کہ اُردو شاعری میں بیسیوں مصرعے ایسے ہیں جو مکمل شعر ہیں تاہم موقعے کی مناسبت از گجرال صاحب کی رعایت سے شاید۔ مصرع سب کے دل میں اُتر جائے گا ؏

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا

وزیر اعظم کی حیثیت سے انھیں کامل ۱۴ جماعتوں کی حمایت حاصل ہے ہمارے پرانے نظامِ تعلیم کے حساب سے ۱۴ جماعتیں زیرِ تعلیم رہنے کے بعد ہی آدمی گریجویٹ بنتا تھا۔ گجرال صاحب اپنے کسی نظام کو بھولے نہیں ہیں۔ دانشت آید بکار چیزوں میں سب سے کارآمد چیز یادداشت ہے اور سنا ہے وہ اپنے اسکولی اور کالجی دوستوں کو اب بھی یاد کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ "کبھی ہم میں تم میں بھی پیار تھا" کا موسم لوٹ آئے۔ لیکن ایک دیوار راہ میں حائل ہے یہ دیوار ہے تو سیاست کی لیکن

حقیقت میں دیوارِ گریہ ہے۔ ایک مکمل مصرع یہاں بھی یاد آ گیا۔

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں

لیکن جانے دیجئیے یہ موقع تہنیت کا ہے۔ تہنیت پیش کرنے کے جوش میں ممکن ہے ہمارے جغرافیہ داں حضرات جہلم کے بارے میں تحقیقی مقالے لکھنے کی اجازت طلب کریں جو ظاہر ہے انھیں ہرگز ہرگز نہیں ملے گی۔ کیوں کہ دفترِ وزارتِ عظمیٰ کو "نو تھینکس" کہنے کی بھی سہل ممتنع پر عبور حال ہے۔ (حال ہی میں ایک درخواست جو ایک سرکاری عہدہ دار کی مدتِ ملازمت میں توسیع سے متعلق تھی "القطع" قرار دی گئی ورنہ ادبی بیت بازی فلمی انتاکشری کا روپ اختیار کر لیتی) یوں بھی جائے پیدائش کے حوالے سے خراجِ عقیدت پیش کرنے کا طریقہ بہت دقیانوسی ہے۔ اس کی بجائے اگر ہمارے ماہرین مشروبات یہ لکھ دیں کہ ہمارے یہاں کے تیار کردہ اور پاکستان کے تیار کردہ شربتِ روح افزا میں لذت اور ذائقے کے معاملے میں وہاں کا شربت زیادہ شیریں ہے حالانکہ یہاں دونوں ہمدرد دواخانے کے ایک ہی فارمولے کے مطابق لیکن فرق پانی کا ہے یعنی وہاں کا پانی زیادہ میٹھا ہے تو یہ جدید طرز کا خراجِ عقیدت ہوگا اس خراجِ عقیدت کو زیادہ وقیع اور لذیذ بنانے کے لیے یہ لکھنا ضروری ہے کہ وہاں کے شربتِ روح افزا کی تیاری میں جو پانی استعمال ہوتا ہے وہ دریائے جہلم کا پانی ہے۔ خواہ وہ پانی بیاس کا ہو یا ستلج کا۔ فی الحال کوئی شخص بھی جہلم کے پانی پر اعتراض نہیں کرے گا۔ تحقیق کی تصحیح کا سلسلہ تو برسوں جاری رہتا ہے۔ محققین خود ہی تھک کر چپ سادھ لیتے ہیں۔ ویسے ہمارا مشورہ ہے کہ پانی کی بات چھیڑی ہی نہ جائے۔ ہندوستان میں پانی کا مسئلہ آگ بنا ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہمارے یہاں ۱۴ کروڑ لوگوں کو پینے کا پانی ہی نہیں ملتا اور جو ملتا ہے وہ صحیح نہیں ہوتا۔ مشتاق احمد یوسفی کی کتاب کی طرح "آبِ گم" ہوتا ہے۔ کتاب تو سب کو پسند آئی لیکن حیرانی سب کو اس بات کی ہے کہ یہ آبِ گم ہے کیا اور وہاں کیسے پہنچا۔

پانی کے مسئلے کے آگ بن جانے کی بات ہم نے اس لیئے کی کہ قرۃ العین حیدر کا ناول "آگ کا دریا" یاد آگیا ورنہ ہم تو صرف پنجاب کے پانچ دریاؤں کا ذکر کر کے آگے بڑھ جاتے۔ جہاں تک مبارکباد اور تہنیت کا تعلق ہے ہم جانتے ہیں کہ گجرال صاحب اس کے قابل نہیں ہیں اور پھول مالاؤں اور گلدستوں کی بہتات وافراط سے وہ تقریباً بیزار آ چکے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ اس شوخ و شاداب کلی کے قائل ہوں گے جس میں بوئے وفا ہو۔ اقبال نے کیا خوب کہا تھا ؂

ہزاروں پھول ہیں کھلتے ریاض ہستی میں — وفا کی جس میں ہو بو وہ کلی نہیں ملتی

لاہور کے شالیمار باغ کے پھولوں کی خوشبوؤں میں بسا ہوا یہ شعر ذہن میں یوں آ گیا کہ گجرال صاحب کی تعلیم دہیں ہوئی ان پر کسی بیرونی یونیورسٹی کی ڈگری کا قرض نہیں ہے اس معاملے میں بھی وہ خالص ہندوستانی ہیں اور انھیں ہر اس چیز سے پیار ہے جس میں ہندوستان کی مٹی کی سوندھی خوشبو موجود ہو۔ اردو زبان بھی انھیں اسی لیئے پیاری ہے۔ ان کی مادری زبان اردو نہ سہی لیکن اپنے مادر وطن ہی کی ایک لطیف زبان پر وہ فدا فدا ہیں۔ انھوں نے اردو میں شاعری اس لیئے نہیں کی کہ انھیں اردو کے تمام اچھے شعر اور خاص طور پر وہ شعر جو جیل کی سلاخوں کو توڑ کر باہر نکلے ہیں یاد ہیں۔ وہی شعر جن میں آہن و فولاد کی مضبوطی اور استحکام ہے لیکن جنھیں زبان کی شیرینی نے شاخ گل کی لچک اور مشام جاں کو معطر کر دینے والی مہک عطا کر دی ہے انھیں ورد زبان ہیں۔ اشارہ فیض کے اشعار کی طرف ہے۔ گجرال صاحب نے اس شاعر کو جو کوئے یار سے نکل کر سوئے دار چل پڑا تھا۔ "یہ یادِ فیض" میں دل کھول کر داد دی ہے گجرال صاحب خود بھی تو "لب پہ حرف غزل، دل میں قندیل غم" کے قتیل رہے ہیں اور وہ بھی چاہتے تو نثر میں ایک زنداں نامہ لکھ ڈالتے۔ لیکن ہم گجرال صاحب کی محبت اور وسعت قلبی کو صرف اردو حلقے میں محدود نہیں کرنا چاہتے۔ یہ تو ایک اتفاق ہے اور کیسا حسین لیکن ستم ظریفانہ اتفاق کہ ہندوستان کے ۵۰ سالہ جشن آزادی کے موقع پر گجرال کمیٹی کی بھی سلور جوبلی

منائی جاسکتی ہے۔ (اس کمیٹی کی تشکیل ۱۹۷۲ء میں عمل میں آئی تھی) اور دوسری ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ سال غالب سے بھی اس لئے منسوب ہے کہ اردو کے اس عظیم اور عجیب و غریب شاعر کی ولادت کا یہ دوسوواں سال ہے اور جب ۱۹۶۸ء میں غالب صدی منائی گئی تھی تو اسی علاقے کے جس کا ذکر گجرال صاحب کے حوالے سے ہو رہا ہے ایک شاعر نے یہ کہا تھا۔

اردو پہ ستم ڈھا کے غالب پہ کرم کیوں ہے ساحر کا لہجہ ذرا سخت تھا لیکن خوش گفتاری کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ گجرال کمیٹی کی سفارشات کو عمر کی اس منزل پر پہنچے دیر ہو گئی جب سہرے کے پھول کھلتے کھلتے ہیں۔ ہاتھ پیلے کرنے کا مطلب، یہ نہیں۔ ہے کہ جس کے ہاتھ پیلے کرنے ہوں وہ خود پیلا پڑ جائے۔ اردو زندہ زبان ہے اور زندہ بھی ہے لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ اس کی خبر گیری ہی نہ کی جائے باغ کے رکھوالوں کی یہ ذمے داری ہوتی ہے کہ وہ اس بات کی نگرانی کرتے رہیں کہ کسی درخت کو گھن تو نہیں لگ گیا ہے؟ گجرال صاحب نے مرض کی تشخیص بھی کر لی ہے اور دوائیں بھی تجویز کر دی ہیں۔ اردو کا کام صلح اور صلاح سے ہونے والا کام ہے فریق اور غنیم بننا تو آسان ہے رفیق اور حلیم بننے کی ضرورت ہے۔ اردو زبان سے روگردانی خاکسار کے حساب سے کفران نعمت کی طرح کی حرکت ہے۔ یہ حرکت اپنی حد میں رہ کر عادت بننے سے پہلے "اسٹاپ" کی تختی دیکھ لے۔ اردو تو پہلے بھی منت پذیر شانہ تھی۔ لیکن جب اس کی زلفیں سنواری جانے لگیں اور ان میں موتی پرونے کا وقت آیا تو پتہ نہیں کیسے اس میں بھوری اور بفاء پیدا ہو گئی۔ حیرت ہے کہ دو آبے میں نرم زمین اس زبان کے لیے سخت ہو گئی۔ جوش نے کس حسرت سے کہا تھا ع

اردو تیری بے کسی پہ دل ہلتا ہے

اور گجرال صاحب نے ۲۷ ستمبر ۱۹۸۲ء کو لکھنؤ کی کل ہند کانفرنس میں جو مقالہ پڑھا تھا اس میں یہ فقرے بھی درج تھے " آپ کو شاید یاد ہو گا کہ میری تقریر کے بعد میرے پاس بیٹھے ہوئے ایک منتری

تیواری جی نے مجھ سے گجرال کمیٹی کی رپورٹ کی تفصیلات جاننے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ ایک حد تک تو مجھے حیرانی بھی ہوئی کہ اُتر پردیش کے محکمہ منتری نے تب تک مطالعہ کرنا تو درکنار اس رپورٹ کے متعلق سنا بھی نہیں تھا۔" گجرال صاحب نے اپنے اس مقالے کی ابتداء یوں کی تھی " ایک عرصے کے بعد لکھنؤ آنا ہوا ہے۔ چند برس پہلے اسی اُردو کے سلسلے میں حاضرِ خدمت ہوا تھا لیکن تب کی دنیا اور آج کا ماحول بدلا ہوا ہے یا یوں کہوں کیا نہیں بدلا ہے۔ اس وقت جناب نرائن دت تیواری میرے عزیز دوست یہاں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے آئے تھے۔ کانگریس کی سرکار تھی۔ لکھنؤ میں بھی اور ملک کی راجدھانی دہلی میں بھی۔ مسئلہ وہی دائمی تھا اُردو کا۔" اس مقالے کے ذکر سے صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ گجرال صاحب اِحال حال میں شریف نہیں ہوئے بلکہ شریف النفس واقع ہوئے ہیں ورنہ اپنے مقالے میں یہ کہہ دینے کے بعد کہ مطالعہ کرنا تو درکنار اس رپورٹ کے متعلق سُنا بھی تھا' وہ یہ نہ کہتے کہ " لیکن پھر بھی یہ اُن کا بڑاپن تھا اور فراخ دلی کا ثبوت بھی کہ انھوں نے فوراً اپنے پاس بیٹھے ہوئے وزیر سے کہا کہ وہ کمیٹی کی رپورٹ فراہم کریں اور اس پر کابینہ میں غور بھی ہو۔"

ہم اُردو بولنے والے (اُردو پڑھنے والے تو اب تعداد میں گنتی کے رہ گئے ہیں) احتجاج کرنے کے معاملے میں خاصے مشہور ہیں اور موقع کوئی ہو ہم سے احتجاج کیے بغیر نہیں رہا جاتا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ احتجاج تو نظر آتا ہے لیکن احتیاج پر کسی کی نظر نہیں پڑتی۔ اکبر الٰہ آبادی کا شعر پرانا بلکہ کہنہ ہو کر آج بھی کتنا نیا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے اس کی روشنائی خشک معلوم نہیں ہوئی ہے۔ وہ شعر ہے

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام　✣　وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ ہمارے عزیز محترم اٹل بہاری باجپئی نے بھی ایک مرتبہ یہ شعر

پارلیمانی میں اپنی تقریر کے دوران پڑھا تھا۔ دیکھیئے اُردو اشعار کی خوبی کہ بے موقع بھی پڑھا جائے تو لطف دے جاتے ہے۔ ہم یہاں گجرال کمیٹی کی رپورٹ کے تعلق سے یہ کہہ کر اپنی بات ختم کریں گے کہ اس رپورٹ پر نظرِ ثانی کی نہیں نظرِ کرم کی ضرورت ہے لیکن ایسا نہ ہو کہ ہم صرف تماشائے اہلِ کرم دیکھتے رہ جائیں۔

گجرال صاحب سے شکایت بھلا کیا ہو سکتی ہے اگر ہے تو بس یہ کہ جو شخص بھی ان کا نام لیتا ہے " ہمارے گجرال صاحب" کہہ کر لیتا ہے۔ گجرال صاحب کے بارے میں ہم نے تفتیش کی یعنی تحقیق کی تو پتہ چلا کہ یہ ہر طرف سے جمالیات کے آدمی ہیں۔ خود ادیب ہیں، سخن شناس ہیں، ان کے بھائی مصور ہیں اور بیگم شاعرہ ہیں۔ انھیں وزیرِ اعظم کے عہدۂ جلیلہ و جمیلہ پر فائز ہوئے کافی دن ہوتے لیکن ان کا تبسم وہی معصومانہ اور مشفقانہ ہے۔ اس تبسم پر سرکاری مہر اس لیے نہیں لگ سکی ہے کہ یہ مسندِ وزارت ان کے لئے کوئی انوکھی چیز نہیں ہے صرف گاؤ تکیہ اور قالین بدلا ہے۔ ان تبدیلیوں کو آب و ہوا کی تبدیلی بھی نہیں کہا جا سکتا اور نہ یہ تبدیلیاں مزاج کی شگفتگی پر اثر انداز ہو سکتی ہیں۔ ثمر ور درخت تو جیسا کہا گیا ہے اور زیادہ جھکتے ہیں۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ گجرال صاحب کی خندہ جبینی میں کم سے کم سترفی صد تو اضافہ ہوا ہی ہوگا۔ اس ۱۵ر اگست کو برسوں بعد ہندوستان کے وزیرِ اعظم کی سمجھ میں آنے والی تقریر سننے کو ملی۔ ورنہ صرف مسائل سمجھ میں آتے تھے زبان نہیں۔

گجرال صاحب جانتے ہیں اور بخوبی جانتے ہیں کہ اُردو رابطے اور واسطے کی زبان ہے اس لیے ان سے یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ آپ کو اُردو زبان کا واسطہ! تہنیت قبول ہو۔ غالب کی زبان میں۔ دستورِ فنِ شعر یہی ہے قدیم سے یعنی دعا پہ مدح کا کرتے ہیں اختتام چوں کہ یہ نثر ہے (وہ بھی بکھری بکھری) اس لیے پہلے مصرعہ میں میری طرف سے گستاخی یعنی ترمیم یہ ہوگی کہ۔ (باقی صلا پر)

مسلمانوں کے ساتھ سماجی ناانصافی کا ازالہ جلد ہونا چاہیئے "راموو الیہ"

مرکزی وزیر بہبود جناب بلونت سنگھ راموو الیہ نے کہا ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ سماجی ناانصافی کا جلد ازالہ ہونا چاہیئے۔ جناب راموو الیہ نے اردو اخبارات و جرائد کے ایڈیٹروں اور نمائندوں سے کھچا کھچ بھرے پی آئی بی کے پریس لاونج میں اظہار خیال اور مختلف سوالوں کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ مسلمان سال بہ سال آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے جا رہے ہیں۔ حکومت اپنے مثبت اقدامات سے اقلیتوں کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہے انہوں نے مسلمانوں کو سب سے پچھڑا ہوا طبقہ قرار دیا۔ جناب راموو الیہ نے کہا کہ متحدہ محاذ سرکار سابقہ خامیوں اور فروگذاشتوں کے ازالہ کی کوشش کر رہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ محاذی حکومت اس معاملے میں بے حد سنجیدہ ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ اب وزیر اعظم مسٹر آئی کے گجرال ہر مہینہ مسلم ممبران پارلیمنٹ سے ملاقات کریں گے اور مسلمانوں کے جملہ مسائل سے بروقت اور براہ راست آگاہی حاصل کریں گے اسی طرح سے موصوف پست ذاتوں اور قبائل کی نمائندگی کرنے والے ممبران پارلیمنٹ سے بھی مہینے میں ایک بار ملاقات کریں گے اور ان کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کریں گے۔

مسٹر راموو الیہ نے کہا از روئے دستور حکومت ہند اقلیتوں کی فلاح و بہبود کے لئے ہنہہ ہے اور ان کی امتیازی شناخت و شان کو برقرار رکھتے ہوئے ان کی تعلیمی اور معاشی پیش رفت

سکے لئے کوشاں ہے۔ انہوں نے بغیر کسی تحفظ کے اس کا اعتراف کیا کہ ملک کی آنجہانی وزیراعظم
اندرا گاندھی نے اقلیتوں کی فلاح و بہبود کی غرض سے جو پندرہ نکاتی پروگرام وضع کیا تھا اس پر
موثر طور پر عمل نہیں ہو پایا اور تعلیمی اور معاشی میدان میں مسلمان سال بہ سال آگے بڑھنے کے بجائے
ترقی معکوس کا شکار ہو رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ محاذی حکومت دل سے محسوس کرتی ہے کہ یہ بہت
بڑی سماجی ناانصافی ہے جس کا جلد از جلد اور موثر طور سے ازالہ ہونا چاہیئے۔ اس حقیقت کے
پیش نظر محاذی حکومت پندرہ نکاتی پروگرام کے ہر ہر نکتہ پر از سر نو غور کر رہی ہے اور اپنے
مثبت اقدام سے اقلیتوں کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ۱۹۷۱ء کی
مردم شماری کی بنیاد پر ملک میں ایسے ۴۱ اضلاع کی نشاندہی کی گئی تھی جہاں اقلیتی فرقوں کا غلبہ تھا
اب قومی اقلیتی کمیشن کی سفارشات کی روشنی میں ۱۳۷ اضلاع کو خصوصی درجہ حاصل ہو گا۔
اور ان کی تیز تر ترقی کے لئے حکومت ان پر زیادہ سے زیادہ مسائل صرف کرے گی۔ وزیر موصوف
نے کہا کہ حکومت اقلیتوں کی تعلیمی حالت سدھارنے کے لئے خصوصی کوشش کر رہی ہے اور مرکزی
وزارت برائے فروغ انسانی وسائل کے ذریعہ اقلیتوں کا اجرار کیا جا رہا ہے اس سلسلے میں
ملک کے آٹھویں پنج سالہ منصوبے میں ۲۶ر۲۷ کروڑ روپے اس اسکیم کے تحت مختص کی گئی تھی جس
میں سے ۹ر۸ کروڑ روپے اس اسکیم کے تحت خرچ کئے جا چکے ہیں۔ وزیر نے کہا کہ حکومت
مدرسوں اور مکتبوں کا بنیادی کردار اور ان کا دینی مزاج برقرار رکھتے ہوئے ان میں حالات حاضرہ
کے تقاضوں کے مطابق سائنس، حساب اور انگریزی کا وغیرہ بھی ادا کرنا چاہتی ہے اور اس
غرض سے اگرچہ آٹھویں منصوبہ میں صرف ایک کروڑ روپے کی رقم مختص کی گئی تھی لیکن حقیقتاً
۲۷ر۱ کروڑ روپے خرچ کئے گئے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اقلیتوں کے غلبہ والے ۴۱ اضلاع میں
۷۹-۱۹۷۸ء میں کمیونیٹی پالی ٹیکنیک اسکیم کا اجرار کیا گیا اور ۲۰۰ سے زائد نشاندہ ٹکنیکل اور

ووکیشنل کاروباروں میں اس کا نفاذ ہوا۔ ۴۱ میں سے ۴۰ اضلاع میں کمیونٹی پالی ٹیکنیک کا اجراء عمل میں آیا۔

وزیر بہبود نے کہا کہ اقلیتی فرقہ کے کمزور طبقوں کے لئے امتحان سے پہلے کوچنگ کی اسکیم شروع کی گئی ہے تاکہ مقابلے کے امتحانوں میں ان کی اہلیت میں اضافہ ہو اور وہ روزگار حاصل کر سکیں۔ آٹھویں منصوبے کے دوران ۱۸۹ مراکز کو منظوری دی گئی ہے اور اس اسکیم پر ۶۵ء۳ کروڑ روپے صرف کیئے جاچکے ہیں۔ وزیر موصوف نے بتایا کہ نویں منصوبے کے تحت اس مد میں ۲۰ء۱۸ کروڑ روپے کی رقم مہیا کی گئی ہے۔

وزیر بہبود مسٹر راموالیہ نے پریس کو اس بات سے آگاہ کیا کہ ستمبر ۱۹۹۴ء ہی میں نیشنل مائنورٹیز ڈیولپمنٹ اینڈ فینانس کارپوریشن کا وجود عمل میں آچکا تھا جس کا مجموعی فنڈ ۵۰۰ کروڑ روپے ہے لیکن افسوس کا مقام ہے کہ مرکزی حکومت نے تو اپنے حصہ کا فنڈ ۱۲۵ کروڑ روپے ادا کر دیا ہے لیکن ریاستوں کی طرف سے مستعدی کا مظاہرہ نہیں کیا جارہا ہے ۔۔۔ ۵۰۰ کروڑ کی مجموعی رقم میں سے ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں کو ۸۷ء۳۴ کروڑ روپے دینا چاہئیے تھا لیکن اس مد میں صرف ۲۶ء۱۸ کروڑ روپے جمع کیا گیا ہے ۔۔۔ یہ پوچھے جانے پر کہ جب یہ صورت حال ہے تو مرکز ریاستوں کو دی جانے والی منصوبہ جاتی رقوم میں سے مطلوبہ رقم پہلے ہی کیوں نہیں وضع کر لیتا' وزیر موصوف نے فرمایا کہ اس سلسلے میں ہم مزید انتظار کریں گے۔ انہوں نے اس امر پر اپنے انتہائی کرب کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ حکومت کی بہترین کوششیں بیوروکریسی اور کارروائی کے مختلف مراحل کی نذر ہوجاتی ہیں۔ انہوں نے خاص طور پر ڈیولپمنٹ کارپوریشن کے سابق مینجنگ ڈائرکٹر کا شکوہ کیا جن کے دور میں خاطر خواہ پیش رفت نہیں ہوسکی۔ انہیں وزیر موصوف نے کارپوریشن سے

نہیں ہوسکی۔ انہیں وزیر موصوف نے کارپوریشن سے کسی طرح سے رخصت کیا لیکن نیا مینجنگ ڈائرکٹر
تو دس ماہ کے وقفے کے بعد ہی میسر آیا۔ انہوں نے نئی مینجنگ ڈائرکٹر شریمتی دینا چکرال کا خاص
طور سے ذکر کیا جو کانفرنس میں موجود تھیں اور کہا کہ امید ہے کہ ان کے آنے سے محکمہ اپنے فرائض
بہ سرعت تمام اور خوش اسلوبی سے انجام دے گا۔ انہوں نے کہا کہ ریاستوں کے مطلوبہ رقم جمع نہ کرنے
پر وہ رنجیدہ ہیں لیکن اس سلسلے میں ہم آہنگی کی کوششیں کی جارہی ہیں اور امید ہے کہ مستقبل
میں نتائج حوصلہ افزا ہوں گے۔ وزیر نے کہا کہ بہرحال اس سلسلے میں ستمبر ۱۹۹۷ء تک ۱۷۱.۷۷
کروڑ روپے مختص کئے جاچکے تھے اور اس سے چالیس ہزار افراد مستفید ہوئے۔ انہوں نے یہ بھی
[illegible] سال کے دوران مد میں ۱۴ کروڑ روپے کی رقم صرف کی جاچکی ہے۔
[illegible] خاص طور سے مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن کا ذکر کیا جسے سنٹرل
[illegible] قائم کیا [illegible] کا مقصد تعلیمی طور سے پچھڑے ہوئے طبقوں میں علم کی
[illegible] ۲۰ کروڑ روپے کی رقم مہیا کی گئی تھی تاکہ یہ
[illegible] کے میدان میں کام کرسکے اب تک فاؤنڈیشن نے ۸۷ اداروں کو
۹۳ء۱ کروڑ روپے کی رقم فراہم کی ہے اور ۶ء۲ کروڑ روپے سے لڑکیوں کے لئے رہائشی
اسکول، موجودہ اسکولی عمارتوں کی توسیع اور کمپیوٹرز کی خریداری وغیرہ کا کام انجام دیا گیا ہے
مسٹر راموو الیہ نے کہا کہ فاؤنڈیشن کی جانب سے مزید رقم کے مطالبہ پر اسے دی جانے والی رقم
اب کروڑ سے بڑھا کر ۱۰۰ کروڑ روپے کر دی گئی ہے۔ لسانی اقلیتوں کی طرف سے بھی حکومت
غافل نہیں ہے۔ اور سنٹرل وقف کونسل نے مسلم طلبا کے لئے ۵۰۰ اسکالرشپ دیئے ہیں
تاکہ وہ ٹیکنیکل ڈگری کورسس میں کامیابی حاصل کرسکیں۔

اس سوال پر کہ کیا یہ سب کچھ مسلمانوں کو رجھانے کے لئے نہیں کیا جارہا ہے۔ مسٹر

راموو الیہ نے کہا کہ یہ سو فیصدی جھوٹا پروپگنڈہ ہے۔ محاذی حکومت نے حقائق کی روشنی میں محسوس کیا کہ اسے ماضی کی غلطیوں اور کوتاہیوں کا ازالہ کرنا ہے' لہذا اس نے اپنی رفتار تیز کردی ہے اور کچھ کرنے کے جذبے سے آگے بڑھ رہی ہے۔ اگر ہماری مخلص کوششوں کو کوئی اور معنی پہناتے تو ہمیں اس کی پرواہ نہیں۔ ہم جو مناسب اور درست سمجھتے ہیں اس پر عمل کرنے کا تہیہ کررکھا ہے اور اسے انجام دے کر رہیں گے۔

ایک اخبار نویس نے جب اس خبر پر ان سے تبصرہ کرنے کو کہا کہ خبر رساں ایجنسی یو این آئی اپنی اردو سروس بند کرنے کا ارادہ رکھتی ہے تو انہوں نے اس سے لاعلمی ظاہر کی مگر کہا کہ وہ اس ضمن میں وزیر اطلاعات ونشریات مسٹر جے پال ریڈی سے رابطہ قائم کریں گے آخر میں وزیر بہبود دستے زور دے کر کہا کہ وہ اقلیتوں کے مفاد میں کام کرنے کی کوشش کرنے میں بے حد سنجیدہ ہیں ◢

خوشونت سنگھ

بابری مسجد کے انہدام کے بعد

اس سے بھلا کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ عبادت گاہ جیسی پاک اور مقدس جگہ کو تباہ کرنے والا کو قرار واقعی سزا ملنی چاہیئے۔ اس گھناؤنے جرم کا ارتکاب کرنے والوں سے بجا طور پر نفرت کی جانی چاہیئے، لیکن میرے دل میں ایک کھٹک ہے، مجھے یہ ڈر ہے کہ جن لوگوں کو ماخوذ کیا گیا ہے اور بابری مسجد کے انہدام کے جرم میں ان کے خلاف عدالت میں مقدمہ چلانے کا فیصلہ کیا گیا ہے کہیں وہ اسے ایک سیاسی حربہ نہ بنالیں اور خود کو ہندو دھرم کا محافظ بنا کر ہیرو نہ بن جائیں، میرا احساس ہے کہ وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے اور جس دن ایسا ہوا ان کو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کرنے کا مقصد فوت ہو جائے گا جن لوگوں پر فرد جرم عائد کی گئی ہے ان کے بارے میں دنیا جانتی ہے کہ انہوں نے کیا کچھ کیا ہے بلکہ ان میں سے تو بعض ایسے بھی ہیں جنہوں نے بڑے فخر سے دنیا کو اس کی کہانی سنائی ہے کہ (چھ دسمبر ۱۹۹۲ء) ان کے غنڈوں نے اجودھیا میں کیا قیامت ڈھائی تھی۔ مجھے فرد جرم عائد کرنے میں غیر معمولی تاخیر کی وجہ سے یہ بھی ڈر ہے کہ کہیں انصاف کا خون نہ ہو جائے۔ ہم سب واقف ہیں کہ ہماری پولیس اور عدلیہ کچھوے کی رفتار سے کام کرتی ہے قتل کے مقدمہ کا فیصلہ ہونے میں کئی برس لگ جاتے ہیں مگر بابری مسجد کا معاملہ ذرا مختلف ہے لہٰذا اس میں زیادہ دلچسپی اور تندہی کا مظاہرہ کرنے کی ضرورت تھی اور ہے؟ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ جن لوگوں نے بھی مسجد کے انہدام کے لئے لوگوں کو اکسایا تھا انہیں فوراً گرفتار کیا جاتا اور ان کے خلاف مقدمات کئے جاتے۔

رپورٹ قسط دوّم

الکٹرانک میڈیا میں اردو کا حصّہ

ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے لگ بھگ پانچ لاکھ مکتبوں اور مدرسوں میں دینی تعلیم کا نظم ہے جہاں عربی اور اردو کے ذریعے ہی مسلم بچوں کو تعلیم دی جاتی ہے کیوں کہ عربی کے بعد اگر کسی زبان میں دینی تعلیم کا لٹریچر ہے تو وہ اردو ہے ملک کے کونے کونے میں واقع مساجد میں اکثر و بیشتر اعلانات اردو زبان میں چسپاں نظر آتے ہیں ملک بھر میں پھیلی ہوئی پندرہ لاکھ درگاہوں اور بزرگان دین کے مزارات میں سے لگ بھگ پانچ لاکھ پر ہر سال تقاریب عرس منعقد ہوتی ہیں۔ عرس کے ان مواقع پر تمام کارروائی اردو اور عربی میں ہوتی ہے۔ ان روایتی اداروں کی موجودگی میں اردو ہمیشہ فروغ پاتی رہے گی کیوں کہ ان اداروں کا تعلق نہ صرف مسلم فرقے کی مذہبی زندگی سے ہے بلکہ ان کی تہذیبی اور سماجی زندگی سے بھی جڑا ہوا ہے۔

۸۸-۱۹۸۷ء کے ایک سروے کے مطابق اس وقت مسلمانوں میں ناخواندگی کی شرح مردوں میں ۴۲ء۴ فیصد اور خواتین میں ۵ء۹۵ فیصد تھی (اس وقت گریجویشن کی سطح پر مسلمان مردوں کا تناسب ۲۳ فیصد اور خواتین کا ۸ء۰ فیصد تھا۔ آج بھی دس سال بعد اس صورتحال میں کوئی انقلابی تبدیلی

نہیں آئی ہے مسلم خواتین کی اکثریت کی تعلیم بھی وہ بہت چھوٹی عمر میں مسجدوں مکتبوں یا گھروں میں استانیوں سے حاصل کرتی ہیں اور اردو میں حاصل کرتی ہیں ان کا مطالعہ اردو میں دینی کتابوں اور اردو اخبارات تک محدود رہتا ہے بہت ہی کم خواتین کی پڑھنے یا لکھنے کی طرف توجہ ہوتی ہے ۔ دوسرے فرقوں کی خواتین اردو دوسری کسی زبان سے ان کا تعلق انتہائی کم ہوتا ہے ضرورت اس بات کی تھی کہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے زیادہ سے زیادہ اردو پروگراموں کے ذریعے سماج کے اس طبقے کی ذہنی وسعت میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کیا جاتا مگر عملاً اس کے برعکس ہوا ۔ ٹیلی ویژن اور ریڈیو نے اردو پروگراموں کو نظر انداز کر کے الیکٹرونکس میڈیا کے سماجی فروغ و ترقی کے نظریہ کو مضحکہ خیز بنا دیا اور انھوں نے اس حقیقت کو بھی نظر انداز کر دیا کہ سماج کے ۱۲ اور ۱۲ فیصد حصے کی ترقی تعلیم اور ان کے ذہنی افق میں توسیع کے بغیر ملک کی ترقی کی رفتار تیز نہیں ہو سکتی اور ان کی پسماندگی پورے ملک کی پسماندگی کا سبب بن سکتی ہے ۔

اردو کے تعلق سے معاملہ صرف ان پروگراموں تک ہی محدود نہیں ہے جو ذہنی افق وسیع کرتے ہیں ۔ سوچ میں تبدیلی پیدا کرتے ہیں ۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں فنی ایجادات اور نئے طریقوں سے تعارف کراتے ہیں بلکہ وزارت اطلاعات و نشریات کے بنیادی کام اطلاعات کی ترسیل میں بھی اردو کے تعلق سے بخل سے کام لیا جا رہا ہے حالانکہ خبریں اطلاع دینے کے ساتھ ساتھ ذہنی افق کو بھی بالواسطہ طور پر وسیع کرتی ہیں ۔

قومی نیوز بلیٹن کی تعداد ۸۹ ہے جن میں ۴۲ بلیٹن ہندی میں ، ۲۲ انگریزی میں اور ایک سے لے کر تین تک بلیٹن مختلف علاقائی زبان میں نشر کیے جاتے ہیں ۔

علاقائی نیوز بلیٹن ـــــ علاقائی زبان میں خبروں کی اپنی ایک علاحدہ اہمیت ہے ۔ اپنی

زبان میں خبریں سن کر لوگوں میں اپنی علاقائی شناخت کی اہمیت کا احساس جاگزیں ہوتا ہے اس لیے فلمی گانوں کے پروگرام کے لیے اگر کسی پروگرام کے سامعین کی تعداد شمار کی جائے تو وہ خبروں کے سامعین کی ہو گی ۔

آل انڈیا ریڈیو کے ۴۷ اسٹیشنوں سے روزانہ ۱۴۴ علاقائی خبروں کے بلیٹن ۶۴ زبانوں اور بولیوں میں نشر کیئے جاتے ہیں ۔ اردو میں علاقائی خبریں اورنگ آباد سے پانچ منٹ کی ۔ حیدرآباد سے دس منٹ کی، پٹنہ سے پانچ منٹ کی اور سری نگر سے تین بلیٹن (ایک دس منٹ کا اور دو پانچ پانچ منٹ کے) نشر کیئے جاتے ہیں ۔

ٹیلی ویژن سے ہندی کے تین اور انگلش کے تین بلیٹن نشر کیئے جاتے ہیں علاقائی ٹیلی ویژن کیندروں سے علاقائی زبانوں میں بھی نیوز بلیٹن نشر کیئے جاتے ہیں ۔ دہلی اور کلکتہ سے چینل ۲ پر اور حیدرآباد، لکھنؤ، پٹنہ اور سری نگر سے چینل ایک پر اردو میں خبریں ٹیلی کاسٹ کی جاتی ہیں ۔

کیا ایک ایسی زبان کے جاننے والوں کے لیے جو سارے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں، نیوز بلیٹن کی یہ تعداد کافی ہے ؟

ان اعداد و شمار کو پیش کرنے کا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ ان ریاستوں میں اردو داں افراد کی اتنی کثیر تعداد کے ہوتے ہوئے (وہ مسلمان جن کو اردو دانوں کی تعداد میں شامل نہیں کیا گیا ان کی بھی کثیر تعداد اردو سمجھتی ہے اور بولتی ہے البتہ لکھ پڑھ نہیں سکتی) انصاف کا تقاضہ یہ تھا کہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر اردو نشریات کے لیے اچھا خاصا وقت متعین کیا جاتا تا کہ اتنی کثیر تعداد اردو آبادی میں جو تعلیمی اور سماجی طور پر پسماندہ ہے ۔ ترقی کر سکتی ۔

شاداب حیدرآباد — ڈسمبر ۷ ۹۶

کیا یہ ناانصافی نہیں ہے کہ ریاستوں میں ۲۵ ہزار سے لے کر چند لاکھ تک کی آبادی جو ایک مخصوص بولی بولتی ہے اس کے لیئے تو علاقائی خبروں اور پروگراموں میں وقت مہیا کیا گیا ہے لیکن اُردو جو قومی سطح پر ایک تسلیم شدہ زبان ہے اس کے لیئے ایسی ریاستوں میں بھی جہاں ان کی آبادی ڈھائی لاکھ سے لے کر تیس لاکھ تک ہو اُردو نشریات کے لیئے صرف کہیں بیس منٹ روز اور کہیں صرف ۳۰ منٹ فی ہفتہ کا وقت دیا جاتا ہے اور اُردو خبروں کے لیئے حیدرآباد، پٹنہ اور اورنگ آباد کو پانچ پانچ منٹ اور اترپردیش کی راجدھانی لکھنؤ کو صرف دس منٹ کا وقت دیا جاتا ہے۔

مضراثرات: ملک میں کروڑوں کی تعداد میں اُردو زبان بولنے اور سمجھنے والے ایک ایسے فرقے کو جو تعلیمی اور سماجی طور پر پسماندہ بھی ہو اور جس کی لگ بھگ ساٹھ فیصد خواتین ناخواندہ ہوں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعے اُردو میں ان کی استعداد، ان کی سمجھ بوجھ میں اضافہ کرنے کی منصفانہ کوشش نہ ہونے سے کئی طرح کے نقصانات ہو رہے ہیں جو براہ راست بھی ہیں اور بالواسطہ بھی۔ مثلاً بھارتی ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے اُردو میں دلچسپ پروگرام اور نشریات نہ ہونے کے سبب بھارتی سامعین دلچسپی اور معلومات کے لیئے امریکہ، چین، برطانیہ، روس، پاکستان، ایران، عراق، سعودی عربیہ، بنگلہ دیش وغیرہ ۲۵ دیگر ممالک کے اُردو پروگرام سنتے ہیں۔ ان میں سے بعض ممالک کے دو گھنٹے یومیہ اور بعض آٹھ گھنٹے روز اُردو پروگرام نشر کرتے ہیں اور ہم یہ بھی بخوبی جانتے ہیں کہ ان میں سے بعض ممالک ہمارے دوست نہیں ہیں اور بھارت کے خلاف معاندانہ جذبات رکھتے ہیں اور اپنی نشریات میں عوام کو گمراہ کرنے کی سازش کر سکتے ہیں۔

ریاستی اور علاقائی ریڈیو اسٹیشنوں سے اُردو پروگراموں کے نہ ہونے سے اُردو کے دانشوروں

شاعروں اور ادیبوں کو اپنے خیالات کی ترسیل کے بہتر مواقع نہیں مل پاتے جو دوسری علاقائی زبانوں کے دانشوروں کو حاصل ہوتے ہیں اس سے ایک قسم کا احساس محرومی اور بیگانگی فروغ پاتا ہے۔

عام معلوماتی پروگراموں کے اُردو میں نہ ہونے سے سماج کی بالخصوص خواتین کی ذہنی ترقی نہیں ہو پاتی ہے اور وہ فرسودہ خیال اور اوہام کا شکار رہتی ہیں۔

فنی، تکنیکی پروگراموں کے اُردو میں نہ ہونے سے اُردو داں کاریگر مزدور تاجر نئی تکنیکوں اور سائنسوں سے جلد آشنا نہیں ہو پاتا اور روایتی طریقوں پر چلتا رہتا ہے۔

اُردو میں معقول نشریات نہ ہونے کے سبب مختلف شعبہ ہائے زندگی میں سرکار کے فلاحی اقدامات کی خبر اُردو داں طبقے تک نہیں پہنچ پاتی اور وہ حکومت کی فلاحی و امدادی اسکیموں کے فوائد سے محروم رہ جاتے ہیں۔

اُردو پروگراموں اور خبروں کی نشریات میں کمی سے ملک کی سماجی اقتصادی زندگی کو اور بھی بہت سے نقصانات پہنچ رہے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ارباب اقتدار اس طرف خصوصی توجہ دیں کیوں کہ ملک خواہ کتنی بھی ترقی کر لے، کتنا ہی آگے بڑھ جائے لیکن جب تک ملک کے بندرہ فیصد مسلمان ترقی نہیں کریں گے ملک کی مجموعی ترقی سست ہی رہے گی۔

اگر حکومت ایمانداری کے ساتھ مسلمانوں کی ترقی چاہتی ہے ان کے ذہنی افق کو وسیع اور انھیں نظریاتی طور پر ملک کی قومی دھارا میں زیادہ متحرک کرنا چاہتی ہے تو ایسے تمام علاقوں میں جہاں مسلمانوں کی آبادی پانچ لاکھ ہے اسے ان علاقوں کے علاقائی ریڈیو اسٹیشنوں اور ٹیلی ویژن سنٹروں سے اُردو کے پروگرام نشر کرنا چاہئیے۔

ذیل میں ہم ایسے کچھ علاقوں کے نام دے رہے ہیں جہاں سے آل انڈیا ریڈیو کو اُردو میں خصوصی

پروگرام نشر کرنے چاہئیں اور کم ازکم دن میں دوبار دس دس منٹ کے اردو نیوز بلیٹن نشر کرنے چاہئیں۔ آندھرا پردیش۔ کڑپہ، حیدرآباد، کتہ گوڑم، وجئے واڑہ، عادل آباد، اننت کرنول، نظام آباد، ورنگل ــــ آسام، گوہاٹی ــــ بہار۔ بھاگلپور، دربھنگہ، جمشید پور، پٹنہ، رانچی، ڈالٹن گنج، ہزاری باغ، گوا۔ پاناجی ــــ گجرات۔ احمد آباد، سورت۔ ہریانہ۔ روہتک، جموں و کشمیر جموں، لیہہ، سری نگر۔ کرناٹک: بنگلور، بھدراوتی، دھارواڑ، گلبرگہ، میسور، چتردرگا، ہاسپیٹ، رائچور ــــ مہاراشٹرا۔ اورنگ آباد، ممبئی، ناگپور جلگاؤں، پونے، سانگلی، رتناگری، احمد نگر، اکولہ، ناسک، ستارا، شولاپور ــــ پنجاب، جے راجستھان ــــ جئے پور، جودھپور، ادے پور، الور، بانسواڑہ، کوٹہ، ناگور ــــ تملناڈو، مدراس تروچیراپلی ــــ اترپردیش۔ آگرہ، الہ آباد، امروہہ، گورکھپور، لکھنؤ، نجیب آباد، رامپور وارانسی، بریلی، فیض آباد ــــ بنگال۔ کلکتہ، مرشدآباد ــــ دہلی۔ دہلی۔

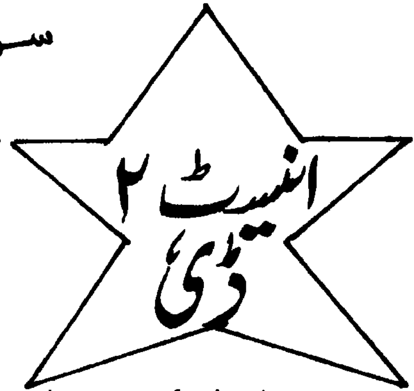
اسی طرح مندرجہ ذیل مقامات سے روزانہ اردو میں ایک گھنٹے کا ٹیلی ویژن پروگرام ٹیلی کاسٹ ہونا ہی چاہیئے اس کے علاوہ پندرہ منٹ کا یومیہ اردو نیوز بلیٹن بھی نشر کرنا چاہیئے۔ دہلی، لکھنؤ، جئے پور، پٹنہ، ممبئی، حیدرآباد، بنگلور ــــ

مندرجہ ذیل مقامات سے ٹیلی ویژن پر روزآنہ ۳۰ منٹ کا اردو پروگرام ٹیلی کاسٹ ہونا چاہیئے، جالندھر، کلکتہ، احمدآباد، بھوپال، مدراس، جموں، گورکھپور، رانچی، پونی، ناگپور ــــ ۰ (بشکریہ اخبار نو دہلی)

اُردو لکھیئے، اُردو پڑھیئے، اُردو بولیئے

سوستنترا

مواصلاتی ٹیکنالوجی میں بیش قیمت اضافہ



ہندوستان کا خلائی پروگرام تین دہائیاں مکمل کرکے اکیسویں صدی میں داخل ہونے جارہا ہے۔
یہ پروگرام اس اصول پر چلایا جارہا ہے کہ ہمارے خلائی سائنسداں نوے کروڑ کی آبادی والے اس ملک کے دیہی علاقوں کی غربت اور جہالت دور کرنے میں مدد دینے کے لئے اپنے تصورات کو عملی جامہ پہناتے ہوئے ضرورت کے مطابق دوسروں کی ٹیکنالوجی بھی استعمال کریں۔

اس پروگرام کے تحت ماضی کی کامیابیوں کے سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے گذشتہ ۴ جون ۹۷ء کو ایک سیارچہ انسیٹ ۲۔ ڈی کامیابی کے ساتھ خلاء میں چھوڑا گیا۔ انسیٹ ۲ سیریز کا یہ چوتھا سیارچہ ہے جو ہندوستان کی خلائی تحقیق کی تنظیم اسرو نے خود اپنے بنائے ہوئے ڈیزائن کے مطابق تیار کیا ہے۔ اسے فرانسیسی گویانا میں کورو کے مقام سے ایک یوروپی لانچ وہیکل آریانے کے ذریعے مخصوص مدار میں پہونچایا گیا بعد میں اسے 450 این لکویڈ اپوجی موٹر کے استعمال سے ۳۶ ہزار کلومیٹر کی آخری بلندی پر پہنچایا جائے گا۔

ہندوستان میں بنے ہوئے سیارچوں کی کامیابی کارکردگی اس بات کا بین ثبوت ہے کہ ہمارے سائنسدانوں نے خلائی ٹیکنالوجی کے میدان میں عمدہ صلاحیت حاصل کرلی ہے۔ اس ٹیکنالوجی کا استعمال بلی مواصلات، ٹیلی ویژن نشریات اور موسمیات کے شعبوں میں کیا جارہا ہے اور سیارچہ سے ملنے والی

تصاویر اور دیگر معلومات کی بنا پر مفید پیشین گوئیاں کی جاتی ہیں اور اگر کہیں طوفان وغیرہ آنے والا ہوتا ہے تو اس کی وارننگ بھی دی جاتی ہے جس سے لوگوں کی جانیں بچانے میں مدد ملتی ہے ۔

سیارچوں کو خلاء میں پہنچانے کے لئے لانچ وہیکلز تیار کرنے میں اب تک جو پیش رفت ہوئی ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہندوستان اپنے خلائی پروگرام پر عمل درآمد میں خود مکتفی بننے کی خواہش رکھتا ہے اور اس کے لئے سرگرم کوشش کر رہا ہے ۔

ہندوستان کا خلائی پروگرام باقاعدہ طور پر ۱۹۷۲ء میں شروع ہوا تھا جب حکومت نے ایک خلائی کمیشن اور ایک خلائی ڈپارٹمنٹ قائم کیا تھا ۔ خلائی پروگرام کا مقصد ملک میں مصنوعی سیارے (سیارچے) اور لانچ سسٹم تیار کرنا اور سیارچوں سے حاصل ہونے والی معلومات کے بڑے پیمانے پر فائدہ مند استعمال کا شن چلانا ہے ۔

انڈین نیشنل سٹلائٹ انڈین سٹلائٹ یا انسیٹ ملک میں ٹیلی مواصلات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی نشریات اور موسمیات کے لئے استعمال کیا جانے والا پہلا آپریشن سسٹم ہے ۔ انسیٹ سیریز کا آغاز اگست ۱۹۸۳ء میں کثیر مقصدی جیو اسٹیشنری سٹلائٹ انسیٹ ۱ بی سے ہوا ۔ انسیٹ اسپیس ڈپارٹمنٹ محکمہ مواصلات ہندوستانی محکمہ موسمیات، آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن کا ایک مشترکہ پروجیکٹ ہے ۔

پہلی نسل کے انسیٹ سیارچے امریکہ سے حاصل کئے گئے تھے ۔ ان میں بارہ سی بینڈ ٹیلی کمیونکیشن ٹرانسپانڈر دو اعلیٰ طاقت والے ایس بینڈ ٹی وی براڈ کاسٹ ٹرانسپانڈر، موسمی پیشگوئیوں کے لئے زمین کی تصاویر لینے والا ویری ہائی ریزولیوشن ریڈیو میٹر اور موسمی آبی اور سمندری تفصیلات فراہم کرکے ریلے کرنے کے واسطے ایک ریلے ٹرانسپانڈر نصب تھا ۔ انسیٹ ۱ ڈی جو ۱۲ جون ۹۰ء کو خلاء میں چھوڑا گیا تھا اور اب تک خدمات انجام دے رہا ہے، انسیٹ ۱ سیریز کا آخری سیارچہ ہے

...سلنسل کے انسیٹ ۲ سیریز کے سیارچوں کا ڈیزائن اسرو نے بنایا اور اسکلنے انہیں تیار کیا
...س سیریز کا پہلا سیارچہ انسیٹ ۲ اے جولائی ۱۹۹۲ کو اور دوسرا انسیٹ ۲ بی ۲۳ جولائی کو چھوڑا
...یہ دونوں سیارچے یوروپی لانچ وہیکل "آریانے" سے چھوڑے گئے۔ ان دونوں سیارچوں میں
...سی بینڈ اور چھ توسیع شدہ سی بینڈ ٹیلی کمیونیکشن ٹرانسپانڈر، دو اعلیٰ طاقت والے ایس بینڈ
...وی براڈکاسٹ ٹرانسپانڈر، ایک وی ایچ آر آر ریڈیومیٹر (جس کے ساتھ دو کے ایم ریزولیوشن
دکھلانے دینے والا بینڈ اور آٹھ کے ایم ریزولیوشن کا انفرا ریڈ بینڈ) ایک آبی اور بحری ڈاٹا
ریلے کرنے والا ٹرانسپانڈر اور تلاش اور راحت رسانی کی کارروائیوں میں مدد دینے والا ایک ٹرا
نسپانڈر نصب ہے۔

اس سیریز کا تیسرا سیارچہ انسیٹ ۲ سی، ۷ ڈسمبر ۱۹۹۵ کو آریانے "لانچ وہیکل ہی سے
چھوڑا گیا۔ اس سیارچہ میں بارہ سی بینڈ، ٹرانسپانڈر، چھ توسیع شدہ سی۔ بینڈ ٹرانسپانڈر
تین کے یو بینڈ ٹرا اور ایک سی ایس ٹرانسپانڈر (موبائیل سیٹلائٹ سروس کے لئے) لگے ہوئے ہیں۔

انسیٹ ۲ ڈی انسیٹ ۲ ڈی انسیٹ ۲ سی جیسا ہی ہے سوائے اس کے کہ اس کی
لوڈ صلاحیت زیادہ ہے انسیٹ ۲ ڈی کا فکسڈ سیٹلائیٹ سروس پے لوڈ بارہ سی بینڈ ٹرانسپانڈروں پر
مشتمل ہے جب کہ انسیٹ ۲ سی میں دو۔ ۵ ڈبلیو ٹرانسپانڈر، سات ۱۰ ڈبلیو ٹرانسپانڈر اور تین 4
یو ٹرانسپانڈر ہیں۔ اس کے علاوہ انسیٹ ۲ ڈی میں براڈ کاسٹ سیٹلائیٹ سروس کے لئے ایس
بینڈ ٹی ڈبلیو ٹی اے کی طاقت انسیٹ ۲ سی کے ۵۰ ڈبلیو سے زیادہ یعنی ۷۰ ڈبلیو ہے۔

انسیٹ ۲ ڈی ہندوستان کے طول و عرض میں اور دوسرے پڑوسی ممالک کو ٹیلی مواصلات کی خدمات
فراہم کرے گا۔ یہ سیارچہ خاص طور پر ایک مواصلاتی سیارچہ ہے اس پر کوئی موسمیات پے لوڈ نہیں
ہے۔ اس سے براڈ کاسٹ سیٹلائیٹ سروس (بی ایس ایس) اور موبائیل سیٹلائیٹ سروس (ایم ایس ایس)

کے لئے انسیٹ خلائی خطے میں جہاں ۶۳ سٹرانسپانڈر پہلے ہی سے موجود ہیں مزید براں ۲۱ سٹرانسپانڈروں کا اضافہ ہوگا۔

انسیٹ ۲ ڈی سے ٹی وی نشریات کے سرکاری ادارہ دوردرشن کو سب سے زیادہ فائدہ ہوگا غیر سرکاری ٹی وی کمپنیاں، کارپوریٹ ادارے اور پبلک سیکٹر کی تنظیمیں بھی اس کی خدمات سے مستفید ہوں گی مگر موسمیاتی پیشنگوئیوں کے لئے کوئی تصاویر ارسال نہیں کر سکے گا۔

مدھیہ پردیش کے جھبوا ضلع میں ابھی گرمیوں میں ایک دو سالہ تجرباتی پروجیکٹ شروع کیا گیا ہے جس پر تیس لاکھ ڈالر صرف ہوں گے۔ اس پروجیکٹ کے تحت نشر ہونے والے دو طرفہ ٹی وی پروگرام سب سے زیادہ دیکھے جا رہے ہیں۔ یہ پروجیکٹ اسرو اور مقامی حکومت کی سرپرستی میں شروع کیا گیا ہے۔ اس کے لئے زیادہ شرح خواندگی والے دیہی مراکز پر انٹرایکٹیو ٹی وی سسٹم نصب کیا گیا ہے۔ ان ٹی وی پروگراموں میں بنیادی تعلیمی موضوعات مثلاً صفائی ستھرائی، حفظان صحت اور خاندانی منصوبہ بندی کے بارے میں مقامی بولیوں میں تبادلہ خیال کیا جاتا ہے۔

اسی طرح اسرو مصنوعی سیاروں سے نیشنل پاور گرڈ کے مانیٹر (نگراں) کا کام لینے کی ایک یہ تجویز بھی غور کر رہی ہے نیشنل پاور گرڈ بجلی کی ترسیل کا ایک وسیع نظام ہے جس کے سوئچنگ اسٹیشن دور دراز علاقوں میں ہیں۔

ہندوستان کے ۱۹۹۰ء سے ۲۰۰۰ کی دہائی کے خلائی پروگرام میں مصنوعی سیاروں کی خدمات کو بہتر بنانے اور بڑھانے پر زور دیا جا رہا ہے آئی آر ایس اور انسیٹ سیریز کے سیاروں سے عملی سروسوں کی فراہمی کے لئے جو دو کلیدی سسٹم قائم کئے گئے تھے انہیں برقرار رکھا جائے گا اور مستقبل میں ملک کے اندر تیار کئے گئے خلا میں چھوڑ کر سیاروں سے فراہم ہونے والی مفید خدمات میں اضافہ کیا جائے گا۔ ٹکنالوجی کو بہتر بنانے کی کوشش کی جائے گی جس سے ہندوستان کی ترقی میں معاون نئی اور متنوع سروسیس شروع کی جا سکیں۔

R.No. 37/979/84
MONTHLY
Telephone : 22916
Postal Regd. No. H/HD59
HYD

SHADAAB

11-5-147, HILLS, HYD-A.P.

VOL. 13 No. 12
DECEMBER 199

شاداب بک کلب

۱۱-۵-۱۴۷، ریڈ ہلز۔ حیدرآباد-۴۰۰۰۴ (اے پی)

- اُردو کتب ورسائل خرید کر پڑھنے اور ہر ماہ کچھ نہ کچھ اس مد پر خرچ کرنے کی عادت ڈالنے کیلئے "شاداب بک کلب" قائم کیا گیا ہے۔
- شاداب بک کلب کی رکنیت فیس -/25 روپے ہے۔
- ہر رکن کو سالانہ -/500 روپے کی کتب ورسائل خریدنے ہونگے۔ یہ رقم وہ پیشگی جمع کروائیں گے یا ہر ماہ -/50 روپے پیشگی ادا کریں گے۔
- مکتبہ شاداب کی مطبوعہ کتب پر (25) فیصد ڈسکاؤنٹ دیا جائے گا دیگر کتب پر ۱۵ فیصد ڈسکاونٹ دیا جائے گا۔
- کتب کی فہرست مکتبہ پر موجود رہیگی اور منتخب کتب کی فہرست "شاداب" میں چھپتی رہے گی۔
- ہر رکن کو اپنی پسند سے انتخاب کا حق حاصل ہوگا۔
- مکتبہ شاداب میں غیر موجود کتب کی خواہش پر انھیں حاصل کرکے فراہم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔
- اگر کوئی رکن سال کے ابتدائی دس ماہ تک -/500 روپے کی کتب فراہم کرنے کی خواہش نہ کریں تو ادارہ اپنی پسند کی کتب روانہ کرے گا